

پیش لفظ

پیر کاہل رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے آپ کے لئے لکھا ہے۔ آپ سب کی زندگی میں آنے والے اُس موڑ کے لئے، جب روشنی یا تاریکی کے انتخاب کا فیصلہ ہم پر چھوڑ دیا جاتا ہے، ہم چاہیں تو اس راستے پر قدم بڑھادیں جو روشن ہے اور چاہیں تو تاریکی میں داخل ہو جائیں۔

روشنی میں ہوتے ہوئے بھی انسان کو آنکھیں کھلی رکھنی پڑتی ہیں۔ اگر وہ ٹھوکر کھائے بغیر زندگی کا سفر طے کرنا چاہتا ہے تو تاریکی میں داخل ہونے کے بعد آنکھیں کھلی رکھیں یا بند کوئی فرق نہیں پڑتا، تاریکی ٹھوکروں کو ہماری زندگی کا مقدر بنا دیتی ہے۔

مگر بعض دفعہ تاریکی میں قدم دھرنے کے بعد ٹھوکر گرنے سے پہلے ہی انسان کو بچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ وہ وہاں اُس موڑ پر آنا چاہتا ہے جہاں سے اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ تب صرف ایک چیز اس کی مدد کر سکتی ہے، کوئی آواز جو رہنمائی کا کام کرے اور انسان اطاعت کے علاوہ کچھ نہ کرے۔

پیر کاہل رحمۃ اللہ علیہ وہی آواز ہے، جو انسان کو تاریکی سے روشنی تک لاسکتی ہے اور لاتی ہے۔ اگر انسان روشنی چاہے تو ”یقیناً ہدایت انہیں کو دی جاتی ہے جو ہدایت چاہتے ہیں۔“
آئیے ایک بار پھر پیر کاہل رحمۃ اللہ علیہ کو سنیں!

باب ۱



”میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش؟“ ہال پوائنٹ ہونٹوں میں دبائے وہ سوچ میں پڑ گئی پھر ایک لمبا سانس لیتے ہوئے قدرے بے بسی سے مسکرائی۔

”بہت مشکل ہے اس سوال کا جواب دینا۔“

”کیوں مشکل ہے؟“ جویریہ نے اس سے پوچھا۔

”کیونکہ میری بہت ساری خواہشات ہیں اور ہر خواہش ہی میرے لئے بہت اہم ہے۔“ اس نے سر جھکتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں آڈیٹوریم کے عقبی حصے میں دیوار کے ساتھ زمین پر لگائے بیٹھی تھیں۔ ایف ایس سی کلاسز میں آج ان کا آٹھواں دن تھا اور اس وقت وہ دونوں اپنے فری ہیریڈ میں آڈیٹوریم کے عقبی حصے میں آکر بیٹھ گئی تھیں۔ لیکن سوئچ پھلی کے دانوں کو ایک ایک کر کے کھاتے

ہوئے جو یہ نے اس سے پوچھا۔

”تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے امام؟“
امام نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا اور سوچ میں پڑ گئی۔

”پہلے تم بتاؤ، تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟“ امام نے جواب دینے کے بجائے اُلٹا سوال کر دیا۔

”پہلے میں نے پوچھا ہے، تمہیں پہلے جواب دینا چاہئے۔“ جو یہ نے گردن ہلائی۔

”اچھا..... ٹھیک ہے..... مجھے اور سوچنے دو۔“ امام نے فوراً ہار مانتے ہوئے کہا: ”میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش؟“ وہ بڑبڑائی۔ ”ایک خواہش تو یہ ہے کہ میری زندگی بہت لمبی ہو۔“ اس نے کہا۔
”کیوں.....؟“ جو یہ یہی۔

”بس پچاس، ساٹھ سال کی زندگی مجھے بڑی چھوٹی لگتی ہے..... کم سے کم سو سال تو ملنے چاہئیں انسان کو دنیا میں..... اور پھر میں اتنا سب کچھ کرنا چاہتی ہوں..... اگر جلدی مری جاؤں گی تو پھر میری ساری خواہشات اور ضروری رو جائیں گی۔“ اس نے مونگ بھلی کا ایک دانہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔
”اچھا اور.....؟“ جو یہ نے کہا۔

”اور یہ کہ میں ملک کی سب سے بڑی ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں..... سب سے اچھی آئی سیٹلٹ۔ میں چاہتی ہوں جب پاکستان میں آئی سرجری کی تاریخ لکھی جائے تو اس میں میرا نام ناپ آف والٹ ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے آسمان کو دیکھا۔

”اچھا اور اگر کبھی تم ڈاکٹر نہ بن سکیں تو.....؟“ جو یہ نے کہا: ”آخر یہ میرٹ اور قسمت کی بات ہے۔“

”ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ میں اتنی محنت کر رہی ہوں کہ میرٹ پر ہر صورت آؤں گی۔ پھر میرے والدین کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ میں اگر یہاں کسی میڈیکل کالج میں نہ جا سکی تو وہ مجھے بیرون ملک بھجوا دیں گے۔“

”پھر بھی اگر کبھی ایسا ہو کہ تم ڈاکٹر نہ بن سکو تو.....؟“

”ہو ہی نہیں سکتا..... یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے میں اس پر وفیشن کے لئے سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔ یہ میرا خواب ہے اور خواہوں کو بھلا کیسے چھوڑا یا بھلا یا جاسکتا ہے۔ اسپاٹل.....“
امام نے قطعی انداز میں سر ہلاتے ہوئے جھٹیلی پر رکھے ہوئے دانوں میں سے ایک اور دانہ منہ

میں ڈالا۔
”زندگی میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا..... کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے، فرض کرو کہ تم ڈاکٹر نہیں بن

پاؤں تو.....؟ پھر تم کیا کرو گی.....؟ کیسے ری ایکٹ کرو گی؟“ امام اب سوچ میں پڑ گئی۔

”پہلے تو میں بہت روؤں گی۔ بہت ہی زیادہ..... کئی دن..... اور پھر میں مری جاؤں گی۔“
جو یہ بے اختیار ہنسی اور ابھی کچھ دیر پہلے تو تم یہ کہہ رہی تھیں کہ تم لمبی زندگی چاہتی ہو..... اور ابھی تم کہہ رہی ہو کہ تم مری جاؤ گی۔“

”ہاں تو پھر زخمی ہو کر کیا کرو گی۔ سارے پلانز ہی میرے میڈیکل کے حوالے سے ہیں..... اور یہ چیز زندگی سے نکل گئی تو پھر باقی رہے گا کیا؟“

”یعنی تمہاری ایک بڑی خواہش دوسری بڑی خواہش کو ختم کر دے گی؟“

”تم کبھی سمجھ لو.....“

”تو پھر اس کا مطلب تو یہی ہو کہ تمہاری سب سے بڑی خواہش ڈاکٹر بننا ہے، لمبی زندگی پانا نہیں۔“

”تم کہہ سکتی ہو.....“

”اچھا..... اگر تم ڈاکٹر نہ بن سکیں تو پھر مرد کی کیسے..... خودکشی کرو گی یا طبی موت؟“ جو یہ نے بڑی لچکی سے پوچھا۔

”طبی موت ہی مردوں کی..... خودکشی تو کبھی نہیں سکتی۔“ امام نے لاپرواہی سے کہا۔
”اور اگر تمہیں طبی موت آنے سکتی تو..... میرا مطلب ہے جلد نہ آئی تو پھر تو تم ڈاکٹر نہ بننے کے باوجود بھی لمبی زندگی گزارو گی۔“

”نہیں، مجھے پتا ہے کہ اگر میں ڈاکٹر نہ بنی تو پھر بہت جلد مری جاؤں گی۔ مجھے اتنا دکھ ہو گا کہ میں تو زندہ رہی نہیں سکوں گی۔“ وہ یقین سے بولی۔

”تم جس قدر خوش مزاج ہو، میں کبھی یقین نہیں کر سکتی کہ تم کبھی اتنی دیکھی ہو سکتی ہو کہ رد و کر مری جاؤ اور وہ بھی صرف اس لئے کہ تم ڈاکٹر نہیں بن سکیں۔ look funny۔“ جو یہ نے اس بار اس کا مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

”تم اب میری بات چھوڑو، اپنی بات کرو، تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟“ امام نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”رہنے دو.....“

”کیوں رہنے دوں.....؟ بتاؤ نا؟“

”تمہیں برا لگے گا؟“ جو یہ نے کچھ ہنچکاتے ہوئے کہا۔

امام نے گردن موڑ کر حیرانی سے اسے دیکھا۔ ”مجھے کیوں برا لگے گا؟“

جو یہ خاموش رہی۔

"اُمی کیا بات ہے جو مجھے بری لگے گی؟" اِمَامہ نے اپنا سوال دہرایا۔

"بری لگے گی۔" جو یہ نے مدغم آواز میں کہا۔

"آخر تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کا میری زندگی سے کیا تعلق ہے کہ میں اس پر برا

مانوں گی۔" اِمَامہ نے اس بار قدرے اچھے ہوئے انداز میں پوچھا۔ "کہیں تمہاری یہ خواہش تو نہیں ہے

کہ میں ڈاکٹر نہ ہوں؟" اِمَامہ کو اچانک یاد آیا۔

جو یہ ہنس دی۔ "نہیں..... زندگی صرف ایک ڈاکٹر بن جانے سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل

ہوتی ہے۔" اس نے کچھ فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"پہیلیاں بچھو اور چھوڑو اور مجھے بتاؤ۔" اِمَامہ نے کہا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں، میں برا نہیں مانوں گی۔" اِمَامہ نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے

ہوئے کہا۔

"وعدہ کرنے کے باوجود میری بات سننے پر تم بری طرح ہراس ہو گی۔ بہتر ہے ہم کچھ اور بات

کریں۔" جو یہ نے کہا۔

"اچھا میں اندازہ لگاتی ہوں، تمہاری اس خواہش کا تعلق میرے لئے کسی بہت اہم چیز سے ہے.....

رائٹ.....؟" اِمَامہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا جو یہ نے سر ہلایا۔

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میرے لئے کون سی چیز اتنی اہم ہو سکتی ہے کہ میں....." وہ بات

کرتے کرتے رک گئی۔

"مگر جب تک میں تمہاری خواہش کی نوعیت نہیں جان لیتی، میں کچھ بھی اندازہ نہیں کر سکتی۔ بتا

دو جو یہ..... پلیز..... اب تو مجھے بہت ہی زیادہ تجسس ہو رہا ہے۔" اس نے منت کی۔

دو کچھ دیر سوچتی رہی۔ اِمَامہ غور سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی، کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جو یہ نے

سر اٹھا کر اِمَامہ کو دیکھا۔

"میرے پروفیشن کے علاوہ میری زندگی میں فی الحال جن چیزوں کی اہمیت ہے وہ صرف ایک

ہی ہے اور اگر تم اس کے حوالے سے کچھ کہنا چاہتی ہو تو کہو میں برا نہیں مانوں گی۔" اِمَامہ نے سمجھتی

سے کہا۔

جو یہ نے قدرے چونک کر اسے دیکھا، وہ اپنے ہاتھ میں موجود ایک انگریزی کو دیکھ رہی تھی۔

جو یہ مسکرائی۔

"میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ تم....." جو یہ نے اسے اپنی خواہش بتائی۔

اِمَامہ کا چہرہ یک دم سفید پڑ گیا۔ وہ شاید تھی یا حیرت زدہ..... جو یہ یہ اندازہ نہیں کر سکی، مگر اس کے

چہرے کے تاثرات یہ ضرور بتا رہے تھے کہ جو یہ کے منہ سے نکلنے والے جملے اس کے ہر اندازے

کے برعکس تھے۔

"میں نے تم سے کہا تھا تم برا مانو گی۔" جو یہ نے جیسے معافی بخش کرنے کی کوشش کی مگر اِمَامہ

کچھ کہے بغیر اسے دیکھتی رہی۔

☆.....☆.....☆

معیز مطلق کے مل چلا تا ہوا درد سے دوہرا ہو گیا، اس کے دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر تھے۔ اس کے

سامنے کھڑے بارہ سالہ لڑکے نے اپنی پھٹی ہوئی ٹی شرٹ کی آستین سے اپنی ناک سے بہتا ہوا خون

صاف کیا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے ٹینس ریٹن ایک بار پھر پوری قوت سے معیز کی ناک پر دے مارا۔

معیز کے مطلق سے ایک بار پھر چیخ نکلی اور وہ اس بار سیدھا ہو گیا۔ کچھ بے چینی کے عالم میں اس نے خود سے

دو سال چھوٹے بھائی کو دیکھا جو اب بغیر کسی لحاظ اور مرآت کے اسے اس ریٹن سے پیٹ رہا تھا جو معیز

کچھ دیر پہلے اسے پیٹنے کے لئے لے کر آیا تھا۔

اس بیٹے میں ان دونوں کے درمیان ہونے والا یہ تیسرا جھگڑا تھا اور تینوں بار جھگڑا شروع کرنے

والا اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ معیز اور اس کے تعلقات ہمیشہ ہی ناخوشگوار رہے تھے۔

ان کا جھگڑا بچپن سے لے کر اب سے کچھ پہلے تک صرف زبانی کلامی باتوں اور دھمکیوں تک ہی

محدود رہتا تھا، مگر اب کچھ عرصے سے دونوں ہاتھ پائی پر بھی اتر آئے تھے۔

آج بھی یہی ہوا تھا وہ دونوں اسکول سے اٹھنے واپس آئے تھے اور گاڑی سے اترتے ہوئے اس

کے چھوٹے بھائی نے بڑی درشتی کے ساتھ چبھے ڈکی سے اس وقت اپنا بیک کھینچ کر نکالا جب معیز اپنا بیک

نکال رہا تھا۔ بیک کھینچتے ہوئے معیز کے ہاتھ کو بری طرح رگڑا آئی۔ معیز بری طرح تھلپایا۔

"تم اندھے ہو چکے ہو؟"

وہ اطمینان سے اپنا بیک اٹھائے بے نیازی سے اندر جا رہا تھا، معیز کے چلانے پر اس نے پلٹ کر

اس کو دیکھا اور لاڈ لہجے کا دردناک کھول کر اندر چلا گیا۔ معیز کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی، وہ تیز

قدموں سے اس کے پیچھے اندر چلا آیا۔

"اگر دوبارہ تم نے ایسی حرکت کی تو میں تمہارا ہاتھ توڑ دوں گا۔" اس کے قریب پہنچتے ہوئے معیز

ایک بار پھر دھاوا۔ اس نے بیک کندھے سے اُتار کر نیچے رکھ دیا اور دونوں ہاتھ کپڑے کر کھڑا ہو گیا۔

"نکالوں گا..... تم کیا کرو گے.....؟ ہاتھ توڑ دو گے؟ اتنی ہمت ہے؟"

"یہ میں تمہیں اس وقت بتاؤں گا جب تم دوبارہ یہ حرکت کرو گے۔" معیز اپنے کمرے کی

طرف بڑھا۔

مگر اس کے بھائی نے پوری قوت سے اس کا بیک کھینچے ہوئے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

”نہیں تم مجھے ابھی ہٹاؤ۔“ اس نے معیز کا بیک اٹھا کر دوڑ پھینک دیا۔ معیز کا چہرہ سرخ ہو گیا اس نے زمین پر پڑا ہوا اپنے بھائی کا بیک اٹھا کر دوڑا چھال دیا۔ ایک لمحے کا انتظار کئے بغیر اس کے بھائی نے پوری قوت سے معیز کی ٹانگ پر ٹھوک ماری۔ جو اب اس نے پوری قوت سے چھوٹنے بھائی کے منہ پر مکارا مارا جو اس کی ناک پر لگا۔ اگلے ہی لمحے اس کی ناک سے خون نکلنے لگا۔ اتنے شدید حملے کے باوجود اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ اس نے معیز کی ٹائی کھینچے ہوئے اس کا گاد ہانے کی کوشش کی۔ معیز نے جو اب اس کی شرٹ کو کالرز سے کھینچا اسے شرٹ کے پھیننے کی آواز آئی۔ اس نے پوری قوت سے اپنے چھوٹے بھائی کے پیٹ میں مکارا اس کے بھائی کے ہاتھ سے اس کی ٹائی نکل گئی۔

”ظہر و میں تمہیں اب تمہارا ہاتھ توڑ کر دکھاتا ہوں۔“ معیز نے اسے گالیاں دیتے ہوئے لاؤنچ کے ایک کونے میں پڑے ہوئے ایک ریکٹ کو اٹھا لیا اور اپنے چھوٹے بھائی کو مارنے کی کوشش کی مگر اگلے ہی لمحے ریکٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پوری قوت سے گھما کر اتنی برقی رفتار کے ساتھ اس ریکٹ کو معیز کے پیٹ میں مارا کہ وہ سنبھل یا خود کو بچا بھی نہیں سکا۔ اس نے یکے بعد دیگرے اس کی کمر اور ٹانگ پر ریکٹ برسادیے۔

اندر سے ان دونوں کا بڑا بھائی اشتعال کے عالم میں باہر لاؤنچ میں آ گیا۔

”کیا تکلیف ہے تم دونوں کو..... گھر میں آتے ہی ہنگامہ شروع کر دیتے ہو۔“ اس کو دیکھتے ہی چھوٹے بھائی نے اٹھا ہوا ریکٹ نیچے کر لیا تھا۔

اور تم..... تمہیں شرم نہیں آتی اپنے سے بڑے بھائی کو مارتے ہو۔“ اس کی نظر اب اس کے ہاتھ میں پکڑے ریکٹ پر گئی۔

”نہیں آتی۔“ اس نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ کہتے ہوئے ریکٹ ایک طرف اچھال دیا اور بڑی بے خوفی سے کچھ فاصلے پر پڑا ہوا اپنا بیک اٹھا کر اندر جانے لگا۔ معیز نے بلند آواز میں میز حیاں چڑھتے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا۔

”تم کو اس کا خیا زہ بھگتتا پڑے گا۔“ وہ ابھی تک اپنی ٹانگ سہلار ہا تھا۔

”sure why not.“ (ہاں، کیوں نہیں) ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ میز حیاں کے آخری سرے پر ٹوک کر اس نے معیز سے کہا: ”اگلی بار تم بیٹ لے کر آنا..... نینس ریکٹ سے کچھ مزہ نہیں آیا..... تمہاری کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی۔“ معیز کو اشتعال آ گیا۔

”تم اپنی ناک سنبھالو..... وہ یقیناً ٹوٹ گئی ہے۔“

معیز غصے کے عالم میں میز حیاں کو دیکھتا رہا، جہاں کچھ دیر پہلے وہ کھڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

سزا سننا تھا چرڈز نے دوسری رو میں کھڑکی کے ساتھ جلیبی کرسی پر بیٹھے ہوئے اس لڑکے کو چوتھی بار گھورا۔ وہ اس وقت بھی بڑی بے نیازی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے میں مصروف تھا۔ وہ قافو قافو باہر سے نظریں ہٹاتا..... ایک نظر سزا سننا تھا کو دیکھتا۔ اس کے بعد پھر اسی طرح باہر جھانکتے لگتا۔

اسلام آباد کے ایک غیر ملکی اسکول میں وہ آج پہلے دن اس کا اس کی بیالوجی پڑھانے کے لئے آئی تھیں۔ وہ ایک ڈپلومیٹ کی بیوی تھیں اور کچھ دن پہلے ہی اسلام آباد اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھیں۔ نیچنگ ان کا پروفیشن تھا اور جس جس ملک میں ان کے شوہر کی پوسٹنگ ہوئی وہ وہاں سفارت خانہ سے منسلک اسکولز میں پڑھاتی رہیں۔

اپنے سے پہلے بیالوجی پڑھانے والی نیچر سز میرین کی سیکم آف ورک کو ہی جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کلاس کے ساتھ کچھ ابتدائی تعارف اور گفتگو کے بعد دل اور نظر اٹھا دو اور ان خون کی ڈایا گرام رائٹنگ بورڈ پر بناتے ہوئے اسے سمجھانا شروع کیا۔

ڈایا گرام کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے اس لڑکے کو کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے دیکھا۔ پرانی بھینک کا استعمال کرتے ہوئے اپنی نظریں اس لڑکے پر مرکوز رکھتے ہوئے انہوں نے اچانک یوں بند کر دیا۔ کلاس میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ اس لڑکے نے سر گھما کر اندر دیکھا۔ سزا سننا تھا چرڈز سے اس کی نظریں ملیں۔ سزا سننا تھا چرڈز مسکرائیں اور ایک بار پھر انہوں نے اپنا نیچر شروع کر دیا۔ کچھ دیر تک انہوں نے اسی طرح بولتے ہوئے اپنی نظریں اس لڑکے پر رکھیں، جو اب اپنے سامنے پڑی نوٹ بک پر کچھ لکھتے میں مصروف تھا اس کے بعد سزا سننا تھا چرڈز نے اپنی توجہ کلاس میں موجود دوسرے اسٹوڈنٹس پر مرکوز کر لی۔ ان کا خیال تھا وہ خاصا شرمندہ ہو چکا ہے دوبارہ باہر نہیں دیکھے گا مگر صرف دو منٹ کے بعد انہوں نے اسے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر متوجہ دیکھا۔ وہ ایک بار پھر بولنے لگے خاموش ہو گئیں۔ بلا توقف اس لڑکے نے گردن موڑ کر پھر ان کی طرف دیکھا، اس بار سزا سننا تھا چرڈز مسکرائیں نہیں، بلکہ قدرے سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے ایک بار پھر نیچر دینا شروع کر دیا۔ چند لمحے گزرنے کے بعد انہوں نے رائٹنگ بورڈ کو دیکھنے کے بعد دوبارہ اس لڑکے کو دیکھا تو وہ ایک بار پھر کھڑکی سے باہر کچھ دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس بار غیر محسوس طور پر ان کے چہرے پر کچھ ناراضی نمودار ہوئی اور وہ کچھ جھنجھلاتے ہوئے خاموش ہوئیں اور ان کے خاموش ہوتے ہی اس لڑکے نے کھڑکی کے باہر سے اپنی نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھا، اس بار اس لڑکے کے ماتھے پر بھی کچھ ٹکلیں تھیں۔ ایک نظر سزا سننا تھا چرڈز کو ناگواری سے دیکھ کر وہ ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

اس کا انداز اس قدر تو چن آ میر تھا کہ سزا سنا تھا چر ڈز کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”سالار! تم کیا دیکھ رہے ہو؟“ انہوں نے سختی سے پوچھا۔

”nothing.....“ ایک لفظی جواب آیا۔ وہ اب چھتتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں پتا ہے، میں کیا پڑھا رہی ہوں؟“

”hope so“ اس نے اتنے روڈ انداز میں کہا کہ سنا تھا چر ڈز نے ایک دم ہاتھ میں پکڑا ہوا مارکر

کیپ سے بند کر کے ٹیبل پر پھینک دیا۔

”یہ بات ہے تو پھر یہاں آؤ اور یہ ڈایا گرام بنا کر اس کو لیبل کرو۔“ انہوں نے اسٹیج کے ساتھ

رائٹنگ بورڈ کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ یکے بعد دیگرے لڑکے کے چہرے پر کئی رنگ آئے۔ انہوں

نے کلاس میں بیٹھے ہوئے اسٹوڈنٹس کو آپس میں نظروں کا تبادلہ کرتے دیکھا۔ وہ لڑکا اب سرد نظروں

کے ساتھ سنا تھا چر ڈز کو دیکھ رہا تھا، جیسے ہی انہوں نے رائٹنگ بورڈ سے آخری نشان صاف کیا وہ اپنی

کرسی سے ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا۔ تیز قدموں کے ساتھ اس نے ٹیبل پر پڑا ہوا مارکر اٹھایا اور

برقی رفتار کے ساتھ رائٹنگ بورڈ پر ڈایا گرام بنانے لگا۔ پورے دو منٹ ستاون سیکنڈز کے بعد اس

نے مارکر پر کیپ لگا کر اسے میز پر اسی انداز میں اچھالا، جس انداز میں سنا تھا چر ڈز نے اچھالا تھا اور

سنا تھا چر ڈز کی طرف دیکھے بغیر اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ سزا چر ڈز نے اسے مار کر اچھالنے یا اپنی کرسی

کی طرف جاتے نہیں دیکھا۔ وہ بے چینی کے عالم میں رائٹنگ بورڈ پر تین منٹ سے بھی کم عرصہ میں بنائی

جانے والی اس labelled ڈایا گرام کو دیکھ رہی تھیں جسے بنانے میں انہوں نے دس منٹ لئے تھے اور وہ

ان کی ڈایا گرام سے زیادہ اچھی تھی۔ وہ کہیں بھی معمولی سی لٹلٹی بھی نہیں ڈھونڈ سکیں۔ کچھ خفیف سی ہوتے

ہوئے انہوں نے گردن موڑ کر ایک بار پھر اس لڑکے کو دیکھا وہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

دو سیم نے تیسری بار دروازے پر دستک دی، اس بار اندر سے امامہ کی آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟“

”امامہ! میں ہوں..... دروازہ کھولو۔“ دو سیم نے دروازے سے اپنا ہاتھ جلاتے ہوئے کہا۔ اندر

خاموشی چھا گئی۔

کچھ دیر بعد دروازے کا لاک کھلنے کی آواز سنائی دی۔ دو سیم نے دروازے کے ہینڈل کو تھما کر

دروازہ کھول دیا۔ امامہ اس کی جانب پشت کئے اپنے بیڈ کی طرف بڑھی۔

”تمہیں اس وقت کیا کام آن پڑا ہے مجھ سے؟“

”آخر تم نے اتنی جلدی دروازہ کیوں بند کر لیا تھا۔ ابھی تو دس بجے ہیں.....“ دو سیم کمرے میں

داخل ہوتے ہوئے بولا۔

”بس نیند آ رہی تھی مجھے۔“ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ دو سیم اس کا چہرہ دیکھ کر چونک گیا۔

”تم روری تھیں؟“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ امامہ کی آنکھیں سرخ اور سوتی ہوئی تھیں اور

وہ اس سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”نہیں رو نہیں رہی تھی، بس سر میں کچھ درد ہو رہا تھا۔“ امامہ نے مسکرائے کی کوشش کی۔

دو سیم نے اس کے پاس بیٹھے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹمبر پکڑ چیک کرنے کی کوشش کی۔

”کیس بخار تو نہیں ہے۔“ اس نے کچھ تشویش بھرے انداز میں کہا اور پھر ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”بخار تو

نہیں ہے..... پھر تم کوئی ٹیبلٹ لے لیتیں۔“

”میں لے چکی ہوں۔“

”اچھا تم سو جاؤ..... میں باتیں کرنے آیا تھا مگر اب اس حالت میں کیا باتیں کروں گا تم سے۔“

دو سیم نے قدم باہر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ امامہ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خود بھی اٹھ

کر اس کے پیچھے گئی اور دو سیم کے باہر نکلنے ہی اس نے دروازے کو پھر لاک کر لیا۔ بیڈ پر ادند سے منہ لیٹ

کر اس نے ٹیبلٹ کے ساتھ چھپا لیا۔ وہ ایک بار پھر آنکھوں کے ساتھ روری تھی۔

☆.....☆.....☆

تیسرا سال کا وہ لڑکا اس وقت نی وی پر میوزک شو دیکھنے میں مصروف تھا، جب طیبہ نے اندر

جھاٹکا۔ بے چینی سے انہوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا اور پھر کچھ ناراضی کے عالم میں اندر چلی آئیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ انہوں نے اندر آتے ہی کہا۔

”نی وی دیکھ رہا ہوں۔“ اس نے نی وی سے نظریں نہیں ہٹائیں۔

”نی وی دیکھ رہا ہوں..... فار گاڈ سیک۔ تمہیں احساس ہے کہ تمہارے بچے زہور ہے ہیں؟“ طیبہ

نے اس کے سامنے آتے ہوئے کہا۔

”سووات.....“ اس لڑکے نے اس بار کچھ لٹلٹی سے کہا۔

”سووات؟“ تمہیں اس وقت اپنے کمرے میں کتابوں کے درمیان ہونا چاہئے نہ کہ یہاں اس

بے ہودہ شو کے سامنے۔“ طیبہ نے ڈانٹا۔

”مجھے جتنا پڑھنا تھا میں پڑھ چکا ہوں آپ سامنے سے ہٹ جائیں.....“ اس کے لہجے میں ناگواری

آگئی۔

”پھر بھی اٹھو اور اندر جا کر پڑھو۔“ طیبہ نے اسی طرح کھڑے کھڑے اس سے کہا۔

”نہ میں یہاں سے اٹھوں گا نہ اندر جا کر پڑھوں گا۔ میری اسٹڈیز اور بچہ زہور میرا مسئلہ ہیں۔ آپ کا

نہیں۔“

”اگر تمہیں اتنی پرواہ تھی اسلئے کی تو اس وقت تم یہاں بیٹھے ہو تے؟“

”step aside“ اس نے طیبہ کے جھلے کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑی بد تمیزی کے ساتھ ساتھ ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

”آج تمہارے پیپا آجائیں تو میں ان سے بات کرتی ہوں۔“ طیبہ نے اسے دھمکانے کی کوشش کی۔
”ابھی بات کر لیں۔ کیا ہو گا؟ پیپا کیا کر لیں گے۔ جب میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھے جتنی تیاری کرنی ہے میں نے کر لی ہے تو پھر آپ کو کیا مسئلہ ہے؟“

”یہ تمہارے سالانہ امتحان ہیں، جنہیں احساس ہونا چاہئے اس بات کا۔“ طیبہ نے یک دم اپنے لہجے کو نرم کرتے ہوئے کہا۔

”میں کوئی دو چار سال کا بچہ نہیں ہوں کہ میرے آگے پیچھے پھرنا پڑے آپ کو۔۔۔ میں اپنے معاملات میں آپ سے زیادہ سمجھ دار ہوں، اس لئے یہ قرڈکاس تم کے جھلے مجھ سے مت بولا کریں۔ ایگزیم بور ہے ہیں۔ اسلئے پر دھیان دو، اس وقت تمہیں اپنے کمرے میں ہونا چاہئے۔“

”میں تمہارے قادر سے بات کروں گی۔“

”what a rubbish“

وہ بات کرتے کرتے فٹے میں صوف سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوٹ اس نے پوری قوت سے سامنے والی دیوار پر دے مارا اور پاؤں پٹخا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ طیبہ کچھ بے بسی اور غفلت کے عالم میں اسے کمرے سے باہر نکلتا ہوا دیکھتی رہیں۔

☆.....☆.....☆

فلوینا فرانس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پکٹ میز پر رکھتے ہوئے ایک نظر ہال میں دوڑائی، پھر شروع ہونے میں ابھی دس منٹ باقی تھے اور ہال میں موجود اسٹوڈنٹس کتابیں، نوٹس اور نوٹ بکس پکڑے تیزی سے صحنے آگے پیچھے کرتے ان پر آخری نظریں ڈال رہے تھے۔ ان کی جسمانی حرکات سے ان کی پریشانی اور اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔ فلوینا فرانس کے لئے یہ ایک بہت مانوس سین تھا پھر ان کی نظریں ہال کے تقریباً درمیان میں بیٹھے ہوئے سالار پر جا ٹھہری۔ کچھ اسٹوڈنٹس میں اس وقت وہ واحد اسٹوڈنٹ تھا جو اطمینان سے اپنی کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں اسکیل پکڑے آہستہ آہستہ اسے اپنے جوتے پر مارتے ہوئے وہ اطمینان سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا، فلوینا کے لئے یہ سین بھی نیا نہیں تھا۔ اپنے سات سالہ کیریئر میں انہوں نے پچھڑے کے دوران سالار کو اسی بے فکری اور لا پرواہی کا مظاہرہ کرتے پایا تھا۔

نونج کر دو منٹ پر انہوں نے سالار کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے Meq's پر نئی Objective Paper تھمایا، تیس منٹ کے بعد اسے وہ بھیجے ان سے لے لیا تھا۔ نونج کر دس منٹ پر انہوں نے سالار کو اپنی کرسی سے کھڑا ہوتے دیکھا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی ہال میں اس سے پیچھے موجود تمام اسٹوڈنٹس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بھیجے ہاتھ میں لئے فلوینا فرانس کی طرف جا رہا تھا۔ فلوینا فرانس کے لئے یہ بھی نیا سین نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی یہی کچھ دیکھتی آئی تھیں۔ تیس منٹ میں حل کیا جانے والا ہیچر وہ اٹھ منٹ میں حل کر کے ان کے سر پر کھڑا تھا۔

”ہیچر کو دوبارہ دیکھ لو۔“ انہوں نے یہ جملہ اس سے نہیں کہا۔ وہ جانتی تھیں اس کا جواب کیا ہو گا۔
”میں دیکھ چکا ہوں۔“ وہ اگر اسے ایک بار پھر بھیجے دیکھنے پر مجبور کرتیں تو وہ ہمیشہ کی طرح ہیچر نے لے جا کر اپنی کرسی کے ہتھ پر رکھ کر بازو سینے پر لپیٹ کر بیٹھ جاتا۔ انہیں یاد نہیں تھا کبھی اس نے ان کے کہنے پر ہیچر کو دوبارہ چیک کیا ہو اور وہ یہ تسلیم کرتی تھیں کہ اسے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کے ہیچر میں کسی ایک بھی لٹلٹی کو ڈھونڈنا بہت مشکل کام تھا۔

انہوں نے ایک ہنگامی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ہاتھ سے ہیچر پکڑ لیا۔

”تم جانتے ہو سالار! میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا کیا ہے؟“ انہوں نے ہیچر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا: ”کہ میں تمہیں تیس منٹ کا۔۔۔ ہیچر۔۔۔ تیس منٹ۔۔۔ کے بعد Submit کرواتے ہوئے دیکھوں۔“ وہ ان کی بات پر خفیف سے انداز میں مسکرایا۔ ”آپ کی یہ خواہش اس صورت میں پوری ہو سکتی ہے ہم اگر میں یہ ہیچر ۱۵۰ سال کی عمر میں حل کرنے بیٹھوں۔“

”نہیں میرا خیال ہے ۱۵۰ سال کی عمر میں تم یہ ہیچر دس منٹ میں کرو گے۔“

اس بار وہ ہنسا اور واہیں مڑ گیا۔ فلوینا فرانس نے ایک نظر اس کے ہیچر کے صفحات کو آٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک سرسری سی نظر بھی انہیں یہ بتانے کے لئے کافی تھی کہ وہ اس ہیچر میں کتنے نمبر گوانے کا۔۔۔۔۔ ”زیر و۔“

☆.....☆.....☆

سلی نے اپنی بیٹی کے ہاتھوں میں گفٹ ہیچر میں لپٹے ہوئے پکٹ کو جیرانی سے دیکھا۔
”یہ کیا ہے اما۔؟ تم تو اکیٹ گئی تھیں۔ شاید کچھ کتابیں لپٹی تھیں جنہیں؟“
”ہاں ای ایچے کتابیں ہی لپٹی تھیں، مگر کسی کو تحفے میں دینے کے لئے۔“
”کس کو تحفہ دینا ہے؟“

”وہ لاہور میں ایک دوست ہے میری، اس کی سالگرہ ہے۔ اسی کے لئے خریدنا ہے کوئی نیرسوں کے ذریعے بھجوادوں گی کیونکہ مجھے تو ابھی یہاں رہنا ہے۔“

”لاؤ پھر مجھے دے دو یہ پیکٹ، میں دسیم کو دوں گی، وہ بھجوا دے گا۔“

”نہیں امی! میں ابھی نہیں بھجواؤں گی۔۔۔ ابھی اس کی سالگرہ کی تاریخ نہیں آئی۔“ سملٹی کو لگا جیسے وہ ایک دم گھبرا گئی ہو۔ انہیں حیرانی ہوئی۔ کیا یہ گھبرانے والی بات تھی؟

تین سال پہلے امامہ کی وجہ سے انہیں بہت زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انہیں اور ان کے شوہر ہاشم کو۔ وہ تب اپنی بیٹی کے بارے میں بہت فکر مند تھیں اور ہاشم ان سے زیادہ مگر کھیلے تین سال میں سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ وہ دونوں اب اس کی طرف سے مکمل طور پر مطمئن تھے۔ خاص طور پر امجد سے اس کی نسبت ملے کر کے۔ وہ جانتی تھیں امامہ امجد کو پسند کرتی ہے اور صرف وہی نہیں امجد کو کوئی بھی پسند کر سکتا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک اچھا لڑکا تھا۔۔۔۔۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ وہ امجد سے نسبت ملے ہوئے پر بہت خوش ہوئی تھی۔ امجد اور اس کے درمیان پہلے بھی خاصی دوستی اور بے تکلفی تھی مگر بعض دفعہ انہیں لگتا جیسے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت چپ ہوتی جا رہی ہے۔ وہ پہلے ایسی نہیں تھی۔

”مگر اب وہ اسکول جانے والی بنی بھی تو نہیں رہی۔ میڈیکل کالج کی اسٹوڈنٹ ہے۔۔۔۔۔ پھر وقت بھی کہاں ہوتا ہے اس کے پاس۔۔۔۔۔“ سملٹی ہمیشہ خود کو تسلی دے لیتیں۔

وہ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ بڑی دونوں بیٹیوں کی وہ شادی کر چکی تھیں۔ ایک بیٹے کی بھی شادی کر چکی تھیں جب کہ دو بیٹے اور امامہ غیر شادی شدہ تھے۔

”اچھا ہی ہے کہ یہ سنجیدہ ہوتی جا رہی ہے۔ لڑکیوں کے لئے سنجیدگی اچھی ہوتی ہے۔ انہیں جتنی جلدی اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔“ سملٹی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے امامہ سے نظریں ہٹائیں۔ وہ چھٹیوں میں گھر آئی ہوئی تھی اور جتنے دن وہ یہاں رہتی ان کی نظریں اس پر ہی طرح مرکوز رہتیں۔

”پتا نہیں یہ ساجد کہاں رہ گیا ہے جو بھی کام اس کے ذمے لگاؤ بس بھول ہی جاؤ۔“ انہیں اچانک اپنے ملازم کا خیال آیا۔ جس کے پیچھے وہ لاؤنج میں آئی تھیں۔ بڑا اتنے ہوئے وہ لاؤنج سے نکل گئیں۔

☆.....☆.....☆

یہ نیا ایئر ہاٹ تھی۔ نیا سال شروع ہونے میں تیس منٹ باقی تھے۔ دس لاکھوں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے چھوٹے سال کے لاکھوں کا وہ گروپ کھیلے دو گھنٹے سے اپنے اپنے موٹر سائیکلز پر شہر کی مختلف سڑکوں پر اپنے کرب و کمانے میں مصروف تھا، ان میں سے چند نے اپنے ماتھے پر چند اربینڈز باندھے ہوئے تھے جن پر نئے سال کے حوالے سے مختلف پیغامات درج تھے۔ وہ لوگ ایک گھنٹہ پہلے پوسٹ علاقے کی ایک بڑی ہیر مارکیٹ میں موجود تھے اور وہاں وہ مختلف لڑکیوں پر آوازے کتے رہے تھے۔

اپنی بانگس پر سوار اب مختلف سڑکوں پر چکر لگا رہے تھے، ان کے پاس خازن کرکیز موجود تھے

جنہیں وہ وقتاً فوقتاً چلا رہے تھے۔ پونے بارہ پر وہ جم خانہ کے باہر موجود تھے جہاں پارکنگ لائٹ گاڑیوں سے بھر چکا تھا۔ یہ گاڑیاں ان لوگوں کی تھیں جو جم خانے میں نئے سال کے سلسلے میں ہونے والی ایک پارٹی میں آئے تھے۔ ان لڑکوں کے پاس بھی اس پارٹی کے دعوتی کارڈ موجود تھے، کیونکہ ان میں سے تقریباً تمام کے والدین جم خانہ کے ممبر تھے۔

وہ لڑکے اندر پہنچے تو گیارہ بج کر پچھن منٹ ہو رہے تھے چند منٹوں بعد ڈانس فلور سمیت تمام جگہوں کی لائٹس آف ہو جاتی تھیں اور اس کے بعد باہر لان میں آتش بازی کے ایک مظاہرہ کے ساتھ نیا سال شروع ہونے پر لائٹس آن ہوتا تھیں اور اس کے بعد تقریباً تمام رات وہاں رقص کے ساتھ ساتھ شراب پی جاتی، جس کا اہتمام نئے سال کی اس تقریب کے لئے جم خانہ کی انتظامیہ خاص طور پر کرتی تھی۔ لائٹس آف ہوتے ہی وہاں ایک طوفان بد تمیزی کا آغاز ہو جاتا تھا اور وہاں موجود لوگ اسی ”طوفان بد تمیزی“ کے لئے وہاں آئے تھے۔

چند روزہ سالہ وہ لڑکا بھی دس لاکھوں کے اس گروپ کے ساتھ آنے کے بعد اس وقت ڈانس فلور پر راک بیٹ پر ڈانس کر رہا تھا، ڈانس میں اس کی مہارت قابل دید تھی۔

بارہ بجتے میں دس سیکنڈ رہ جانے پر لائٹس آف ہو گئیں اور ٹھیک بارہ بجے لائٹس ایک دم دوبارہ آن کر دی گئیں۔

اندھے کے بعد سیکنڈ گھنٹے والوں کی آوازیں اب شور اور خوشی کے قبضوں اور چیخوں میں بدل گئی تھیں چند سیکنڈ پہلے ختم جانے والا میوزک ایک بار پھر بجنا جانے لگا۔ وہ لڑکا اب اپنے دوستوں کے ساتھ باہر پارکنگ میں آ گیا جہاں بہت سے لڑکے اپنی اپنی گاڑیوں کے پارن بجا رہے تھے۔ ان ہی لڑکوں کے ساتھ میز کے کین پکڑے وہ وہاں موجود ایک گاڑی کی چھت پر چڑھ گیا۔ اس لڑکے نے گاڑی کی چھت پر کھڑے کھڑے اپنی جیکٹ کی جیب سے بیٹر کا ایک بھرا ہوا کین نکالا اور پوری طاقت سے کچھ فاصلے پر کھڑی ایک گاڑی کی ونڈا سکرین پر دے مارا۔ ایک دھماکے کے ساتھ گاڑی کی ونڈا سکرین چور چور ہو گئی وہ لڑکا اطمینان کے ساتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا کین پتارہا۔

☆.....☆.....☆

وہ کھیلے آدھے گھنٹے سے کامران کو ڈیوٹی گیم کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسکرین پر موجود اسکرین کوئی خاص اضافہ نہیں ہو رہا تھا، شاید اس کی وجہ وہ مشکل ٹریک تھا جس پر کامران کو گاڑی ڈرائیو کرنی تھی۔ سالار لاؤنج کے صوفوں میں سے ایک صوفے پر بیٹھا اپنی نوٹ بک پر کچھ لکھنے میں مصروف تھا، مگر وقتاً فوقتاً نظر اٹھا کر ڈی وی اسکرین کو بھی دیکھ رہا تھا جہاں کامران اپنی جدوجہد میں مصروف تھا۔

ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد اس نے نوٹ بک بند کر کے سامنے پڑی میز پر رکھ دی۔ پھر منہ پر ہاتھ

رکھ کر جمای روکی۔ دونوں ٹانگیں سامنے پڑی میز پر رکھ کر اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں سر کے پیچھے باندھے وہ کچھ دیر اسکرین کو دیکھتا رہا، جہاں کامران اپنے تمام چانسز ضائع کرنے کے بعد ایک بار پھر نیا گیم کھیلنے کی تیاری کر رہا تھا۔

”کیا پرالم ہے کامران؟“ سالار نے کامران کو مخاطب کیا۔

”ایسے ہی..... نیا گیم لے کر آیا ہوں مگر اسکو کرنے میں بڑی مشکل ہو رہی ہے۔“ کامران نے بے زاری سے کہا۔

”اچھا مجھے دکھاؤ.....“ اس نے صوفے سے اٹھ کر ریوٹ کنٹرول اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

کامران نے دیکھا۔ پہلے بیس سیکنڈ میں ہی سالار اسے جس اسپینڈ پر دوڑا رہا تھا اس اسپینڈ پر کامران اب تک نہیں دوڑا پایا تھا۔ جوڑیک اسے بہت مشکل لگ رہا تھا وہ سالار کے سامنے ایک پچکانہ چیز محسوس ہو رہا تھا۔ ایک منٹ بعد وہ جس اسپینڈ پر گاڑی دوڑا رہا تھا اس اسپینڈ پر کامران کے لئے اس پر نظریں جمانا مشکل ہو گیا جب کہ سالار اس اسپینڈ پر بھی گاڑی کو کھل طور پر کنٹرول کئے ہوئے تھا۔

تین منٹ کے بعد کامران نے پہلی بار گاڑی کو ڈنگ گاتے اور پھر جوڑیک سے اتر کر ایک دھماکے کے ساتھ جاہ کرتے دیکھا۔ کامران نے کچھ سکرانے ہوئے سڑک سالار کو دیکھا۔ گاڑی کیوں جاہ ہوئی تھی وہ جان گیا تھا ریوٹ اب سالار کے ہاتھ کے بجائے میز پر پڑا تھا اور وہ اپنی ٹوٹ بک اٹھانے لگا اور رہا تھا۔ کامران نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ ”بہت پورنگ گیم ہے۔“ سالار نے تبصرہ کیا اور کامران کی ٹانگوں کو پھلانگتے ہوئے لاؤنچ سے باہر نکل گیا۔ کامران ہونٹ بیچھے سات ہندسوں پر جمی اس اسکو کو دیکھ رہا تھا جو اسکرین کے ایک کونے میں جھنگار رہا تھا، کچھ نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں اس نے بیرونی دروازے کو دیکھا جس سے وہ غائب ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

وہ دونوں ایک بار پھر خاموش تھے، امجد کو الجھن ہونے لگی۔ امامہ اتنی کم گو نہیں تھی جتنی وہ اس کے سامنے ہو جاتی تھی۔ پچھلے آدھے گھنٹے میں اس نے گنتی کے لفظ بولے تھے۔

وہ اسے بچپن سے جانتا تھا۔ وہ بہت خوش مزاج تھی۔ ان دونوں کی نسبت ٹھہرائے جانے کے بعد بھی ابتدائی سال میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ امجد کو اس سے بات کر کے خوشی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بلا کی حاضر جواب تھی، مگر پچھلے کچھ سالوں میں وہ یک دم بدل گئی تھی اور میڈیکل کالج میں جا کر تو یہ تبدیلی اور بھی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ امجد کو بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا جیسے اس سے بات کرتے ہوئے وہ حدود درجہ محتاط رہتی ہے۔ کبھی وہ الجھی ہوئی سی محسوس ہوتی اور کبھی اسے اس کے لہجے میں عجیب سی سرد مہری محسوس ہوتی۔ اسے لگتا وہ جلد از جلد اس سے چھٹکارا پا کر اس کے پاس سے اٹھ کر چلی جانا

چاہتی ہے۔

اس وقت بھی وہ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔

”میں کئی بار سوچتا ہوں کہ میں خواہ مخواہی تمہارے لئے یہاں آنے کا تردد کرتا ہوں..... تمہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہو گا کہ میں آؤں یا نہ آؤں۔“ امجد نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ وہ اس کے بالتقابل لان چیئر پر بیٹھی دور باؤنڈری وال پر چڑھی ہوئی تیل کو گھور رہی تھی۔ امجد کی شکایت پر اس نے گردن ہلائے بغیر اپنی نظریں تیل سے ہٹا کر امجد پر مرکوز کر دیں۔ امجد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا مگر وہ خاموش رہی تو اس نے لفظوں میں کچھ رد و بدل کے ساتھ اپنا سوال ذہن لایا۔

”تمہیں میرے نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا امامہ..... کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں میں؟“

”اب میں کیا کہہ سکتی ہوں اس پر؟“

”تم کم از کم انکار تو کر سکتی ہو۔ میری بات کو جھٹھا تو سکتی ہو کہ ایسی بات نہیں ہے۔ میں غلط سوچ رہا ہوں اور.....“

”ایسی بات نہیں ہے، آپ غلط سوچ رہے ہیں۔“ امامہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ اس کا لہجہ اب بھی اتنا ہی ٹھنڈ اور چہرہ اتنا ہی بے تاثر تھا جتنا پہلے تھا، امجد ایک ٹھنڈی سانس لے کر رو گیا۔

”ہاں، میری دعا اور خواہش تو یہی ہے کہ ایسا نہ ہو اور میں واقعی غلط سوچ رہا ہوں مگر تم سے بات کرتے ہوئے میں ہر بار ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔“

”کس بات سے آپ ایسا محسوس کرتے ہیں؟“ اس بار پہلی بار امجد کو اس کی آواز میں کچھ ناراضی جھلکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”بہت سی باتوں سے..... تم میری کسی بات کا ڈھنگ سے جواب ہی دیتیں۔“

”حالانکہ میں آپ کی ہر بات کا ڈھنگ سے جواب دینے کی بھرپور کوشش کرتی ہوں..... لیکن

اب اگر آپ کو میرے جواب پسند نہ آئیں تو میں کیا کر سکتی ہوں۔“

امجد کو اس بار بات کرتے ہوئے وہ کچھ مزید خاموش ہوئی۔

”میں نے یہ کب کہا کہ مجھے تمہارے جواب پسند نہیں آئے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ میری ہر بات کے جواب میں تمہارے پاس..... ہاں اور نہیں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ تو مجھے لگتا ہے میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔“

”اگر آپ مجھ سے یہ پوچھیں گے کہ تم ٹھیک ہو؟ تو میں اس کا جواب ہاں یا نہیں میں ہی دوں گی۔

ہاں اور نہیں کے علاوہ اس سوال کا جواب کسی تقریر سے دیا جاسکتا ہے تو آپ مجھے وہ دے دیں، میں وہ کر دوں گی۔“ وہ بالکل سنجیدہ تھی۔

”ہاں اور نہیں کے ساتھ بھی تو کچھ کہا جاسکتا ہے..... اور کچھ نہیں، تم جو اب میرا حال ہی پوچھ سکتی ہو۔“
 ”میں آپ کا کیا حال پوچھوں، ظاہر ہے اگر آپ میرے گھر آئے ہیں، میرے سامنے بیٹھے مجھ سے باتیں کر رہے ہیں تو اس کا واضح مطلب تو یہی ہے کہ آپ ٹھیک ہیں ورنہ آپ اس وقت اپنے گھر، اپنے بستر پر پڑے ہوتے۔“

”یہ فارمیٹی ہوتی ہے امام.....!“

”اورے آپ جانتے ہیں، میں فارمیٹیز پر یقین نہیں رکھتی۔ آپ بھی مجھ سے میرا حال نہ پوچھا کریں۔ میں بالکل ہائینڈ نہیں کروں گی۔“ امجد جیسے لاجواب ہو گیا۔

”ٹھیک ہے فارمیٹیز کو چھوڑو، بندہ کوئی اور بات کر لیتا ہے۔ کچھ ڈسکس کر لیتا ہے۔ اپنی مصروفیات کے بارے میں ہی کچھ بتا دیتا ہے۔“

”امجد! میں آپ سے کیا ڈسکس کروں..... آپ بزنس کرتے ہیں۔ میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں..... آپ سے میں کیا پوچھوں، اسٹاک مارکیٹ کی پوزیشن.....؟ ٹریڈنگ bullish تھا یا bearish انڈیکس میں کتنے پوائنٹس کا اضافہ ہوا؟ یا اگلی کسٹائنٹ کہاں بھیج رہے ہیں؟ اس بار گورنمنٹ نے آپ کو کتنی رپیٹ دی؟“ اس کا لہجہ اب بھی اتنا ہی سرد تھا یا آپ سے اتنا ہی ڈسکس کروں، کون سے عوامل انسان کے جگر کو متاثر کر سکتے ہیں۔ ہائی پاس سرجری میں اس سال کون سی نئی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ دل کی دھڑکن بحال کرنے کے لئے کتنے سے کتنے دولت کا الیکٹرک شاک دیا جاسکتا ہے۔ تو ہم دونوں کی مصروفیات تو یہ ہیں اب ان کے بارے میں ڈسکشن سے آپ اور میں محبت اور بے تکلفی کی کون سی منزلیں طے کریں گے۔ وہ میری کجھ سے باہر ہے۔“

امجد کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اب وہ اس لمحہ کو کوس رہا تھا جب اس نے امام سے شکایت کی تھی۔

”اور بھی تو مصروفیات ہوتی ہیں انسان کی۔“ امجد نے قدرے کمزور لہجہ میں کہا۔

”نہیں پڑھائی کے علاوہ میری تو اور کوئی مصروفیات نہیں ہیں۔“ امام نے قطعیت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”پہلے بھی تو ہم دونوں آپس میں بہت سی باتیں کرتے تھے۔“ امام نے اس کی بات کاٹ دی۔

”پہلے کی بات چھوڑیں، اب میں وقت ضائع کرنا انورڈ نہیں کر سکتی۔ حیرت مجھے آپ پر ہو رہی ہے، آپ بزنس میں ہو کر اتنی اچھوڑ اور ایجوٹل سوچ رکھتے ہیں۔ آپ کو تو خود بہت پریکٹیکل ہونا چاہئے۔“

امجد کجھ بول نہ سکا۔

”ہم دونوں کے درمیان جو رشتہ ہے وہ ہم دونوں جانتے ہیں۔ اب اگر آپ میری پریکٹیکل اپروچ

کو بے اتفاقی، بے نیازی، ناراضی سمجھیں تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں آپ کے ساتھ یہاں بیٹھی ہوں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ میں اس رشتے کو اہمیت دیتی ہوں ورنہ کوئی اچھی تو اس طرح یہاں میرے ساتھ بیٹھ کر چائے نہیں پی سکتا۔“ وہ ایک لمحے کے لئے زکی۔ ”اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آپ کے آنے یا نہ آنے سے مجھے کوئی فرق پڑے گا یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں ہی بہت مصروف رہتے ہیں۔ ہم ماڈرن ایجنسی کی پیداوار ہیں نہ میں کوئی ہیرو ہوں کہ آپ کے لئے کھی لی چوری لے جا کر گھنٹوں آپ کی بائسری منتی رہوں گی نہ ہی آپ رانچے کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں کہ میرے لئے گھنٹوں یہ فریضہ سرانجام دیں۔ سچ یہی ہے کہ فرق واقعی نہیں پڑتا کہ ہم دونوں ملیں یا نہ ملیں، باتیں کریں یا نہ کریں۔ ہمارا رشتہ وہی رہے گا جو اب ہے یا آپ کو لگتا ہے اس میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے؟“

اگر امجد کے ماتھے پر ہینڈ نہیں آیا تھا تو اس کی واحد وجہ دسمبر کا مہینہ تھا ان دونوں کی عمر میں آٹھ سال کا فرق تھا مگر اس وقت پہلی بار امجد کو یہ فرق اٹھارہ سال کا محسوس ہوا تھا۔ وہ اسے اپنے سے اٹھارہ سال بڑی لگی تھی۔ دو ہفتے پہلے وہ انیس سال کی ہوئی تھی مگر اس وقت امجد کو لگ رہا تھا جیسے وہ سٹن ایجنٹ سے سیدھی ایدز عمری میں چلی گئی تھی اور خود وہ ایک بار پھر Pre-teen میں آ گیا تھا۔ وہ اس کے بالفاظ ٹانگ پر ٹانگ رکھے امجد کے چہرے پر نظریں جمائے اسی بے تاثر انداز میں اس کے جواب کی منتظر تھی۔ امجد نے کرسی کے ہتھے پر تلے اس کے ہاتھ میں مٹکئی کی انگوٹھی کو دیکھا اور ٹھنکھار کر اپنا گھا صاف کرنے کی کوشش کی۔

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو؟ میں صرف اس لئے ڈسکشن کی بات کر رہا تھا کہ ہمارے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ڈویپ ہو سکے۔“

”امجد! میں آپ کو بہت اچھی طرح سمجھتی اور جانتی ہوں اور یہ جان کر مجھے انوس ہوا کہ آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارے درمیان اچھی بھی کسی انڈر اسٹینڈنگ کو ڈویپ کرنے کی ضرورت ہے۔ میرا خیال تھا ہم دونوں کے درمیان اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔“

وہ امجد کا دل نہیں تھا، امجد نے اعتراف کیا۔

”اور اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ اتاٹوی اور بزنس کو ڈسکس کر کے ہم کوئی انڈر اسٹینڈنگ ڈویپ کر لیں گے تو ٹھیک ہے، آئندہ ہم یہی ڈسکس کر لیا کریں گے۔“ امام کے لہجے میں لاہروائی کا عنصر واضح تھا۔

”تم کو میری بات بری لگی ہے؟“

”بالکل بھی نہیں..... میں کیوں برا مانوں گی؟“ اس کے لہجے میں موجود حیرت کے عنصر نے امجد کو مزید شرمندہ کیا۔

”شاید میں نے غلط بات کی ہے۔“ ”شاید نہیں یقیناً۔“ اس نے تینوں نظروں پر باری باری زور

دیتے ہوئے کہا۔

”تم جانتی ہو میرے نزدیک یہ رشتہ کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ میرے بہت سے خواب ہیں۔ اس رشتے کے حوالے سے، تمہارے حوالے سے۔“ امجد نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ہمارے بے تاثر چہرے کے ساتھ اسی تیل کو دیکھ رہی تھی۔

”شاید اس لئے میں ضرورت سے زیادہ حساس ہو جاتا ہوں۔ مجھے اس رشتے کے حوالے سے کوئی خوف نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں، یہ رشتہ ہم دونوں کی مرضی سے ہوا ہے۔“

وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے بڑے جذب سے کہہ رہا تھا اور یکدم ہی اسے ایک بار پھر یہ احساس ہونے لگا تھا جیسے وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ اس کی بات نہیں سن رہی تھی۔ امجد کو لگا وہ ایک بار پھر خود سے باتیں کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک بہت بڑی کوٹھی کے عقب میں موجود انگیسی سے میوزک کی آواز باہر لان تک آرہی تھی۔ باہر موجود کوئی بھی شخص انگیسی کے اندر موجود لوگوں کی قوت برداشت پر حیرانی کا اظہار کر سکتا تھا لیکن وہ انگیسی کے اندر موجود لوگوں کی حالت دیکھ لیتا تو وہ اس حیران کن قوت برداشت کی وجہ جان جاتا۔ انگیسی کے اندر موجود چھ لڑکے جس حالت میں تھے اس حالت میں اس سے زیادہ حیران اور بلند میوزک بھی ان پر اثر انداز نہ ہو سکتا تھا اور جہاں تک ساتویں لڑکے کا تعلق تھا تو وہ ایسی کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔

انگیسی کا وہ کمرہ اس وقت دھوئیں کے مرغولوں اور عجیب قسم کی بو سے بھرا ہوا تھا۔ قالین پر ایک مشہور ریٹورنٹ سے لائے گئے کھانے کے کھلے ہوئے ڈبے اور ڈسپوزیبل پلیٹیں، چمچے بھی پڑے تھے۔ قالین پر کھانے پینے کی بچی بچی چیزیں اور ہڈیاں بھی ادھر ادھر پھینگی گئی تھیں۔ سوٹ ڈرنک کی پلاسٹک کی بوتلیں بھی ادھر ادھر لڑھک رہی تھیں۔ کچپ کی بوتلوں سے نکلنے والی کچپ قالین کو کچھ اور بدلتا بنا رہی تھی۔ وہ سات لڑکے اسی قالین پر ایک دوسرے سے کچھ قاسلے پر ابراجمان تھے۔ ان کے سامنے قالین پر بیڑ کے خالی کینز کا ایک ڈھیر بھی لگا ہوا تھا اور تفریح کا یہ سلسلہ وہیں تک نہیں لڑکا تھا اس وقت وہ ان ڈرگز کو استعمال کرنے میں مصروف تھے جن کا انتظام ان میں سے ایک نے کیا تھا۔

پچھلے دو ماہ میں وہ تیسری بار اس ایڈونچر کے لئے اکٹھے ہوئے تھے اور ان تین مواقع پر وہ چار مختلف قسم کی ڈرگز استعمال کر چکے تھے۔ پہلی بار انہوں نے وہ ڈرگ استعمال کی تھی جو ان میں سے ایک کو اپنے باپ کی دوا سے ملی تھی۔ دوسری بار انہوں نے جو ڈرگ استعمال کی تھی وہ انہوں نے اپنے ایک اسکول ٹیلو کے توسط سے اسلام آباد کے ایک کلب سے خریدی تھی اور اس بار وہ جو ڈرگ استعمال کر

رہے تھے وہ انہوں نے ایک ٹرپ پر راولپنڈی کی ایک مارکیٹ میں ایک افغان سے خریدی تھی۔ تینوں مواقع پر انہوں نے ان ڈرگز کے ساتھ الگ الگ استعمال کیا تھا جس کا حصول ان کے لئے مشکل نہیں تھا۔ اس وقت بھی ان سات لڑکوں میں سے چھ لڑکے پوری طرح نشے میں تھے۔ ان میں سے ایک ابھی بھی کانپتے ہاتھوں کے ساتھ ڈرگ کو سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ دو لڑکے سگریٹ پیٹے ہوئے باقی لڑکوں کے ساتھ نوٹی پھوٹی گفتگو کر رہے تھے۔ صرف ساتواں لڑکا مکمل طور پر ہوش میں تھا اس لڑکے کا چہرہ pimples / مہاسوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کے گلے میں موجود ایک سیاہ رنگ ڈوری میں تین چار تانبے کی عجیب سی شکلوں کے زیورات پڑے ہوئے تھے۔ ایلس پر پیسلے اسٹائل کے کارڈروالی ایک چمکر ڈارک بلو شرٹ کے ساتھ وہ ایک بے ہودہ سی سرنگی جنٹلمین ہونے لگا تھا جس کے دونوں گھٹنوں پر میڈوٹا کا چہرہ پینٹ کیا گیا تھا۔

اس نے آنکھیں کھول کر اپنی دائیں طرف موجود لڑکوں پر ایک اپنی نظر ڈالی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں مگر اس سرنگی کے باوجود وہ ایسا کوئی تاثر نہیں دے رہی تھیں کہ وہ باقی لڑکوں کی طرح مکمل طور پر نشے کی گرفت میں تھا۔ چند منٹ انہیں دیکھنے کے بعد اس نے سیدھے ہوتے ہوئے ڈیمیا میں موجود باقی ڈرگ کون میں ڈال دی اور ایک چھوٹے سے سڑا کے ساتھ اسے سونگھنے لگا۔ کافی دیر کے بعد اس نے اسٹرا کو ایک طرف پھینک دیا اور اپنے ہاتھ کی پور پر تھوڑی سی ڈرگ رکھ کر زبان کی نوک کے ساتھ کچھ دلچسپی، تجسس مگر احتیاط کے ساتھ اسے چکھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے برق رفتاری کے ساتھ اپنے بائیں جانب تھوکا، ڈرگ جیتنا بہت اچھی کوالٹی کی تھی۔ اس کی آنکھیں اب پہلے سے زیادہ سرخ ہو رہی تھیں مگر ابھی بھی وہ اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی اس سرگرمی سے کچھ زیادہ مفلوظ نہیں ہوا۔ ایک دو منٹ کے بعد اس نے اپنے پاس قالین پر پڑے ہوئے بیڑ کے can سے چند گھونٹ لیتے ہوئے جیسے ڈرگ کے ذائقے کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ can رکھنے کے بعد وہ چند منٹ تک کون میں موجود ڈرگ کو دیکھا رہا، دوسرے چھ لڑکے اس وقت تک نشے میں پوری طرح دھت کار پٹ پڑے تھے مگر وہ اب بھی اسی طرح بیٹھا تھا can میں موجود بیڑ کے گھونٹ لیتے ہوئے وہ پر سوچ انداز میں ان سب کو دیکھا رہا۔ اس کی آنکھیں اب حورم ہو رہی تھیں مگر ان میں موجود چمک بتا رہی تھی کہ وہ ابھی بھی مکمل طور پر نشے میں نہیں ہے۔

یہ اس کے ساتھ تیسری بار ہوا تھا۔ پہلی دو بار ڈرگ استعمال کرنے کے بعد بھی وہ اسی طرح بیٹھا رہا تھا، جب کہ اس کے دوست بہت جلد نشے میں دھت ہوئے تھے۔ رات کے پچھلے پہر وہ ان لوگوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر خود گھر آ گیا تھا۔ آج بھی وہ یہی کرنا چاہتا تھا۔ کمرے کے اندر موجود ڈرگ کی بوتل سے اب پہلی بار وہ ایجنے لگا تھا اس نے کھڑا ہونے کی کوشش کی اور وہ لاکھڑا ہوا۔ اپنی لاکھڑاہٹ پر قابو

پاتے ہوئے وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ نیچے بھٹک کر اس نے کاہٹ سے کی رنگ، والٹ اور کریڈٹ کارڈ اٹھائے پھر آگے بڑھ کر اس نے اسٹیریو کو بند کر دیا۔ اپنی ستورم اور سرخ آنکھوں سے اس نے کمرے میں ایک نظر دوڑائی۔ یوں جیسے وہ کوئی چیز یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو پھر وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ایک بار پھر نیچے بیٹھ کر اس نے جاگڑ پینے اور ان کے تسوں کو ٹخنوں کے گرد لپیٹ کر گرہ باندھی پھر دروازے کا لاک کھول کر وہ باہر نکل گیا۔ روشنی سے یک دم وہ کوریڈر کی تاریکی میں آ گیا تھا۔ اندھیرے میں اپنا راستہ ڈھونڈتے ہوئے وہ انگلیسی کے بیرونی دروازے کو کھولتا ہوا باہر لان میں آ گیا۔ انگلیسی کی سڑکیاں آتے ہوئے اسے اپنی ناک سے کوئی چیز بہتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بیاباں ہاتھ اٹھا کر اس نے اپنے اوپری ہونٹ پر رکھا اس کی انگلیاں چھپانے لگی تھیں۔ اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اپنی انگلیوں کو انگلیسی کی بیرونی لائٹ کی روشنی میں دیکھا۔ اس کی پوروں پر خون کے قطرے گھے ہوئے تھے، اس نے اپنی ٹراؤڈر کی جیب ٹٹولتے ہوئے اندر سے ایک رومال برآمد کیا اور اپنی پوروں پر لگا ہوا خون صاف کیا اس کے بعد اسی رومال کے ساتھ اس نے اپنے ناک سے چپکنے والا خون صاف کیا اسے اپنے حلق میں کوئی چیز چھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے کھانکھار کر اپنا گلا صاف کرنے کی کوشش کی۔ اسے اب اپنے سینے میں بھی ٹھنکن کا احساس ہونے لگا۔ چند گہرے سانس لے کر اس نے اس ٹھنکن کو کم کرنے کی کوشش کی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے دو تین بار نیچے تھوکا اور ایک بار پھر سڑکیاں اترنے کے لئے قدم بڑھایا۔ وہ یک دم ٹھٹھک گیا۔ اس کے ناک میں عجیب سی سنسنیٹ ہوئی اور پھر یک دم کوئی چیز پوری قوت سے بہنے لگی۔ وہ بے اختیار کمرے کی طرف بھاگا گیا۔ ایک دھماکہ کی صورت میں اس کی ناک سے نکلنے والا خون سڑکیوں پر گرنے لگا تھا۔ مارٹل پر پھسلتا ہوا خون، وہ اسے دیکھتا رہا۔

☆.....☆.....☆

گالف کلب میں تقریباً تقسیم انعامات منعقد کی جا رہی تھی۔ سولہ سالہ سالار سکندر بھی انڈر سکلمین کی کٹیکری میں seven under par کے اسکور کے ساتھ پہلی پوزیشن کی ٹرائی وصول کرنے کے لئے موجود تھا۔

سکندر عثمان نے سالار سکندر کا نام پکارے جانے پر تالیاں بجاتے ہوئے اس ٹرائی کیبنٹ کے بارے میں سوچا، جس میں اس سال انہیں کچھ مزید تبدیلیاں کروانی پڑیں گی۔ سالار کو لٹے والی شیلڈ زاور ٹرائی کی تعداد اس سال بھی پچھلے سالوں جیسی ہی تھی۔ ان کے تمام بچے ہی پڑھائی میں بہت اچھے تھے مگر سالار سکندر باقی سب سے مختلف تھا۔ ٹرائی، شیلڈ زاور سرنیکٹینس کے معاملے میں وہ سکندر عثمان کے باقی بچوں سے بہت آگے تھا۔ ۱۵۰ آئی کیو لیول کے حامل اس بچے کا مقابلہ کرنا ان میں سے کسی کے لئے ممکن

تھا بھی نہیں۔

فخریہ انداز میں تالیاں بجاتے ہوئے سکندر عثمان نے دائیں طرف بیٹھی ہوئی اپنی بیوی سے سرگوشی میں کہا: "یہ گالف میں اس کی تیرہویں اور اس سال کی چوتھی ٹرائی ہے۔"

"ہر چیز کا حساب رکھتے ہو تم۔" اس کی بیوی نے مسکراتے ہوئے جیسے قدرے ستائشی انداز میں اپنے شوہر سے کہا، جس کی نظریں اس وقت مہمان خصوصی سے ٹرائی وصول کرتے ہوئے سالار پر مرکوز تھیں۔

"صرف گالف کا اور کیوں، وہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔" سکندر عثمان نے اپنی بیوی کو دیکھا جواب سیٹ کی طرف جاتے ہوئے سالار کو کچھ رہی تھی۔

"I bet! اگر یہ اس وقت اس مقابلے میں شرکت کرنے والے پروفیشنل کھلاڑیوں کے ساتھ کھیل رہا ہو تو ابھی اس وقت اس کے ہاتھ میں یہی ٹرائی ہوتی۔" سکندر عثمان نے بیٹے کو دور سے دیکھتے ہوئے کچھ فخریہ انداز میں دعویٰ کیا۔ سالار اب اپنی سیٹ کے اطراف میں موجود دوسری سیٹوں پر موجود دوسرے انعامات حاصل کرنے والوں سے ہاتھ ملانے میں مصروف تھا۔ ان کی بیوی کو سکندر عثمان کے دعویٰ پر کوئی حیرانی نہیں ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھیں سالار کے بارے میں یہ ایک باپ کا جذباتی جملہ نہیں تھا۔ وہ واقعی اتنا ہی غیر معمولی تھا۔

اسے دو ہفتے پہلے اپنے بھائی زبیر کے ساتھ اسی گالف کورس پر اٹھارہ ہول پر کھیلا جانے والا گالف کا بیچ یاد آیا۔ rough میں اتفاقاً گر جانے والی ایک بال کو وہ جس صفائی اور مہارت کے ساتھ واپس گرین پر لایا تھا اس نے زبیر کو حیرت کر دیا، وہ پہلی بار سالار کے ساتھ گالف کھیل رہا تھا "مجھے یقین نہیں آ رہا۔" اٹھارہ ہول کے خاتمہ تک کسی کو بھی یہ یاد نہیں تھا کہ اس نے یہ جملہ کتنی بار بولا تھا۔

rough سے کھیلی جانے والی اس شاٹ نے اگر اسے حیرت کیا تھا تو سالار سکندر کے Putters نے اسے دم بخود کر دیا تھا۔ گیند کو ہول میں جاتے دیکھ کر اس نے کلب کے سہارے کھڑے کھڑے صرف گردن موڑ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں سالار سکندر اور اس ہول کے درمیان موجود فاصلے کو ماپا تھا اور پھر جیسے بے یقینی سے سر ہلاتے ہوئے سالار کو دیکھا۔

"آج سالار صاحب اچھا نہیں کھیل رہے۔" زبیر نے مڑ کر بے یقینی کے عالم میں اپنے بیٹے کھڑے کیڑی کو دیکھا جو گالف کارٹ پکڑے سالار کو دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

"ابھی یہ اچھا نہیں کھیل رہا؟" زبیر نے کچھ استہزائیہ انداز میں کلب کے کیڑی کو دیکھا۔

"ہاں صاحب ورنہ بال کھی rough میں نہ جاتی۔" کیڑی نے بڑے معمول کے انداز میں انہیں بتایا۔

"آپ آج یہاں پہلی بار کھیل رہے ہیں اور سالار صاحب پچھلے سات سال سے یہاں کھیل رہے ہیں۔"

میں اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ آج وہ اچھا نہیں کھیل رہے۔“
کیڑی نے زیر کی معلومات میں اضافہ کیا اور زیر نے اپنی بہن کو دیکھا جو فخریہ انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

”اگلی بار میں پوری تیاری کے ساتھ آؤں گا اور اگلی بار کھیل کی جگہ کا انتخاب بھی میں کروں گا۔“
زیر نے کچھ وقت کے عالم میں اپنی بہن کے ساتھ سالار کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”any time any place (کسی بھی وقت کسی بھی جگہ)“ انہوں نے اپنے بیٹے کی طرف سے اپنے بھائی کو پر اعتماد انداز میں چیلنج کرتے ہوئے کہا ”میں تمہیں اس ویک اینڈ پر ٹی اے اور ڈی اے کے ساتھ کراچی بلوا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے سالار کے قریب پہنچ کر ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ سالار مسکرایا۔
”کس لئے.....؟“

”میرے behalf پر تمہیں کراچی چیمبر آف کامرس کے صدر کے ساتھ ایک میچ کھیلنا ہے میں اس بار ایکشن میں اس سے ہار ہوں، مگر وہ اگر کسی سے گالف کا میچ ہار گیا تو اسے ہارٹ ایک ہو جائے گا اور وہ بھی ایک بیٹے کے ہاتھوں so let's settle the scores کی بات پر ہنسی تھیں، مگر سالار کے ماتھے پر چند ٹل نمودار ہو گئے تھے۔

”بچہ؟“ اس نے ان کے جملے میں موجود واحد قابل اعتراض لفظ پر زور دیتے ہوئے اسے دہرایا۔
”میرا خیال ہے انکل اچھے کل آپ کے ساتھ اٹھارہ ہو کر کا ایک اور ٹیم کرنا پڑے گا۔“

☆.....☆.....☆

اجدرو واڑہ کھول کر اپنی ماں کے کمرے میں داخل ہوا۔

”ای! آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”ہاں کہو..... کیا بات ہے؟“

اجدرو صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”آپ ہاشم انکل کی طرف نہیں گئیں؟“

”نہیں۔ کیوں کوئی خاص بات ہے؟“

”ہاں امامہ اس ویک اینڈ پر آئی ہوئی ہے۔“

”اچھا..... آج شام کو چلیں گے..... تم گئے تھے وہاں؟“ کھلیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ میں گیا تھا۔“

”کیسی ہے وہ۔ اس بار تو خاصے عرصے کے بعد آئی ہے۔“ کھلیلہ کو یاد آیا۔

”ہاں دو ماہ کے بعد.....“ کھلیلہ کو اجدد کچھ الجھا ہوا لگا۔

”کوئی مسئلہ ہے؟“

”ای! مجھے! امامہ کچھ عرصے سے بہت بدلی بدلی لگ رہی ہے۔“ اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”بدلی بدلی؟ کیا مطلب؟“

”مطلب تو میں شاید آپ کو نہیں سمجھا سکتا، بس اس کا رویہ میرے ساتھ کچھ عجیب سا ہے۔“ اجدد نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”آج تو وہ ایک معمولی سی بات پر ناراض ہو گئی۔ پہلے جیسی کوئی بات ہی نہیں رہی اس میں..... میں سمجھ نہیں پارہا کہ اسے ہوا کیا ہے۔“

”تمہیں وہم ہو گیا ہو گا اجدد..... اس کا رویہ کیوں بدلنے لگا..... تم کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو کر سوچ رہے ہو۔“ کھلیلہ نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

”نہیں امی.....! پہلے میں بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ شاید مجھے وہم ہو گیا ہے لیکن اب خاص طور پر آج مجھے اپنے یہ احساسات صرف وہم نہیں لگے ہیں۔ وہ بہت آگے سے اس انداز میں بات کرتی رہی مجھ سے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، اس کا رویہ کیوں بدل گیا ہے؟“ کھلیلہ نے برش میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا؟“

”تم نے پوچھا اس سے؟“

”ایک بار نہیں کئی بار.....“

”پھر.....؟“

”ہر بار آپ کی طرح وہ بھی یہی کہتی ہے کہ مجھے غلط فہمی ہو گئی ہے۔“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”کبھی وہ کہتی ہے اسٹریز کی وجہ سے ایسا ہے..... کبھی کہتی ہے وہ اب بچور ہو گئی ہے اس لئے.....“
”یہ ایسی کوئی غلط بات تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے واقعی یہ بات ہو۔“ کھلیلہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”ای! بات سمجھ گئی کی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ مجھ سے کھرانے لگی ہے۔“ اجدد نے کہا۔
”تم فضول باتیں کر رہے ہو اجدد! میں نہیں سمجھتی کہ ایسی کوئی بات ہو گی، ویسے بھی تم دونوں تو

بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہو، ایک دوسرے کی عادات سے واقف ہو۔“

کھلیلہ کو بیٹے کے خدشات بالکل بے معنی لگے۔

”ظاہر ہے۔ عمر کے ساتھ کچھ تبدیلیاں آتی جاتی ہیں، اب بچے تو رہے نہیں ہو تم لوگ..... تم معمولی معمولی باتوں پر پریشان ہونے کی عادت چھوڑ دو.....“ انہوں نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
”ویسے بھی ہاشم بھائی اگلے سال اس کی شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ وہ بعد میں اپنی تعلیم

کھل کرتی رہے گی۔ کم از کم وہ تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔" کھلیڈ نے انکشاف کیا۔

"انکل نے ایسا کیا کہا؟" امجد کچھ چونکا۔

"کئی بار کہا ہے..... میرا خیال ہے وہ لوگ تو تیار یاں بھی کر رہے ہیں۔" امجد نے ایک اطمینان

بھرا سانس لیا۔

"ہو سکتا ہے امارا اسی وجہ سے قدرے پریشان ہو۔"

"ہاں ہو سکتا ہے..... بہر حال یہ ہی سچ ہے۔ اگلے سال شادی ہو جانی چاہئے۔" امجد نے کچھ

مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

وہ سولہ سترہ سال کا ایک دبلا پتلا مگر لمبا لڑکا تھا، اس کے چہرے پر بلوغت کا وہ گہرا درواں نظر آرہا

تھا جسے ایک بار بھی شیو نہیں کیا گیا تھا اور اس روئیں نے اس کے چہرے کی مصمصیت کو برقرار رکھا تھا۔

وہ اسپورٹس شارٹس اور ایک ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہنے ہوتے تھا۔ اس کے بیروں میں کاشن کی جرابیں اور

جاگرز تھے، جنوگم چپاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی بے چینی اور اضطراب تھا۔

وہ اس وقت ایک پر بھوم سڑک کے بچوں کے گروپ میں ایک ہیوی ڈیوٹی موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا تھی

تقریباً اسے اڑائے لے جا رہا تھا۔ وہ کسی قسم کے ہیلمٹ کے بغیر تھا اور بہت ریش انداز میں موٹر سائیکل

کو چلا رہا تھا۔ اس نے دو دفعہ کھٹل توڑا..... تمہیں دفعہ خطرناک طریقے سے کچھ گاڑیوں کو اور ٹیک کیا.....

چار دفعہ ہانپک چلاتے چلاتے اس کا اگلا پیر اٹھا دیا اور کتنی ہی دیر دور تک صرف ایک پیچے پر ہانپک چلاتا

رہا..... دو دفعہ دائیں بائیں دیکھے بغیر اس نے برقی رفتار سے اپنی مرضی کا لٹرن لیا..... ایک دفعہ وہ

زگ زگ انداز میں ہانپک چلانے لگا، پچھے دفعہ اس نے پوری رفتار سے ہانپک چلاتے ہوئے اپنے

دونوں پاؤں اٹھا دیئے۔

پھر ایک دم اسی رفتار سے ہانپک چلاتے ہوئے اس نے دن دے کی خلاف ورزی کرتے اس لین

کو توڑا اور دوسری لین میں زانے کے ساتھ گھس گیا، سامنے سے آتی ہوئی ٹریفک کی بیکیں یک دم

چرچانے لگیں..... اس نے نل اسپینڈر پر ہانپک چلاتے ہوئے یک دم ہینڈل پر سے اپنے ہاتھ ہٹا دیئے۔

ہانپک پوری رفتار کے ساتھ سامنے سے آنے والی گاڑی کے ساتھ ٹکرائی، وہ ایک جھٹکے کے ساتھ ہوا

میں بلند ہوا اور پھر کسی چیز پر گرا..... اسے اندازہ نہیں ہوا۔ اس کا ذہن تاریک ہو چکا تھا۔

وہ دونوں لڑکے اسٹیج پر ایک دوسرے کے بالفاظی روسٹم کے پیچھے کھڑے تھے، مگر ہال میں

موجود اسٹوڈنٹس کی نظریں ہمیشہ کی طرح ان میں سے ایک پر مرکوز تھیں، وہ دونوں ہیڈ ہوائے کے

انتخاب کے لئے کنوینٹ کر رہے تھے اور وہ پروگرام بھی اس کا ایک حصہ تھا۔ دونوں کے روسٹم پر ایک

ایک پوسٹر لگا ہوا تھا، جن میں سے ایک پر دوٹ فار سالار اور دوسرے پر دوٹ فار فیضان لکھا ہوا تھا۔

اس وقت فیضان ہیڈ ہوائے بن جانے کے بعد اپنے ممکنہ اقدامات کا اعلان کر رہا تھا، جب کہ

سالار پوری سنجیدگی کے ساتھ اسے دیکھنے میں مصروف تھا۔ فیضان اسکول کا سب سے اچھا مقرر تھا اور

اس وقت بھی وہ اپنے جوش و خروش کے کمال دکھانے میں مصروف تھا اور اسی برٹش لب دلچسپی میں بات

کر رہا تھا جس کے لئے وہ مشہور تھا۔ بہترین سائڈ سٹم کی وجہ سے اس کی آواز اور انداز دونوں ہی

خاصے متاثر کن تھے۔ ہال میں بلاشبہ سکوت طاری تھا اور یہ خاموشی صرف اسی وقت نوبتی جب فیضان کے

سپورٹرز اس کے کسی اچھے پہلے پر داد دینا شروع ہوتے ہال تک دم تالیوں سے گونج اٹھتا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد وہ جب اپنے لئے دوٹ کی اپیل کرنے کے بعد خاموش ہوا تو ہال میں اگلے کئی

منٹ تالیاں اور بیٹیاں بکتی رہیں۔ ان تالیاں بجانے والوں میں خود سالار سکندر بھی شامل تھا۔ فیضان

نے ایک فاتحانہ نظر ہال پر اور سالار پر ڈالی اور اسے تالیاں بجاتے دیکھ کر اس نے گردن کے ہٹکے سے

اشارے سے اسے سراہا، سالار سکندر آسان حریف نہیں تھا یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

اسٹیج سیکرٹری اب سالار سکندر کے لئے اتارنسمٹ کر رہا تھا۔ تالیوں کی گونج میں سالار نے بولنا

شروع کیا۔

"گڈ مارننگ فرینڈز....." وہ یک لکھ ٹھہرا۔ "فیضان اکبر ایک مقرر کے طور پر یقیناً ہمارے اسکول

کا اٹلہ ہیں۔ میں یاد دہرا کوئی بھی ان کے مقابلے میں کسی اسٹیج پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔" وہ ایک لمبے کے لئے

رکا اس نے فیضان کے چہرے کو دیکھا۔ جس پر ایک فخریہ مسکراہٹ ابھر رہی تھی مگر سالار کے پہلے کے

باقی حصے نے اگلے لمحے اس مسکراہٹ کو غائب کر دیا۔

"اگر معاملہ صرف ہاتھ پانے کا ہو تو....."

ہال میں ہلکی سی کھٹکھٹا نہیں ابھری۔ سالار کے لہجے کی سنجیدگی برقرار تھی۔

"مگر ایک ہیڈ ہوائے اور مقرر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مقرر کو ہاتھ پانے ہوتی ہیں۔ ہیڈ ہوائے

کو کام کرنا ہوتا ہے۔ دونوں کے درمیان فرق talker اور doer کا ہوتا ہے اور

great talkers are not great doers سالار کے سپورٹرز کی تالیوں سے ہال گونج اٹھا۔

"میرے پاس فیضان اکبر جیسے خوب صورت لفظوں کی روانی نہیں ہے۔" اس نے اپنی بات جاری

رکھی۔ "میرے پاس صرف میرا نام ہے اور میرا متاثر کن ریکارڈ اور مجھے کنوینٹ کے لئے لفظوں کے

کوئی ورپا نہیں بہانے، مجھے صرف چند الفاظ کہنے ہیں۔" وہ ایک بار پھر زکا۔

"trust me and vote for me" (مجھ پر اعتماد کریں اور مجھے ووٹ دیں)۔

اس نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے جس وقت اپنے مائیک کو آف کیا اس وقت ہال تالیوں سے گونج رہا تھا ایک منٹ چالیس سیکنڈز میں وہ اسی پے سٹے اور calculated انداز میں بولا تھا، جو اس کا خاصا تھا..... اور اسی ڈیزے منٹ نے فیضان کا تختہ کر دیا تھا۔

اس ایجنڈائی تعارف کے بعد دونوں امیدواروں سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ سالار سکندر ان جوابات میں بھی اتنے ہی اختصار سے کام لے رہا تھا جتنا اس نے اپنی تقریر میں لیا تھا۔ اس کا سب سے طویل جواب چار جملوں پر مشتمل تھا جب کہ فیضان کا سب سے مختصر جواب بھی چار جملوں پر مشتمل نہیں تھا۔ فیضان کی وہ نصاحت و بلاغت جو پہلے اس کی خوبی سمجھی جاتی تھی اس وقت اس اسٹیج پر سالار کے مختصر جوابات کے سامنے چرب زبانی نظر آ رہی تھی اور اس کا احساس خود فیضان کو بھی ہو رہا تھا، جس سوال کا جواب سالار ایک لفظ یا ایک جملے میں دیتا، اس کے لئے فیضان کو عاداتاً تمہید پاندہ مٹی پڑتی اور سالار کا اپنی تقریر میں اس کے بارے میں کیا ہوا یہ تمبر وہاں موجود اسٹوڈنٹس کو کچھ اور محسوس ہوتا کہ ایک مقرر صرف باتیں کر سکتا ہے۔

”سالار سکندر کو ہیڈ بوائے کیوں ہونا چاہئے؟“ سوال کیا گیا۔

”کیونکہ آپ بہترین شخص کا انتخاب چاہتے ہیں۔“ جواب آیا۔

”کیا یہ جملہ خود ستائشی نہیں ہے؟“ اعتراض کیا گیا۔

”نہیں یہ جملہ خود ستائشی ہے۔“ اعتراض کو رد کر دیا گیا۔

”خود ستائشی اور خود ستائشی میں کیا فرق ہے؟“ ایک بار پھر چیتے ہوئے لہجے میں پوچھا گیا۔

”وہی جو فیضان اکبر اور سالار سکندر میں ہے۔“ سنجیدگی سے کہا گیا۔

”اگر آپ کو ہیڈ بوائے نہ بنایا تو آپ کو کیا فرق پڑے گا؟“

”فرق مجھے نہیں آپ کو پڑے گا۔“

”کیسے.....؟“

”اگر بہترین آدمی کو ملک کا لیڈر نہ بنایا جائے تو فرق قوم کو پڑتا ہے، اس بہترین آدمی کو نہیں۔“

”آپ اپنے آپ کو پھر بہترین آدمی کہہ رہے ہیں۔“ ایک بار پھر اعتراض کیا گیا۔

”کیا اس ہال میں کوئی ایسا ہے جو خود کو برے آدمی کے ساتھ equate کرے؟“

”ہو سکتا ہے ہو؟“

”پھر میں اس سے ملتا جا ہوں گا۔“ ہال میں ہنسی کی آوازیں ابھریں۔

”ہیڈ بوائے بننے کے بعد سالار سکندر جو تہلیل لائے گا اس کے بارے میں بتائیں۔“

”تہذیبی بتائی نہیں جاتی دکھائی جاتی ہے اور یہ کام میں ہیڈ بوائے بننے سے پہلے نہیں کر سکتا۔“

چند اور سوال کئے گئے پھر اسٹیج سیکرٹری نے حاضرین میں سے ایک آخری سوال لیا۔ وہ ایک سری لنکن لڑکا تھا جو کچھ شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے کھڑا ہوا۔

”اگر آپ میرے ایک سوال کا جواب دے دیں تو میں اور میرا پورا گروپ آپ کو ووٹ دے گا۔“

سالار اس کی بات پر مسکرایا۔ ”جواب دینے سے پہلے میں جاننا چاہوں گا کہ آپ کے گروپ میں

کتنے لوگ ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”بچھے.....“ اس لڑکے نے کہا۔

سالار نے سر ہلایا ”او کے۔ سوال کریں۔“

”آپ کو کچھ حساب کتاب کرتے ہوئے مجھے بتا ہے کہ اگر ہم 267895 میں 952852 کو جمع

کریں پھر اس میں سے 399999 کو تفریق کریں پھر اس میں 929292 کو جمع کریں اور اسے.....“ وہ

سری لنکن لڑکا ٹھہر ٹھہر کر ایک کانڈ پر لکھا ہوا ایک سوال پوچھ رہا تھا۔ ”مجھے کے ساتھ ضرب دیں پھر

اسے دو کے ساتھ تقسیم کریں اور جواب میں 492359 کو جمع کر دیں تو کیا جواب آئے۔“ وہ لڑکا اپنی

بات مکمل نہیں کر سکا۔

”8142473 بڑی برق رفتاری کے ساتھ سالار نے جواب دیا۔ اس لڑکے نے کانڈ پر ایک نظر

دوڑائی اور پھر کچھ بے یقینی سے سر ہلاتے ہوئے تالیاں بجانے لگا۔ فیضان اکبر کو اس وقت اپنا آپ ایک

ایکٹرس سے زیادہ نہیں لگا۔ پورا ہال اس لڑکے کے ساتھ تالیاں بجانے میں مصروف تھا۔ فیضان اکبر کو وہ

پورا پروگرام ایک مذاق محسوس ہونے لگا۔

ایک گھنٹے کے بعد جب دو سالار سکندر سے پہلے اس اسٹیج سے اتر رہا تھا تو وہ جانتا تھا کہ وہ مقابلے

سے پہلے ہی مقابلہ ہار چکا تھا۔ 150 کے آئی کیو لیول والے اس لڑکے سے اسے زندگی میں اس سے پہلے

کبھی اتنا حسد محسوس نہیں ہوا۔

☆.....☆.....☆

”ایمانہ آپ! آپ لاہور کب جائیں گی؟“

”وہ اپنے فونٹس کو دیکھتے ہوئے چونکی۔ سر اٹھا کر اس نے سہو کو دیکھا۔ وہ سائیکل کی رفتار کو اب

بالکل آہستہ کئے اس کے گرد پھرنے لگا رہا تھا۔

”کل..... کیوں.....؟ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ ایمانہ نے اپنی فائل بند کرتے ہوئے کہا۔

”جب آپ چلی جاتی ہیں تو میں آپ کو بہت مس کرتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”کیوں.....؟“ ایمانہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کیونکہ آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں اور آپ میرے لئے بہت سے کھلونے لاتی ہیں اور آپ مجھے

بیر کروانے لے کر جاتی ہیں اور آپ میرے ساتھ کھیلتی ہیں اس لئے۔" اس نے تفصیلی جواب دیا۔
 "آپ مجھے اپنے ساتھ لاہور نہیں لے جاسکتیں؟" امام اندازہ نہیں کر سکی، یہ تجویز تھی یا سوال.....
 "میں کیسے لے جاسکتی ہوں..... میں تو خود ہاسٹل میں رہتی ہوں، تم کیسے رہو گے وہاں؟" امام نے کہا۔

سعد سائیکل چلاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا پھر اس نے کہا "تو پھر آپ جلدی یہاں آیا کریں۔"
 "اچھا۔ جلدی آیا کروں گی۔" امام نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم ایسا کیا کرو کہ مجھ سے فون پر بات کر لیا کرو۔ میں فون کیا کروں گی تمہیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" سعد کو اس کی تجویز پسند آئی۔ سائیکل کی رفتار میں اضافہ کرتے ہوئے وہ لان کے لیے لمبے پتھر کاٹنے لگا۔ امام بے دھیانی کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔

وہ اس کا بھائی نہیں تھا، دس سالہ سعد پانچ سال پہلے اُن کے گھر آیا تھا کہاں سے آیا تھا اس کے بارے میں وہ نہیں جانتی تھی، کیونکہ اسے اس کے بارے میں اس وقت کوئی تجسس نہیں ہوا تھا مگر کیوں لایا گیا تھا۔ یہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ سعد اب دس سال کا تھا اور وہ گھر میں بالکل مکمل مل گیا تھا۔ امام سے وہ سب سے زیادہ مانوس تھا۔ امام کو اس پر اکثر ترس آتا۔ ترس کی وجہ اس کا لاوارث ہونا نہیں تھا۔ ترس کی وجہ اس کا مستقبل تھا..... اس کے دو چچاؤں اور ایک تایا کے گھر بھی اس وقت اسی طرح کے گود لئے ہوئے بیٹے پہلے رہے تھے۔ وہ ان کے مستقبل پر بھی ترس کھانے پر مجبور تھی۔

فائل کاٹھ میں پکڑے سائیکل پر لان میں گھومتے سعد پر نظریں جمائے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے وہ اسی طرح کی بہت سی سوچوں میں الجھ جاتی تھی مگر اس کے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ چاروں اس وقت لاہور کے ریڈ لائن ایریا میں موجود تھے۔ ان کی عمریں اٹھارہ، انیس سال کے لگ بھگ تھیں اور اپنے طبقے سے وہ چاروں اپر کلاس کے تھتے تھے مگر وہاں پر نہ ان کی عمر کوئی نمایاں کر دینے والی چیز تھی نہ ہی ان کی اپر کلاس سے تعلق رکھنے کی امتیازی خصوصیت..... کیونکہ وہاں پر ان سے بھی کم عمر لڑکے آتے تھے اور اپر کلاس اس علاقے کے مستقل کسٹمرز میں شامل تھی۔

چاروں لڑکے ریڈ لائن ایریا کی ٹوٹی ہوئی گلیوں سے گزرتے جا رہے تھے، تین لڑکے آپس میں باتیں کر رہے تھے، جب کہ صرف چوتھا قدرے تجسس اور دلچسپی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چھٹی بار وہاں آیا تھا اور ان تینوں کے ساتھ تھوڑی دیر بعد ہونے والی اس کی گفتگو سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ واقعی وہاں پہلی بار آیا تھا۔

گلی کے دونوں اطراف میں کھلے دروازوں میں بناؤ سنگھار کے نیم عریاں کپڑوں میں ملبوس ہر عمر اور ہر شکل کی عورت کھڑی تھیں سفید..... سانولی..... سیاہ..... گندی..... بہت خوب صورت..... درمیانی..... اور معمولی شکل و صورت والی۔

گلی میں سے ہر شکل اور عمر کا مرد گزر رہا تھا۔ وہ لڑکا وہاں سے گزرتے ہوئے ہر چیز پر غور کر رہا تھا۔
 "تم یہاں کتنی بار آئے ہو؟" چلتے چلتے اس لڑکے نے اچانک اپنے دائیں طرف چلنے والے لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

وہ لڑکا جو ابا بھسا "کتی بار.....؟" یہ تو پتا نہیں..... اب تو کتنی بھی بھول چکا ہوں، اکثر آتا ہوں یہاں پر۔" اس لڑکے نے قدرے فخریہ انداز میں کہا۔

"ان عورتوں میں مجھے تو کوئی اٹریکشن محسوس نہیں ہو رہی۔"

"nothing special about them" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"مگر کہیں رات ہی گزارنی ہو تو کم از کم environment (ماحول) تو اچھا ہو۔"

"it's such a dirty, filthy place." (یہ تو بہت ہی گندی جگہ ہے) اس نے گلی میں موجود

گڑھوں اور کوزے کے ڈبیروں کو دیکھتے ہوئے کچھ ناگواری سے کہا۔

"پھر گرل فرینڈز کے ہوتے ہوئے یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے اس بار اپنی

بیٹیوں کو اچکاتے ہوئے کہا۔

"اس جگہ کا اپنا ایک چارم ہے۔ گرل فرینڈز اور یہاں کی عورتوں کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ گرل

فرینڈز اس طرح کے ڈانس تو نہیں دکھائیں جو ابھی کچھ دیر بعد تم دیکھو گے۔" تیسرا لڑکا ہنسنا "اور پھر

پاکستان کی جس بڑی ایکٹریس کا ڈانس دکھانے ہم تمہیں لے جا رہے ہیں وہ تو بس....."

دوسرے لڑکے کی بات کو پہلے لڑکے نے کاٹ دیا۔ "اس کا ڈانس تو تم پہلے بھی مجھے دکھانچکے ہو۔"

"اگر وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ بھائی کی شادی پر ایک بچہ لایا تھا..... مگر یہاں پر تو بات ہی کچھ اور

ہوتی ہے۔"

"وہ ایکٹریس تو ایک پوش علاقے میں رہتی ہے پھر یہاں کیوں آتی ہے؟" پہلے لڑکے نے کچھ

غیر مطمئن انداز میں اس سے پوچھا۔

"یہ تم آج خود اس سے پوچھ لیا میں کبھی اس سے اس طرح کے سوال نہیں کرتا۔" دوسرے

لڑکے کی بات پر باقی دونوں لڑکے ہنسے مگر تیسرا لڑکا اسی طرح چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

ان کا سفر ہالہ خراساں گلی کے آخر میں ایک عمارت کے سامنے ختم ہو گیا، عمارت کے نیچے موجود

دکان سے تینوں لڑکوں نے سوچے کے بہت سے ہار خریدے اور اپنی کلائیوں میں لپیٹ لئے۔ ایک ہار

دوسرے لڑکے نے اس لڑکے کی کھائی میں بھی لپیٹ دیا جو وہاں آنے پر اعتراض کر رہا تھا پھر ان لوگوں نے وہاں سے پان خریدے۔ تمباکو والا پان دوسرے لڑکے نے اس لڑکے کو بھی دیا جو شاید زندگی میں پہلی بار پان کھا رہا تھا۔ پان کھاتے ہوئے دو چاروں اس عمارت کی میز صیباں چڑھنے لگے۔ اوپر پہنچ کر پہلے لڑکے نے ایک بار پھر تنہیدی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک جھلک نمودار ہوئی۔ وہ جگہ بہت صاف ستھری اور خاصی حد تک آراستہ تھی۔

گاؤ بچے اور چاند نیاں بھی ہوئی تھیں اور باریک پردے لہرا رہے تھے، کچھ لوگ پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ رقص ابھی شروع نہیں ہوا تھا ایک عورت لپکتی ہوئی ان کی طرف آئی۔ اس کے چہرے پر ایک خوب صورت مصنوعی مسکراہٹ تھی ہوئی تھی اس نے دوسرے لڑکے کو مخاطب کیا پہلے لڑکے نے غور سے اس عورت کو دیکھا۔ اوپر عمر کی وہ عورت اپنے چہرے پر بے تماشائیک اپ صوبے اور ہالوں میں سوئے اور گلاب کے گجرے لٹکانے، ہیلوں کی ایک چنگھاڑتی ہوئی سرخ ساڑھی میں ملبوس تھی۔ جس کا بلاؤڈز اس کے جسم کو چھپانے میں ناکام ہو رہا تھا مگر وہ جسم کو چھپانے کے لئے پہنا گیا بھی نہیں تھا۔ ان چاروں کو وہ ایک کونے میں لے گئی اور وہاں اس نے انہیں بٹھایا۔

پہلے لڑکے نے وہاں بیٹھے ہی منہ میں موجود پان اُس اگلا دن میں تھوک دیا، جو ان کے قریب موجود تھا کیونکہ پان منہ میں ہوتے ہوئے اس سے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا، پان کا ذائقہ بھی اس کے لئے کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ تینوں لڑکے وہاں بیٹھے مدہم آواز میں باتیں کرنے لگے جب کہ پہلا لڑکا اس ہال کے چاروں طرف موجود گاؤ نکلیوں سے ٹیک لگائے ہوئے لوگوں کو دیکھتا رہا جن میں سے کچھ اپنے سامنے شراب کی بوتلیں اور نوٹوں کی گڈیاں رکھے بیٹھے تھے۔ ان میں سے اکثریت سفید لٹھے کے کلف لگے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اس نے عید کے اجتماعات کے علاوہ آج پہلی بار کسی اور جگہ پر سفید لباس پہننے والوں کا اتنا بڑا اجتماع دیکھا تھا۔ خود وہ اپنے ساتھیوں کی طرح سیاہ جینز اور اسی رنگ کی آدھے بازوؤں والی ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ ان کی عمر کے کچھ اور لڑکے بھی وہاں انہیں کی طرح جینز اور ٹی شرٹس میں ملبوس تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور عورت اسی طرح کے چمچنے چنگھاڑتے رنگوں والے کپڑوں میں ملبوس وہاں آکر ہال کے درمیان میں بیٹھ کر ایک غزل سنانے لگی تھی۔ اس کے ساتھ کچھ سازندے بھی تھے۔ دو غزلیں سنانے اور اپنے اوپر اچھالے جانے والے کچھ نوٹ اٹھا کر وہ خاصی خوش اور مطمئن داپہں چلی گئی اور اس کے جانے کے فوراً بعد ہی قلم انڈسٹری کی وہ ایکٹریس ہال میں داخل ہوئی اور ہال میں موجود ہر مرد کی نظر اس سے جیسے چپک کر رہ گئی تھی۔ اس نے ہال میں باری باری چاروں طرف گھوم کر ہر ایک کوسر کے اشارے سے خوش آمدید کہا تھا۔

سازندوں کو اس بار کسی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ کیسٹ پیئر پر باری باری چند بیجان انگیز کانٹے لگائے گئے تھے جن پر اس عورت نے اپنا رقص پیش کرنا شروع کیا تھا اور کچھ دیر پہلے کی خاموشی ایک دم ختم ہو گئی تھی چاروں طرف موجود مرد اس عورت کو داد و تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ شراب نوشی میں مصروف تھے۔ ان میں سے کچھ جو زیادہ جوش میں آ رہے تھے وہ اٹھ کر اس ایکٹریس کے ساتھ ڈانس میں مصروف ہو جاتے۔

ہال میں واحد شخص جو اپنی جگہ پر کسی حرکت کے بغیر بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا وہ ہی لڑکا تھا مگر اس کے باوجود یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ اس ایکٹریس کے رقص سے خاصا محظوظ ہو رہا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد جب اس ایکٹریس نے اپنا رقص ختم کیا تو وہاں موجود آدمی سے زیادہ مرد ایسا غفلت ہو چکے تھے، وہاں گھر جانا ان کے لئے زیادہ مسئلہ اس لئے نہیں تھا کیونکہ ان میں سے کوئی بھی گھر جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ سب وہاں رات گزارنے آئے تھے۔ ان چاروں نے بھی رات وہاں گزار دی۔

اگلے دن وہاں سے واپسی پر گاڑی میں اس دوسرے لڑکے نے جہاں لیتے ہوئے پہلے لڑکے سے پوچھا، جو اس وقت لاپرواہی سے گاڑی سے باہر دیکھنے میں مصروف تھا۔

”کیسا رہا یہ تجربہ؟“

”اچھا تھا.....“ پہلے لڑکے نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”بس اچھا تھا..... اور کچھ نہیں..... تم بھی بس.....“ اس نے قدرے ناراضی کے عالم میں بات از محوری چھوڑ دی۔

”کبھی کبھار جانے کے لئے اچھی جگہ ہے..... اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں..... مگر something special سوائی کوئی بات نہیں ہے۔ میری گرل فرینڈ اس لڑکی سے بہتر ہے جس کے ساتھ میں نے رات گزار دی ہے۔“

اس لڑکے نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

☆.....☆.....☆

ڈانٹنگ نچل پر ہاشم بین کی پوری فیملی موجود تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ سب آپہں میں خوش گپوں میں بھی مصروف تھے۔ موضوع گفتگو اس وقت ایسا ہی جو اس ویک اینڈ پر بھی اسلام آباد میں موجود تھی۔

”بابا..... آپ نے یہ بات نوٹ کی کہ امامہ دن بہ دن سنجیدہ سے سنجیدہ ہوتی جا رہی ہے۔“ وسیم نے قدرے چھیڑنے والے انداز میں امامہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ یہ تو میں بھی جھپٹے کی ماہ سے لوٹ کر رہا ہوں۔" ہاشم سمین نے دسم کی بات پر بیٹی کے چہرے سے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

امام نے چادروں کا چھوڑنا منہ میں رکھتے ہوئے دسم کو گھورا۔

"کیوں امام! کوئی مسئلہ ہے؟"

"بابا! یہ بڑی فضول باتیں کرتا ہے اور آپ بھی خواستوار اس کی باتوں میں آ رہے ہیں۔ میں اپنی اسٹڈی کی وجہ سے مصروف اور سنجیدہ ہوں۔ اب ہر کوئی دسم کی طرح نکلا تو نہیں ہوتا۔" اس نے اپنے ساتھ بیٹھے دسم کے کندھے پر کچھ ناراضی سے ہلکا سا ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"بابا! آپ ذرا اندازہ کریں، میڈیکل کے شروع کے سالوں میں اس کا یہ حال ہے تو جب یہ ڈاکٹر بن جائے گی تب اس کا کیا حال ہو گا۔" دسم نے امام کی سمجھداری پر واندہ کرتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔

"سالوں گزر جایا کریں گے مس امام ہاشم کو مسکرائے ہوئے۔"

ڈانٹنگ نچیل پر موجود لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ان دونوں کے درمیان یہ فوک جوہک ہمیشہ ہی رہتی تھی۔ بہت کم مواقع ایسے ہوتے تھے جب وہ دونوں اکٹھے ہوں اور ان کے درمیان آپس میں جھگڑا نہ ہو۔ مشکل بنیادوں پر ہوتے رہنے والے ان جھگڑوں کے باوجود امام کی سب سے زیادہ دوستی بھی دسم کے ساتھ ہی تھی۔ اس کی وجہ شاید ان کی اوپر تلے کی پیدائش بھی تھی۔

"اور آپ تصور کریں کہ....." اس بار امام نے اسے اپنی بات مکمل کرنے نہیں دی، اس نے اس کے کندھے پر پوری طاقت سے مکارا۔ دسم پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔

"ہمارے گھر میں ایک ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا کے سوا اور کیا کیا ہو سکتا ہے۔ آپ اس کا مظاہرہ دیکھ رہے ہیں اس سے آپ یہ اندازہ بھی لگا سکتے ہیں کہ آج کل کے ڈاکٹر زوارڈ میں مریضوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہوں گے۔ ملک میں بڑھتی ہوئی شرح اموات کی ایک وجہ....."

"بابا! اس کو منع کریں۔" امام نے بالآخر ہتھیار ڈالنے ہوئے ہاشم سمین سے کہا۔

"دسم....." ہاشم سمین نے اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے دسم کو جھڑکا، وہ بڑی سعادت مندی سے فوراً خاموش ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اس نے پورے لفافے کو گراؤنڈ میں خالی کر دیا اور پھر اسے بند کر کے چلا دیا۔ خانماں اسی وقت اندر آیا۔

"چھوٹے صاحب! انیس، میں آپ کی مدد کر دوں۔" وہ اس کی طرف بڑھا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"نہیں میں خود کر لیتا ہوں۔ تم مجھے دودھ کا ایک گلاس دے دو۔" اس نے گراؤنڈ آف کرتے ہوئے کہا۔ خانماں ایک گلاس میں دودھ لے کر اس کے پاس چلا آیا۔ دودھ کے آدھے گلاس میں اس نے گراؤنڈ میں موجود تمام پاؤڈر ڈال دیا اور ایک چمچ سے اچھی طرح ہلانے لگا پھر ایک ہی سانس میں دودھ پی گیا۔

"کھانے میں آج کیا کھایا ہے تم نے؟" اس نے خانماں سے پوچھا۔

خانماں نے کچھ ڈسٹرگوائی شروع کر دیں۔ اس کے چہرے پر کچھ ناگواری ابھری۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا، سونے جا رہا ہوں، مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔"

اس نے سختی سے کہا اور بچن سے نکل گیا۔

غروں میں پہنچی ہوئی ہانپا کی جنبل کو وہ فرش پر تقریباً تھپتھپ رہا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ تھیں۔ شرٹ کے چند ایک کے سوا سارے ہی ٹخن کھلے ہوئے تھے۔

اپنے کمرے میں جا کر اس نے دروازے کو لاک کر لیا اور وہاں موجود جھازی ساز کے میوزک سسٹم کی طرف گیا اور کمرے میں بولٹن when a man loves a woman بلند آواز میں بجنے لگا۔ وہ ریکوٹ لے کر اپنے بیڈ پر آیا اور اوندھے منہ بے ترتیبی کے عالم میں لیٹ گیا۔

اس کا ریوٹ والا بالیاں ہاتھ بیڈ سے نیچے لٹک رہا تھا اور مسلسل بل رہا تھا۔ اس کے دونوں پاؤں بھی میوزک کے ساتھ گردش میں تھے۔

کمرے میں بیڈ اور اس کے اپنے طبقے کے علاوہ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی، کہیں پر کچھ بھی بے ترتیب نہیں تھا۔ کہیں پر گرد کا ایک ذرہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ میوزک سسٹم کے پاس موجود دیواری ٹیلیفون میں تمام آؤٹ اور ڈیو کیٹس بڑے اچھے طریقے سے لگی ہوئی تھیں۔ ایک دوسری دیوار میں موجود ریسیں پر کنکریوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ کونے میں بڑی ہوئی کیمپوٹرنجیل سے عیاں تھا کہ اُسے استعمال کرنے والا بہت آرتھرائڈ ہے۔ کمرے کی مختلف دیواروں پر ہائی ڈی وی ایکٹریٹور اور وہاں کے بیئرز کے پاس لگے تھے۔ ہاتھ روم کے دروازے اور کمرے کی کڑکیوں کے پیشوں کو پلے بوائے میگزین سے کالی گئی کچھ ماڈرن کی نیوڈ تصویروں سے سجایا گیا تھا، کمرے میں ٹیلی بارڈ اصل ہونے والا اور وائزہ کھولنے ہی بہت بڑی طرح چمکتا کیونکہ بالکل سامنے کڑکیوں کے پیشوں پر موجود دو تصویروں میں چند لٹھوں کے لئے دیکھنے والوں کو تصویروں میں نہیں بلکہ اصل لڑکیاں نظر آتی تھیں۔ ان تصویروں کو وہاں لگاتے ہوئے ترتیب کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ میوزک سسٹم جس دیوار کے ساتھ موجود تھا اسی دیوار کے ایک کونے میں دیوار پر ایک الیکٹریک کنٹرا لٹکا یا گیا تھا اور اسی کونے میں ایک کی بورڈ بھی اسٹینڈ پر رکھا ہوا تھا۔ دیوار پر گٹار سے کچھ قاصطے پر piccolo، فلوٹ اور oboe بھی لٹکائے گئے تھے اس کمرے کے کہیں کو بیٹینا میوزک سے گہری

دیکھی تھی۔ بیڈ کے بالکل سامنے والی دیوار میں موجود کینٹ میں ٹی وی موجود تھا اور اسی کینٹ کے مختلف خانوں میں مختلف ٹرانزیاور شیڈز پڑی ہوئی تھیں۔

کمرے کا چوڑھا کونا بھی خالی نہیں تھا وہاں دیوار پر مختلف ریٹکس لٹکے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ٹینس کا تھا اور دو اسکواش کے، ان ریٹکس کو دیوار پر لٹکانے سے پہلے نیچے پوسٹرز لگائے گئے تھے اور پھر ریٹکس اس طرح لٹکائے گئے تھے کہ یوں لگتا تھا وہ ریٹکس ان کھلاڑیوں نے پکڑے ہوں ٹینس کے ریٹکس کے نیچے کمریلا سبائیٹ کا پوسٹر تھا جب کہ اسکواش کے ایک ریٹکس کے نیچے جہانگیر خان کا پوسٹر تھا جب کہ دوسرے ریٹکس کے نیچے روڈنی مارٹن کا۔

کمرے میں واحد جگہ جہاں بے ترتیبی تھی وہ ڈبل بیڈ تھا، جس پر وہ لیٹا ہوا تھا۔ سلک کی بیڈ شیٹ بری طرح سلوٹ زد تھی اور اس پر ادھر ادھر چند پورنو گرائی کے غیر ملکی میگزین پڑے ہوئے تھے جن میں پلے پوائے نمایاں تھا بیڈ پر ایک بیس کوز اور کاغذ کی کچھ چھوٹی چھوٹی کتھیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ یقیناً کچھ دیر پہلے وہ ان میگزینز سے تصویریں کاٹ رہا تھا۔ فوٹو گھر کے کچھ ریمپر ز بھی ٹرے ٹرے بیڈ پر ہی پڑے ہوئے تھے۔ ڈن مل کا ایک پیکٹ اور لائٹنگ بھی اٹلٹ ٹرے کے ساتھ بیڈ پر ہی پڑا تھا جب کہ سلک کی سفید چمک دار بیڈ شیٹ پر کئی جگہ ایسے نشان تھے جیسے وہاں پر سگریٹ کی راکھ بھی تھی۔ کافی کا ایک خالی گلاس بھی بیڈ پر پڑا ہوا تھا اور اس کے پاس ایک ٹائی اور دست داغ بھی تھی۔ ان سب چیزوں سے کچھ فاصلے پر سربانے ایک موبائل پڑا تھا جس پر ایک دم کوئی کال آنے لگی تھی۔ بیڈ پر اوٹھ سے منہ لیٹا ہوا وہ نوجوان اب شاید نیند کے عالم میں تھا کیونکہ موبائل کی بیپ پر اس نے سر اٹھائے بغیر اپنا دایاں ہاتھ بیڈ پر ادھر ادھر پھیرتے ہوئے جیسے موبائل تلاش کرنے کی کوشش کی مگر موبائل اس کے ہاتھ کی رسائی سے بہت دور تھا۔ اس پر مسلسل کال آ رہی تھی۔ کچھ دیر اسی طرح ادھر ادھر ہاتھ پھیرنے کے بعد اس کا ہاتھ ساکت ہو گیا شاید اب وہ واقعی سوچا تھا کیونکہ اس کے حتمی جی ڈک پکھے تھے۔ موبائل پر اب بھی کال آ رہی تھی۔ بیڈ سے باہر نکلے ہوئے اس کے ہائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوٹ یک دم اس کی گرفت سے نکل کر نیچے کارپٹ پر گر پڑا۔ مائیکل بولٹن کی آواز ابھی بھی کمرے میں گونج رہی تھی۔ "when a man loves a woman" پھر یک دم کمرے کے دروازے پر کسی نے دستک دی اور پھر دستک کی یہ آواز بڑھتی ہی گئی۔ موبائل کی کال ختم ہو چکی تھی، دروازے پر دستک دینے والے ہاتھ بڑھتے گئے وہ بیڈ پر اوٹھ سے منہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

"ڈونٹ ٹیل می، اماں! کیا تم واقعی اٹکچڈ ہو؟"

زینب کو جو یہ بکے انکشاف پر جیسے کرنٹ لگا۔ اماں نے ملامتی نظروں سے جو یہ یہ کو دیکھا جو پہلے

ہی معذرت خواہانہ انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"اسے نہیں دیکھ کر بتاؤ، کیا تم واقعی اٹکچڈ ہو؟" زینب نے اس بار اسے کچھ جھڑکتے ہوئے کہا۔ "ہاں، مگر یہ اس قدر غیر معمولی اور حیرت انگیز واقعہ تو نہیں کہ تم اس پر اس طرح ری ایکٹ کرو۔" اماں نے بڑی رسائیت سے کہا۔ وہ سب لائبریری میں بیٹھی ہوئی تھیں اور اپنی طرف سے حتی المقدور سرکوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔

"مگر تمہیں ہمیں بتانا تو چاہئے تھا، آخر راز میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس بار اماں نے کہا۔ "راز میں تو نہیں رکھا، بس یہ کوئی اتنا اہم واقعہ نہیں تھا کہ تمہیں بتانی اور پھر تم لوگوں سے میری دوستی تو اب ہوئی ہے جبکہ اس سبھی کو کئی سال گزر چکے ہیں۔" اماں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"کئی سال سے کیا مراد ہے تمہاری؟"

"میرا مطلب ہے، دو تین سال۔"

"پھر بھی اماں! بتانا تو چاہئے تھا تمہیں....." زینب کا اعتراض ابھی بھی اپنا جگہ قائم تھا۔ اماں نے مسکراتے ہوئے زینب کو دیکھا۔

"اب کروں گی تو اور کسی کو بتاؤں یا نہ بتاؤں تمہیں ضرور بتاؤں گی۔"

"دیر ہی تھی۔" زینب نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"اور کچھ نہیں تو تم ہمیں کوئی تصویر وغیرہ ہی لا کر دکھا دو موصوف کی..... ہے کون؟..... نام کیا ہے؟..... کیا کرتا ہے؟"

رابعہ نے ہمیشہ کی طرح ایک ہی سانس میں سوال در سوال کر ڈالے۔

"فرسٹ کزن ہے..... اجد نام ہے۔" اماں نے ڈک ڈک کر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ایم بی اے کیا ہے اس نے اور بزنس کرتا ہے۔"

"شکل و صورت کیسی ہے؟" اس بار زینب نے پوچھا۔ اماں نے خود سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ "ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے؟ میں تم سے پوچھ رہی ہوں لہذا ہے؟ ڈارک ہے؟ چند سم ہے؟" اس بار اماں مسکراتے ہوئے کچھ کے بغیر زینب کو دیکھتی رہی۔

"اماں نے اپنی پسند سے یہ سبھی کی ہے..... دو اچھا خاصا گنڈ لٹک ہے۔" جو یہ یہ نے اس بار اماں کی طرف سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ہمیں اندازہ کر لینا چاہئے تھا، آخر وہ اماں کا فرسٹ کزن ہے..... اب اماں! تمہارا اگلا کام یہ ہے کہ تم ہمیں اس کی تصویر لا کر دکھاؤ۔" زینب نے کہا۔

”نہیں، اس سے پہلے کا ضروری کام یہ ہے کہ تم ہمیں کچھ کھلانے پلانے لے چلو۔“ رابعہ نے مدعا ملت کرتے ہوئے کہا۔

”نی الحال تو یہاں سے چلیں، ہاسٹل جانا ہے مجھے۔“ امامہ یک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی تو وہ بھی اٹھ گئیں۔

”ویسے جویریہ! تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟“ ساتھ چلتے ہوئے زینب نے جویریہ سے پوچھا۔
”بھئی، امامہ نہیں چاہتی تھی..... اس لئے میں نے بھی اس موضوع پر بات نہیں کی۔“ جویریہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ امامہ نے مز کر ایک بار پھر جویریہ کو گھورا، اس کی نظروں میں حیرت تھی۔

”امامہ کیوں نہیں چاہتی تھی..... میری منگنی ہوئی تو میں تو شور مچاتی ہر جگہ، وہ بھی اس صورت میں جب یہ میری اپنی مرضی سے ہوتی۔“ زینب نے بلند آواز میں کہا۔
امامہ نے اس بار کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

☆.....☆.....☆

”آپ کا بیٹا آبادی کے اس ۲.۵ لاکھ حصے میں شامل ہے، جو ۱۵۰ سے زیادہ کا آئی کیو لیول رکھتے ہیں۔ اس آئی کیو لیول کے ساتھ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ غیر معمولی سہی مگر غیر متوقع نہیں ہے۔“ اس غیر ملکی اسکول میں سالار کو جانتے ہوئے ابھی صرف ایک ہفتہ ہوا تھا جب سکندر عثمان اور ان کی بیوی کو وہاں بلوایا گیا تھا۔ اسکول کے سائیکالوجسٹ نے انہیں سالار سکندر کے مختلف آئی کیو ٹیسٹ کے بارے میں بتایا تھا جس میں اس کی پرفارمنس نے اس کے ٹیچر زاور سائیکالوجسٹ کو حیران کر دیا تھا۔ اس اسکول میں وہ ۱۵۰ کا آئی کیو لیول والا پہلا اور واحد بچہ تھا اور چند ہی دنوں میں وہ وہاں سب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔

سکندر عثمان اور ان کی بیوی سے ملاقات کے دوران سائیکالوجسٹ کو اس کے بچپن کے بارے میں کچھ اور رکھوج لگانے کا موقع ملا۔ وہ کافی دلچسپی سے سالار کے کیس کو اسٹڈی کر رہا تھا اور دلچسپی کی یہ نوعیت پروفیشنل نہیں ذاتی تھی۔ اپنے کیریئر میں وہ پہلی بار اس آئی کیو کے بچے کا سامنا کر رہا تھا۔

سکندر عثمان کو آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔ سالار اس وقت صرف دو سال کا تھا اور غیر معمولی طور پر وہ اس عمر میں ایک عام بچے کی نسبت زیادہ صاف لہجے میں باتیں کرتا تھا اور باتوں کی نوعیت ایسی ہوتی تھی کہ وہ اور ان کی بیوی اکثر حیران ہوتے۔

ایک دن جب وہ اپنے بھائی سے فون پر بات کرنے کے لئے فون کر رہے تھے تو سالار ان کے پاس کھڑا تھا۔ وہ اس وقت فی دی لائونج میں بیٹھے تھے اور فون پر باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ فی دی بھی دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے فون رکھ دیا۔ ریسیور رکھنے کے فوراً بعد انہوں نے سالار کو فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے دیکھا۔

”ہیلو انگل! میں سالار ہوں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اطمینان سے ریسیور کان سے لگائے کسی سے باتوں میں مصروف تھا۔

”میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟“ سکندر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پہلے ان کے ذہن میں یہی آیا کہ وہ جھوٹ موٹ فون پر باتیں کر رہا ہے۔

”پاپا میرے پاس بیٹھے فی دی دیکھ رہے ہیں۔ نہیں، انہوں نے فون نہیں کیا، میں نے خود کیا ہے۔“ وہ اس کے اگلے جملے پر چونکے۔

”سالار! کس سے باتیں کر رہے ہو؟“ سکندر نے پوچھا۔

”انگل! شائناواز سے۔“ سالار نے سکندر کو جواب دیا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اس سے لے لیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس نے غلطی سے کوئی نمبر ملا لیا ہو گا یا پھر لاسٹ نمبر کو ری ڈائل کر دیا ہو گا۔ انہوں نے کان سے ریسیور لگایا، دوسری طرف ان کے بھائی ہی تھے۔

”یہ سالار نے نمبر ڈائل کیا ہے۔“ انہوں نے معذرت کرتے ہوئے اپنے بھائی سے کہا۔

”سالار نے کیسے ڈائل کیا وہ تو بہت چھوٹا ہے۔“ من کے بھائی نے دوسری طرف کچھ جراتی سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے اس نے آپ کا نمبر ری ڈائل کر دیا ہے۔ اتفاق سے ہاتھ لگ گیا ہو گا۔ ہاتھ مار رہا تھا سیٹ پر۔“ انہوں نے فون بند کر دیا اور ریسیور نیچے رکھ دیا۔ سالار جو خاموشی کے ساتھ ان کی گفتگو

سننے میں مصروف تھا ریسیور کے نیچے رکھتے ہی اس نے ایک بار پھر ریسیور اٹھا لیا۔ اس بار سکندر عثمان اسے دیکھنے لگے، وہ بالکل کسی بچور آدمی کی طرح ایک بار پھر شائناواز کا نمبر ڈائل کر رہا تھا اور بڑی روانی کے ساتھ۔ وہ ایک لمحے کے لئے دم بخود رہ گئے تھے۔ دو سال کے بچے سے انہیں یہ توقع نہیں تھی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر کرینل دبا دیا۔

”سالار! تمہیں شائناواز کا نمبر معلوم ہے؟“ انہوں نے حیرانی کے اس جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے کہا۔
”ہاں۔“ بڑے اطمینان سے جواب دیا گیا۔

”کیا نمبر ہے؟“ اس نے بھی روانی کے ساتھ وہ نمبر دہرا دیا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ گھنٹی کے اعداد سے واقف ہو گا اور پھر وہ نمبر.....

”تمہیں یہ نمبر کس نے سکھایا؟“

”میں نے خود سیکھا ہے۔“

”کیسے؟“

”ابھی آپ نے ملایا تھا۔“ سالار نے ان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں گھنٹی آتی ہے؟“

"ہاں۔"

"کہاں تک۔"

"بہتر ڈنک۔"

"سناؤ۔"

وہ شین کی طرح شروع ہو گیا۔ ایک ہی سانس میں اس نے انہیں سو تک گنتی سادی۔ سکندر عثمان کے پیٹ میں تل پڑنے لگے۔

"اچھا۔ میں ایک اور نمبر ڈائل کرتا ہوں میرے بعد تم اسے ڈائل کرنا۔" انہوں نے ریسیور اس سے لیتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" سالار کو یہ سب ایک دلچسپ کھیل کی طرح لگا۔ سکندر عثمان نے ایک نمبر ملایا اور پھر فون بند کر دیا۔ سالار نے فوراً ریسیور ان سے پکڑ کر انہیں کی روانی کے ساتھ وہ نمبر ملایا۔ سکندر عثمان کا سر گھومنے لگا تھا۔ وہ واقعی وہی نمبر تھا جو انہوں نے ملایا تھا۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی نمبر ملائے اور پھر سالار سے وہی نمبر ملانے کے لئے کہا۔ وہ کوئی لفظی کئے بغیر وہی نمبر ملا تا رہا۔ وہ یقیناً فون نمبر ایک سیوری رکھتا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی کو بلایا۔

"میں نے اسے گنتی نہیں سکھائی، میں نے تو بس کچھ دن پہلے اسے چند کتابیں لا کر دی تھیں اور کل ایک بار ایسے ہی اس کے سامنے سو تک گنتی پڑھی تھی۔" انہوں نے سکندر عثمان کے انتظار پر کہا۔ سکندر عثمان نے سالار کو ایک بار پھر گنتی سنانے کے لئے کہا، وہ سنا تا گیا۔ ان کی بیوی ہکا بکا اسے دیکھتی رہیں۔

دونوں میاں بیوی کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا بچہ ذہنی اعتبار سے غیر معمولی صلاحیتیں رکھتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ ان دونوں نے اپنے باقی بچوں کی نسبت اسے بہت جلد ہی اسکول میں داخل کر دیا تھا اور اسکول میں بھی وہ اپنی ان غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے بہت جلد ہی دوسروں کی نظروں میں آ گیا تھا۔

"اس بچے کو آپ کی خاص توجہ کی ضرورت ہے، عام بچوں کی نسبت ایسے بچے زیادہ حساس ہوتے ہیں، اگر آپ اس کی اچھی تربیت کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ بچہ آپ کے اور آپ کے خاندان کے لئے ایک سرمایہ ہو گا نہ صرف خاندان کے لئے بلکہ آپ کے ملک کے لئے بھی۔" سکندر عثمان اور ان کی بیوی اس غیر ملکی سائیکالوجسٹ کی باتیں بڑے فخریہ انداز میں سنتے رہے۔

اپنے دوسرے بچوں کے مقابلے میں وہ سالار کو زیادہ اہمیت دینے لگے تھے۔ وہ ان کی سب سے قیمتی اولاد تھا اور انہیں اس کی کامیابیوں پر فخر تھا۔

اسکول میں ایک ٹرم کے بعد اسے اگلی کلاس میں پڑھوٹا کر دیا گیا اور دوسری ٹرم کے بعد اس سے اگلی کلاس میں اور اس وقت پہلی بار سکندر عثمان کو کچھ تشویش ہونے لگی۔ وہ نہیں چاہتے تھے سالار

آٹھ دس سال کی عمر میں جو نیز یا سینئر لیجر کر لیتا مگر جس رفتار سے وہ ایک کلاس سے دوسری کلاس میں جا رہا تھا یہی ہونا تھا۔

"میں چاہتا ہوں آپ میرے بیٹے کو اب پورے ایک سال کے بعد ہی اگلی کلاس میں پڑھوٹن دیں۔ میں نہیں چاہتا وہ اتنی جلدی اتنے اہل طریقے سے اپنا ایک تک کیریئر ختم کر لے۔ آپ اس کے آپیکس اور اینٹیونیوز بڑھا دیں، مگر اسے نارل طریقے سے ہی پڑھوٹن کریں۔"

ان کے اصرار پر سالار کو دوبارہ ایک سال کے اندر ڈائل یا ٹرپل پڑھوٹن نہیں دیا گیا، اس کے ٹیلنٹ کو اسپورٹس اور دوسری چیزوں کے ذریعے جھکا کر کیا جانے لگا۔ طرغ، ٹینس، گالف اور میوزک وہ چار شے تھے جن میں اسے سب سے زیادہ دلچسپی تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ خود کو صرف ان چاروں چیزوں تک ہی محدود رکھتا تھا۔ وہ اسکول میں ہونے والے تقریباً ہر ٹیم میں شریک ہوتا تھا اگر کسی میں شریک نہیں ہوتا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ ہوتی تھی کہ وہ ٹیم یا سپورٹ اسے زیادہ دلچسپ نہیں لگتی تھی۔

☆.....☆.....☆

"جویریہ! پروفیسر امتنان کے لیجر کے نوٹس مجھے دینا۔" امام نے جویریہ کو مخاطب کیا جو ایک کتاب کھولے بیٹھی ہوئی تھی۔ جویریہ نے ہاتھ بڑھا کر اپنی ایک نوٹ بک اسے تھما دی۔ امام نوٹ بک کھول کر مطالعہ کرنے لگی۔ جویریہ ایک بار پھر کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو گئی۔ کچھ دیر بعد اچانک اسے جیسے ایک خیال آیا تھا۔ اس نے مڑ کر اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی امام کو دیکھا۔

"تم نے لیجر نوٹ کرنا کیوں بند کر دیا ہے؟" اس نے امام کو مخاطب کیا۔ امام نے نوٹ بک سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"مجھے کچھ سمجھ میں آئے تو میں نوٹ کر دوں۔"

"کیا مطلب؟ تمہیں پروفیسر امتنان کا لیجر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔" جویریہ کو جیسے حیرت ہوئی۔

"اٹا اچھا تو پڑھاتے ہیں۔"

"میں نے کب کہا کہ برا پڑھاتے ہیں، بس مجھے....."

اس نے کچھ اٹھے ہوئے لہجے میں بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑی نوٹ بک کو دیکھ رہی تھی۔ جویریہ نے غور سے اسے دیکھا۔

"تم آج کل کچھ غائب دماغ نہیں ہوتی جا رہی؟" ڈسٹرب ہو کر اس نے اپنے سامنے رکھی کتاب بند کرتے ہوئے بڑے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"ڈسٹرب؟" وہ بڑبڑائی۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

”تمہاری آنکھوں کے گرد جھلنے بھی پڑے ہوئے ہیں۔ کل رات کو شاید ساڑھے تین کا وقت تھا جب میری آنکھ کھلی اور تم اس وقت بھی جاگ رہی تھیں۔“

”میں پڑھ رہی تھی۔“ اس نے مدافعتاً لہجے میں کہا۔

”نہیں، صرف کتاب اپنے سامنے رکھے بیٹھی ہوئی تھیں، مگر کتاب پر نظر نہیں تھی تمہاری۔“

جویریہ نے اس کا اندر رد کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟“

”کیا مسئلہ ہو سکتا ہے مجھے؟“

”پھر تم اتنی چپ چاپ کیوں رہنے لگی ہو؟“ جویریہ اس کی نال منول سے حاشا ہوئے بغیر بولی۔

”نہیں، میں کیوں چپ رہوں گی۔“ اما نے مسکراتے کی کوشش کی۔ ”میں تو پہلے ہی کی طرح

بولتی ہوں۔“

”صرف میں ہی نہیں، باقی سب بھی تمہاری پریشانی کو محسوس کر رہے ہیں۔“ جویریہ سنجیدگی سے بولی۔

”کوئی بات نہیں ہے، صرف اسٹڈیز کی فینشن ہے مجھے۔“

”میں یقین نہیں کر سکتی ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں، تمہیں ہم سے زیادہ فینشن تو نہیں ہو سکتی۔“

جویریہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اما نے ایک گہرا سانس لیا، وہ اب رنج ہو رہی تھی۔

”تمہارے گھر میں تو خیریت ہے؟“

”ہاں، بالکل خیریت ہے۔“

”اسجد کے ساتھ تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا؟“

”اسجد کے ساتھ جھگڑا کیوں ہو گا؟“ اما نے اسی کے انداز میں پوچھا۔

”پھر بھی اختلافات تو ایک بہت ہی.....“ جویریہ کی بات اس نے درمیان میں ہی کاٹ دی۔

”جب کہہ رہی ہوں کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے تو تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا۔ اتنے سوالوں سے کون

سی بات ہے جو میں نے تم سے شیئر نہیں کی یا جو تمہیں پتا نہیں ہے پھر تم اس طرح مجھے مجرم سمجھ کر گفتگو

کیوں کر رہی ہو۔“ وہ اب خفا ہو رہی تھی۔

جویریہ گڑبڑا گئی۔ ”یقین کیوں نہیں کروں گی، میں صرف اس لئے اصرار کر رہی تھی کہ شاید تم

مجھے اس لئے اپنا مسئلہ نہیں بتا رہیں کہ میں پریشان نہ ہوں اور تو کوئی بات نہیں۔“

جویریہ کچھ تادم ہی ہو کر اس کے پاس سے اٹھ کر واپس اپنی اسٹڈیز ٹیبل کے سامنے جا بیٹھی۔

اس نے ایک بار پھر وہ کتاب کھول لی جسے وہ پہلے پڑھ رہی تھی۔ کافی دیر تک کتاب پڑھتے رہنے کے

بعد اس نے ایک جھالی لی اور گردن موڑ کر لاشعوری طور پر اما کو دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے

اس کی نوٹ بک کھولے بیٹھی تھی مگر اس کی نظریں نوٹ بک پر نہیں تھیں وہ سامنے والی دیوار پر نظریں

جمائے بیٹھی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس نے گاڑی نمبر کے پل سے کچھ فاصلے پر کھڑی کر دی پھر ڈگی سے ایک بوری اور ری نکال لی۔

دو بوری کو کھینچتے ہوئے اس پل کی طرف بڑھتا رہا۔ پاس سے گزرنے والے کچھ راہ گیروں نے اسے دیکھا

مگر وہ ڈکے نہیں، اوپر پہنچ کر اس نے اپنی شرٹ اُتار کر نمبر میں پھینک دی۔ چند لمحوں میں اس کی شرٹ

پہتے پانی کے ساتھ غائب ہو چکی تھی۔ ڈارک بلو کھڑکی ٹھک جھڑ میں اس کا لمبا قد اور خوب صورت جسم

بہت نمایاں تھا۔

اس وقت اس شخص کی آنکھوں میں کوئی ایسا اثر تھا جسے پڑھنا دوسرے کسی بھی شخص کے لئے

ناممکن تھا۔ اس کی عمر انیس بیس سال ہو گی، مگر اس کے قد و قامت اور طبع نے اس کی عمر کو جیسے بڑھا دیا

تھا۔ اس نے ری پل سے نیچے نمبر میں لٹکانی شروع کر دی، جب ری کا سر اپنی میں غائب ہو گیا تو اس نے

ری کا دوسرا سر ابوری کے منہ پر لپٹ کر تختی سے گریں لگانی شروع کر دیں اور اس وقت تک لگا رہا جب

تک کوائل ختم نہیں ہو گیا پھر پانی میں پڑا سر اداہل کھینچ کر اس نے اندازے سے تین فٹ کے قریب ری

چھوڑی اور اپنے دونوں سر ساتھ جوڑتے ہوئے اس نے اپنے بیروں کے گرد ری کو بہت مضبوطی کے

ساتھ دو تین ٹلی دیئے اور گرو لگا دی۔ اب اس تین فٹ کے ٹکڑے کے سرے پر بڑی مہارت کے

ساتھ اس نے دو پھندے بنائے پھر اپک کر پل کی منڈ پر پر بندھ گیا۔ اپنا دایاں ہاتھ کر کے پیچھے لے

جاتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ کے ساتھ پہلے پھندے میں سے دایاں ہاتھ گزارا اور پھر بائیں ہاتھ

کے ساتھ اس نے وہ پھندا کھینچ کر کس دیا۔ اس کے بعد اس نے کر کے پیچھے دائیں ہاتھ کے ساتھ

دوسرے پھندے میں سے دایاں ہاتھ گزارا اور دائیں ہاتھ سے اسے کس دیا۔

اس کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے پشت

کے بل خود کو پل کی منڈ پر سے نیچے گرا دیا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اس کا سر پانی سے ٹکرایا اور کربک کا

حصہ پانی میں ڈوب گیا پھر ری ختم ہو گئی۔ اب وہ اس طرح لٹکا ہوا تھا کہ اس کے بازو پشت پر بندھے

ہوئے تھے اور کربک کا دھڑپانی کے اندر تھا۔ بوری میں موجود وزن یقیناً اس کے وزن سے زیادہ تھا یہی

وجہ تھی کہ بوری اس کے ساتھ نیچے نہیں آئی اور وہ اس طرح لٹک گیا۔ اس نے اپنا سانس روکا ہوا تھا۔

پانی کے اندر اپنا سر جاتے ہی اس نے آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی مگر کام رہا۔ پانی گدلا تھا اور اس

میں موجود مٹی اس کی آنکھوں میں چھینے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہچھوڑے اب جیسے

پہننے لگے تھے۔ اس نے یک دم سانس لینے کی کوشش کی اور پانی منہ اور ناک سے اس کے جسم کے اندر

داخل ہونے لگا۔ وہ اب بری طرح پھڑپھڑا رہا تھا مگر نہ وہ اپنے بازوؤں کو استعمال کر کے خود کو سٹخ پر لا

سکا تھا اور نہ ہی اپنے جسم کو اٹھا سکتا تھا۔ اس کے جسم کی ہڈیاں آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھی۔ چند لوگوں نے اسے ہل سے نیچے گرتے دیکھا اور چیخے ہوئے اس طرف بھاگے، وہ ابھی تک ہل رہی تھی، ان لوگوں کی بھگ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ پانی کے نیچے ہونے والی حرکت اب دم توڑ گئی تھی۔ اس کی ٹانگیں اب بالکل بے جان نظر آ رہی تھیں۔ ہل پر کھڑے لوگ خوف کے عالم میں اس بے جان وجود کو دیکھ رہے تھے۔ ہل پر موجود ہجوم بڑھ رہا تھا۔ نیچے پانی میں موجود وہ وجود ابھی بھی ساکت تھا۔ صرف پانی اسے حرکت دے رہا تھا۔ کسی ہڈی کی طرح۔ آگے پیچھے۔ آگے پیچھے۔

☆.....☆.....☆

”امام! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ رابع نے اپنی الماری سے اپنا ایک سوٹ نکال کر بیڈ پر پھینکتے ہوئے کہا۔
 امام نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا۔ ”کس لئے تیار ہو جاؤں؟“
 ”بھئی، شاپنگ کے لئے جا رہے ہیں، ساتھ چلو۔“ رابع نے اسی تیز رفتاری کے ساتھ استری کا پگ نکالتے ہوئے کہا۔
 ”نہیں، مجھے کہیں نہیں جانا۔“ اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھوں پر اپنا بازو رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔
 ”کیا مطلب ہے..... مجھے کہیں نہیں جانا۔ تم سے پوچھ کون رہا ہے..... تمہیں بتا رہے ہیں۔“ رابع نے اسی لہجے میں کہا۔

”اور میں نے بتا دیا ہے، میں کہیں نہیں جا رہی۔“ اس نے آنکھوں سے بازو ہٹائے بغیر کہا۔
 ”زیب بھی چل رہی ہے ہمارے ساتھ، پورا گروپ جا رہا ہے، ظم بھی دیکھیں گے واہسی پر۔“ رابع نے پورا پروگرام بتاتے ہوئے کہا۔
 امام نے ایک لٹھ کے لئے اپنی آنکھوں سے بازو ہٹا کر اسے دیکھا۔ ”زیب بھی جا رہی ہے؟“
 ”ہاں، زیب کو ہم راستے سے پک کریں گے۔“ امام کسی سوچ میں ڈوب گئی۔
 ”تم بہت ڈل ہوئی جا رہی ہو امام!“ رابع نے قدرے ناراضی کے ساتھ تہرہ کیا۔ ”ہمارے ساتھ کہیں آنا جانا ہی چھوڑ دیا ہے تم نے، آخر ہو تا کیا جا رہا ہے تمہیں۔“
 ”کچھ نہیں، بس میں آج کچھ تھکی ہوئی ہوں، اس لئے سونا چا رہی ہوں۔“ امام نے بازو ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد جو یہ بھی امام آگئی اور وہ بھی اسے ساتھ چلنے کے لئے مجبور کرتی رہی، مگر امام

کی زبان پر ایک ہی رٹ تھی۔ ”نہیں مجھے سونا ہے، میں بہت تھک گئی ہوں۔“ وہ مجبور اسے برا بھلا کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔
 رستے سے انہوں نے زیب کو اس کے گھر سے پک کیا اور زیب کو پک کرتے ہوئے جو یہ کہنا یاد آیا کہ اس کے بیک کے اندر اس کا دولت نہیں ہے، وہ اسے ہاسل میں ہی چھوڑ آئی تھی۔
 ”واہیں ہاسل چلے ہیں، وہاں سے دولت لے کر پھر بازار چلیں گے۔“ جو یہ کہنے پر وہ لوگ دوبارہ ہاسل چلی آئیں، مگر وہاں آکر انہیں حیرانی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ کمرے کے دروازے پر ۲ لاکھ ہوا تھا۔

”یہ امام کہاں ہے؟“ رابع نے حیرانی سے کہا۔

”پتا نہیں۔ کرو لاک کر کے اس طرح کہاں جا سکتی ہے۔ وہ تو کہہ رہی تھی کہ اسے سونا ہے۔“ جو یہ کہنے لگا۔

”ہاسل میں تو کسی کے روم میں نہیں چلی گئی؟“ رابع نے خیال ظاہر کیا۔ وہ دونوں اگلے کئی منٹ ان واقف لڑکیوں کے کمروں میں جاتی رہیں جن سے ان کی پیلو ہائے تھی، مگر امام کا کہیں پتا نہیں تھا۔
 ”کہیں ہاسل سے باہر تو نہیں گئی؟“ رابع کو اچانک خیال آیا۔
 ”آؤ دارڈن سے پوچھ لیتے ہیں۔“ جو یہ کہنے لگا۔ وہ دونوں دارڈن کے پاس چلی آئیں۔
 ”ہاں، امام ابھی کچھ دیر پہلے باہر گئی ہے۔“ دارڈن نے ان کی انگوٹھی پر بتایا۔ جو یہ اور رابع ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔

”وہ کہہ رہی تھی شام کو آئے گی۔“ دارڈن نے انہیں مزید بتایا۔ وہ دونوں دارڈن کے کمرے سے نکل آئیں۔

”یہ گئی کہاں ہے؟ ہمارے ساتھ تو جانے سے انکار کر دیا تھا کہ اسے سونا ہے اور وہ تھکی ہوئی ہے اور اس کی طبیعت خراب ہے اور اب اس طرح غائب ہو گئی ہے۔“ رابع نے لٹھے ہوئے انداز میں کہا۔
 رات کو وہ قدرے لیٹ واہسی آئیں اور جس وقت وہ واہسی آئیں۔ امام کمرے میں موجود تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ان دونوں کا استقبال کیا۔
 ”گلتا ہے۔ خاصی شاپنگ ہوئی ہے آج۔“ اس نے ان دونوں کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے شاپرز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ان دونوں نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا، بس شاپرز رکھ کر اسے دیکھنے لگیں۔
 ”تم کہاں گئی ہوئی تھیں؟“ جو یہ کہنے لگا۔ امام کو پیسے ایک جھٹکا لگا۔
 ”میں اپنا دولت لینے واہسی آئی تھی تو تم یہاں نہیں تھیں، کرو لاکڈ تھا۔“ جو یہ کہنے لگا۔

میں کہا۔

”میں تم لوگوں کے پیچھے گئی تھی۔“

”کیا مطلب؟“ جو یہ نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

”تمہارے نکلنے کے بعد میرا روادہ بدل گیا تھا۔ میں یہاں سے نرنپ کی طرف گئی کیونکہ تم لوگوں کو اسے پک کرنا تھا، مگر اس کے چوکیدار نے بتایا کہ تم لوگ پہلے ہی وہاں سے نکل گئے ہو، پھر میں وہاں سے واپس آگئی۔ بس رستے میں کچھ کتابیں لی تھیں میں نے۔“ امانہ نے کہا۔

”دیکھا۔ تم سے پہلے کہا تھا کہ ہمارے ساتھ چلو مگر اس وقت تم نے فوراً انکار کر دیا، بعد میں بے وقوفوں کی طرح پیچھے چل پڑی۔ ہم لوگ تو سٹھوک ہو گئے تھے تمہارے بارے میں۔“ زاہد نے کچھ اطمینان سے ایک شاپر کھولتے ہوئے کہا۔

امانہ نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ صرف مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھتی رہی۔ وہ دونوں اب اپنے شاپر کھولتے ہوئے خریدی ہوئی چیزیں اسے دکھا رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”چا نہیں؟“

”ماں باپ نے کیا رکھا تھا؟“

”یہ ماں باپ سے پوچھیں۔“ خاموشی۔

”لوگ کس نام سے پکارتے ہیں تمہیں؟“

”لڑکے یا لڑکیاں؟“

”لڑکے؟“

”بہت سارے نام لیتے ہیں۔“

”زیادہ تر کون سا نام پکارتے ہیں؟“

”daredevil“ خاموشی.....

”اور لڑکیاں؟“

”وہ بھی بہت سے نام لیتی ہیں۔“

”زیادہ تر کس نام سے پکارتی ہیں؟“

”یہ میں نہیں بتا سکتا۔“ it's too personal (یہ بالکل ذاتی ہے)۔

گہری خاموشی، طویل سانس پھر خاموشی۔

”میں آپ کو ایک مشورہ دوں؟“

”ہیا؟“

”آپ میرے بارے میں وہ جاننے کی کوشش کیوں نہیں کرتے جو نہ آپ پہلے جانتے ہیں نہ میں۔ آپ کے دائیں طرف نیمل پر جو سفید فائل پڑی ہے اس میں میرے سارے particulars موجود ہیں پھر آپ وقت ضائع کیوں کر رہے ہیں؟“

سانیکو اناست نے اپنے پاس موجود نیمل بسپ کی روشنی میں سامنے کاؤچ پر دراز اس نوجوان کو دیکھا جو اپنے سر مسلسل ہار رہا تھا، اس کے چہرے پر گہرا اطمینان تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سانیکو اناست کے ساتھ ہونے والی اس ساری گفتگو کو بے کار سمجھ رہا تھا۔ کمرے میں موجود ٹھنڈک، خاموشی اور نرم تاریکی نے اس کے اعصاب کو بالکل ساڑھا نہیں کیا تھا۔ وہ بات کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ سانیکو اناست کے لئے سامنے لیٹا ہوا نوجوان ایک عجیب کیس تھا، وہ فوٹو گرافک سموری کا مالک تھا۔ اس کا آئی کیو لیول ۱۵۰ کی رینج میں تھا۔ وہ تھرو آؤٹ، آؤٹ اسٹینڈنگ اکیڈمک ریکارڈ رکھتا تھا وہ گالف میں پریزیڈنٹس گولڈ میڈل تین بار جیت چکا تھا اور وہ..... وہ تیسری بار خودکشی کی ناکام کوشش کرنے کے بعد اس کے پاس آیا تھا۔ اس کے والدین ہی اسے اس کے پاس لے کر آئے تھے اور وہ بے حد پریشان تھے۔

وہ ملک کے چند بہت اچھے خاندانوں میں سے ایک سے تعلق رکھتا تھا۔ ایسا خاندان جس کے پاس پیسے کی بھرمار تھی، چار بھائیوں اور ایک بہن کے بعد دو چوتھے نمبر پر تھا۔ دو بھائی اور ایک بہن اس سے بڑے تھے۔ اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے وہ اپنے والدین کا بہت زیادہ چہیتا تھا۔ اس کے باوجود وہ پچھلے تین سال میں اس نے تین بار خودکشی کی کوشش کی۔

پہلی دفعہ اس نے سڑک پر بانیک چلاتے ہوئے دن وے کی خلاف ورزی کی اور بانیک سے ہاتھ اٹھائے، اس کے پیچھے آنے والے ٹریفک کا ٹھیل نے ایسا کرتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ خوش قسمتی سے گاڑی سے نکلنے کے بعد وہ اسیں آجمل کر ایک دوسری گاڑی کی چھت پر گر گیا اور پھر زمین پر گر گیا۔ اس کی کچھ ribs ایک بازو اور ایک ٹانگہ میں فریکچر ہوئے، تب اس کے والدین کا ٹھیل کے اصرار کے باوجود اسے ایک حادثہ ہی سمجھے، کیونکہ اس نے اپنے ماں باپ سے یہی کہا تھا کہ وہ غلطی سے دن وے سے ہٹ گیا تھا۔

دوسری بار پورے ایک سال کے بعد اس نے لاہور میں خود کو ہاندہ کرپانی میں ڈوبنے کی کوشش کی۔ ایک بار پھر اسے پھالیا گیا۔ ہل پر کمرے لوگوں نے اسے اس رسی سمیت باہر کھینچ لیا تھا جس کے ساتھ ہاندہ کو اس نے خود کو غچے کر لیا تھا۔ اس بار اس بات کی گواہی دینے والوں کی تعداد زیادہ تھی کہ

اس نے خود اپنے آپ کو پانی میں گر لیا تھا مگر اس کے اس باپ کو ایک بار پھر یقین نہیں آیا۔ سالار کا بیان یہ تھا کہ کچھ لڑکوں نے اس کی گاڑی کو پلے کے پاس روکا اور پھر اسے ہاندہ کر پانی میں پھینک دیا، جس طرح وہ بندھا ہوا تھا اس سے یوں ہی لگتا تھا کہ اسے واقعی ہی ہاندہ کر گر لیا گیا تھا۔ پولیس اگلے گلی پہنچنے اس کے بتائے گئے مٹھے کے لڑکوں کو پورے شہر میں تلاش کرتی رہی۔ سکندر عثمان نے خاص طور پر ایک گارڈ اس کے ساتھ فیصلت کر دیا جو چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتا تھا۔

مگر تیسری بار وہ اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکا۔ خواب آور گولیوں کی ایک بڑی تعداد کو پیس کر اس نے کھالیا تھا۔ گولیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ معدہ واہ کرنے کے باوجود اگلے کئی دن وہ بیمار رہا تھا۔ اس بار کسی کو بھی کوئی تعلق نہیں ہوئی۔ اس نے خانہ سالار کے سامنے ان گولیوں کے پاؤڈر کو دودھ میں ڈال کر پیا تھا۔

سکندر عثمان اور طیبہ سکندر شاکر رو گئے تھے۔ پچھلے دونوں واقعات بھی انہیں پوری طرح یاد آگئے تھے اور وہ بچھتانے لگے تھے کہ انہوں نے پہلے اس کی بات پر اعتبار کیوں کیا..... پورا مگر اس کی وجہ سے پریشان ہو گیا تھا، اس کے بارے میں اسکول، کالونی اور خاندان ہر جگہ خبریں پھیل رہی تھیں۔ وہ اس بار اس بات سے انکار نہیں کر سکا کہ اس نے خود کئی کی کوشش کی تھی، مگر وہ یہ بتانے پر تیار نہیں تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ بھائی، بہن، ماں یا باپ اس نے کسی کے سوال کا بھی جواب نہیں دیا تھا۔

سکندر اسے لیوٹر کے بعد اس کے بڑے دو بھائیوں کی طرح اسے بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھجوانا چاہتے تھے، وہ جانتے تھے اسے کبھی بھی نہ صرف بڑی آسانی سے ایڈمیشن مل جائے گا بلکہ اسکالرشپ بھی..... لیکن ان کے سارے پلانز جیسے بھک کر کے اڑ گئے تھے۔

اور اب وہ اس سائیکو انالسٹ کے سامنے موجود تھا، جس کے پاس سکندر عثمان نے اسے اپنے ایک دوست کے مشورہ پر بھجوا لیا تھا۔

”ٹھیک ہے سالار! بالکل نوڈا پوائنٹ بات کرتے ہیں۔ مرنا کیوں چاہتے ہو تم؟“ سالار نے کندھے اچکائے۔

”آپ سے کس نے کہا کہ میں مرنا چاہتا ہوں؟“

”خود کئی کی تین کوششیں کر چکے ہو تم۔“

”کوشش کرنے اور مرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“

”تینوں دفعہ تم اتفاقاً بیچے ہو ورنہ تم نے خود کو مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

”دیکھیں۔ جس کو آپ خود کئی کی کوشش کہہ رہے ہیں اسے خود کئی کی کوشش نہیں سمجھتا۔ میں صرف دیکھنا چاہتا تھا کہ موت کی تکلیف کیسی ہوتی ہے۔“

وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگا جو بڑے پرسکون انداز میں انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اور موت کی تکلیف تم کیوں محسوس کرنا چاہتے تھے؟“

”بس ایسے ہی، curiosity تجسس سمجھ لیں۔“ سائیکو انالسٹ نے ایک گہرا سانس لے کر اس ۱۵۰

آئی کیولیوں والے نوجوان کو دیکھا، جواب سمجھتے ہوئے گھوم رہا تھا۔

”تو ایک بار خود کئی کی کوشش سے تمہارا یہ تجسس ختم نہیں ہوا۔“

”اوہ تب..... تب میں بے ہوش ہو گیا تھا اس لئے میں ٹھیک سے کچھ بھی محسوس نہیں کر سکا۔

دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا۔ تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا۔“ وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”اور اب تم جو کئی کی کوشش کر رہے؟“

”یقیناً“ میں محسوس کرنا چاہتا ہوں کہ درد کی انتہا پر جا کر کیسا لگتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”جیسے Joy کی انتہا ecstasy ہوتی ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خوشی کی اس انتہا کے بعد کیا

ہے، اسی طرح درد کی بھی تو کوئی انتہا ہوتی ہوگی، جس کے بعد آپ کچھ بھی سمجھ نہیں سکتے جیسے ecstasy

میں آپ کچھ بھی سمجھ نہیں سکتے۔“

”بس نہیں سمجھ سکا۔“

”فرض کریں آپ ایک بار میں striptease دیکھ رہے ہیں، بہت تیز میوزک بج رہا ہے، آپ

ڈرنک کر رہے ہیں، آپ نے کچھ ڈرگز بھی لی ہوئی ہیں، آپ ناچ رہے ہیں پھر آہستہ آہستہ آپ اپنے

ہوش و حواس کھو دیتے ہیں، آپ ecstasy (سرور) میں ہیں، کہاں ہیں؟ کیوں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟

آپ کو کچھ بھی پتا نہیں لیکن آپ کو یہ ضرور پتا ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ آپ کو اچھا

لگ رہا ہے۔ میں جب باہر چھٹیاں گزارنے جاتا ہوں تو اپنے کزنز کے ساتھ ایسے بارز میں جاتا ہوں۔

میرا پرائیم یہ ہے کہ ان کی طرح میں ecstatic (مد ہوش) نہیں ہوتا I never get wild with joy

مجھے ان چیزوں سے اتنی خوشی نہیں مل پاتی جتنی پائی لوگوں کو ملتی ہے اور یہی چیز مجھے مایوس کرتی ہے۔

میں نے سوچا کہ اگر سرور کی انتہا پر نہیں پہنچ سکتا تو شاید میں درد کی انتہا پر پہنچ سکوں لیکن وہ بھی نہیں ہو

سکا۔“ وہ خاصا مایوس نظر آ رہا تھا۔

”تم اس طرح کی چیزوں میں وقت ضائع کیوں کرتے ہو، اتنا شاندار ایکٹنگ دیکھا ہے تمہارا.....“

سالار نے اس بار انتہائی جزاری سے اس سے کہا۔ ”پلیز، پلیز اب میری ذہانت کے راگ الاپنا

مت شروع کیجئے گا۔ مجھے پتا ہے میں کیا ہوں۔ ٹھگ آ گیا ہوں میں اپنی تعریفیں سنتے سنتے۔“ اس کے لہجے

میں تکی تھی۔ سائیکو انالسٹ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔

”اپنے لئے کوئی گول کیوں نہیں سین کرتے تم؟“

”میں نے کیا ہے؟“

”کیا؟“

”مجھے خودکشی کی ایک اور کوشش کرنی ہے۔“ عمل اطمینان تھا۔

”کیا تمہیں کوئی ذہنیشن ہے؟“

”ناٹ اینٹ آل۔“

”تو پھر مرنا کیوں چاہتے ہو؟“ ایک گہرا سانس۔

”کیا آپ کو ایک بار پھر سے بتانا شروع کروں کہ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں کچھ اور کرنے کی

کوشش کر رہا ہوں۔“ وہ آگیا۔

بات محکم پھر کر پھر وہیں آگئی تھی۔ سائیکو لاسٹ کچھ دیر سوچتا رہا۔

”کیا تم یہ سب کسی لڑکی کی وجہ سے کر رہے ہو؟“

سالار نے گردن موڑ کر جراتی سے اسے دیکھا۔ ”لڑکی کی وجہ سے؟“

”ہاں۔ کوئی ایسی لڑکی جو تمہیں اچھی لگتی ہو جس سے تم شادی کرنا چاہتے ہو؟“ اس نے بے اختیار

تہقہ لگایا اور پھر وہ بیٹھا ہی گیا۔

”مائی گاڈ! آپ کا مطلب ہے کہ کسی لڑکی کی محبت کی وجہ سے میں خودکشی۔“ وہ ایک بار پھر

بات اور صوری چھوڑ کر بٹھنے لگا۔ ”لڑکی کی محبت..... اور خودکشی..... کیا مذاق ہے۔“ وہ اب اپنی ہنسی پر

قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

سائیکو لاسٹ نے اس طرح کے کئی سیشنز اس کے ساتھ کئے تھے اور ہر بار نتیجہ ڈھاک کے

وہی تھنا پاتا رہا۔

”آپ اس کو تعلیم کے لئے بیرون ملک بھجوانے کے بجائے یہیں رکھیں اور اس پر بہت زیادہ توجہ

دیں۔ ہو سکتا ہے یہ توجہ حاصل کرنے کے لئے یہ سب کرتا ہو۔“

اس نے کئی ماہ کے بعد سالار کے ماں باپ کو مشورہ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے باہر بھجوانے کے

بجائے اسلام آباد کے ایک ادارے میں ایڈمیشن دلوا دیا گیا۔ سکندر عثمان کو یہ اطمینان تھا کہ وہ اسے اپنے

پاس رکھیں گے تو شاید وہ دوبارہ ایسی حرکت نہ کرے۔ سالار نے ان کے اس فیصلے پر کسی رد عمل کا اظہار

نہیں کیا بالکل اسی طرح جس طرح اس نے ان کے اس فیصلے پر کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا کہ اسے

بیرون ملک تعلیم کے لئے بھجوا دیا جائے گا۔

سائیکو لاسٹ کے ساتھ آخری سیشن کے بعد سکندر عثمان اسے گھر لے آئے اور انہوں نے طیب

کے ساتھ مل کر اس سے ایک لمبی چوڑی مینٹگ کی۔ وہ دونوں اپنے بیڈ روم میں بٹھا کر اسے ان تمام

آسانٹوں کے بارے میں بتاتے رہے جو وہ پچھلے کئی سالوں میں اسے فراہم کرتے رہے تھے۔ انہوں

نے اسے ان توقعات کے بارے میں بھی بتایا جو وہ اس سے رکھتے تھے۔ اسے ان محبت بھرے جذبات

سے بھی آگاہ کیا گیا جو وہ اس کے لئے محسوس کرتے تھے۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ جوجم چپا تا باپ کی

بے چینی اور ماں کے آنسو دیکھتا رہا۔ گھٹکے کے آخر میں سکندر عثمان نے تقریباً نگ آکر اس سے کہا۔

”تمہیں کس چیز کی کمی ہے؟ کیا ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے یا جو تمہیں چاہئے۔ مجھے بتاؤ۔“ سالار

سوچا میں پڑ گیا۔

”اسپورٹس کار۔“ اگلے ہی لمحے اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں اسپورٹس کار باہر سے منگوا دیتا ہوں مگر دوبارہ ایسی کوئی حرکت مت کرنا

جو تم نے کی ہے، او کے؟“ سکندر عثمان کو کچھ اطمینان ہوا۔

سالار نے سر ہلادیا۔ طیب سکندر نے نشو سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے جیسے سکون کا سانس لیا۔

وہ کرے سے چلا گیا تو سکندر عثمان نے سگھار سلگاتے ہوئے ان سے کہا۔

”طیب! تمہیں اس پر بہت توجہ دینی پڑے گی۔ اپنی activities کچھ کم کرو اور کوشش کرو کہ اس

کے ساتھ روزانہ کچھ وقت گزار سکو۔“ طیب نے سر ہلادیا۔

☆.....☆.....☆

دسم نے امامہ کو دور سے ہی لان میں بیٹھے دیکھ لیا۔ وہ کانوں پر بیڈ فون لگائے واک مین پر کچھ سن

رہی تھی۔ دسم دے قدموں اس کی پشت کی جانب سے اس کے عقب میں گیا اور اس کے پاس جا کر اس

نے ایک دم امامہ کے کانوں سے بیڈ فون کے تار کھینچ لئے۔ امامہ نے برق رفتاری سے واک مین کا stop

کاٹن رہا تھا۔

”کیا بتا جا رہا ہے یہاں اکیلے بیٹھے؟“ دسم نے بلند آواز میں کہتے ہوئے بیڈ فون کو اپنے کانوں

میں فون لیا مگر تب تک امامہ کیسٹ بند کر چکی تھی۔ کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو کر اس نے بیڈ فون کو

اپنی طرف کھینچتے ہوئے دسم سے کہا۔

”بد تمیزی کی کوئی حد ہوتی ہے دسم اپنی بیوی پر سیلف۔“ اس کا چہرہ فٹے سے سرخ ہو رہا تھا۔ دسم

نے بیڈ فون کے سروں کو نہیں چھوڑا، امامہ کے فٹے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”میں سننا چاہتا ہوں، تم کیا سن رہی تھیں۔ اس میں بد تمیزی دہائی کیا بات ہے، کیسٹ کو آن کرو۔“

امامہ نے کچھ جھنجھلاتے ہوئے بیڈ فون کو واک مین سے الگ کر دیا۔ ”میں تمہارے سننے کے لئے

واک مین لے کر یہاں نہیں بیٹھی، دو فوج ہو جاؤ یہ بیڈ فون لے کر۔“

وہ ایک بار پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی، اس نے واک مین کو بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں جکڑا ہوا تھا۔

دویم کو لگا جیسے وہ کچھ گھبرائی ہوئی ہے مگر وہ گھبرائے گی کیوں؟ دویم نے سوچا اور اس خیال کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے سامنے والی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ ہیڈ فون کو اس نے میز پر رکھ دیا۔

”یہ لوہا پنا غصہ ختم کرو۔ واک مین کر رہا ہوں میں، تم سنو، جو بھی سن رہی ہو۔“ اس نے بڑے صلح جویانہ انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں، اب مجھے نہیں سننا چاہیے، تم ہیڈ فون رکھو اپنے پاس۔“ اما نے ہیڈ فون کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

”ویسے تم سن کیا رہی تھیں؟“

”کیا سنا جاسکتا ہے؟“ اما نے اسی کے انداز میں کہا۔

”فریٹس سن رہی ہوگی؟“ دویم نے خیال ظاہر کیا۔

”جسبیں ہتا ہے دویم! تم میں بہت ساری عادتیں بوڑھی عورتوں والی ہیں؟“

”مثلاً“

”مثلاً پال کی کھال اُتارنا۔“

”اور۔“

”اور دوسروں کی جاسوسی کرتے پھرنا اور شرمندہ بھی نہ ہونا۔“

”اور جسبیں یہ ہتا ہے کہ تم آہستہ آہستہ کتنی خود غرض ہوتی جا رہی ہو۔“ دویم نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔ اما نے اس کی بات پر برا نہیں مانا۔

”اچھا..... جسبیں ہتا چل گیا ہے کہ میں خود غرض ہوں۔“ اس بار اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”حالانکہ تم جتنے بے وقوف ہو میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ نتیجہ اخذ کر لو گے۔“

”تم اگر مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو تو مت کرو، میں شرمندہ نہیں ہوں گا۔“ دویم نے

ذہناتی کامیاب ہوتے ہوئے کہا۔

”پھر بھی ایسے کاموں کی کوشش تو ہر ایک پر فرض ہوتی ہے۔“

”آج تمہاری زبان کچھ زیادہ نہیں چل رہی؟“ دویم نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے نہیں، ایسا ہی ہے۔ پلو اچھا ہے، وہ چپ شاد کاروزہ تو زودیا ہے تم نے جو اسلام آباد

آنے پر تم رکھ لیا ہو۔“ اما نے غور سے دویم کو دیکھا۔

”کون سا چپ شاد کاروزہ؟“

”تم جب سے لاہور گئی ہو خاصی بدل گئی ہو۔“

”مجھ پر اسٹریز کا بہت بوجھ ہے۔“

”سب پر ہوتا ہے اما۔ مگر کوئی بھی اسٹریز کو اتنا سر پر سوار نہیں کرتا۔“ دویم نے اس کی بات

کالتے ہوئے کہا۔

”چھوڑو اس فضول بحث کو، یہ بتاؤ تم آج کل کیا کر رہے ہو؟“

”میش۔“ وہ اسی طرح کرسی جھلاتا رہا۔

”یہ تو تم پورا سال ہی کرتے ہو، میں آج کل کی خاص مصروفیت کا پوچھ رہی ہوں۔“

”آج کل تو بس دو سٹوں کے ساتھ پھر رہا ہوں۔ جسبیں ہتا ہونا چاہئے کہ پیچھے کے بند میری

مصروفیات کیا ہوتی ہیں۔ سب کچھ بھولتی جا رہی ہو تم۔“ دویم نے افسوس بھری نظروں سے کہا۔

”میں نے اس امید میں یہ سوال کیا تھا کہ شاید اس سال تم میں کوئی بہتری آجائے مگر نہیں، میں

نے بے کار سوال کیا۔“ اما نے اس کے تمبرے کے جواب میں کہا۔

”جسبیں ہتا ہونا چاہئے کہ میں تم سے ایک سال بڑا ہوں، تم نہیں، اس لئے اب اپنی ملاحتی تقریر

ختم کرو۔“ دویم نے اسے کچھ جتاتے ہوئے کہا۔

”یہ ساتھ والوں کے لڑکے سے تعلقات کا کیا حال ہے؟“ اما کو اچانک یاد آیا۔

”چنچن چنچن؟“ اس کچھ عجیب سے ہی تعلقات ہیں۔“ دویم نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”بڑا

عجیب سا بندہ ہے وہ، موڈ اچھا ہے تو دوسرے کو ساتویں آسمان پر بٹھادے گا، سوڈ خراب ہے تو سیہ خاکٹر

میں پھینکا دے گا۔“

”تمہارے زیادہ تر دوست اسی طرح کے ہیں۔“ اما نے مسکراتے ہوئے کہا ”کند ہم جنس باہم

جنس پرواز۔“

”نہیں، خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ کم از کم میری عادتیں اور حرکتیں چنچن جیسی تو نہیں ہیں۔“

”وہ تو باہر جانے والا تھا؟“ اما کو اچانک یاد آیا۔

”ہاں جاتا تو تھا مگر پتا نہیں میرا خیال ہے اس کے بیٹنس نہیں بھجوا رہے۔“

”علیہ بڑا عجیب سا ہوتا ہے اس کا۔ مجھے بعض دفعہ لگتا ہے پیوں کے کسی قبیلے سے کسی نہ کسی طرح

اس کا تعلق ہو گا یا آئندہ ہو جائے گا۔“

”تم نے دیکھا ہے اسے؟“

”نکل میں باہر سے آ رہی تھی تو دیکھا تھا۔ وہ بھی اسی وقت باہر نکل رہا تھا، کوئی لڑکی بھی تھی ساتھ۔“

"لڑکی؟ بیٹو وغیرہ پہنی ہوئی تھی اس نے؟" "وسیم نے اچانک دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔"

"شروم کت بالوں والی..... فیکری؟"

"ارسر۔" "وسیم چنگی بجاتے ہوئے مسکرایا۔ "اس کی گرل فرینڈ ہے۔"

"بھلی دفعہ تو تم کسی اور کا نام لے رہے تھے۔" امام نے اُسے گھورا۔

"بھلی دفعہ کب؟" "وسیم سوچ میں پڑ گیا۔"

"سات آٹھ ماہ پہلے شاید تم سے اس کی گرل فرینڈ کی بات ہوئی تھی۔"

"ہاں تب شیا تھی۔ اب پتا نہیں وہ کہاں ہے۔"

"اس بار تو گاڑی کے پچھلے شیشے پر اس نے اپنے موبائل کا نمبر بھی پینٹ کر دیا ہوا تھا۔" امام

ایک موبائل نمبر ڈہراتے ہوئے فرمایا۔

"تمہیں یاد ہے؟" "وسیم بھی ہنسا۔"

"میں نے زعم کی میں پہلی بار اتنا بڑا موبائل نمبر کہیں کھسا دیکھا تھا اور وہ بھی ایک گاڑی کے شیشے

پر اس کے نام کے ساتھ، یاد تو ہونا ہی تھا۔" امام ہنسا۔

"میں تو خود سوچ رہا ہوں اپنی گاڑی کے شیشے پر موبائل نمبر کھوانے کا۔" "وسیم نے بالوں میں

ہاتھ بھیرتے ہوئے کہا۔

"کون سے موبائل کا۔ وہ جو تم نے ابھی خریدی ابھی نہیں۔" امام نے وسیم کا مذاق اڑایا۔

"میں خرید رہا ہوں اس ماہ۔"

"بابا کے جوتے کھانے کے لئے تیار رہنا، اگر تم نے موبائل کے نمبر کو گاڑی کے شیشے پر لکھوایا

سب سے پہلا فون اُن ہی کا آئے گا۔"

"بس اسی لئے ہر بار میں زک جاتا ہوں۔" "وسیم نے ایک غصّی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارے لئے اچھا ہی ہے۔ بابا سے ہڈیاں تڑوانے سے بہتر ہے کہ بندہ اپنے جذبات پر کچھ

قابور رکھے اور تمہارے لئے تو خطرات ویسے بھی زیادہ ہیں۔ سید کو پتا چلتا اگر اس قسم کے کسی موبائل

فون کا تو....." "وسیم نے اس کی بات کا ٹھنڈی۔

"تو کیا کرے گی وہ، میں اس سے ڈرتا نہیں ہوں۔"

"میں جانتی ہوں تم اس سے ڈرتے نہیں ہو، مگر مجھے بھائیوں کی اگلوٹی بہن سے مٹھنی کرنے سے

پہلے تمہیں تمام نفع نقصان پر غور کر لینا چاہئے تھا جن کا سامنا تمہیں کسی ایسی ویسی حرکت کے بعد ہو سکتا

ہے۔" امام نے ایک بار پھر اس کی سنگھیز کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔

"اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ بس میرے مقدر میں تھا یہ سب کچھ۔" "وسیم نے ایک معنوی آہ بھرتے

ہوئے کہا۔

"مجھے کبھی بھی موبائل فون نہیں خریدنا چاہئے کیونکہ یہ میرے کسی کام نہیں آسکے گا۔ کم از کم

جہاں تک گرل فرینڈ کی تلاش کا سوال ہے۔" "وہ ایک بار پھر کرسی جھلانے لگا۔

"دیر سے کسی مگر بات تمہاری کچھ میں آئی گئی۔" امام نے ہاتھ بڑھا کر میز سے بیڈ فون اٹھاتے

ہوئے کہا۔

"ویسے تم سن کیا رہی تھیں؟" "وسیم کو اسے بیڈ فون اٹھاتے دیکھ کر پھر یاد آیا۔

"ویسے ہی کچھ خاص نہیں تھا۔" امام نے اُٹھتے ہوئے اسے جیسے نالا۔

☆.....☆.....☆

"آپ لاہور جا رہے ہیں تو واپسی پر امام کے ہاسٹل چلے جائیں، یہ کچھ کپڑے ہیں اس کے،

درزی سے لے کر آئی ہوں، آپ اسے دے آئیں۔" سہلی نے ہاشم سے کہا۔

"بھئی۔ میں بڑا مصروف ہوں گا لاہور میں، کہاں آتا جاتا پھروں گا اس کے ہاسٹل۔" ہاشم کو

قدرے تامل ہوا۔

"آپ ڈرائیور کو ساتھ لے کر جا رہے ہیں، خود نہیں جا سکتے تو اسے بھیج دیجئے گا، وہ دے آئے گا

یہ پیکٹ۔ سیزن ختم ہو رہا ہے پھر یہ کپڑے اسی طرح پڑے رہیں گے۔ اس کا تو پتا نہیں اب کب آئے۔"

سہلی نے لمبی چوڑی وضاحت کی۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں لے جاتا ہوں۔ فرصت ملی تو خود دے آؤں گا ورنہ ڈرائیور کے ہاتھ بھرا

دوں گا۔" ہاشم رضامند ہو گئے۔

لاہور میں انہوں نے خاصا مصروف دن گزارا۔ شام پانچ بجے کے قریب انہیں کچھ فرصت ملی اور

تب انہیں اس پیکٹ کا بھی خیال آیا۔ ڈرائیور کو پیکٹ لے جانے کا کہنے کے بجائے وہ خود امام کے

ہاسٹل چلے آئے۔ اس کے ایڈیشن کے بعد آج پہلی بار وہ وہاں آئے تھے۔ گیٹ کپڑے کے ہاتھ انہوں

نے امام کے لئے پیغام بھجوایا اور خود انتظار کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی آجائے گی مگر ایسا نہ

ہوا، دس منٹ، پندرہ منٹ، بیس منٹ..... وہ اب کچھ بیزار ہونے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ اندر دوبارہ

پیغام بھجواتے انہیں گیٹ کپڑے ایک لڑکی کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ کچھ قریب آئے پر انہوں نے اس

لڑکی کو پہچان لیا وہ جو یہ تھی امام کی بچپن کی دوست اور اس کا تعلق بھی اسلام آباد سے ہی تھا۔

"السلام علیکم انکل!" جو یہ نے پاس آکر کہا۔

"وعلیکم السلام بیٹا کیسی ہو تم۔"

”میں ٹھیک ہوں۔“

”میں یہ امامہ کے کچھ کپڑے دینے آیا تھا، لاہور آ رہا تھا تو اس کی امی نے یہ پیکٹ دے دیا۔ اب یہاں بیٹھے مجھے گھنٹے ہو گیا ہے مگر انہوں نے اسے نہیں بلایا۔“ ہاشم کے لہجے میں شکوہ تھا۔

”انگل! امامہ مارکیٹ گئی ہے کچھ دوستوں کے ساتھ، آپ یہ پیکٹ مجھے دے دیں، میں خود اسے دے دوں گی۔“

”ٹھیک ہے، تم رکھ لو۔“ ہاشم نے وہ پیکٹ جو یہی کی طرف بڑھا دیا۔

رہی ملیک سلیک کے بعد وہ وہاں مزے۔ جو یہی بھی پیکٹ پکڑ کر ہاسٹل کی طرف چلی گئی مگر اب اس کے چہرے پر موجود مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی، کوئی بھی اس وقت اس کے چہرے پر پریشانی کو واضح طور پر بھانپ سکتا تھا۔

ہاسٹل کے اندر آتے ہی دارڈن سے اس کا سامنا ہو گیا جو سامنے ہی کھڑی تھیں۔ جو یہی کے چہرے پر ایک بار پھر مسکراہٹ آگئی۔

”بات ہوئی تمہاری اس کے والد سے؟“ دارڈن نے اسے دیکھتے ہی اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں، پریشانی والا کوئی مسئلہ نہیں ہے، وہ اسلام آباد میں اپنے گھر پر ہی ہے، اس کے والد یہ پیکٹ لے کر آئے تھے، میرے گھر والوں نے میرے کچھ کپڑے بھجوائے ہیں۔ انگل لاہور آ رہے تھے تو امامہ نے کہا کہ وہ لے جائیں۔ انگل نے لٹلی سے یہاں آکر میرا نام لینے کے بجائے امامہ کا نام لے دیا۔“ جو یہی نے ایک ہی سانس میں کئی جھوٹ روائی سے بولے۔

دارڈن نے سکون کا سانس لیا۔ ”خدا کا شکر ہے ورنہ میں تو پریشان ہی ہو گئی تھی کہ مجھے تو وہ دیکھ ایڈ پر گھر جانے کا کہہ کر گئی ہے..... تو پھر وہ کہاں ہے.....“

دارڈن نے مزے ہوئے کہا۔ جو یہی پیکٹ پکڑے اپنے کمرے کی طرف چلی آئی۔ راہبہ اسے دیکھتے ہی تیری طرح اس کی طرف آئی۔

”کیا ہوا..... اسلام آباد میں ہی ہے وہ؟“

”نہیں۔“ جو یہی نے مایوسی سے سر ہلایا۔

”مائی گاڈ۔“ راہبہ نے بے چینی سے اپنے دونوں ہاتھ کر اس کے سینے پر رکھے۔ ”تو پھر کہاں گئی ہے وہ؟“

”مجھے کیا پتہ مجھ سے تو اس نے یہی کہا تھا کہ گھر جا رہی ہے، مگر وہ گھر نہیں گئی، آخر وہ گئی کہاں ہے؟ امامہ ایسی تو نہیں ہے۔“ جو یہی نے پیکٹ ہنتر پر پھینکتے ہوئے کہا۔

”دارڈن سے کیا کہا تم نے؟“ راہبہ نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

”کیا کہا؟ جھوٹ بولا ہے اور کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ بتاؤ گی کہ وہ اسلام آباد میں نہیں ہے تو ہاسٹل میں تو ابھی ہنگامہ شروع ہو جاتا، وہ تو پوچھ لیس کو بلواتی تھیں۔“ جو یہی نے ناخن کاٹتے ہوئے کہا۔

”اور انگل کو..... ان کو کیا بتایا ہے؟“ راہبہ نے پوچھا۔

”ان سے بھی جھوٹ بولا ہے، یہی کہا ہے کہ وہ مارکیٹ گئی ہے۔“

”مگر اب ہو گا کیا؟“ راہبہ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

”مجھے تو یہ فکر ہو رہی ہے کہ اگر وہ وہاں نہ آئی تو میں تو بری طرح پکڑی جاؤں گی۔ سب یہی

کبھیس کے کہ مجھے اس کے پروگرام کا پتا تھا، اس لئے میں نے دارڈن اور اس کے گھر والوں سے سب کچھ پچھایا۔“ جو یہی کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

”گنہیں امامہ کو کوئی حادثہ ہی پیش نہ آیا ہو؟ ورنہ وہ ایسی لڑکی تو نہیں ہے کہ اس طرح.....“

راہبہ کو اچانک ایک خدشے نے ستایا۔

”مگر اب ہم کیا کریں۔ ہم تو کسی سے اس سارے معاملے کو ڈسکس بھی نہیں کر سکتے۔“ جو یہی

نے ناخن کھرتے ہوئے کہا۔

”تذنب سے بات کریں۔“ راہبہ نے کہا۔

”فائر گارڈ سیک راہبہ! کبھی تو حصل سے کام لیا کرو، اس سے کیا بات کریں گے ہم۔“ جو یہی نے

جھنجھلا کر کہا۔

”تو پھر انتظار کرتے ہیں، ہو سکتا ہے وہ آج رات تک یا کل تک آجائے اگر آگئی پھر تو کوئی مسئلہ

نہیں رہے گا اور اگر نہ آئی تو پھر ہم دارڈن کو سب کچھ سچ بتا دیں گے۔“ راہبہ نے سنجیدگی سے

سارے معاملے پر غور کرتے ہوئے طے کیا۔ جو یہی نے اسے دیکھا مگر اس کے مشورے پر کچھ کہا

نہیں۔ پریشانی اس کے چہرے سے چمک رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

جو یہی اور راہبہ رات بھر سو نہیں سکیں۔ وہ عمل طور پر خوف کی گرفت میں تھیں۔ اگر وہ نہ آئی تو

کیا ہو گا، یہ سوال ان کے سامنے بار بار بھیانک شکلیں بدل بدل کر آ رہا تھا۔ انہیں اپنا کیرئیر ڈھونڈنا ہوا نظر آ

رہا تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ ان کے گھر والے ایسے معاملے پر کیسا رد عمل ظاہر کریں گے۔ وہ انہیں بری

طرح ملامت کرتے، انہیں امامہ کے والد کو سب کچھ صاف صاف نہ بتانے پر تنقید کا نشانہ بناتے اور پھر

دارڈن سے سارے معاملے کو چھپانے پر اور بھی ناراض ہوتے۔

انہیں اندازہ نہیں تھا کہ حقیقت سامنے آنے پر خود ہاشم بہین اور ان کی جلیلی کارو عمل کیا ہو گا، وہ

اس سارے معاملے میں ان دونوں کے رول کو کس طرح دیکھیں گے۔ ہاسٹل میں لڑکیاں ان کے بارے میں کس طرح کی باتیں کریں گی اور پھر اگر یہ سارا معاملہ پولیس کیس بن گیا تو پولیس ان کی اس پر وہ پوشی کو کیا سمجھے گی، وہ اندازہ کر سکتی تھیں اور اسی لئے بار بار ان کے روٹھے کھڑے ہو رہے تھے۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ گئی کہاں..... اور کیوں..... وہ دونوں اس کے پچھلے رویوں کا تجربہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کس طرح پچھلے ایک سال سے وہ بالکل بدل گئی تھی، اس نے ان کے ساتھ گھومنا پھرنا بند کر دیا تھا، وہ اب بھی ابھی رہنے لگی تھی، پڑھائی میں اس کا اٹھنا کبھی بھی کم ہو گیا تھا اور اس کی کم گوئی۔

”اور وہ جو ایک بار وہ ہمارے شاپنگ کے لئے جانے پر پیچھے سے غائب تھی، جب بھی یقیناً وہ وہیں گئی ہوگی جہاں وہ اب گئی ہے اور ہم نے اس طرح ہے وہ تو فون کی طرح اس پر اعتبار کر لیا۔“ رابعہ کو پچھلی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

”مگر امارہ ایسی نہیں تھی، میں تو اسے بھینٹ سے جانتی ہوں۔ وہ ایسی بالکل بھی نہیں تھی۔“ جویریہ کو اب بھی اس پر کوئی شک نہیں ہو رہا تھا۔

”ایسا ہونے میں کوئی راز تو ہونی لگتی ہے، بس انسان کا کردار کمزور ہونا چاہئے۔“ رابعہ بدگمانی کی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی۔

رابعہ اس کی مرضی سے اس کی منگنی ہوئی تھی، وہ اور ابجد ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے پھر وہ اس طرح کی حرکت کیسے کر سکتی ہے۔“ جویریہ نے اس کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

”پھر تم بتاؤ کہ وہ کہاں ہے..... میں نے تو کبھی بتا کر اسے کسی دیوار کے ساتھ نہیں چپکا پایا ہے، اس کے باپ اس سے ملنے یہاں آئے ہیں اور وہ اپنے گھر سے آئے ہیں، تو ظاہر ہے وہ گھر پر نہیں گئی اور ہم سے وہ یہی کہہ کر گئی تھی کہ وہ گھر جا رہی ہے۔“ رابعہ نے بے چارگی سے کہا۔

”ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔“ ہو سکتا ہے، وہ اسی لئے گھر نہ پہنچ سکی ہو۔“

”وہ ہر بار یہاں سے فون کر کے اسلام آباد اپنے گھر والوں کو اپنے آنے کی اطلاع دے دیتی تھی تاکہ اس کا بھائی اسے کوئٹہ کے شہر سے پک کر لے۔ اگر اس بار بھی اس نے اسے اطلاع دی تھی تو پھر اس کے وہاں نہ پہنچنے پر وہ لوگ اطمینان سے وہاں نہ بیٹھے ہوتے، وہ یہاں ہاسٹل میں فون کرتے اور اس کے والد کے انداز سے تو ایسا ہی محسوس ہوا ہے جیسے اس کا اس ویک اینڈ پر اسلام آباد کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔“ رابعہ نے اس کے قیاس کو مکمل طور پر رد کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔ وہ کبھی بھی ایک ماہ میں دو بار اسلام آباد نہیں جاتی تھی مگر اس بار تو دوسرے ہی پہنچے

اسلام آباد جا رہی تھی اور اس نے وارڈن سے خاص طور پر یہ کہہ کر اجازت لی تھی۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے، کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ ضرور غلط ہے۔“ جویریہ کو پھر خدشات ستانے لگے۔

”اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی بری طرح ڈوبیں گے۔ ہم سے بہت بڑی نطفی ہوئی جو ہم نے سب کچھ اس طرح گورا پ کیا، ہمیں صاف صاف بات کرنی چاہئے تھی اس کے والد سے کہ وہ یہاں نہیں ہے، پھر وہ جو چاہے کرتے۔ یہ ان کا مسئلہ ہوتا، کم از کم ہم تو اس طرح نہ پھنتے جس طرح اب پھنس گئے ہیں۔“ رابعہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

”خیر۔ اب کیا ہو سکتا ہے، صحتک انتظار کرتے ہیں اگر وہ کل بھی نہیں آئی تو پھر وارڈن کو سب کچھ بتا دیں گے۔“ جویریہ نے کمرے کے چکر لگاتے ہوئے کہا۔

دو رات ان دونوں نے اسی طرح باتیں کرتے جاتے ہوئے گزار لی۔ اگلے دن وہ دونوں کالج نہیں گئیں۔ اس حالت میں کالج جانے کا کوئی ٹائمہ بھی نہیں ہوتا۔

امارہ ویک اینڈ پر ہفتہ کو واپسی پر نوبے کے قریب آ جا کر تھی مگر اس دن وہ نہیں آئی، ان کے اعصاب جواب دینے لگے۔ ذہنی بیچے کے قریب وقت رکھتے اور اپنے ہونے ہاتھوں کے ساتھ اپنے کمرے سے وارڈن کے کمرے میں جانے کے لئے نکل آئیں، ان کے ذہن میں وہ بیٹل کر دہا کر رہے تھے، جو انہیں وارڈن سے کہنے تھے۔

دو وارڈن کے کمرے سے ابھی کچھ دوری تھی جب انہوں نے امارہ کو بڑے اطمینان کے ساتھ اندر آتے دیکھا۔ اس کا بیگ اس کے کانٹے پر تھا اور فولڈر ہاتھوں میں، وہ یقیناً سیدھی کالج سے آ رہی تھی۔ جویریہ اور رابعہ کو یوں لگا جیسے ان کے بیروں کے بیچے سے نکلنے ہوئی زمین یک دم ختم ہو گئی تھی۔ ان کی رکی ہوئی سانس ایک بار پھر پھیلنے لگی تھی۔ کل کے اخبارات میں متوقع وہ ہینڈ لائنز جو بھوت بن کر ان کے گرد ناچ رہی تھیں یک دم غائب ہو گئیں اور ان کی جگہ اس غصے اور اشتعال نے لی تھی جو انہیں امارہ کی شکل دیکھ کر آیا تھا۔

وہ انہیں دیکھ چکی تھی اور اب ان کی طرف بڑھ رہی تھی، اس کے چہرے پر بڑی خوشگوار سی مسکراہٹ تھی۔

”تم دونوں آج کالج کیوں نہیں آئیں؟“ سلام دعا کے بعد اس نے ان سے پوچھا۔

”تہماری مصیبتوں سے چھٹکارا ملے گا تو ہم کبھی آنے جانے کا سوچ سکیں گے۔“ رابعہ نے تند و تیز لہجے میں اس سے کہا۔

امارہ کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

”کیا ہوا رابعہ! اس طرح نصیحتیں میں کیوں ہو؟“ امارہ نے قدرے تشویش سے پوچھا۔

”تم ذرا اندر کرے میں آؤ پھر تمہیں بتاتی ہوں کہ میں غصے میں کیوں ہوں۔“ رابع نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور تقریباً کھینچے ہوئے کمرے میں لے آئی۔ جو یہ یہ کچھ کہے بغیر ان دونوں کے پیچھے آگئی۔ امام بکا بکا تھی وہ رابع اور جو یہ کے رویے کو کچھ نہیں پارہی تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی رابع نے دروازہ بند کر لیا۔

”کہاں سے آ رہی ہو تم؟“ رابع نے مز کر اجنبائی رخ اور درشت لہجے میں اس سے پوچھا۔

”اسلام آباد سے اور کہاں سے۔“ امام نے اپنا بیک نیچے زمین پر رکھ دیا اس کے جواب نے رابع کو کچھ اور مشتعل کیا۔

”شرم کرو امام۔۔۔۔۔ اس طرح ہمیں دھوکا دے کر، ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر آخر تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔ یہ کہ ہم ذفر ہیں۔ ایٹم ہیں۔ پائل ہیں۔ بجٹی ہم ہیں۔ ہم مانتے ہیں۔۔۔۔۔ نہ ہوتے تو یوں تم پر اندھا حجاب نہ کیا ہوتا تم سے اتنا بڑا دھوکا نہ کھایا ہوتا۔“ رابع نے کہا۔

”مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ کون سا دھوکا۔۔۔۔۔ کیسا دھوکا، کیا یہ بہتر نہیں کہ تم آرام سے مجھے اپنی بات سمجھاؤ۔“ امام نے بے چارگی سے کہا۔

”تم ویک اینڈ کہاں گزار کر آئی ہو؟“ جو یہ نے پہلی بار گفتگو میں مداخلت کی۔

”تمہیں بتا چکی ہوں اسلام آباد میں، وہاں سے آج سیدھا کالج آئی ہوں اور اب کالج سے۔۔۔۔۔“

رابع نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔

”کیوں بند کرو۔۔۔۔۔ یہ جھوٹ اب نہیں چل سکتا، تم اسلام آباد نہیں گئی تھیں۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“ اس بار امام نے بھی قدرے بلند آواز میں کہا۔

”کیونکہ تمہارے خادریہاں آئے تھے کل؟“ امام کا رنگ اڑ گیا۔ وہ کچھ بول نہیں سکی۔

”اب کیوں منہ بند ہو گیا ہے۔ اب بھی کہو کہ تم اسلام آباد سے آ رہی ہو۔“ رابع نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”بابا یہاں۔ آئے تھے؟“ امام نے اٹکتے ہوئے کہا۔

”ہاں آئے تھے، تمہارے کچھ کپڑے دینے کے لئے۔“ جو یہ نے کہا۔

”انہیں یہ پتا چل گیا کہ میں ہاسٹل میں نہیں ہوں۔“

”میں نے جھوٹ بول دیا کہ تم ہاسٹل سے کسی کام کے لئے باہر گئی ہو، وہ کپڑے دے کر چلے گئے۔“ جو یہ نے کہا۔ امام نے بے اختیار اطمینان کا سانس لیا۔

”یعنی انہیں کچھ پتا نہیں چلا؟“ اس نے بستر پر بیٹھ کر اپنے جوتے کے اسٹریپس کھولنے ہوئے کہا۔

”نہیں انہیں کچھ پتا نہیں چلا۔۔۔۔۔ تم منہ اٹھا کر اگلے بیٹے پھر کہیں روانہ ہو جاؤ۔ مانڈیو امام! میں

اب وارڈن سے اس سلسلے میں بات کرنے والی ہوں۔ ہم تمہاری وجہ سے خاصی پریشانی اٹھائے ہیں، مزید اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بہتر ہے تمہارے جوش کو تمہاری ان حرکتوں کے بارے میں پتا چل جائے۔“ رابع نے دونوں انداز میں اس سے کہا۔ امام نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کون سی حرکتوں کے بارے میں۔۔۔۔۔ میں نے کیا کیا ہے؟“

”کیا کیا ہے۔۔۔۔۔؟ ہاسٹل سے اس طرح دونوں کے لئے گھر کا کہہ کر غائب ہو جانا تمہارے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے۔“

امام جو اب دینے کے بجائے دوسرے جوتے کے بھی اسٹریپس کھولنے لگی۔

”مجھے وارڈن کے پاس چلے ہی جانا چاہئے۔“

رابع نے غصے کے عالم میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

جو یہ نے آگے بڑھ کر اسے روکا۔ ”وارڈن سے بات کر لیں گے، پہلے اس سے تو بات کر لیں۔ تم جلد بازی مت کرو۔“

”مگر تم اس وحیث کا اطمینان دیکھو۔۔۔۔۔ مجال ہے ذرا برابر شرمندگی بھی اس کے چہرے پر جھلک رہی ہو۔“ رابع نے غصے میں امام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں تم دونوں کو سب کچھ بتاؤں گی۔ اتنا غصے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا نہ ہی کسی غلط جگہ پر گئی ہوں اور ہاں بھائی بھی نہیں ہوں۔“ امام نے جوتوں کی قید سے اپنے جوتوں کو آزاد کرتے ہوئے قدرے دھمکے لہجے میں کہا۔

”پھر تم کہاں گئی تھیں؟“ اس بار جو یہ نے پوچھا۔

”اپنی ایک دوست کے پاس۔“

”کون سی دوست؟“

”بے ایک۔“

”اس طرح جھوٹ بول کر کیوں؟“

”میں تم لوگوں کے سوالوں سے بچنا چاہتی تھی اور گھر والوں کو بتاتی یا ان سے اجازت لینے کی کوشش کرتی تو وہ بھی اجازت نہ دیتے۔“

”کس کے پاس گئی تھیں؟ اور کس لئے؟“ جو یہ نے اس بار قدرے تجسس آمیز انداز میں پوچھا۔

”میں نے کہا نا، میں بتا دوں گی۔ کچھ وقت دو مجھے۔“ امام نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”کوئی وقت نہیں دے سکتے تمہیں۔۔۔۔۔ تمہیں وقت دیں گا کہ تم ایک بار پھر غائب ہو جاؤ اور اس بار واپس ہی نہ آؤ۔“ رابع نے اس بار بھی ناراضی سے کہا مگر پہلے کی نسبت اس بار اس کا لہجہ دھیمہ تھا۔

"تمہیں تو اس بات کا بھی احساس نہیں ہوا کہ تم نے ہماری پوزیشن کتنی آگورڈ بنا دی تھی، اگر تمہارے اس طرح غائب ہونے کا پتہ چل جاتا تو ہماری کتنی بے عزتی ہوتی۔ اس کا احساس تھا تمہیں؟" رابعہ نے اسی انداز میں کہا۔

"مجھے یہ توقع ہی نہیں تھی کہ بابا یہاں اس طرح اچانک آجائیں گے۔ اس لئے میں یہ بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ تم لوگوں کو کسی ہزک صورت حال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے ورنہ میں اس طرح بھی نہ کرتی۔" امارہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"تم کم از کم ہم پر اعتبار کر کے، ہمیں بتا کر جا سکتی تھیں۔" جویریہ نے کہا۔

"میں آئندہ ایسا کبھی نہیں کروں گی۔" امارہ نے کہا۔

"کم از کم میں تمہارے کسی وعدے، کسی بات پر اعتبار نہیں کر سکتی۔" رابعہ نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"مجھے اپنی پوزیشن بھینٹ کر نے دو رابعہ! تم مجھے لفظ سمجھ رہی ہو۔" امارہ نے اس بار قدرے کمزور انداز میں کہا۔

"تم کو احساس ہے کہ تمہاری وجہ سے ہمارا کیریئر اور ہماری زندگی کس طرح داؤ پر لگ گئی تھی۔ یہ دوستی ہوتی ہے؟ اسے دوستی کہتے ہیں؟"

"ٹھیک ہے۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دو۔" امارہ نے جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"جب تک تم یہ نہیں بتاؤ گی کہ تم کہاں غائب ہو گئی تھیں، میں تمہاری کوئی معذرت قبول نہیں کروں گی۔" رابعہ نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

امارہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

"میں صیبر کے گھر چلی گئی تھی۔" جویریہ اور رابعہ نے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"کون.....؟" ان دونوں نے تقریباً ایک وقت پوچھا۔

"تم لوگ جانتی ہو اسے۔" امارہ نے کہا۔

"وہ فوراً تمہاری سبب؟" جویریہ نے بے اعتبار پوچھا۔

امارہ نے سر ہلایا۔ "مگر اس کے گھر کس لئے گئی تھیں تم؟"

"دوستی ہے اس سے میری۔" امارہ نے کہا۔

"دوستی.....؟ کبھی دوستی.....؟ چاروں کی سلام دعا ہے تمہارے ساتھ اس کی اور میرا خیال ہے تم تو اسے اچھی طرح جانتی بھی نہیں ہو پھر اس کے گھر رہنے کے لئے کیوں چل پڑیں؟" جویریہ نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی اس طرح جھوٹ بول کر..... کم از کم اس کے گھر جا کر رہنے کے لئے تمہیں ہم سے یا اپنے گھروالوں سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔" رابعہ نے اسی لہجے میں کہا۔

"تم اسے کال کر کے پوچھ لو کہ میں اس کے گھر پر تھی یا نہیں۔" امارہ نے کہا۔

"چلو یہ مان لیا کہ تم اس کے گھر پر تھیں مگر کیوں تھیں.....؟" جویریہ نے پوچھا۔

امارہ خاموش رہی پھر کچھ دیر بعد اس نے کہا "مجھے اس کی مدد کی ضرورت تھی۔"

ان دونوں نے حیران ہو کر دیکھا "کس سلسلے میں؟"

امارہ نے سر اٹھایا اور ہلکی سی جھپکائی بغیر دیکھتی رہی۔ جویریہ نے کچھ بے چینی محسوس کی۔ "کس سلسلے میں؟"

"تم اچھی طرح جانتی ہو۔" امارہ نے قدرے مدہم انداز میں کہا۔

"میں.....؟" جویریہ نے کچھ گڑبگڑا کر رابعہ کو دیکھا جو اب بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں، تم تو اچھی طرح جانتی ہو۔"

"تم پہیلیاں مت بھجواؤ۔ سیدھی اور صاف بات کرو۔" جویریہ نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

امارہ سر اٹھا کر خاموشی سے اسے دیکھنے لگی پھر کچھ دیر بعد ہلکتے خوردہ انداز میں اس نے سر جھکا دیا۔

☆.....☆.....☆

"بتاؤ۔ آخر تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟" اس دن کالج میں امارہ نے جویریہ سے اصرار کیا۔

جویریہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ "میری خواہش ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔"

امارہ کو جیسے ایک کرنٹ سا لگا۔ اس نے شاک اور بے چینی کے عالم میں جویریہ کو دیکھا۔ وہ جیسے لہجے میں کہتی جا رہی تھی۔

"تم میری اتنی اچھی اور گہری دوست ہو کہ مجھے یہ سوچ کر تکلیف ہوتی ہے کہ تم گمراہی کے راستے پر چل رہی ہو اور تمہیں اس کا احساس تک نہیں ہے..... نہ صرف تم بلکہ تمہاری پوری فیملی..... میری خواہش ہے کہ نیک اعمال پر اگر اللہ مجھے جنت میں بھیجے تو تم میرے ساتھ ہو لیکن اس کے لئے مسلمان ہونا تو ضروری ہے۔"

امارہ کے چہرے پر ایک کے بعد ایک رنگ آ رہا تھا۔ بہت دیر بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہوئی۔

"میں توقع نہیں کر سکتی تھی جویریہ کہ تم مجھ سے تخریم جیسی باتیں کر دو گی۔ تمہیں تو میں اپنا دوست سمجھتی تھی مگر تم بھی....." جویریہ نے نرمی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"تخریم نے تم سے تب جو کچھ کہا تھا، ٹھیک کہا تھا۔" امارہ ہلکی سی جھپکائی بغیر اسے دیکھتی رہی، اسے

جویریہ کی باتوں سے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

”اور صرف آج ہی نہیں، میں اس وقت بھی تحریم کو صحیح سمجھتی تھی مگر میری تمہارے ساتھ دوستی تھی اور میں چاہنے کے باوجود تم سے یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں تحریم کو حق بجانب سمجھتی ہوں۔ اگر وہ یہ کہتی تھی کہ تم مسلمان نہیں ہو تو یہ ٹھیک تھا۔ تم مسلمان نہیں ہو۔“

امامہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کچھ بھی کہے بغیر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جویریہ بھی اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ امامہ نے کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے جانے کی کوشش کی مگر جویریہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”تم میرا بازو چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو، آئندہ کبھی تم مجھ سے بات تک مت کرنا۔“ امامہ نے بھڑائے ہوئے لہجے میں اس سے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”امامہ! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“

امامہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم نے کتنا ہرٹ کیا ہے مجھے۔ جویریہ مجھے کم از کم تم سے یہ امید نہیں تھی۔“

”میں تمہیں ہرٹ نہیں کر رہی ہوں۔ حقیقت بتا رہی ہوں۔ رونے یا جذبات میں آنے کے بجائے تم ٹھنڈے دل و دماغ سے میری بات پر سوچو۔۔۔۔۔ میں آخر تم کو بے کار کسی بات پر ہرٹ کیوں کروں گی۔“ جویریہ نے اس کا بازو نہیں چھوڑا۔

”یہ تو تمہیں پتا ہو گا کہ تم مجھے ہرٹ کیوں کر رہی ہو، مگر مجھے آج یہ اندازہ ضرور ہو گیا ہے کہ تم میں اور تحریم میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ تم نے تو مجھے اس سے بھی زیادہ تکلیف پہنچائی ہے۔ اس سے میری دوستی اتنی پرانی نہیں تھی جتنی تمہارے ساتھ ہے۔“ امامہ کے گالوں پر آنسو بہ رہے تھے اور وہ مسلسل اپنا بازو جویریہ کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”یہ تمہارا اصرار تھا کہ میں تمہیں اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بتاؤں۔ میں اسی لئے تمہیں نہیں بتا رہی تھی اور میں نے تمہیں پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا کہ تم میری بات پر بہت ناراض ہو گی مگر تم نے مجھے یقین دلایا تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔“ جویریہ نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

”مجھے اگر یہ پتا ہوتا کہ تم میرے ساتھ اس طرح کی بات کرو گی تو میں کبھی تم سے تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش جاننے پر اصرار نہ کرتی۔“ امامہ نے اس بار قدرے ہنسنے سے کہا۔

”اچھا میں دوبارہ اس معاملے پر تم سے بات نہیں کروں گی۔“ جویریہ نے قدرے مدافعتانہ انداز میں کہا۔

”اس سے کیا ہو گا۔ مجھے یہ تو پتا چل گیا ہے کہ تم درحقیقت میرے بارے میں کیا سوچتی ہو۔۔۔۔۔“

تمہاری دوستی اب کبھی بھی پہلے جیسی نہیں ہو سکتی۔ آج تک میں نے کبھی تم پر اس طرح کی تنقید نہیں کی مگر تم مجھے اسلام کا ایک فرقہ سمجھنے کے بجائے غیر مسلم بتا رہی ہو۔“ امامہ نے کہا۔

”میں اگر ایسا کر رہی ہوں تو غلط نہیں کر رہی۔ اسلام کے تمام فرقے کم از کم یہ ایمان ضرور رکھتے ہیں کہ حضور ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں اور ان کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔“ اس بار جویریہ کو بھی غصہ آ گیا۔

”مانڈیو ر لیکچرنگ۔“ امامہ بھی بھڑک اٹھی۔

”میں تمہیں حقیقت بتا رہی ہوں امامہ۔۔۔۔۔ اور میں ہی نہیں یہ بات سب لوگ جانتے ہیں کہ تمہاری فیملی نے روپے کے حصول کے لئے مذہب بدلا ہے۔“

”امامہ! میری باتوں پر اتنا ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے۔“

امامہ نے جویریہ کی بات کاٹ دی۔ ”مجھے ضرورت نہیں ہے تمہاری کسی بھی بات پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کی۔ میں جانتی ہوں حقیقت کیا ہے اور کیا نہیں۔۔۔۔۔“

”تم نہیں جانتیں اور یہی افسوس ناک بات ہے۔“ جویریہ نے کہا۔ امامہ نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اس بار بہت زور کے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا اور تیز قدموں کے ساتھ وہاں سے چل پڑی۔ اس بار جویریہ نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کچھ افسوس اور پریشان سے اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔ امامہ اس طرح ناراض نہیں ہوتی تھی جس طرح وہ آج ہو گئی تھی اور یہی بات جویریہ کو پریشان کر رہی تھی۔

باب ۲

پیر سب کچھ اسکول میں ہونے والے ایک واقعے سے شروع ہوا تھا۔ امام اس وقت میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی اور تحریم اس کی اچھی دوستوں میں سے ایک تھی۔ وہ لوگ کئی سال سے اکٹھے تھے اور نہ صرف ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے بلکہ ان کی فیملیز بھی ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتی تھیں۔ اپنی فرینڈز میں سے امام کی سب سے زیادہ دوستی تحریم اور جویریہ سے تھی مگر اسے حیرت ہوتی تھی کہ اتنی گہری دوستی ہونے کے باوجود بھی جویریہ اور تحریم اس کے گھر آنے سے کتراتے تھیں۔ امام ہر سال اپنی سالگرہ پر انہیں انوائٹ کرتی اور اکثر وہ اپنے گھر پر ہونے والی دوسری تقریبات میں بھی انہیں مدعو کرتی، وہ گھر سے اجازت نہ ملنے کا بہانہ بنا دیتیں۔ چند بار امام نے خود ان دونوں کے والدین سے اجازت لینے کے لئے بات کی، لیکن اس کے بے تحاشا اصرار کے باوجود ان دونوں کے والدین انہیں اس کے گھر آنے کی اجازت نہ دیتے۔ ان کے اس رویے پر کچھ شاک ہو کر اس نے اپنے والدین سے شکایت کی۔

”تمہاری یہ دونوں فرینڈز سید ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر ہمارے فرقہ کو پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے ان دونوں کے والدین انہیں ہمارے گھر آنے نہیں دیتے۔“

ایک بار اس کی امی نے اس کی شکایت پر کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی..... ہمارے فرقے کو کیوں پسند نہیں کرتے.....“ امام کو ان کی بات پر تعجب ہوا۔

”اب یہ تو وہی لوگ بنا سکتے ہیں کہ وہ ہمارے فرقے کو کیوں پسند نہیں کرتے..... یہ تو ہمیں

غیر مسلم بھی کہتے ہیں۔“ اس کی امی نے کہا۔

”کیوں غیر مسلم کہتے ہیں۔ ہم تو غیر مسلم نہیں ہیں۔“ امام نے کچھ الجھ کر کہا۔

”ہاں بالکل۔ ہم مسلمان ہیں..... مگر یہ لوگ ہمارے نبی پر یقین نہیں رکھتے۔“ اس کی امی نے کہا۔

”کیوں.....؟“

”اب اس کیوں کا میں کیا جواب دے سکتی ہوں۔ بس یہ لوگ یقین نہیں رکھتے۔ کمز ہیں بڑے، یہ

تو انہیں قیامت کے دن ہی پتا چلے گا کہ کون سیدھے رستے پر تھا۔ ہم باہر.....“

”مگر امی! مجھ سے تو انہوں نے کبھی مذہب پر بات نہیں کی۔ پھر مذہب مسئلہ کیسے بن گیا..... اس

سے کیا فرق پڑتا ہے پھر دوسرے کے گھر آنے جانے سے کیا ہوتا ہے۔“ امام ابھی ابھی ہوئی تھی۔

”یہ بات انہیں کون سمجھائے..... یہ لوگ ہمیں جھوٹا کہتے ہیں، حالانکہ خود انہیں ہمارے بارے

میں کچھ پتا نہیں..... بس مولویوں کے کہنے میں آکر ہم پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ انہیں ہمارے بارے میں

اور ہمارے نبی کی تعلیمات کے بارے میں کچھ پتا ہو تو یہ لوگ اس طرح نہ کریں۔ شاید پھر انہیں کچھ

شعور آجائے..... اور یہ لوگ بھی ہماری طرح راہ ہدایت پر آجائیں۔ تمہاری فرینڈز اگر تمہارے گھر

نہیں آتیں تو تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم بھی ان کے گھر مت جایا کرو۔“

”مگر امی! ان کی غلط فہمیاں تو دور ہونا چاہئیں میرے بارے میں۔“ امام نے ایک بار پھر کہا۔

”یہ کام تم نہیں کر سکتیں۔ ان لوگوں کے ماں باپ مسلسل اپنے بچوں کی ہمارے خلاف برین واشنگ

کرتے رہتے ہیں۔ ان کے دلوں میں ہمارے خلاف زہر بھرتے رہتے ہیں۔“

”نہیں امی! وہ میری بیٹ فرینڈز ہیں۔ ان کو میرے بارے میں اس طرح نہیں سوچنا چاہئے۔

میں ان لوگوں کو اپنی کتابیں پڑھنے کے لئے دوں گی، تاکہ ان کے دل سے میرے بارے میں یہ غلط فہمیاں

دور ہو سکیں، پھر ہو سکتا ہے یہ ہمارے نبی کو بھی مان جائیں۔“ امام نے کہا۔ اس کی امی کچھ سوچ میں

پڑ گئیں۔

”آپ کو میری تجویز پسند نہیں آتی؟“

”ایسا نہیں ہے..... تم ضرور انہیں اپنی کتابیں دو..... مگر اس طریقے سے نہیں کہ انہیں یہ لگے کہ

تم اپنے فرقہ کی ترویج کے لئے انہیں یہ کتابیں دے رہی ہو۔ تم انہیں یہ کہہ کر کتابیں دینا کہ تم چاہتی ہو وہ ہمارے بارے میں جانیں۔ ہم کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکیں اور ان سے یہ بھی کہنا کہ ان کتابوں کا ذکر وہ اپنے گھروالوں سے نہ کریں۔ ورنہ وہ لوگ زیادہ ناراض ہو جائیں گے۔" امام نے ان کی بات پر سر ہلادیا۔

☆.....☆.....☆

اس کے چند دنوں بعد امام اسکول میں کچھ کتابیں لے گئی تھی۔ بربک کے دور ان وہ جب گراؤنڈ میں آکر بیٹھیں تو امام اپنے ساتھ وہ کتابیں بھی لے آئی۔

"میں تمہارے اور جویریہ کے لئے کچھ لے کر آئی ہوں۔"

"کیا لائی ہو دکھاؤ؟" امام نے شاپر سے وہ کتابیں نکال لیں اور انہیں دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے ان دونوں کی طرف بڑھا دیا۔ وہ دونوں ان کتابوں پر ایک نظر ڈالنے ہی کچھ چپ سی ہو گئیں۔ جویریہ نے امام سے کچھ نہیں کہا مگر تحریم یک دم کچھ اکھڑ گئی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے سرد مہری سے پوچھا۔

"یہ کتابیں میں تمہارے لئے لائی ہوں۔" امام نے کہا۔

"کیوں.....؟"

"تاکہ تم لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہو سکیں۔"

"کس طرح کی غلط فہمیاں؟"

"وہی غلط فہمیاں جو تمہارے دل میں، ہمارے مذہب کے بارے میں ہیں۔" امام نے کہا۔

"تم سے کس نے کہا کہ ہمیں تمہارے مذہب یا تمہارے نبی کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں ہیں؟"

تحریم نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں خود اندازہ کر سکتی ہوں۔ صرف اسی وجہ سے تو تم لوگ ہمارے گھر نہیں آتے۔ تم لوگ شاید یہ سمجھتے ہو کہ ہم لوگ مسلمان نہیں ہیں یا ہم لوگ قرآن نہیں پڑھتے یا ہم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر نہیں مانتے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم لوگ ان سب چیزوں پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہمارا بھی ایک نبی ہے اور وہ بھی اسی طرح قابل احترام ہے جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔" امام نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

تحریم نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابیں اسے واپس تھما دیں۔ "ہمیں تمہارے اور تمہارے مذہب کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ ہم تمہارے مذہب کے بارے میں ضرورت سے زیادہ

جانتے ہیں۔ اس لئے تم کو کوئی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے بڑے روکے لہجے میں امام سے کہا۔ "اور جہاں تک ان کتابوں کا تعلق ہے تو میرے اور جویریہ کے پاس اتنا بے کار وقت نہیں ہے کہ ان احکامات و عموماً، خوش فہمیوں اور گمراہی کے اس پلندے پر مضامین لکھیں جسے تم اپنی کتابیں کہہ رہی ہو۔" تحریم نے ایک جھٹکے کے ساتھ رابعہ کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابیں کھینچ کر انہیں بھی امام کے ہاتھ میں تھما دیا۔ امام کا چہرہ غصت اور شرمندگی سے سرخ پڑ گیا۔ اسے تحریم سے اس طرح کے تبصرے کی توقع نہیں تھی اگر ہوتی تو وہ کبھی اسے وہ کتابیں دینے کی حماقت ہی نہ کرتی۔

"اور جہاں تک اس احرام کا تعلق ہے تو اس نبی میں جس پر نبوت کا نزول ہوتا ہے اور اس نبی میں جو خود بخود نبی ہونے کی خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ تم لوگوں کو اگر قرآن پر واقعی یقین ہوتا تو تمہیں اس کے ایک ایک حرف پر یقین ہوتا۔ نبی ہونے میں اور نبی بننے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"تحریم اتم میری اور میرے فرقہ کی بے عزتی کر رہی ہو۔" امام نے آنکھوں میں امدتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ کہا۔

"میں کسی کی بے عزتی نہیں کر رہی۔ میں صرف حقیقت بیان کر رہی ہوں، وہ اگر تمہیں بے عزتی لگتی ہے تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کر سکتی۔" تحریم نے دونوں کندھوں میں کہا۔

"روزہ رکھنے میں اور بھوکے رہنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ قرآن پڑھنے اور اس پر ایمان لانے میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ بہت سارے عیسائی اور ہندو بھی اسلام کے بارے میں جاننے کے لئے قرآن پاک پڑھتے ہیں تو کیا انہیں مسلمان مان لیا جاتا ہے اور بہت سے مسلمان بھی دوسرے مذہب کے بارے میں جاننے کے لئے دوسری الہامی کتابیں پڑھتے ہیں تو کیا وہ غیر مسلم ہو جاتے ہیں اور تم لوگ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغمبر مانتے ہو تو کوئی احسان نہیں کرتے۔ تم ان کی نبوت کو جھٹلاؤ گے تو اور کیا کیا جھٹلاؤ گے، پھر تو انجیل کو بھی جھٹلانا پڑے گا، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی خوش خبری دی گئی ہے، پھر تو تورات کو بھی جھٹلانا پڑے گا جس میں ان کی نبوت کی بات کی گئی ہے، پھر قرآن پاک کو بھی جھٹلانا پڑے گا جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری نبی قرار دیتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر تمہارا نبی، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو جھٹلاتا تو وہ ان مناظروں کی کیا توجیہ پیش کرتا جو وہ نبوت کا دعویٰ کرنے سے پہلے کئی سال عیسائی پادریوں سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور اسلام کے آخری دین ہونے پر کرتا رہا تھا۔ اس لئے امام ہاشم اتم ان چیزوں کے بارے میں بحث کرنے کی کوشش مت کرو جن کے بارے میں تمہیں سرے سے کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ تمہیں نہ اس مذہب کے بارے میں پتا ہے جس پر تم چل رہی ہو اور نہ اس کے بارے میں جس پر تم بات کر رہی ہو۔"

تحریم نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”اور میں ایک چیز بتا دوں تمہیں..... دین میں کوئی جبر نہیں ہوتا..... تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے حتمی ہونے کا انکار کرتے ہو تو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”مگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر یقین رکھتے ہیں۔“ امام نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”تو پھر ہم بھی انجیل پر یقین رکھتے ہیں، اسے الہامی کتاب مانتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر یقین رکھتے ہیں تو کیا ہم کرکچن ہیں.....؟ اور ہم تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت پر بھی یقین رکھتے ہیں تو کیا پھر ہم یہودی ہیں؟“ تحریم نے کچھ متحضر سے کہا ”لیکن ہمارا دین اسلام ہے، کیونکہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکار ہیں اور ہم ان پیغمبروں پر یقین رکھنے کے باوجود نہ عیسائیت کا حصہ ہیں نہ یہودیت کا، بالکل اسی طرح تم لوگوں کا نبی ہے کیونکہ تم اس کے پیروکار ہو۔ ویسے تم لوگ تو ہمیں بھی مسلمان نہیں سمجھتے۔ ابھی تم اصرار کر رہی ہو کہ تم اسلام کا ایک فرقہ ہو..... جب کہ تمہارے نبی اور اس کے بعد آنے والے تمہاری جماعت کے تمام لیڈرز کا دعویٰ ہے کہ جو مرزا کی نبوت پر یقین نہیں رکھتا وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ تو اسلام سے تو تم لوگ تمام مسلمانوں کو پہلے ہی خارج کر چکے ہو.....“

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے..... میں نے ایسا کب کہا ہے؟“ امام نے قدرے لاکھڑائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تو پھر تم اپنے والد صاحب سے ذرا اس معاملے کو ڈسکس کرنا..... وہ تمہیں خاصی اپ ٹوڈیٹ انفارمیشن دیں گے اس بار سے میں..... تمہارے مذہب کے خاصے سرکردہ رہنما ہیں وہ.....“ تحریم نے کہا ”اور یہ جو کتابیں تم ہمیں پیش کر رہی ہو..... انہیں خود پڑھا ہے تم نے..... نہیں پڑھا ہو گا..... ورنہ تمہیں پتا ہوتا ان سرکردہ رہنماؤں کے بارے میں۔“

جو یہ تحریم کی اس ساری گفتگو کے دوران خاموش رہی تھی، وہ صرف کن اکھیوں سے امام کو دیکھتی رہی تھی۔ ”اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے آخری نبی ہیں اور میرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر گواہی دیتے ہیں کہ وہ اللہ کے آخری نبی ہیں اور میری کتاب مجھ تک یہ دونوں باتیں بہت صاف واضح اور دو ٹوک انداز میں پہنچا دیتی ہے تو پھر مجھے کسی اور شخص کے ثبوت اور اعلان کی ضرورت نہیں ہے..... سمجھیں۔“

تحریم نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”بہتر ہے تم اپنے مذہب کو یا میرے مذہب کو زیر بحث لانے کی کوشش نہ کرو۔ اتنے سالوں سے

دوستی چل رہی ہے، چلنے دو.....“

”جہاں تک تمہارے گھر نہ آنے کا تعلق ہے تو ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے کہ میرے والدین کو تمہارے گھر آنا پسند نہیں ہے۔ یہاں اسکول میں تم سے دوستی اور بات ہے۔ بہت سے لوگوں سے دوستی ہوتی ہے ہماری اور دوستی میں عام طور پر مذہب آڑے نہیں آتا لیکن گھر میں آنا جانا..... کچھ مختلف چیز ہے..... انہیں شاید میری کسی عیسائی یا یہودی یا ہندو دوست کے گھر جانے پر اعتراض نہ ہو لیکن تمہارے گھر جانے پر ہے..... کیونکہ وہ لوگ اپنے مذہب کو مانتے ہیں وہ اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہتے جس مذہب سے تعلق ہوتا ہے وہی بتاتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بتانا تم لوگوں کو ناپسند کیا جاتا ہے اتنا ان لوگوں کو نہیں کیا جاتا کیونکہ تم لوگ صرف پیسے کے حصول اور اچھے مستقبل کے لئے یہ نیا مذہب اختیار کر کے ہمارے دین میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہو، مگر کرکچن، ہندو یا یہودی ایسا نہیں کرتے۔“

امام نے بے اختیار اسے ٹوکا۔ ”کس پیسے کی بات کر رہی ہو تم.....؟ تم ہماری فیملی کو جانتی ہو..... ہم لوگ شروع سے ہی بہت امیر ہیں۔ ہمیں کون سا روپیہ مل رہا ہے اس مذہب پر رہنے کے لئے۔“

”ہاں تم لوگ اب بڑے خوشحال ہو، مگر شروع سے تو ایسے نہیں تھے۔ تمہارے دادا مسلمان مگر غریب آدمی تھے۔ وہ کاشت کاری کیا کرتے تھے اور ایک چھوٹے سے کاشت کار تھے۔ ربوہ سے کچھ فاصلے پر ان کی تھوڑی بہت زمین تھی پھر تمہارے تایا نے اپنے کسی دوست کے توسط سے وہاں جانا شروع کر دیا اور یہ مذہب اختیار کر لیا اور بے تحاشا امیر ہو گئے کیونکہ انہیں وہاں سے بہت زیادہ پیسہ ملا پھر آہستہ آہستہ تمہارے والد اور تمہارے چچا نے بھی اپنا مذہب بدل لیا پھر تم لوگوں کا خاندان اس ملک کے معمول ترین خاندانوں میں شمار ہونے لگا اور یہ کام کرنے والے تم لوگ واحد نہیں ہو زیادہ تر اسی طریقے سے لوگوں کو اس مذہب کا پیر و کار بنایا جا رہا ہے۔“

امام نے کچھ بھڑکتے ہوئے اس کی بات کو کاٹا ”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“

”تمہیں یقین نہیں آ رہا تو تم اپنے گھر والوں سے پوچھ لینا کہ اس قدر دولت کس طرح آئی ان کے پاس..... اور ابھی بھی کس طرح آ رہی ہے۔ تمہارے والد اس مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ہر سال لاکھوں ڈالرز آتے ہیں، انہیں غیر ملکی مشنز اور این جی او ز سے.....“ تحریم نے کچھ حقیر آمیز انداز میں کہا۔

”یہ جھوٹ ہے، سفید جھوٹ۔“ امام نے بے اختیار کہا۔ ”میرے بابا کسی سے کوئی پیسہ نہیں لینے۔ وہ اگر اس فرقہ کے لئے کام کرتے ہیں، تو غلط کیا ہے۔ کیا دوسرے فرقوں کے لئے کام نہیں کیا جاتا۔ دوسرے فرقوں کے بھی تو علماء ہوتے ہیں یا ایسے لوگ جو انہیں سپورٹ کرتے ہیں۔“

”دوسرے فرقوں کو یورپی مشنز سے روپیہ نہیں ملتا۔“

”میرے بابا کو کہیں سے کچھ نہیں ملتا۔“ امام نے ایک بار پھر کہا۔ تحریم نے اس کی بات کے

جو اب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

امام نے اسے جاتے ہوئے دیکھا پھر گردن موڑ کر اپنے پاس بیٹھی جو یہ کہنے کی طرف دیکھا۔

”کیا تم بھی میرے بارے میں ایسا ہی سوچتی ہو؟“

”تحریم نے غصہ میں آکر تم سے یہ سب کچھ کہا ہے۔ تم اس کی باتوں کا برا مت مانو۔“ جو یہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”تم ان سب باتوں کو چھوڑو..... آؤ کلاس میں چلتے ہیں، بریک ختم ہونے والی ہے۔“ جو یہ نے کہا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

اس دن وہ واپس گھر آکر اپنے کمرے میں بند ہو کر روتی رہی۔ تحریم کی باتوں نے اسے واقعی بہت دل برداشتہ اور مایوس کیا تھا۔

ہاشم مبین احمد اس دن شام کو ہی آفس سے گھر واپس آگئے تھے۔ واپس آنے پر انہیں سہیلی سے پتا چلا کہ امام کی طبیعت خراب ہے۔ وہ اس کا حال احوال پوچھنے اس کے کمرے میں چلے آئے۔ امام کی آنکھیں سوئی ہوئی تھیں۔ ہاشم مبین حیران رہ گئے۔

”کیا بات ہے امام؟“ انہوں نے امام کے قریب آکر پوچھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور کچھ بہانہ کرنے کے بجائے بے اختیار رونے لگی۔ ہاشم کچھ پریشان ہو کر اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئے۔

”کیا ہوا امام؟“

”تحریم نے آج اسکول میں مجھ سے بہت بد تمیزی کی ہے۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔

ہاشم مبین نے بے اختیار ایک اطمینان بھری سانس لی۔ ”پھر کوئی جھگڑا ہوا ہے تم لوگوں میں؟“

”بابا! آپ کو نہیں پتا اس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟“ امام نے باپ کو مطمئن ہوتے دیکھ کر کہا۔

”بابا! اس نے.....“ وہ باپ کو تحریم کے ساتھ ہونے والی تمام گفتگو بتاتی گئی۔ ہاشم مبین کے چہرے کی رنگت بدلتے گئی۔

”تم سے کس نے کہا تھا۔ تم اسکول کتابیں لے کر جاؤ، انہیں پڑھانے کے لئے؟“ انہوں نے امام کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”میں ان کی غلط فہمیاں دور کرنا چاہتی تھی۔“ امام نے قدرے کمزور لہجے میں کہا۔

”تمہیں ضرورت ہی کیا تھی کسی کی غلط فہمیاں دور کرنے کی۔ وہ ہمارے گھر نہیں آئیں تو نہ آئیں۔ ہمیں برا سمجھتی ہیں تو سمجھتی رہیں، ہمیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ ہاشم مبین نے اسے سمجھاتے

ہوئے کہا۔

”مگر اب تمہاری اس حرکت سے پتا نہیں وہ کیا سمجھے گی۔ کس کس کو بتائے گی کہ تم نے اسے وہ کتابیں دینے کی کوشش کی۔ خود اس کے گھر والے بھی ناراض ہوں گے۔ امام! ہر ایک کو یہ بتاتے نہیں پھرتے کہ تم کیا ہو۔ نہ ہی اپنے فرقہ کے بارے میں بحث کرتے ہیں اگر کوئی بحث کرنے کی کوشش بھی کرے تو ہاں میں ہاں ملادیتے ہیں ورنہ لوگ خواہ مخواہ فضول طرح کی باتیں کرتے ہیں اور فضول طرح کے شبہات میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔“ انہوں نے سمجھایا۔

”مگر بابا! آپ بھی تو بہت سارے لوگوں کو تبلیغ کرتے ہیں؟“ امام نے کچھ اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔ ”پھر مجھے کیوں منع کر رہے ہیں؟“

”میری بات اور ہے میں صرف ان ہی لوگوں سے مذہب کی بات کرتا ہوں جن سے میری بہت بے تکلفی ہو چکی ہوتی ہے اور جن کے بارے میں مجھے یہ محسوس ہو کہ ان پر میری ترقیب اور تبلیغ کا اثر ہو سکتا ہے۔ میں دو چار دن کی ملاقات میں کسی کو کتابیں یا ثنا شروع نہیں ہو جاتا۔“ ہاشم مبین نے کہا۔

”بابا! ان سے میری دوستی دو چار دن کی نہیں ہے۔ ہم کئی سالوں سے دوست ہیں۔“ امام کو اعتراض ہوا۔

”ہاں مگر وہ دونوں سید ہیں اور دونوں کے گھرانے بہت مذہبی ہیں۔ تمہیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے تھی۔“

”میں نے تو صرف انہیں اپنے فرقے کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ ہمیں غیر مسلم تو نہ سمجھیں۔“ امام نے کہا۔

”اگر وہ ہمیں غیر مسلم سمجھتے ہیں تو بھی ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ خود غیر مسلم ہیں۔“ ہاشم مبین نے بڑی عقیدت سے کہا۔ ”وہ تو خود گمراہی کے راستے پر ہیں۔“

”بابا وہ کہہ رہی تھی کہ آپ کو غیر ملکی مشین سے روپیہ ملتا ہے۔ این جی اوڈ سے روپیہ ملتا ہے تاکہ آپ لوگوں کو ہمارے فرقہ کا پیر و کار بنائیں۔“

ہاشم مبین نے تنفر سے گردن کو جھٹکا۔ ”مجھے صرف اپنی جماعت سے روپیہ ملتا ہے اور وہ بھی وہ روپیہ ہوتا ہے جو ہماری اپنی کیونٹی، اندرون ملک اور بیرون ملک اکٹھا کرتی ہے۔ ہمارے پاس اپنے روپے کی کیا کمی ہے۔ ہماری اپنی ٹیکسٹریز نہیں ہیں کیا اور اگر مجھے غیر ملکی مشین اور این جی اوڈ سے روپیہ ملے بھی تو میں بڑی خوشی سے لوں گا، آخر اس میں برائی کیا ہے۔ دین کی خدمت کر رہا ہوں اور جہاں تک اپنے مذہب کی ترویج و تبلیغ کی بات ہے تو اس میں بھی کیا برائی ہے۔ اگر اس ملک میں جیسا سائیت کی تبلیغ ہو سکتی ہے تو ہمارے فرقے کی کیوں نہیں۔ ہم تو ویسے بھی اسلام کا ایک فرقہ ہیں۔ لوگوں کو راہ ہدایت پر

لانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ہاشم مبین نے بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا۔

”مگر تم لوگوں سے اس معاملے پر بات مت کیا کرو۔ اس بحث مباحثے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ابھی ہم لوگ اقلیت میں ہیں جب اکثریت میں ہو جائیں گے تو پھر اس طرح کے لوگ اتنی بے خوفی کے ساتھ اس طرح بڑھ بڑھ کر بات نہیں کر سکیں گے پھر وہ اس طرح ہماری تبدیل کرتے ہوئے ڈریں گے مگر فی الحال ایسے لوگوں کے منہ نہیں لگنا چاہئے۔“

”ہا! آئین میں ہمیں اقلیت اور غیر مسلم کیوں قرار دیا گیا ہے۔ جب ہم اسلام کا ایک فرقہ ہیں تو پھر انہوں نے ہمیں غیر مسلم کیوں ٹھہرایا ہے؟“ امامہ کو تحریم کی کمی ہوئی ایک اور بات یاد آئی۔

”یہ سب مولویوں کی کارستانی تھی۔ اپنے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے وہ سب ہمارے خلاف اٹھتے ہو گئے تھے۔ ہماری تعداد بھی زیادہ ہو جائے گی تو ہم بھی اپنی مرضی کے قوانین بنوائیں گے اور اس طرح کی تمام تر مہمات کو آئین میں سے ہٹا دیں گے۔“ ہاشم مبین نے پر جوش انداز میں کہا۔ ”اور تمہیں اس طرح بے وقوفوں کی طرح کمرے میں بند ہو کر رونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ہاشم مبین نے اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا، امامہ انہیں وہاں سے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

تحریم کے ساتھ وہ اس کی دوستی کا آخری دن تھا اور اس میں تحریم سے زیادہ خود اس کا رویہ وجہ تھا۔ وہ تحریم کی باتوں سے اس حد تک دل برداشتہ ہوئی تھی کہ اب تحریم کے ساتھ دوبارہ پہلے سے تعلقات قائم رکھنا اس کے لئے مشکل ہو گیا تھا۔ خود تحریم نے بھی اس کی اس خاموشی کو پھلانگتے یا توڑنے کی کوشش نہیں کی۔

ہاشم مبین احمدی جماعت کے سرکردہ رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ ان کے بڑے بھائی اعظم مبین احمد بھی جماعت کے اہم رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ ان کے پورے خاندان میں سے چند ایک کو چھوڑ کر باقی تمام افراد بہت سال پہلے اس وقت قادیانیت اختیار کر گئے تھے جب اعظم مبین احمد نے اس کام کا آغاز کیا تھا جن لوگوں نے قادیانیت اختیار نہیں کی تھی وہ باقی لوگوں سے قطع تعلق کر چکے تھے۔

اپنے بڑے بھائی اعظم مبین کے نقش قدم پر چلنے ہوئے ہاشم مبین نے بھی یہ مذہب اختیار کر لیا۔ اعظم مبین ہی کی طرح انہوں نے اپنے مذہب کے فروغ اور تبلیغ کے لئے کام کرنا بھی شروع کر دیا۔ دس پندرہ سالوں میں وہ دونوں بھائی اس تحریک کے سرکردہ رہنماؤں میں شمار ہونے لگے۔ اس کی وجہ سے انہوں نے بے تحاشا پیسہ کمایا اور اس پیسے سے انہوں نے سرمایہ کاری بھی کی مگر ان کی آمدنی کا بڑا زریعہ تحریک کی تبلیغ کے لئے میسر ہونے والے فنڈز ہی تھے۔ ان کا شمار اسلام آباد کی ایلٹ کلاس میں ہوتا تھا۔ بے تحاشا دولت ہونے کے باوجود ہاشم اور اعظم مبین کے گھر کا ماحول رواجی تھا۔ ان کی خواتین باقاعدہ پرہیزگار تھیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ان خواتین پر ناروا پابندیاں یا کسی قسم کا جبر روا رکھا گیا

تھا۔ اس مذہب کی خواتین میں تعلیم کا تناسب پاکستان میں کسی بھی مذہب کے مقابلے میں ہمیشہ ہی زیادہ رہا ہے۔ ان لوگوں نے اعلیٰ تعلیم بھی مصروف اداروں سے حاصل کی۔

امامہ بھی اسی قسم کے ماحول میں پئی بڑھی تھی۔ وہ یقیناً ان لوگوں میں سے تھی جو منہ میں سونے کا پتھر لے کر پیدا ہوئے ہیں اور اس نے ہاشم مبین کو کبھی کسی قسم کے مالی مسائل سے گزرتے نہیں دیکھا۔ سبھی وجہ تھی کہ اس کے لئے تحریم کی یہ بات ناقابل یقین تھی کہ اس کے خاندان نے پیسہ حاصل کرنے کے لئے یہ مذہب اختیار کیا۔ غیر ملکی مشنز اور بیرون ملک سے ملنے والے فنڈز کا الزام بھی اس کے لئے ناقابل قبول تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ ایک ایسی کلاس سے تعلق رکھتی ہے جس کا لمبا چوڑا کاروبار تھا اور اگرچہ وہ یہ بات بھی جانتی تھی کہ ہاشم مبین اس مذہب کی تبلیغ اور ترویج کرتے ہیں اور تحریم کے سرکردہ رہنماؤں میں سے ایک ہیں مگر یہ کوئی خلاف معمول بات نہیں تھی۔ وہ شروع سے ہی اس سلسلے میں اپنے تایا اور والد کی سرگرمیوں کو دیکھتی آ رہی تھی۔ اس کے نزدیک یہ ایک ایسا کام تھا جو وہ ”اسلام“ کی تبلیغ و ترویج کے لئے کر رہے تھے۔

اپنے گھروالوں کے ساتھ وہ کئی بار مذہبی اجتماع میں بھی جا چکی تھی اور سرکردہ رہنماؤں کے لندن سے سلاطنت کے ذریعے ہونے والے خطبات کو بھی باقاعدگی سے سنتی اور دیکھتی آ رہی تھی۔ تحریم کے ساتھ ہونے والے جھگڑے سے پہلے بھی اس نے اپنے مذہب کے بارے میں غور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے لئے اپنا فرقہ ایسا ہی تھا جیسے اسلام کا کوئی دوسرا فرقہ۔ اس کی برین واشنگ بھی اسی طرح کی گئی تھی کہ وہ سمجھتی تھی کہ صرف وہی سیدھے راستے پر تھے بلکہ وہی جنت میں جائیں گے۔

اگرچہ گھر میں بہت شروع میں ہی اسے باقی بہن بھائیوں کے ساتھ یہ نصیحت کر دی گئی تھی کہ وہ باوجود لوگوں کو یہ نہ بتائیں کہ وہ دراصل کیا ہیں۔ اسکول میں تعلیم کے دوران ہی وہ یہ بھی جان گئی تھی کہ ۱۹۷۳ء میں انہیں پارلیمنٹ نے ایک غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا تھا وہ سمجھتی تھی کہ یہ مذہبی داؤ میں آ کر کیا جانے والا ایک سیاسی فیصلہ ہے، مگر تحریم کے ساتھ ہونے والے جھگڑے نے اسے اپنے مذہب کے بارے میں غور کرنے اور سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

تحریم سے ہونے والے جھگڑے کے بعد ایک تبدیلی جو اس میں آئی وہ اپنے مذہب کا مطالعہ تھا۔ تبلیغی مواد کے علاوہ اور ان کتابوں کے علاوہ جنہیں اس مذہب کے ماننے والے مقدس سمجھتے تھے اس نے اور بھی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا اور بنیادی طور پر اسی زمانے میں اس کی آنجنوں کا آغاز ہوا مگر کچھ عرصہ مطالعہ کے بعد اس نے ایک بار پھر ان آنجنوں اور اضطراب کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ میٹریک کے فوراً بعد مسجد سے اس کی منگنی ہو گئی وہ اعظم مبین کا بیٹا تھا۔ یہ اگرچہ کوئی محبت کی منگنی نہیں تھی مگر اس کے باوجود امامہ اور اس کی پسند اس رشتہ کا باعث بنی تھی۔ نسبت ملنے ہونے کے بعد

اجہد کے لئے امامہ کے دل میں خاص جگہ بن گئی تھی۔

اپنی پسند کے شخص سے نسبت کے بعد اس کا دوسرا ہارگٹ میڈیکل میں ایڈمیشن تھا اور اسے اس کے بارے میں زیادہ فکر نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے باپ کی پہنچ اتنی ہے کہ اگر وہ میرٹ پر نہ بھی ہوئی تب بھی وہ اسے میڈیکل کالج میں داخل کروا سکتے تھے اور اگر یہ ممکن نہ ہوتا تو بھی وہ بیرون ملک جا کر میڈیکل کی تعلیم حاصل کر سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

”تم پچھلے کچھ دنوں سے بہت پریشان ہو، کوئی پرالم ہے؟“ وسیم نے اس رات امامہ سے پوچھا۔ وہ پچھلے کچھ دن سے بہت زیادہ خاموش اور اُنہمی اُنہمی نظر آ رہی تھی۔

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ تمہارا وہم ہے۔“ امامہ نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”خیر وہم تو نہیں، کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور۔ تم بتانا نہیں چاہتیں تو اور بات ہے۔“ وسیم نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ وہ امامہ کے ڈبل بیڈ پر اس سے کچھ فاصلے پر لیٹا ہوا تھا اور وہ اپنی فائل میں رکھے نوٹس اُلٹ پلٹ رہی تھی۔ وسیم کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔

”میں نے ٹھیک کہا، تم بتانا نہیں چاہتیں؟“

”ہاں، میں فی الحال بتانا نہیں چاہتی۔“ امامہ نے ایک گھر اسانس لے کر اعتراف کیا۔

”بتاؤ، ہو سکتا ہے میں تمہاری مدد کر سکوں۔“ وسیم نے اسے آسایا۔

”وسیم! میں خود تمہیں بتا دوں گی مگر فی الحال نہیں اور اگر مجھے مدد کی ضرورت ہوگی تو میں خود تم سے کہوں گی۔“ اس نے اپنی فائل بند کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی، میں تو صرف تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔“ وہ بیڈ سے اٹھ گیا۔

وسیم کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ واقعی جو یہ کہنے کے ساتھ اس دن ہونے والے جھگڑے کے بعد سے پریشان تھی۔ اگرچہ جو یہ نے اگلے دن اس سے معذرت کر لی تھی مگر اس کی اُنہمن اور اضطراب میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ جو یہ کی باتوں نے اسے بہت پریشان کر دیا تھا۔ ایک ڈیڑھ سال پہلے تحریم کے ساتھ ہونے والا جھگڑا اسے ایک بار پھر یاد آنے لگا تھا اور اس کے ساتھ ہی اپنے مذہب کے بارے میں اُبھرنے والے سوالات اور اُنہمنیں بھی جو اس نے اپنے مذہب کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد اپنے ذہن میں محسوس کی تھیں۔ جو یہ نے کہا تھا ”میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ کاش تم مسلمان ہو تیں۔“

”مسلمان ہوتی؟“ وہ عجیب سی بے یقینی میں جتا ہو گئی تھی۔ ”کیا میں مسلمان نہیں ہوں؟ کیا میری بہترین دوست بھی مجھے مسلمان نہیں مانتی؟ کیا یہ سب کچھ صرف اس پر دیکھنے کی وجہ سے ہے جو ہمارے

بارے میں کیا جاتا ہے؟ آخر ہمارے ہی بارے میں یہ سب کچھ کیوں کہا جاتا ہے؟ کیا ہم لوگ واقعی کوئی غلط کام کر رہے ہیں؟ کسی غلط عقیدے کو اختیار کر بیٹھے ہیں؟ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے، آخر میرے گھر والے ایسا کیوں کریں گے اور پھر ہماری ساری کیونٹی ایسا کیوں کرے گی؟ اور شاید یہ ان سوالوں سے نجات پانے کی ایک کوشش تھی کہ ایک بیٹھے کے بعد اس نے ایک بہت بڑے عالم دین کی قرآن پاک کی تفسیر خریدی۔ وہ جانتا چاہتی تھی کہ ان کے بارے میں دوسرے فریق کا موقف کیا تھا۔ قرآن پاک کا ترجمہ وہ اس سے پہلے بھی پڑھتی رہی تھی مگر وہ تحریف شدہ حالت میں تھا۔ اسے اس سے پہلے اس بات کا یقین نہیں تھا کہ، جو قرآن وہ پڑھتے ہیں اس میں کچھ جگہوں پر کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں مگر اس مشہور عالم دین کی تفسیر پڑھنے کے دور ان اسے ان تبدیلیوں کے بارے میں معلوم ہو گیا جو ان کے اپنے قرآن میں موجود تھیں۔ اس نے یکے بعد دیگرے مختلف فرقوں کے اداروں سے شائع ہونے والے قرآن پاک کے نسخوں کو دیکھا۔ ان میں سے کسی میں بھی وہ تبدیلیاں نہیں تھیں جو خود ان کے قرآن میں موجود تھیں جبکہ مختلف فرقوں کی تفسیر میں بہت زیادہ فرق تھا جو ان جوں جوں وہ اپنے مذہب اور اسلام کا تقابلی مطالعہ کر رہی تھی اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ہر تفسیر میں آخری نبی پیغمبر اسلام ﷺ کو ہی ظہر لیا گیا تھا۔ کہیں بھی کسی ظنی یا امتی نبی کا کوئی ذکر یا اشارہ بھی موجود نہیں تھا۔ صحیح موعود کی حقیقت بھی اس کے سامنے آگئی تھی۔ اپنے مذہبی رہنمائی جھوٹی چیزوں میں اور حقیقت میں ہونے والے واقعات کا تضاد اسے اور بھی زیادہ چبھنے لگا تھا۔ اس کے مذہبی رہنمائے نبوت کا دعویٰ کرنے سے پہلے جن پیغمبر کے بارے میں سب سے زیادہ غیر مذہب زبان استعمال کی تھی وہ خود حضرت یحییٰ علیہ السلام ہی تھے اور بعد میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے سے پہلے یہ بھی کہا تھا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی روح کا حلول اس کے اندر ہو گیا ہے اور اگر اس دعوے کی سچائی کو مان بھی لیا جاتا تو حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنے دوبارہ نزول کے بعد چالیس سال تک زندہ رہتے اور پھر جب ان کا انتقال ہوا تو، اسلام پوری دنیا پر غلبہ پا چکا ہوتا مگر ان رہنمائی واقعات کے وقت دنیا میں اسلام کا غلبہ تو ایک طرف، خود ہندوستان میں مسلمان آزادی جیسی نعت کے لئے ترس رہے تھے۔ امامہ کو اپنے مذہبی رہنما کے گفتگو کے اس انداز پر بھی تعجب ہوتا جو اس نے اپنی مختلف کتابوں میں اپنے مخالفین یا دوسرے انبیائے کرام کے لئے اختیار کیا تھا۔ کیا کوئی نبی اس طرح کی زبان استعمال کر سکتا تھا جس طرح کی اس نبوت کے دعویٰ کرنے والے نے کی تھی۔

بہت غیر محسوس انداز میں اس کا دل اپنے مذہبی لٹریچر اور مقدس کتابوں سے اچاٹ ہونے لگا تھا۔ پہلے جیسا اعتقاد اور یقین تو ایک طرف اسے سر سے ان کی صداقت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ اس نے جو یہ سے یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ اب اپنے مذہب سے ہٹ کر دوسری کتابوں کو پڑھنے لگی تھی۔ اس کے گھر میں بھی کسی کو یہ اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کس قسم کی کتابیں گھرا کر پڑھ رہی تھی۔ اس نے انہیں اپنے

کمرے میں بہت حفاظت سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ صرف ایک دن ایسا ہوا کہ وسم اس کے کمرے میں آکر اس کی کتابوں میں سے کوئی کتاب ڈھونڈنے لگا۔ وسم کے ہاتھ سب سے پہلے قرآن پاک کی وہی تفسیر لگی تھی اور وہ جیسے دم بخور رہ گیا تھا۔

”یہ کیا ہے امام؟“ اس نے مزکر توجہ سے پوچھا۔ امام نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور دھک سے رہ گئی۔

”یہ... یہ... یہ قرآن پاک کی تفسیر ہے۔“ اس نے ایک دم اپنا زبان میں ہونے والی لاکڑاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں مگر یہ یہاں کیا کر رہی ہے۔ کیا تم اسے خرید کر لائی ہو؟“ وسم نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

”ہاں، میں اسے خرید کر لائی ہوں، مگر تم اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو؟“

”بابا کو پتہ چلے گا تو وہ کتاب فصد کریں گے، تمہیں اندازہ ہے؟“

”ہاں، مجھے اندازہ ہے، مگر مجھے یہ کوئی اتنی قابل اعتراض بات نظر نہیں آتی۔“

”آخر تمہیں اس کتاب کی ضرورت کیوں پڑی؟“ وسم نے کتاب ویز رکھ دی۔

”کیونکہ میں جانتا چاہتی ہوں کہ دوسرے عقائد کے لوگ آخر قرآن پاک کی کیا تفسیر کر رہے ہیں۔

ہمارے بارے میں، قرآن کے حوالے سے ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔“ امام نے سنجیدگی سے کہا۔

وسم ہلکی سی جھپکائی بغیر اسے دیکھتا رہا۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟“

”میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔“ امام نے پرسکون انداز میں کہا۔ ”کیا برائی ہے، اگر میں دوسرے

مذہب کے بارے میں جانوں اور ان کے قرآن پاک کی تفسیر پڑھوں۔“

”ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وسم نے ناراضی سے کہا۔

”تمہیں ضرورت نہیں ہوگی، مجھے ضرورت ہے۔“ امام نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”میں آنکھیں

بند کر کے بھی چیز پر یقین کی قائل نہیں ہوں۔“ اس نے واضح الفاظ میں کہا۔

”تو یہ تفسیر پڑھ کر تمہارے شبہات دور ہو گئے ہیں؟“ وسم نے طنز یہ لہجے میں پوچھا۔

امام نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”پہلے مجھے اپنے اعتقاد کے بارے میں شبہ نہیں تھا، اب ہے۔“

وسم اس کی بات پر ہنرک اٹھا۔ ”دیکھا، اس طرح کی کتابیں پڑھنے سے یہی ہوتا ہے۔ میں اسی لئے

تم سے کہہ رہا ہوں کہ تمہیں اس طرح کی کتابیں پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لئے ہماری

اپنی کتابیں کافی ہیں۔“

”میں نے اتنی تفاسیر دیکھی ہیں، قرآن پاک کے اتنے ترجمے دیکھے ہیں، حیرانی کی بات ہے وسم! کہیں بھی ہمارے نبی کا ذکر نہیں ہے، ہر تفسیر میں احمد سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی لیا جاتا ہے، ہمارے نبی کو نہیں اور اگر کہیں ہمارے نبی کا ذکر ہے بھی تو نبوت کے ایک جمونے دعوے دار کے طور پر۔“ امام نے اچھے ہوئے انداز میں کہا۔

”یہ لوگ ہمارے بارے میں ایسی باتیں نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔ ہمارے نبی کی نبوت کو مان لیں گے تو ہمارا اور ان کا تو اختلاف ہی ختم ہو جائے گا۔ یہ کبھی بھی اپنی تفاسیر میں سچ نہیں شائع کریں گے۔“ وسم نے تلخی سے کہا۔

”اور جو ہماری تفسیر ہے، کیا ہم نے سچ لکھا ہے اس میں۔“

”کیا مطلب؟“ وسم ٹٹکا۔

”ہمارے نبی دوسرے تفسیروں کے بارے میں غلط زبان کیوں استعمال کرتے ہیں؟“

”وہ ان لوگوں کے بارے میں اپنی بات کرتے ہیں جو ان پر ایمان نہیں لائے۔“ وسم نے کہا۔

”جو ایمان نہ لائے کیا اسے گالیاں دینی چاہئیں؟“

”ہاں، فصد کا اظہار تو کسی نہ کسی صورت میں ہوتا ہے۔“ وسم نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

”فصد کا اظہار پاپے کی کا؟“ امام کے جملے پر وہ بخود اسے دیکھنے لگا۔

”جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لوگ ایمان نہیں لائے تو انہوں نے لوگوں کو گالیاں تو نہیں

دیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لوگ ایمان نہیں لائے تھے تو انہوں نے بھی کسی کو گالیاں

نہیں دیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو ان لوگوں کے لئے بھی دعا کی جنہوں نے انہیں پتھر مارے،

جو وحی قرآن پاک کی صورت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی ہے اس میں کوئی گالی

نہیں ملتی اور جس مجموعے کو ہمارے نبی اپنے اوپر نازل شدہ صحیفہ کہتے ہیں وہ گالیوں سے بھرا ہوا ہے۔“

”امام! ہر انسان کا مزاج دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، ہر انسان الگ طرح سے ری ایکٹ کرتا

ہے۔“ وسم نے تیزی سے کہا۔ امام نے قائل نہ ہونے والے انداز میں سر ہلایا۔

”میں ہر انسان کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ میں نبی کی بات کر رہی ہوں جو شخص اپنے فصد پر قابو

نہیں رکھ سکتا وہ نبوت کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے۔ جس شخص کی زبان سے گالیاں نکلتی ہوں اس کی زبان سے

حق و صداقت کی بات نکل سکتی ہے؟ وسم! مجھے اپنے مذہب اور عقیدے کے بارے میں ابھن سی ہے۔“

وہ ایک لمحہ کے لئے ٹکی۔ ”میں نے اتنی تفاسیر میں اگر کسی امتی نبی کا ذکر پایا ہے تو وہ حضرت عیسیٰ علیہ

السلام ہیں اور میں نہیں سمجھتی کہ ہمارے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا مسیح موعود ہیں۔

نہیں... یہ وہ نہیں ہیں، جن کے آنے کے بارے میں قرآن پاک میں ذکر ہے۔“ اس بار اس

نے اپنے الفاظ کی خود ہی پر زور تردید کی۔

”تم اب اپنی بکواس بند کر لو تو بہتر ہے۔“ وسم نے ترش لہجے میں کہا۔ ”کافی فضول باتیں کر چکی ہو تم۔“

”فضول باتیں؟“ امام نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”تم کہہ رہے ہو میں فضول باتیں کر رہی ہوں۔ مسجد اقصیٰ اگر ہمارے شہر میں ہے تو پھر جو اتنے سینکڑوں سالوں سے فلسطین میں مسجد اقصیٰ ہے وہ کیا ہے۔ ایک نام کی دو مقدس جگہیں دنیا میں بنا کر خدا تو مسلمانوں کو کنفیوز نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں کو چھوڑو، یہودی، عیسائی ساری دنیا اسی مسجد کو قبلہ ازل تسلیم کرتی ہے۔ اگر کوئی نہیں کرتا تو ہم نہیں کرتے، یہ عجیب بات نہیں؟“

”امام! میں ان معاملات پر تم سے بحث نہیں کر سکتا۔ بہتر ہے تم اس مسئلے کو ہا ہا سے ڈسکس کرو۔“ وسم نے اکتا کر کہا۔ ”ویسے تم غلطی کر رہی ہو، اس طرح کی فضول بحث شروع کر کے۔ میں بابا کو تمہاری یہ ساری باتیں بتا دوں گا اور یہی کہ تم آج کل کیا پڑھ رہی ہو۔“ وسم نے جاتے جاتے دھمکانے والے انداز میں کہا۔ وہ کچھ سوچ کر اٹھنے ہوئے انداز میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ وسم کچھ دیر ناراضی کا اظہار کر کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں بیٹھنے لگی۔ وہ ہاشم مبین سے ڈرتی تھی اور جانتی تھی کہ وسم ان سے اس بات کا ذکر ضرور کرے گا۔ وہ ان کے رد عمل سے خوفزدہ تھی۔

۶۶.....۶۶.....۶۶

وسم نے ہاشم مبین کو امام کے ساتھ ہونے والی بحث کے بارے میں بتا دیا تھا مگر اس نے بہت سی ایسی باتوں کو سن کر دیا تھا جس پر ہاشم مبین کے بھڑک اٹھنے کا امکان تھا۔ اس کے باوجود ہاشم مبین دم بخود رہ گئے تھے، یوں جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

یہ سب تم سے امام نے کہا؟“ ایک لمبی خاموشی کے بعد انہوں نے وسم سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اسے بلا کر لاؤ۔“ وسم کچھ جھجکتے ہوئے ان کے کمرے سے نکل گیا۔ امام کو خود بلا کر لانے کے بجائے اس نے ملازم کے ہاتھ پیغام بھجوادیا اور خود اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ امام اور ہاشم مبین کی گفتگو کے دوران موجود رہنا نہیں چاہتا تھا۔

ہاشم مبین کے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر وہ اندر داخل ہوئی تو اس وقت ہاشم اور ان کی نیگم بالکل خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ہاشم مبین نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا اس نے اس کے جسم کی لڑش میں کچھ اور اضافہ کر دیا۔

”بابا..... آپ نے..... مجھے..... بلوایا تھا۔“ کوشش کے باوجود دور وانی سے بات نہیں کہہ سکی۔

”ہاں، میں نے بلوایا تھا۔ وسم سے کیا بکواس کی ہے تم نے؟“ ہاشم مبین نے بلا تہید بلند آواز میں اس سے پوچھا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ ”کیا پوچھ رہا ہوں تم سے؟“ وہ ایک بار پھر دھاڑے۔ ”شرم سے ڈوب مرنا چاہئے تمہیں، خود گناہ کرتی ہو اور اپنے ساتھ ہمیں بھی گناہ گار بناتی ہو۔“ امام کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”تمہیں اپنی اولاد کہتے ہوئے مجھے شرم آ رہی ہے۔ کون سی کتابیں لائی ہو تم؟“ وہ مشتعل ہو گئے تھے۔ ”جہاں سے یہ کتابیں لے کر آئی ہو، کل تک وہیں دے آؤ، ورنہ میں انہیں اٹھا کر پیچیک دوں گا باہر۔“

”جی بابا!“ اس نے اپنے آنسو پونچھے ہوئے صرف اتنا ہی کہا۔
”اور آج کے بعد اگر تم نے جو یہیہ کے ساتھ میل جول رکھا تو میں تمہارا کانچ چاہتا ہی بند کر دوں گا۔“
”بابا..... جو یہیہ نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اس کو تو کچھ پتا ہی نہیں ہے۔“ اس بار امام نے قدر سے مضبوط آواز میں احتجاج کیا۔

”تو پھر اور کون ہے جو تمہارے دماغ میں یہ خناس بھر رہا ہے؟“ وہ بری طرح چلائے۔

”میں..... خود..... ہی.....“ امام نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”ہو کیا تم، اپنی عمر دیکھو اور چلی ہو تم عقیدے جانچنے، اپنے نبی کی نبوت کو پر کھنے۔“ ہاشم مبین کا پارہ پھر بانی ہو گیا۔ ”اپنے باپ کی شکل دیکھو جس نے ساری عمر تبلیغ میں گزار دی۔ کیا میں عقل کا اندھا ہوں یا پھر تم مجھ سے زیادہ عقل رکھتی ہو۔ جو جمع چار دن ہوئے ہیں تمہیں پیدا ہوئے اور تم چل پڑی ہو اپنے نبی کی نبوت کو ثابت کرنے۔“ ہاشم مبین اب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ”تم منہ میں سونے کا بیج لے کر اسی نبی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو، جس کی نبوت کو آج تم جانچنے بیٹھ گئی ہو۔ وہ نہ ہوتا تو سڑک پر دھکے کھا رہا ہوتا ہمارا سارا خاندان اور تم اس قدر احسان فراموش اور بے خمیر ہو چکی ہو کہ جس تھالی میں کھاتی ہو اسی میں چھید کر رہی ہو۔“

ہاشم مبین کی آواز پھٹ رہی تھی۔ امام کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی رفتار میں اور اضافہ ہو گیا۔

”بند کر دو یہ لکھنا پڑھنا اور گھر بیٹھو تم ایہ تعلیم حاصل کر رہی ہو جو تمہیں گمراہی کی طرف لے جا رہی ہے۔“

ان کے اگلے جھلے پر امام کی سٹی گم ہو گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اسے گھر اٹھانے کی بات کریں گے۔

”بابا..... آئی ایم سوری۔“ ان کے ایک جھلے نے اسے گھٹنے جھکے پر مجبور کر دیا تھا۔

”مجھے تمہارے کسی ایکسکیوز کی ضرورت نہیں ہے۔ بس کہہ دیا ہے کہ گھر بیٹھو، تو گھر بیٹھو۔“

”بابا..... میں..... میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔ پتا نہیں وسیم..... اس نے آپ سے کس طرح بات کی ہے۔“ اس کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔ ”پھر بھی میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ میں آئندہ وہ ایسا کچھ نہیں پڑھوں گی، نہ ہی ایسی کوئی بات کروں گی۔ پلیز بابا!“ اس نے مت کی۔

ان معذرتوں کا سلسلہ وہیں ختم نہیں ہوا تھا، اگلے کئی دن تک وہ ہاشم مبین سے معافی مانگتی رہی اور پھر تقریباً ایک ہفتے کے بعد وہ نرم پڑ گئے تھے اور انہوں نے اسے کانچ جانے کی اجازت دے دی تھی مگر اس ایک ہفتے میں وہ اپنے پورے گھر کی لعنت ملامت کا شکار رہی تھی۔ ہاشم مبین نے اسے سخت قسم کی تنبیہ کے بعد کانچ جانے کی اجازت دی تھی مگر اس ایک ہفتے کے دوران ان لوگوں کے رویے نے اسے اپنے عقیدے سے مزید متنفر کیا تھا۔ اس نے ان کتابوں کو پڑھنے کا سلسلہ روکا نہیں تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ پہلے وہ انہیں گھر لے آتی تھی اور اب وہ انہیں کانچ کی لا بیری میں ہی پڑھ لیا کرتی تھی۔

ایف ایس سی میں میرٹ لسٹ پر آنے کے بعد اس نے میڈیکل کانچ میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ جو یہ کہ جو بھی اسی میڈیکل کانچ میں ایڈمیشن مل گیا تھا، ان کی دوستی میں اب پہلے سے زیادہ مضبوطی آگئی تھی اور اس کی بنیادی وجہ امام کے ذہن میں آنے والی تبدیلی تھی۔

☆.....☆.....☆

صبیحہ سے امام کی پہلی ملاقات اتفاقاً ہوئی تھی۔ جو یہ کہ ایک کزن صبیحہ کی کا اس فیلو تھی اور اسی کے توسط سے امام کی اس سے شناسائی ہوئی۔ وہ ایک مذہبی جماعت کے اسٹوڈنٹ ونگ سے منسلک تھی اور ہفتے میں ایک بار وہ کلاس روم میں اسلام سے متعلق کسی نہ کسی ایک موضوع پر لیکچر دیا کرتی تھی۔ چالیس پچاس کے لگ بھگ لڑکیاں اس لیکچر کو اینڈ کیا کرتی تھیں۔

صبیحہ نے اس دن ان سے متعارف ہونے کے بعد انہیں بھی اس لیکچر کے لئے انوائٹ کیا تھا۔ وہ چاروں ہی وہاں موجود تھیں۔

”میں تو ضرور آؤں گی، کم از کم میری شرکت کے بارے میں آپ تسلی رکھیں۔“ جو یہ نے صبیحہ کی دعوت کے جواب میں کہا۔

”میں کوشش کروں گی، وعدہ نہیں کر سکتی۔“ رابعہ نے کچھ جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”میرا آنا ذرا مشکل ہے کیونکہ میں اس دن کچھ مصروف رہوں گی۔“ زینب نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

صبیحہ مسکراتے ہوئے امام کو دیکھنے لگی جو اب تک خاموش تھی۔ امام کارنگ کچھ فن ہو گیا۔

”اور آپ؟ آپ آئیں گی؟“ امام کی نظر جو یہ سے ملی جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”ویسے اس بار کس موضوع پر بات کریں گی آپ؟“ اس سے پہلے کہ امام کچھ کہتی، جو یہ نے

صبیحہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ شاید ایسا اس نے دانستہ طور پر کیا تھا۔

”اس بار اسراف کے بارے میں بات ہوگی۔ اس ایک عادت کی وجہ سے ہمارا معاشرہ کتنی تیزی سے زوال پذیر ہو رہا ہے اور اس کے سدباب کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔ اسی موضوع پر گفتگو ہوگی۔“ صبیحہ نے جو یہ کو تفصیل سے بتایا۔

”آپ نے بتایا نہیں امام! آپ آرہی ہیں؟“ جو یہ سے بات کرتے کرتے صبیحہ ایک بار پھر امام کی طرف متوجہ ہو گئی۔ امام کارنگ ایک بار پھر بدلا۔ ”میں..... میں..... دیکھوں گی۔“ اس نے جھپکتے ہوئے کہا۔

”مجھے بہت خوشی ہوگی اگر جو یہ کے ساتھ آپ تینوں بھی آئیں۔ اپنے دین کی بنیادی تعلیمات کے بارے میں ہمیں روز نہیں تو کبھی کبھل کچھ علم حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ صرف میں ہی لیکچر نہیں دیتی ہوں ہم جتنے لوگ بھی اکٹھے ہوتے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے آزاد ہوتا ہے جسے ہم نے منتخب کیا ہوتا ہے اور اگر آپ میں سے بھی کوئی کسی خاص موضوع کے حوالے سے بات کرنا یا کچھ بتانا چاہے تو ہم لوگ اسے بھی ارجح کر سکتے ہیں۔“ صبیحہ بڑی سہولت سے بات کر رہی تھی پھر کچھ دیر بعد جو یہ اور اس کی کزن کے ہمراہ ان کے کمرے سے باہر چلی گئی۔

کو ریڈور میں صبیحہ نے جو یہ سے کہا: ”آپ کم از کم امام کو تو ساتھ لے آئیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ آنا چاہ رہی ہیں۔“

”اس کا عقیدہ بالکل الگ ہے، وہ کبھی بھی ایسی محفلوں میں شرکت نہیں کرے گی۔“ جو یہ نے سنجیدگی سے اسے بتایا۔ صبیحہ کچھ حیران ہوئی۔

”آپ کو چاہئے کہ آپ انہیں اسلام کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیں۔ ہو سکتا ہے اس طرح وہ صحیح اور غلطی کا فرق کر سکیں۔“ صبیحہ نے چلنے ہوئے کہا۔

”میں ایک بار ایسی کوشش کر چکی ہوں۔ وہ بہت ناراض ہو گئی تھی اور میں نہیں چاہتی کہ ہم دونوں کی اتنی لمبی دوستی اس طرح ختم ہو۔“ جو یہ نے کہا۔

”ایچھے دوست وہی ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو گمراہی سے بچائیں اور آپ پر بھی فرض ہے کہ آپ ایسا ہی کریں۔“ صبیحہ نے کہا۔

”وہ ٹھیک ہے مگر کوئی بات سننے پر بھی تیار نہ ہو تو؟“

”تب بھی صحیح بات کہتے رہنا فرض ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی دوسرا آپ کی بات پر غور کرنے پر مجبور ہو جائے۔“ صبیحہ اپنی جگہ درست تھی۔ اس لئے وہ صرف مسکرا کر رہی گئی۔

☆.....☆.....☆

اسے اندازہ نہیں تھا کہ کسی مرد کی آواز اتنی خوب صورت ہو سکتی ہے۔ اس قدر خوب صورت کہ پوری دنیا اس آواز کی قید میں لگے۔ امام نے اپنا سانس روک لیا یا شاید وہ سانس لینا بھول گئی۔

لوگ کہتے ہیں کہ سایہ تیرے بیکر کا نہ تھا

میں کہتا ہوں جہاں بھر پہ ہے سایہ تیرا

انسان کی زندگی میں کچھ ساتھیوں سے ملتی ہیں۔ شب قدر کی رات میں آنے والی اس سعادت کی طرح جسے بہت سے لوگ گزر جانے دیتے ہیں، صرف چند اس ساعت کے انتظار میں ہاتھ اٹھائے اور جموں پھیلائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس ساعت کے انتظار میں جو پھلتے پانی کو روک دے اور ٹرکے ہوئے پانی کو رواں کر دے، جو دل سے نکلنے والی دعا کو لہروں تک آنے سے پہلے مقدر بنا دے۔

امام ہاشم کی زندگی میں وہ سعادت شب قدر کی کسی رات کو نہیں آئی تھی۔ نہ اس نے اس سعادت کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے نہ جموں پھیلائی تھی پھر بھی اس نے زمین و آسمان کی گردش کو کچھ دیر کے لئے چھتے دیکھا تھا۔ پوری کائنات کو ایک گنبد بے در میں بدلتے دیکھا تھا جس کے اندر بس ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔

دست گیری میری تہائی کی تو نے ہی تو کی

میں تو مر جاتا اگر ساتھ نہ ہوتا تیرا

وہ اندھیروں سے بھی دزدانہ گزر جاتے ہیں

جن کے ماتھے پہ چمکتا ہے ستارا تیرا

آواز بہت صاف اور واضح تھی۔ امام بت کی طرح ریسیدور ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی۔

”بیٹو امام!“ دوسری طرف زینب کی آواز گونجی اور وہ آواز کم ہو گئی۔ چند لمحوں کے لئے زمین کی رکی ہوئی گردش و پارہ بھال ہو گئی۔

”بیٹو امام! آواز سن رہی ہو میری؟“ وہ ایک جھٹکے سے ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔

”ہاں، میں سن رہی ہوں۔“

”میں نے سوچا لائن کٹ گئی۔“ دوسری طرف سے زینب نے کچھ مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ امام اگلے چند منٹ اس سے بات کرتی رہی مگر اس کا دل دوہل گئی اور تھا۔

☆.....☆.....☆

جلال انصر زینب کا بڑا بھائی تھا اور امام کا ناناں طور پر اس سے واقف تھی۔ زینب اس کی کلاس فیو تھی اور اس سے امام کا تعارف وہیں میڈیکل کالج میں ہوا تھا۔ چند ماہ میں ہی یہ تعارف اچھی خاصی دوستی میں بدل گیا۔ اس تعارف میں اسے یہ پتا چلا کہ وہ لوگ چار بھائی بہن تھے۔ جلال سب سے بڑا تھا اور

باؤس چاب کر رہا تھا۔ زینب کے والد واپڈا میں انجینئر تھے اور ان کا گھرانہ خاصا مذہبی تھا۔

اسلام آباد سے واپسی پر اس نے زینب سے نعت پڑھنے والے اس شخص کے بارے میں پوچھا تھا۔

”زینب! اس رات میں نے تمہیں فون کیا تو کوئی نعت پڑھ رہا تھا، وہ کون تھا؟“ اس نے اپنے لہجے

کو حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

”وو..... وو..... جلال بھائی تھے۔ ایک مقابلہ میں حصہ لینے کے لئے وہ نعت پاد کر رہے تھے۔

فون کو ریڈور میں ہے اور ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس لئے آواز تم تک پہنچ گئی۔“ زینب نے تفصیل سے بتایا۔

”بہت اچھی آواز ہے ان کی۔“

”ہاں، آواز تو بہت اچھی ہے ان کی۔ قرأت تو نعت سے بھی زیادہ خوب صورت کرتے ہیں۔

بہت سے مقابلوں میں انعام بھی لے چکے ہیں۔ ابھی بھی کالج میں ایک مقابلہ ہونے والا ہے تم اس میں اٹھیں سننا۔“

زینب صاف یہ نہیں جانتی تھی کہ امام کس مذہب کی تھی، وہ جس طرح پردے کا خیال رکھتی تھی

زینب کا خیال تھا کہ وہ کسی مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ خود زینب بھی خاصے مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور چادر اوڑھا کرتی تھی۔

دو تین دن کے بعد امام، جلال انصر کی نعت سننے کے لئے اپنی فرینڈز کو بتائے بغیر کلاسز بنک

کر کے نعتوں کے اس مقابلے میں جلی گئی تھی۔

جلال انصر کو اس دن پہلی بار اس نے دیکھا تھا۔ کہنیز نے جلال انصر کا نام پکارا اور امام نے تیز

ہوتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ زینب سے مشابہت رکھنے والے عام سی شکل و صورت اور ڈاڑھی والے

ایک چوبیس بجیس سال لڑکے کو اسٹیج پر چڑھتے دیکھا۔ اسٹیج پر سبز صیاس چڑھنے سے لے کر وہ سٹرم کے

پہنچے آکر کھڑے ہونے تک امام نے ایک بار بھی اپنی نظر جلال انصر کے چہرے سے نہیں ہٹائی۔ اس

نے اسے سینے پر ہاتھ باندھے اور آنکھیں بند کرتے دیکھا۔

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا

اس کی دولت ہے فقط نقش کعب پا تیرا

امام کو اپنے پورے وجود میں ایک لہری دوڑتی محسوس ہوئی۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی اور صرف

اس کی خوب صورت آواز گونج رہی تھی۔ وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح بیٹھی اسے سنتی رہی۔ اس نے

کب نعت ختم کی، کب وہ اسٹیج سے اتر کر واپس ہوا، مقابلے کا نتیجہ کیا نکلا، اس کے بعد کس کس نے نعت

پڑھی، کس وقت سارے اسٹوڈنٹ وہاں سے گئے اور کس وقت ہال خالی ہو گیا امام کو پتا نہیں چلا۔

”تم جاؤ گی اس کا لیکچر سننے؟“ صبیحہ کے نکلنے کے بعد زینب نے رابعہ سے پوچھا۔
 ”نہیں، میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں ایسے لیکچر ہضم نہیں کر سکتی۔“ رابعہ نے اپنی کتابیں اٹھاتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔ امامہ، زینب اور جویریہ کے برعکس وہ قدرے آزاں خیال تھی اور زیادہ مذہبی رجحان بھی نہیں رکھتی تھی۔

”ویسے میں نے صبیحہ کی خاصی تعریف سنی ہے۔“ زینب نے رابعہ کی بات کے جواب میں کہا۔
 ”ضرور سنی ہوگی، بولتی تو واقعی اچھا ہے اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ اس کے والد بھی کسی مذہبی جماعت سے منسلک ہیں۔ ظاہر ہے پھر اثر تو ہو گا۔“ رابعہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔
 امامہ ان سے کچھ دور ایک کونے میں اپنی کتابیں لئے بیٹھی نظر ان کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھی مگر ان دونوں کی گفتگو بھی ان تک پہنچ رہی تھی۔ اس نے شکر کیا تھا کہ ان دونوں نے اسے اس گفتگو میں کھینچنے کی کوشش نہیں کی۔

تین دن کے بعد امامہ مقررہ وقت پر ان لوگوں سے کوئی بہانہ بنا کر صبیحہ کا لیکچر اینڈ کرنے جلی گئی تھی۔ رابعہ، جویریہ اور زینب تینوں ہی اس لیکچر میں نہیں گئیں پھر اس کا ارادہ بدل گیا۔ امامہ نے ان لوگوں کو یہ نہیں بتایا کہ وہ صبیحہ کا لیکچر اینڈ کرنے جا رہی تھی۔
 صبیحہ، امامہ کو دیکھ کر کچھ حیران ہوئی تھی۔

”مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے آپ کو یہاں دیکھ کر۔ مجھے آپ کے آنے کی توقع نہیں تھی۔“ صبیحہ نے اس سے گرم جوشی سے ملتے ہوئے کہا۔

یہ پہلا قدم تھا اسلام کی جانب جو امامہ نے اٹھایا تھا۔ اس سارے عرصے میں اسلام کے بارے میں اتنی کتابیں تصاویر اور تراجم پڑھ چکی تھی کہ کم از کم وہ کسی بھی چیز سے ناواقف اور انجان نہیں تھی۔ اسراف کے بارے میں اسلامی اور قرآنی تعلیمات اور احکامات سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھی مگر اس کے باوجود صبیحہ کی دعوت کو رد کرنے کے بجائے قبول کر لینے میں اس کے پیش نظر صرف ایک ہی چیز تھی۔ وہ اپنے مذہب سے اسلام تک کا وہ قاصد ملے کر چاہتی تھی، جو اسے بہت مشکل لگتا تھا۔

اور پھر وہ صرف پہلا اور آخری لیکچر نہیں تھا۔ یکے بعد دیگرے وہ اس کا ہر لیکچر اینڈ کرتی رہی۔ وہی چیزیں جنہیں وہ کتابوں میں پڑھتی رہی تھی اس کے منہ سے سن کر پراثر ہو جاتی تھیں۔ اس کی صبیحہ سے عقیدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ صبیحہ نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کے عقیدے کے بارے میں جانتی تھی مگر امامہ کو اس کے پاس آتے ہوئے دو ماہ ہوئے تھے جب صبیحہ نے ختم نبوت پر ایک لیکچر دیا۔
 ”قرآن پاک وہ کتاب ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی۔“ صبیحہ نے اپنے لیکچر کا آغاز کیا۔ ”اور قرآن پاک میں ہی اللہ نبوت کا سلسلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم کر

دیتے ہیں۔ وہ کسی دوسرے نبی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھتے۔ اگر کسی نبی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ نزول کا ذکر ہے بھی تو وہ بھی ایک نئے نبی کی شکل میں نہیں ہے بلکہ ایک ایسے نبی کا دوبارہ نزول ہے جن پر نبوت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت پہلے نازل کر دی گئی تھی اور جن کا دوبارہ نزول ان کی اپنی امت کے لئے نہیں بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے لئے ہی ہو گا اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی رہیں گے۔ کسی بھی آنے والے دور میں یا کسی بھی گزر جانے والے دور میں یہ رتبہ اور فضیلت کسی اور کو نہیں دی گئی کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ ایک پیغمبر کو یہ رتبہ اور درجہ عطا کرے اور پھر اسے اس سے چھین کر کسی دوسرے شخص کو دے دیتا۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”بات میں اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہے۔“

”تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی بات کو خود ہی رد کر دیتا اور پھر اگر اللہ کی اس بات کی گواہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود دیتے ہیں کہ ہاں وہ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور ان کے بعد دوبارہ کوئی نبی نہیں آئے گا تو پھر کیا ہمارے لئے کسی بھی طور پر یہ جائز اور مناسب ہے کہ ہم کسی دوسرے شخص کے نبوت کے دعوے پر غور تک کریں؟ انسان اللہ کی مخلوقات میں سے وہ واحد مخلوق ہے جسے عقل جیسی نعمت سے نوازا گیا اور یہ ایسی مخلوق ہے جو اسی عقل کو استعمال کر کے سوچنے پر آئے تو خود اللہ کے وجود کے لئے ثبوت کی تلاش شروع کر دیتی ہے پھر اس سلسلے کو ہمیں پر محدود نہیں رکھتی، بلکہ اسے پیغمبروں کی ذات تک دراز کر دیتی ہے۔ پہلے سے موجود پیغمبروں کی نبوت کے بارے میں سوال کرتی ہے پھر انہیں پیغمبر مان لیتی ہے اور اس کے بعد قرآن کے واضح احکامات کے باوجود زمین پر مزید پیغمبروں کی تلاش شروع کر دیتی ہے اور اس تلاش میں یہ بات فراموش کر دیتی ہے کہ نبی بنتا نہیں تھا، بنایا جاتا تھا، اسے مبعوث کیا جاتا تھا اور ہم انسانی evolution کی ان آخری رہائیوں میں کھڑے ہیں جہاں مزید نبیوں کی آمد کا سلسلہ اس لئے ختم کر دیا گیا کیونکہ انسان کے لئے ایک دین اور ایک نبی کا انتخاب کر لیا گیا۔

اب کسی نئے عقیدے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف عقیدہ کی ہے، صرف عقیدہ یعنی پرنکس..... اس ایک، آخری اور مکمل دین کی جسے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم کر دیا گیا۔ اب ہر وہ شخص خسارے میں رہے گا، جو دین کی رشتی کو مضبوطی سے تھامنے کے بجائے تفرقے کی راہ اختیار کرے گا۔ اگر ہماری اعلیٰ تعلیم اور ہمارا شعور ہمیں دین کے بارے میں صحیح اور غلط کی تمیز تک نہیں دے سکتے تو پھر ہم میں اور اس جانور میں کوئی فرق نہیں، جو سبز جازہ گھاس کے ایک گھٹے کے پیچھے کہیں بھی جاسکتا ہے، اس بات کی پروا کئے بغیر کہ اس کا ریوڈ کہاں ہے۔“

چالیس منٹ کے اس لیکچر میں صبیحہ نے کسی اور غلط عقیدے یا فرقے کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا بالواسطہ کہا تھا۔ صرف ایک چیز بلا واسطہ کہی تھی اور وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کا اقرار تھا۔ "اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جنہوں نے چودہ سو سال پہلے مدینہ میں وفات پائی۔ چودہ سو سال سے پہلے مسلمان ایک امت کے طور پر اسی ایک شخص کے سامنے میں کھڑے ہیں۔ چودہ سو سال بعد بھی ہمارے لئے وہ ایک آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جن کے بعد کوئی دوسرا نبی بھیجا گیا نہ بھیجا جائے گا اور ہر وہ شخص جو کسی دوسرے شخص میں کسی دوسرے نبی کا عکس تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے اسے ایک بار اپنے ایمان کا از سر نو جائزہ لے لینا چاہئے۔ شاید یہ کوشش اسے اس عذاب سے بچا دے جس میں وہ اپنے آپ کو جلا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

امام ہر لیکچر کے بعد صبیحہ سے مل کر چلایا کرتی تھی۔ اس لیکچر کے بعد وہ صبیحہ سے نہیں ملی۔ ایک لمحہ بھی وہاں رُکے بغیر وہ وہاں سے چلی آئی۔ عجیب سے ذہنی امتحان میں جتا ہو کر وہ کالج سے باہر نکل کر بیڈل چلتی رہی۔ کتنی دیر فٹ پاتھ پر چلتی رہی اور اس نے کتنی سڑکیں عبور کیں، اسے اندازہ نہیں ہوا۔ کسی معمول کی طرح چلتے ہوئے وہ فٹ پاتھ سے نیچے نہر کے کنارے بنی ہوئی ایک بچہ پر جا کر بیٹھ گئی۔ سورج غروب ہونے والا تھا اور اوپر سڑک پر گاڑیوں کے شور میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ چپ چاپ نہر کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھتی رہی۔

ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے بڑ بڑاتے ہوئے خود سے پوچھا۔

"آخر میں کر کیا رہی ہوں اپنے ساتھ۔ کیوں اپنے آپ کو الجھا رہی ہوں، آخر کس یقین کی کھوج میں سرگرداں ہوں اور کیوں؟ میں اس سب کے لئے تو یہاں لاہور نہیں آئی۔ میں تو یہاں ڈاکٹر بننے آئی ہوں۔ مجھے آئی اسپیشلسٹ بنانا ہے۔ پیغمبر..... پیغمبر..... پیغمبر..... میرے لئے ہر چیز وہاں کیوں ختم ہو جاتی ہے۔"

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

"مجھے اس سب سے نجات حاصل کرنی ہے، میں اس طرح اپنی اسٹڈیز پر کبھی توجہ نہیں دے سکتی۔ مذہب اور عقیدہ میرا مسئلہ نہیں ہونا چاہئے۔ صحیح یا غلط جو میرے بڑوں نے دیا وہی ٹھیک ہے۔ میں اب صبیحہ کے پاس نہیں جاؤں گی۔ میں مذہب یا پیغمبر کے بارے میں کبھی سوچوں گی بھی نہیں۔" وہاں بیٹھے بیٹھے اس نے طے کیا تھا۔

رات کو اٹھ بجے وہ واپس آئی تو جویریہ اور رابعہ کچھ فکر مند سی تھیں۔

"بس ایسے ہی مارکیٹ چلی گئی تھی۔" اس نے سستے ہوئے چہرے کے ساتھ انہیں بتایا۔

☆.....☆.....☆

"ارے امام اتم تو بہت عرصے بعد آئی ہو، آخر آنا کیوں چھوڑ دیا تم نے۔" بہت دنوں کے بعد

ایک بار پھر صبیحہ کے پاس پہنچ گئی تھی۔ صبیحہ کا لیکچر شروع ہونے ہی والا تھا۔ "مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں، آپ اپنا لیکچر ختم کر لیں، میں باہر بیٹھ کر آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔" امام نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس سے کہا۔ "ٹھیک ہے بیٹیا، چالیس منٹ کے بعد جب صبیحہ اپنا لیکچر ختم کر کے باہر نکلی تو اس نے امام کو باہر کوریڈور میں ٹھیکے ہوئے پایا۔ وہ صبیحہ کے ساتھ دوبارہ اسی کمرے میں آن بیٹھی جو اب خالی تھا۔ صبیحہ خاموشی سے اس کی طرف سے بات شروع کرنے کا انتظار کرتی رہی۔

امام چند لمبے کسی سوچ میں ڈوبی رہی پھر اس نے صبیحہ سے کہا۔

"آپ کو پتا ہے میں کس مذہب سے ہوں؟"

"ہاں، میں جانتی ہوں۔ جویریہ نے مجھے بتایا تھا۔" صبیحہ نے پرسکون انداز میں کہا۔

"میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ میں کس حد تک فرسٹریڈ ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے میں دنیا چھوڑ کر کہیں بھاگ جاؤں۔" اس نے کچھ دیر کے بعد صبیحہ سے کہنا شروع کیا۔ "میں..... میں....." اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ "مجھے پتا ہے کہ....." اس نے ایک بار پھر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی پھر خاموشی۔ "مگر میں اپنا مذہب نہیں چھوڑ سکتی۔ میں تباہ ہو جاؤں گی، میرے ماں باپ مجھے مار ڈالیں گے۔ میرا کیریئر، میرے خواب، سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ میں نے تو سرے سے عبادت کرنا تک چھوڑ دی ہے مگر پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے سکون نہیں مل رہا ہے۔ آپ میری صورت حال کو سمجھیں۔ مجھے لگ رہا ہے یہ سب کچھ غلط ہے اور صحیح کیا ہے، مجھے نہیں معلوم۔"

"امام اتم اسلام قبول کر لو۔" صبیحہ نے اس کی بات کے جواب میں صرف ایک جملہ کہا۔

"یہ میں نہیں کر سکتی، میں آپ کو بتا رہی ہوں، میں کتنے مسائل کا شکار ہو جاؤں گی۔"

"تو پھر تم میرے پاس کس لئے آئی ہو؟" صبیحہ نے اسی پرسکون انداز میں کہا۔ وہ اس کا منہ دیکھنے لگی پھر اس نے بے بسی سے کہا۔

"پتا نہیں میں آپ کے پاس کس لئے آئی ہوں؟"

"تم صرف یہی ایک جملہ سننے کے لئے آئی ہو جو میں نے تم سے کہا ہے۔ میں تمہیں کوئی دلیل نہیں دوں گی، کیونکہ تمہیں کسی سوال کے جواب کی تلاش نہیں ہے۔ ہر سوال کا جواب تمہارے اندر موجود ہے۔ تم سب جانتی ہو، بس تمہیں اقرار کرنا ہے۔ ایسا ہی ہے نا۔"

امام کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "مجھے لگ رہا ہے میرے پاؤں زمین سے اٹھ چکے ہیں۔

میں جیسے خلا میں سفر کر رہی ہوں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

صبیحہ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ بسم اللہ پڑھ رہی تھی۔ امام گیلی آنکھوں کے ساتھ

اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”کہیں کچھ بھی نظر نہیں آتا صبراً کچھ بھی نہیں۔“ اس نے اپنے ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا۔

”لا الہ الا اللہ۔“ صبراً کے لب آہستہ آہستہ ہلنے لگے۔ امام دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور دہرو تے ہوئے صبراً کے پیچھے کلمے کے الفاظ ڈہرا رہی تھی۔ ”حمد رسول اللہ۔“ امام نے اگلے الفاظ ڈہرائے۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

امام کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اسے اتار دنا کیوں آ رہا تھا۔ اسے کوئی پچھتاوا، کوئی افسوس نہیں تھا مگر پھر بھی اسے اپنے آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ بہت دیر تک روتے رہنے کے بعد اس نے جب سر اٹھایا تھا تو صبراً اس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ امام کیلے چہرے کے ساتھ اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

☆.....☆.....☆

راہجہ اور جویریہ ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہی تھیں اور امام اپنے پاؤں کے انگوٹھے کے ساتھ فرش کو رگڑتے ہوئے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”تمہیں یہ سب کچھ ہمیں پہلے ہی بتا دینا چاہئے تھا۔“ جویریہ نے ایک طویل وقفے کے بعد اس خاموشی کو توڑا۔ امام نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پرسکون انداز میں کہا۔

”اس سے کیا ہوتا؟“

”کم از کم ہم تمہارے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار تو نہ ہوتے اور تمہاری مدد کر سکتے تھے ہم دونوں۔“

امام سر جھٹکتے ہوئے جیب سے انداز میں مسکرائی۔ ”اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔“

”مجھے تو بہت خوشی ہے امام! کہ تم نے ایک صحیح راستے کا انتخاب کیا ہے۔ ویر سے سبھی مگر تم غلط راستے سے ہٹ گئی ہو۔“ جویریہ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ”تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ میں اس وقت تمہارے لئے اپنے دل میں کیا محسوس کر رہی ہوں۔“ امام چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ ”تمہیں اگر ہم دونوں کی طرف سے کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو پگچھا پگچھا، تمہاری مدد کر کے ہمیں خوشی ہوگی۔“

”مجھے واقعی تم لوگوں کی مدد کی بہت ضرورت ہے، بہت زیادہ ضرورت ہے۔“ امام نے کہا۔

”میری وجہ سے اگر تم نے اپنے مذہب کی اصلیت جانچ کر اسے چھوڑ دیا ہے تو.....“ جویریہ کہہ رہی تھی۔

امام اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ”تمہاری وجہ سے؟“ اس نے جویریہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے سوچا۔ اس

کا ذہن اسے کہیں اور لے جا رہا تھا۔

ذہن میں اب ایک اور چہرہ ابھر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی، وہ چہرہ آہستہ آہستہ واضح ہو رہا تھا، زیر آب ابھرنے والے کسی نقش کی طرح۔ چہرہ اب واضح ہو گیا تھا۔ امام مسکرائی، وہ اس چہرے کو پہچان سکتی تھی۔ اس نے اس چہرے کے ہونٹوں کو ہلنے دیکھا۔ آہستہ آہستہ وہ آواز سن سکتی تھی۔ وہ آواز سن رہی تھی۔

قطرہ مانگتے جو تو اُسے دریا دے دے

مجھ کو کچھ اور نہ دے اپنی تمنا دے دے

”میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم لوگ کسی کو کچھ نہ بتاؤ، زینب کو بھی نہیں۔“ اپنے سر کو جھٹکتے

ہوئے اس نے جویریہ اور راہجہ سے کہا تھا۔ ان دونوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا

اس کی دولت ہے فقط نقش کتب پا تیرا

پورے قد سے میں کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم

مجھ کو جھٹکتے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

لوگ کہتے ہیں کہ سایہ تیرے چکر کا نہ تھا

میں تو کہتا ہوں جہاں بھر پہ ہے سایہ تیرا

دو اس آواز کو پہچانتی تھی۔ یہ جلال انصر کی آواز تھی۔

☆.....☆.....☆

امام کو میڈیکل کالج میں چند روز ہوئے تھے جب ایک ویک اینڈ پر اسلام آباد آنے کے بعد اس

نے رات کو زینب کے گھر لاہور فون کیا۔

”بیٹا! میں زینب کو بلاتی ہوں، تم ہو لڈ رکھو۔“ زینب کی امی فون رکھ کر چلی گئیں۔ وہ ریسپورٹ کان سے لگائے انتظار کرنے لگی۔

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا

اس کی دولت ہے فقط نقش کتب پا تیرا

مردانہ آواز میں فون پر سنائی دینے والی وہ نعت امام نے پہلے بھی سنی تھی مگر اس وقت جو کوئی بھی

اسے پڑھ رہا تھا وہ کمال کمال جذب سے اسے پڑھ رہا تھا۔

پورے قد سے کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم

مجھ کو جھٹکتے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

اسے اندازہ نہیں تھا کہ کسی مرد کی آواز اتنی خوب صورت ہو سکتی ہے۔ اس قدر خوب صورت کہ پوری دنیا اس آواز کی قید میں لگے۔ امام نے اپنا سانس روک لیا یا شاید وہ سانس لینا بھول گئی۔

لوگ کہتے ہیں کہ سایہ تیرے بیکر کا نہ تھا

میں کہتا ہوں جہاں بھر پہ ہے سایہ تیرا

انسان کی زندگی میں کچھ ساتھیوں سے ملتی ہیں۔ شب قدر کی رات میں آنے والی اس سعادت کی طرح جسے بہت سے لوگ گزر جانے دیتے ہیں، صرف چند اس ساعت کے انتظار میں ہاتھ اٹھائے اور جموں پھیلائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس ساعت کے انتظار میں جو پھلتے پانی کو روک دے اور لڑکے ہوئے پانی کو رواں کر دے، جو دل سے نکلنے والی دعا کو لہروں تک آنے سے پہلے مقدر بنا دے۔

امام ہاشم کی زندگی میں وہ سعادت شب قدر کی کسی رات کو نہیں آئی تھی۔ نہ اس نے اس سعادت کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے نہ جموں پھیلائی تھی پھر بھی اس نے زمین و آسمان کی گردش کو کچھ دیر کے لئے چھتے دیکھا تھا۔ پوری کائنات کو ایک گنبد بے در میں بدلتے دیکھا تھا جس کے اندر بس ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔

دست گیری میری تہائی کی تو نے ہی تو کی

میں تو مر جاتا اگر ساتھ نہ ہوتا تیرا

وہ اندھیروں سے بھی دزدانہ گزر جاتے ہیں

جن کے ماتھے پہ چمکتا ہے ستارا تیرا

آواز بہت صاف اور واضح تھی۔ امام بت کی طرح ریسیدور ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی۔

”بیٹو امام!“ دوسری طرف زینب کی آواز گونجی اور وہ آواز کم ہو گئی۔ چند لمحوں کے لئے زمین کی لڑکی ہوتی گردش و بارہ ہمال ہو گئی۔

”بیٹو امام! آواز سن رہی ہو میری؟“ وہ ایک جھٹکے سے ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔

”ہاں، میں سن رہی ہوں۔“

”میں نے سوچا لائن کٹ گئی۔“ دوسری طرف سے زینب نے کچھ مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ امام اگلے چند منٹ اس سے بات کرتی رہی مگر اس کا دل دوہل گئی اور تھا۔

☆.....☆.....☆

جلال انصر زینب کا بڑا بھائی تھا اور امام کا ناناں طور پر اس سے واقف تھی۔ زینب اس کی کلاس فیو تھی اور اس سے امام کا تعارف وہیں میڈیکل کالج میں ہوا تھا۔ چند ماہ میں ہی یہ تعارف اچھی خاصی دوستی میں بدل گیا۔ اس تعارف میں اسے یہ پتا چلا کہ وہ لوگ چار بھائی بہن تھے۔ جلال سب سے بڑا تھا اور

باؤس چاب کر رہا تھا۔ زینب کے والد واپڈا میں انجینئر تھے اور ان کا گھرانہ خاصا مذہبی تھا۔

اسلام آباد سے واپسی پر اس نے زینب سے نعت پڑھنے والے اس شخص کے بارے میں پوچھا تھا۔

”زینب! اس رات میں نے تمہیں فون کیا تو کوئی نعت پڑھ رہا تھا، وہ کون تھا؟“ اس نے اپنے لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

”وو..... وو..... جلال بھائی تھے۔ ایک مقابلہ میں حصہ لینے کے لئے وہ نعت پاد کر رہے تھے۔ فون کو ریڈور میں ہے اور ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس لئے آواز تم تک پہنچ گئی۔“ زینب نے تفصیل سے بتایا۔

”بہت اچھی آواز ہے ان کی۔“

”ہاں، آواز تو بہت اچھی ہے ان کی۔ قرأت تو نعت سے بھی زیادہ خوب صورت کرتے ہیں۔ بہت سے مقابلوں میں انعام بھی لے چکے ہیں۔ ابھی بھی کالج میں ایک مقابلہ ہونے والا ہے تم اس میں اٹھیں سننا۔“

زینب صاف یہ نہیں جانتی تھی کہ امام کس مذہب کی تھی، وہ جس طرح پردے کا خیال رکھتی تھی زینب کا خیال تھا کہ وہ کسی مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ خود زینب بھی خاصے مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور چادر اوڑھا کرتی تھی۔

دو تین دن کے بعد امام، جلال انصر کی نعت سننے کے لئے اپنی فرینڈز کو بتائے بغیر کلاسز بنک کر کے نعتوں کے اس مقابلے میں چلی گئی تھی۔

جلال انصر کو اس دن پہلی بار اس نے دیکھا تھا۔ کہنیز نے جلال انصر کا نام پکارا اور امام نے تیز ہوتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ زینب سے مشابہت رکھنے والے عام سی شکل و صورت اور ڈائری والے ایک چوبیس بجیس سال لڑکے کو اسٹیج پر چڑھتے دیکھا۔ اسٹیج پر سبز حلیاں چڑھنے سے لے کر وہ سٹریمر کے پیچھے آکر کھڑے ہونے تک امام نے ایک بار بھی اپنی نظر جلال انصر کے چہرے سے نہیں ہٹائی۔ اس نے اسے سینے پر ہاتھ باندھے اور آنکھیں بند کرتے دیکھا۔

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا

اس کی دولت ہے فقط نقش کعب پا تیرا

امام کو اپنے پورے وجود میں ایک لہری دوڑتی محسوس ہوئی۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی اور صرف اس کی خوب صورت آواز گونج رہی تھی۔ وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح بیٹھی اسے سنتی رہی۔ اس نے کب نعت ختم کی، کب وہ اسٹیج سے اتر کر واپس ہوا، مقابلے کا نتیجہ کیا نکلا، اس کے بعد کس کس نے نعت پڑھی، کس وقت سارے اسٹوڈنٹ وہاں سے گئے اور کس وقت ہال خالی ہو گیا امام کو پتا نہیں چلا۔

بہت دیر کے بعد اسے ایک دم ہوش آیا تھا۔ اس وقت اپنے ارد گرد دیکھنے پر اسے احساس ہوا کہ وہ ہال میں اکیلی بیٹھی تھی۔

”میں نے کل تمہارے بھائی کو نعت پڑھتے سنا۔“ امام نے اگلے دن زینب کو بتایا۔

”اچھا..... انہیں پہلا انعام ملا ہے۔“ زینب نے اس کی بات پر مسکرا کر اسے دیکھا۔

”بہت خوب صورت نعت پڑھی تھی انہوں نے۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد امام نے پھر اس موضوع پر آگئی۔

”ہاں! وہ بچپن سے نعتیں پڑھتے آرہے ہیں۔ اتنے قرأت اور نعت کے مقابلے جیت چکے ہیں کہ اب تو انہیں خود بھی ان کی تعداد یاد نہیں ہوگی۔“ زینب نے فخر سے کہا۔

”ان کی آواز بہت خوب صورت ہے۔“ امام نے پھر کہا۔ ”ہاں خوب صورت تو ہے مگر ساری بات اس محبت اور عقیدت کی ہے، جس کے ساتھ وہ نعت پڑھتے ہیں۔ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق ہے۔ اتنی محبت کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ قرأت اور نعت کے علاوہ انہوں نے کبھی کوئی اور چیز نہیں پڑھی، حالانکہ اسکول اور کالج میں انہیں بہت مجبور کیا جا رہا مگر ان کا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ میں جس زبان سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قصیدہ پڑھتا ہوں اس زبان سے کسی اور شخص کا قصیدہ نہیں پڑھ سکتا۔ محبت تو ہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کرتے ہیں مگر جیسی محبت بھائی کرتے ہیں ویسی محبت تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ پچھلے دس سالوں میں ایک بار بھی انہوں نے نماز قضا نہیں کی۔ ہر ماہ ایک قرآن پاک پڑھتے ہیں۔ تم تو نعت کی تعریف کر رہی ہو مگر ان سے تلاوت سن لو تو.....“

وہ بڑے فخر سے بتا رہی تھی۔ امام چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے زینب سے اس کے بعد کچھ نہیں پوچھا۔

اگلے دن وہ صبح کالج جانے کے لئے تیار ہونے کے بجائے اپنے بستر میں گھسی رہی۔ جو یہ یہ نے خاصی دیر کے بعد بھی اسے بستر سے برآمد نہ ہوتے دیکھ کر جھنجھوڑا۔

”اٹھ جاؤ امام! کالج نہیں جانا کیا۔ دیر ہو رہی ہے۔“

”نہیں، آج مجھے کالج نہیں جانا۔“ امام نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

”کیوں؟“ جو یہ یہ کچھ حیران ہوئی۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ امام نے کہا۔

”آنکھیں تو بہت سرخ ہو رہی ہیں تمہاری، کیا رات کو سوئیں نہیں تم؟“

”نہیں، نیند نہیں آئی اور پلیز اب مجھے سوئے دو۔“ امام نے اس کے کسی اور سوال سے بچنے کے

لئے کہا۔ جو یہ یہ کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد اپنا بیگ اور فولڈر اٹھا کر باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد امام نے آنکھیں کھول دیں۔ یہ بات ٹھیک تھی کہ وہ ساری رات سو نہیں سکی تھی اور اس کی وجہ جلال انصر کی آواز تھی۔ وہ اپنے ذہن کو اس آواز کے علاوہ اور کبھی بھی فوکس نہیں کر پاتی تھی۔

”جلال انصر!“ اس نے زیر لب اس کا نام دہرایا۔ ”آخر اس کی آواز کیوں مجھے اس قدر اچھی لگ رہی ہے کہ میں..... میں اسے اپنے ذہن سے نکال نہیں پاتی؟“ اس نے اُلٹھے ہوئے ذہن کے ساتھ بستر سے نکلے ہوئے سوچا۔ وہ اپنے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی میں آکر کھڑی ہو گئی۔

”میرے بھائی کی آواز میں ساری تاثیر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشق کی وجہ سے ہے۔“ اس کے کانوں میں زینب کی آواز گونجی۔

”آواز میں تاثیر..... اور عشق؟“ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”سوز، گداز، لوج، مٹھاس..... آخر تھا کیا اس آواز میں؟“ وہ اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ”دنیا عشق اللہ سے شروع ہوتی ہے اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہو جاتی ہے۔“ اسے ایک اور جملہ یاد آیا۔

”عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟“ اس نے حیرانی سے سوچا۔ ”عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا عشق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟“ یکدم اسے اپنے اندر ایک عجیب سا سناٹا اترتا محسوس ہوا۔ اس نے اس سناٹے اور چارکی کو کھوجنا شروع کیا، اپنے اندر سیرجی و سیرجی اترتا شروع کیا۔ اسے کہیں کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔ ”آخر وہ کیا چیز ہوتی ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام سننے پر لوگوں کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر درود لے آتی ہے۔ عقیدت، عشق، محبت..... ان میں سے کیا ہے؟ مجھے کچھ کیوں محسوس نہیں ہوتا۔ میری آنکھوں میں آنسو کیوں نہیں آتے؟ میرے ہونٹوں پر درود کیوں نہیں آتا؟ میری آواز میں تاثیر.....“ وہ لمحہ بھر کے لئے ٹکی، اس نے زیر لب پڑھا۔

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا

اس کی دولت ہے فقط نقش کف پا تیرا

اسے اپنی آواز بھرائی ہوئی لگی۔ ”شاید ابھی جاگی ہوں، اس لئے آواز ایسی ہے۔“ اس نے اپنا گلا

صاف کرتے ہوئے سوچا۔ اس نے ایک بار پھر پڑھنا شروع کیا۔

”کچھ نہیں مانگتا.....“ وہ ایک بار پھر رک گئی۔ اس بار اس کی آواز میں لرزش تھی۔ اس نے دوبارہ

پڑھنا شروع کیا۔ ”کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا“ کھڑکی سے باہر نظریں مرکوز رکھتے ہوئے اس

نے لرزتی، بھڑائی آواز اور کانپتے ہونٹوں کے ساتھ پہلا مصرع پڑھا پھر دوسرا مصرع پڑھنا شروع کیا اور

رک گئی۔ کھڑکی سے باہر خلا میں گھورتے ہوئے وہ ایک بار پھر جلال انصر کی آواز اپنے کانوں میں اترتی

محسوس کر رہی تھی۔

بلند، صاف، واضح اور لڑان کی طرح دل میں اتر جانے والی مقدس آواز..... اسے اپنے گالوں پر نمی محسوس ہوئی۔

ایک دم وہ اپنے ہوش و حواس میں آئی اور پتا چلا کہ وہ دور رہی تھی۔ کچھ دیر جیسے بے یقینی کے عالم میں وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں دونوں آنکھوں پر رکھے دم بخود کھڑی رہی۔ اس نے اپنے آپ کو بے بسی کی انتہا پر پایا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے وہ آہستہ آہستہ گھٹنوں کے بل وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور اس نے پھوٹ پھوٹ کر رون شروع کر دیا۔

انسان کے لئے سب سے مشکل مرحلہ وہ ہوتا ہے جب اس کا دل کسی چیز کی گواہی دے رہا ہو مگر اس کی زبان خاموش ہو جب اس کا دماغ چلا چلا کر کسی چیز کی صداقت کا اقرار کر رہا ہو مگر اس کے ہونٹ ساکت ہوں، امامہ ہاشم کی بھی اپنی زندگی اسی مرحلے پر آن پہنچی تھی، جو فیصلہ وہ پچھلے دو تین سالوں سے نہیں کر پاری تھی وہ فیصلہ ایک آواز نے چند دنوں میں کروا دیا تھا۔ یہ جاننے، یہ سمجھنے، یہ پرکھے بغیر کہ آخر لوگ کیوں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی عقیدت رکھتے ہیں۔ آخر کیوں عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کی جاتی ہے۔ اس نے اتنے سال اپنے نبی کے قصیدے سنے تھے، اس پر کبھی رقت طاری نہیں ہوئی تھی، کبھی اس کا وجود موم بن کر نہیں پگھلا تھا، کبھی اسے کسی پر رشک نہیں آیا تھا مگر ہر بار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام پڑھتے، دیکھتے اور سنتے ہوئے وہ عجیب سی کیفیات کا شکار ہوتی تھی۔ ہر بار، ہر دفعہ اس کا دل اس نام کی طرف کھینچا جاتا تھا اور صبر کے پاس نہ جانے کے اس کے سارے اروے بھاپ بن کر اڑ گئے تھے۔ جلال الصبر کی آواز تاریکی میں نظر آنے والے جگنو کی طرح تھی جس کے تعاقب میں وہ بنا سوچے کبھے چل پڑی تھی۔

میں تجھے عالم اشیا میں بھی پا لیتا ہوں

لوگ کہتے ہیں کہ ہے عالم بالا تیرا

☆.....☆.....☆

امامہ کے لئے وہ ایک نئے سفر کا آغاز تھا۔ وہ پہلے کی طرح باقاعدگی سے صبر کے پاس جانے لگی۔ ان اجتماعات میں شرکت نے اسے اگر ایک طرف اپنے فیصلے پر استقامت بخشی تو دوسری طرف اس کے باقی ماندہ شبہات کو بھی دور کر دیا۔

مذہب تبدیل کرنے کا فیصلہ امامہ کے لئے کوئی چھوٹا یا معمولی فیصلہ نہیں تھا، اس ایک فیصلے نے اس کی زندگی کے ہر معاملے کو متاثر کیا تھا۔ وہ اب سجد سے شادی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ غیر مسلم تھا۔ اسے جلد یا بدیر اپنے گھر والوں سے علیحدگی بھی اختیار کرنی تھی کیونکہ وہ اب ایسے کسی ماحول میں رہنا نہیں چاہتی

تھی جہاں اسلامی شعائر اور عقائد میں اتنے دھڑلے سے تحریکات کی جاتی تھیں۔ وہ اس پیسے کے بارے میں بھی ٹھنک کا شکار ہونے لگی تھی جو اسے اپنی تعلیم اور دوسرے اخراجات کے لئے ہاشم بنین کی طرف سے ملتے تھے۔ چند سال پہلے تک پر یوں کی کہانی نظر آنے والی زندگی یک دم ہی ایک ڈراؤنے خواب میں تبدیل ہو گئی تھی اور زندگی کے اس مشکل راستے کا انتخاب اس نے خود کیا تھا۔ اسے بعض دفعہ حیرت ہوتی کہ اس نے اتنا بڑا فیصلہ کس طرح کر لیا۔ اس نے اللہ سے استقامت ہی مانگی تھی اور اسے استقامت سے نوازا گیا تھا مگر وہ ابھی اتنی کم عمر تھی کہ خدشات اور اندیشوں سے مکمل طور پر بچنا چھڑا لےنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔

”امامہ! تم فی الحال اپنے والدین کو مذہب کی تبدیلی کے بارے میں نہ بتاؤ۔ اپنے بیروں پر کھڑی ہو جاؤ۔ اس وقت نہ صرف تم آسانی سے سجد سے شادی سے انکار کر سکتی ہو بلکہ تم انہیں اپنے مذہب کی تبدیلی کے بارے میں بھی بتا سکتی ہو۔“

صبر نے ایک بار اس کے خدشات سننے کے بعد اسے مشورہ دیا تھا۔

”میں اس پیسے کو اپنے اوپر خرچ کرنا نہیں چاہتی جو میرے باپ مجھے دیتے ہیں، اب جبکہ میں جاہلی ہوں کہ میرے والد ایک جھوٹے مذہب کی تبلیغ کر رہے ہیں یہ جائز تو نہیں ہے کہ میں ایسے شخص سے اپنے اخراجات کے لئے رقم لوں؟“

”تم ٹھیک کہتی ہو مگر تمہارے پاس فی الحال کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ بہتر ہے تم اپنی تعلیم مکمل کر لو، اس کے بعد تمہیں اپنے والد سے کچھ بھی نہیں لینا پڑے گا۔“ صبر نے اسے سمجھایا۔ صبر اگر اسے یہ راہ نہ دکھاتی تب بھی امامہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس میں فی الحال اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش چھوڑ دیتا۔

☆.....☆.....☆

اس وقت رات کے دس بجے تھے جب وہ سینما سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی پاپ کارن کا ٹکٹ تھا اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا پاپ کارن کھاتے ہوئے سڑک پر چل رہا تھا۔

آدھ گھنٹہ تک سڑک میں ناپتے رہنے کے بعد اس نے ایک بہت بڑے پنگلے کی گھنٹی بجائی تھی۔

”صاحب کمانا گاؤں؟“ لاؤنج میں داخل ہونے پر ملازم نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے لٹی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”دودھ؟“

”نہیں۔“ وہ ڈکے بغیر وہاں سے گزر چلا گیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ کمرے کی لائٹ آن کر کے وہ کچھ دیر بے مقصد ادھر ادھر دیکھا رہا پھر ہاتھ روم کی طرف بڑھ

گیا۔ شیونگ کٹ نکال کر اس کے اندر سے ایک ریڑز بلیڈ نکال لیا اور اسے لے کر بیڈ روم میں آگیا۔ اپنے بیڈ پر بیٹھ کر اس نے سائیز ٹیبل پر پڑا ہوا ایسپ جلا لیا اور بیڈ روم کی ٹیوب لائٹ بند کر دی۔ ریڑز بلیڈ کے اوپر موجود پیر کو اُتار کر وہ کچھ ڈیر ایسپ کی روشنی میں اس کی تیز دھار کو دیکھتا رہا پھر اس نے بلیڈ کے ساتھ اپنے دائیں ہاتھ کی کھائی کی رنگ کو ایک تیز جھٹکے سے کاٹ دیا۔ اس کے منہ سے ایک سسکی سی نکلی اور پھر اس نے ہونٹ بھیج لئے۔ وہ اپنی آنکھوں کو کھلا رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی کھائی بیڈ سے نیچے لٹک رہی تھی اور خون کی دھار اب سیدھا کارپٹ پر گر کر اس میں جذب ہو رہی تھی۔

اس کا ذہن جیسے کسی گہری کھائی میں جا رہا تھا پھر اس نے کچھ دھماکے سے۔ تاریکی میں جانا ہوا ذہن ایک بار پھر جھماکے کے ساتھ روشنی میں آگیا۔ شراب اور بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ فوری طور پر شور کی وجہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں کھول دیں مگر وہ کسی چیز کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ سو رہی تھی جب بڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کوئی اس کا دروازہ بجا رہا تھا۔

"امامہ! امامہ!" وہ سیم دروازہ بجاتے ہوئے بلند آواز میں اس کا نام پکار رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟ کیوں جا رہے ہو؟" دروازہ کھولتے ہی اس نے کچھ حراس باہر نکلی کے عالم میں وسم سے پوچھا جس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔

"فرسٹ ایڈ باکس ہے تمہارے پاس؟" وسم نے اسے دیکھتے ہی فوراً پوچھا۔

"ہاں، کیوں؟" وہ مزید پریشان ہوئی۔

"بس اسے لے کر میرے ساتھ آ جاؤ۔" وسم نے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا؟" اس کے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین ٹھکنے لگی۔

"چوچو نے پھر خودکشی کی کوشش کی ہے۔ اپنی کھائی کاٹ لی ہے اس نے۔ ملازم آیا ہوا ہے نیچے اس کا، تم میرے ساتھ چلو۔" امامہ نے بے اختیار ایک اطمینان بھرا سانس لیا۔

"تمہارے اس دوست کو مینٹل ہاسپتال میں ہونا چاہئے جس طرح کی حرکتیں یہ کرتا پھرتا ہے۔"

امامہ نے ناگواری سے اپنے بیڈ پر پڑا ہوا دوپٹہ اوڑھتے ہوئے کہا۔

"میں تو اسے دیکھتے ہی بھاگ آیا ہوں، ابھی وہ ہوش میں تھا۔" اس نے مڑ کر امامہ کو بتایا۔ وہ دونوں اب آگے پیچھے سڑھیاں اُتر رہے تھے۔

"تم اسے ہاسپتال لے جاتے۔" امامہ نے آخری سڑھی پر پہنچ کر کہا۔

"وہ بھی لے جاؤں گا، پہلے تم اس کی کھائی وغیرہ تو ہاندھو، خون تو بند ہو۔"

"وسم! میں اسے کوئی بہت اچھی قسم کی فرسٹ ایڈ نہیں دے سکتی۔ چاہیں اس نے کس چیز سے کھائی

کھائی ہے اور زخم کتنا گہرا ہے۔ اس کے اپنے گھروالے کہاں ہیں؟" بات کرتے کرتے امامہ کو خیال آیا۔ "اس کے گھر میں کوئی بھی نہیں ہے، صرف ملازم ہیں۔ وہ تو کوئی فون کال آئی تھی جس پر ملازم اسے بلانے کے لئے گیا اور جب اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو پریشان ہو کر دوسرے ملازموں کے ساتھ مل کر اس نے دروازہ توڑ دیا۔" وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اب اپنے گھر سے باہر نکل آئے تھے۔

"تمہارا یہ دوست جو ہے نا....." امامہ نے کچھ ناراضی کے عالم میں وسم کے ساتھ چلتے ہوئے سالار کے بارے میں کچھ کہنا چاہا مگر وسم نے غصے میں پلٹ کر اس کو جھڑک دیا۔

"فارگاڈ سیک۔ اپنی لعنت ملامت بند نہیں کر سکتیں تم۔ اس کی حالت سیریس ہے اور تم اس کی برائیوں میں مصروف ہو۔"

"ایسی حرکتیں کرنے والوں کے لئے میرے پاس کوئی بھد رومی نہیں ہے۔" وہ دونوں اب سالار کے لاؤنج میں پہنچ چکے تھے۔

چند قدم چلنے کے بعد وسم ایک موڑ مزا اور کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ امامہ اس کے پیچھے ہی تھی مگر پھر جیسے کرنٹ کھا کر ڈک گئی۔ کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے قد آدم کھڑکیوں پر کچھ ماڈرن اور ایکسٹریسوی بڑی بڑی عریاں تصویریں اس طرح لگائی گئی تھیں کہ ایک لمبے کے لئے امامہ کو یوں لگا جیسے وہ تمام لڑکیاں حقیقی طور پر اس کمرے میں موجود ہوں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

ایک طرف بیڈ پر پڑے ہوئے زخمی کے بارے میں اس کی رائے کچھ اور خراب ہو گئی۔ وہ تصویریں اس کے کردار کی بہت سی اور ثبوت تھیں اور کمرے میں تین چار لوگوں کی موجودگی میں اس کے لئے وہ تصویریں خاصی محنت اور شرمندگی کا باعث بن رہی تھیں۔ ان تصویروں سے نظریں چراتے ہوئے وہ

تیز رفتاری سے ڈبل بیڈ کی طرف آگئی جہاں سالار سکندر لیٹا ہوا تھا۔ وسم اس کے پاس بیڈ پر بیٹھا فرسٹ ایڈ باکس کھول رہا تھا جبکہ امامہ کا بڑا بھائی سالار کی اس کھائی کو بیڈ شیٹ کے ایک ٹکٹے ہونے کو نے کے ساتھ دبا کر خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ خود سالار نشتے میں ڈوبے ہوئے کسی انسان کی طرح اپنا

ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ وسم اور وہاں موجود ملازموں سے کچھ کہہ بھی رہا تھا۔

امامہ کے آگے بڑھتے ہی اس کے بڑے بھائی نے اس کرسی کو چھوڑ دیا، جس پر وہ بیٹھے ہوئے تھے۔

"اس کے زخم کو دیکھو، میں نے چادر سے خون روکنے کی کوشش کی ہے مگر میں کامیاب نہیں ہوا۔" انہوں نے اس کی کھائی امامہ کو حتماتے ہوئے کہا۔ امامہ نے کرسی پر بیٹھے ہی اس کی کھائی کے گرد لپٹا ہوا

چادر کا کونہ ہٹایا۔ زخم بہت گہرا اور لمبا تھا۔ ایک نظر ڈالتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا۔

سالار نے پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ بھینپنے کی کوشش کی مگر امامہ مضبوطی سے کھائی کے کچھ نیچے سے اس کا بازو پکڑے رہی۔

”وسیم! بس جینٹلنگ کال دو، یہ زخم بہت گہرا ہے۔ یہاں کچھ نہیں ہو سکتا۔ جینٹلنگ کرنے سے خون رُک جائے گا پھر تم لوگ اسے ہاسپٹل لے جاؤ۔“ اس نے ایک نظر نیچے کارپٹ پر جذب ہوتے خون پر ڈالی۔ وسیم تیزی سے فرسٹ ایڈ باکس میں سے جینٹلنگ نکالنے لگا۔

سالار نے بیڈ پر لیٹے لیٹے اپنے سر کو جھونکا دیا اور آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اب دھندلاہٹ سی تھی مگر اس کے باوجود اس نے اپنے بیڈ سے کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی اس لڑکی اور اس کے ہاتھ میں موجود اپنے بازو کو دیکھا تھا۔

کچھ مشتعل ہو کر اس نے ایک اور جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ اس لڑکی کے ہاتھ سے آزاد کروانے کی کوشش کی۔ ہاتھ آزاد نہیں ہوا مگر ردی ایک تیز لہرنے بے اختیار اسے کراہنے پر مجبور کیا تھا۔ اسے چند لمحوں کے لئے یہ ہی محسوس ہوا تھا جیسے اس کی جان نکل گئی مگر اگلے ہی لمحے وہ ایک بار بھر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم لوگ دفع ہو..... جاؤ..... کہاں سے..... آگئے..... ہو؟“ اس نے کچھ مشتعل ہو کر لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔ ”یہ میرا..... کرو..... ہے..... تم..... لوگوں..... کو اندر..... آنے کی جرأت کیسے..... ہوئی..... تم..... وسیم..... تم..... دفع..... ہو جاؤ..... گیٹ..... گیٹ..... جسٹ..... گیٹ..... لاسٹ..... ہڈی باسٹرف“

اس نے بلند آواز میں مگر لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔ اما نے اس کے منہ سے نکلنے والی گالی کو سنا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے چہرے کا رنگ بدلا مگر وہ پھر اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے بیٹھی رہی۔ اس نے وسیم سے کاشن لے کر کراہتے ہوئے سالار کی کلائی کے زخم پر رکھ دی جو ہاتھ کو کھینچنے اور ہلانے سے باز نہیں آ رہا تھا اور وسیم کے ہاتھ سے جینٹلنگ لے کر لیٹنا شروع کر دیا۔ سالار نے دھندلائی آنکھوں کے ساتھ اپنی کلائی کے گرد کسی چیز کی نرمی کو محسوس کیا۔

کچھ بے بسی اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں سالار نے اپنے ہاتھوں کے زور سے اپنے دائیں ہاتھ کو چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ دھندلائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کا آگے بڑھنے والا بائیں ہاتھ لڑکی کے سر سے نکل گیا تھا۔ اس کے سر سے صرف دو پٹہ اترتا تھا بلکہ اس کے ہال بھی کھل گئے تھے۔

اما نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا جو ایک بار پھر اپنا بائیں ہاتھ آگے اڑا رہا تھا۔ اما نے اپنے ہاتھوں کو ہاتھ سے اس کی کلائی کو پکڑے رکھا جبکہ دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی جینٹلنگ چھوڑ کر اپنی پوری قوت سے اپنا دایاں ہاتھ اس کے ہاتھیں گال پر دے مارا۔ چھیڑا تازانے دار تھا کہ ایک لمحہ کے لئے سالار کی آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی دھندلاہٹ گئی۔ کھلے منہ اور آنکھوں کے ساتھ دم بخود اس نے اس لڑکی کو دیکھا تھا جو سرخ چہرے کے ساتھ بلند آواز میں اس سے کہہ رہی تھی۔

”اب اگر تم بٹے تو میں تمہارا دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دوں گی، سنا تم نے۔“

سالار نے اس لڑکی کے عقب میں وسیم کو بلند آواز میں کچھ کہتے سنا مگر وہ کچھ سمجھ نہیں پایا۔ اس کا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب رہا تھا مگر اس نے پھر ایک آواز سنی تھی، نسوانی آواز۔ ”اس کا بلڈ پریشر چیک کرو.....“ سالار کو بے اختیار چند لمحے پہلے اپنے گال پر پڑنے والا تھپڑ یاد آیا۔ وہ چاہنے کے باوجود آنکھیں نہیں کھول سکا۔ وہی نسوانی آواز ایک بار پھر گونجی تھی مگر اس بار وہ اس آواز کو کوئی مہلوم نہیں پہناسکا۔ اس کا ذہن مکمل طور تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلی بار جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک پرائیویٹ کلینک میں موجود تھا۔ آنکھیں کھول کر اس نے ایک بار اپنے ارد گرد دیکھنے کی کوشش کی۔ کمرے میں اس وقت ایک نرس موجود تھی جو اس کے پاس کمری ڈرپ کو صحیح کرنے میں مصروف تھی۔ سالار نے اسے مسکراتے دیکھا تھا وہ اس سے کچھ کہتا چاہ رہا تھا مگر اس کا ذہن ایک بار پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔

دوسری بار اسے کب ہوش آیا، اسے اندازہ نہیں ہوا مگر دوسری بار آنکھیں کھولنے پر اس نے اس کمرے میں کچھ شناسا چہرے دیکھے تھے۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر مئی اس کی طرف بڑھ آئیں۔

”کیسا محسوس کر رہے ہو تم؟“ انہوں نے اس پر جھکتے ہوئے بے تابی سے کہا۔

”جسٹ فائن۔“ سالار نے دور کھڑے سکندر عثمان کو دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس سے پہلے کہ اس کی مئی کچھ اور کہتیں کمرے میں موجود ایک ڈاکٹر آگے آیا تھا۔ وہ اس کی نبض چیک کرنے لگا تھا۔

ڈاکٹر نے انجکشن لگانے کے بعد ایک بار پھر اسے ڈرپ لگائی۔ سالار نے کچھ بیزارگی کے ساتھ یہ کارروائیاں دیکھیں۔ ڈرپ لگانے کے بعد وہ سکندر عثمان اور ان کی بیوی سے باتیں کرنے لگا۔ سالار اس گفتگو کے دوران چھت کو گھورتا رہا پھر کچھ دیر بعد ڈاکٹر کمرے سے نکل گیا۔

کمرے میں اب بالکل خاموشی تھی۔ سکندر عثمان اور ان کی بیگم اپنا سر پکڑے بیٹھے تھے۔ ان کی تمام کوششوں اور احتیاط کے باوجود یہ سالار سکندر کی خودکشی کی چوٹی کی کوشش تھی اور اس بار وہ واقعی مرتے مرتے بچا تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق اگر چند منٹوں کی تاخیر ہو جاتی تو وہ اسے نہیں بچا سکتے تھے۔

سکندر اور ان کی بیوی کو رات کے دو بجے ملازم نے سالار کی خودکشی کی اس کوشش کے بارے میں بتایا تھا اور وہ دونوں میاں بیوی پوری رات سو نہیں سکے تھے۔ سکندر عثمان نے صبح لٹائے ملنے تک تقریباً بڑھ سو سکرٹ چھوٹ ڈالے تھے، مگر اس کے باوجود ان کی بے چینی اور اضطراب میں کمی نہیں ہو پارہی تھی۔

”میری بھجھ میں نہیں آتا یہ آخر اس طرح کی حرکتیں کیوں کرتا ہے، آخر اس پر ہماری نصیحتوں اور

ہمارے سمجھانے کا اثر کیوں نہیں ہوا۔" سکندر عثمان نے دور ان سطر کہا۔ "میرا تو دماغ پھٹنے لگتا ہے جب میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں۔ کیا نہیں کیا میں نے اس کے لئے۔ ہر سہولت، بہترین تعلیم حتیٰ کہ بڑے سے بڑے سائیکالرسٹ تک کو دکھایا، کچھ ہوں مگر نتیجہ وہی ڈھاگ کے تین پات..... میری تو جگہ میں نہیں آتا کہ مجھ سے کیا غلطی ہو گئی ہے، جو مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ جاننے والوں کے درمیان مذاق بن گیا ہوں میں اس کی وجہ سے۔" سکندر عثمان بہت پریشان تھے۔ "ہر وقت میرا دم طلق میں اٹکا رہتا ہے کہ پتا نہیں وہ کس وقت کیا کر گزرے۔ اتنی احتیاط برتنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایک بار ہم غافل ہوئے اور وہ پھر وہی حرکت کر گزرا ہے۔" طیبہ نے اپنی آنکھوں میں اُمّتے ہوئے آنسوؤں کو نشو کے ساتھ صاف کیا۔ وہ دونوں اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے کراچی سے اسلام آباد آئے تھے مگر سالار کے سامنے آ کر دونوں کو چپ لگ گئی تھی۔ ان دونوں ہی کی کجگہ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس حالت میں اس سے کیا کہیں۔

سالار کو ان کی دلی اور ذہنی کیفیات کا اچھی طرح اندازہ تھا اور ان کی خاموشی کو وہ غنیمت جان رہا تھا۔ انہوں نے اس دن اس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اگلے دن بھی وہ دونوں خاموش ہی رہے تھے۔

مگر تیسرے دن ان دونوں نے اپنی خاموشی تو زودی تھی۔

"مجھے صرف یہ بتاؤ کہ آخر تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟" سکندر نے اس رات بڑی جھل جھل جراتی سے اس کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ "آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔ میں نے اسی وعدہ پر تمہیں اسپورٹس کار بھی لے کر دی۔ ہر بات مان رہے ہیں ہم لوگ تمہاری، پھر بھی تمہیں قطعاً احساس نہیں ہے ہم لوگوں کا، نہ خاندان کی عزت کا۔" سالار اسی طرح چپ بیٹھا رہا۔

"کسی اور کا نہیں تو تم ہم دونوں کا ہی خیال کرو، تمہاری وجہ سے ہماری راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں۔" طیبہ نے کہا۔ "تمہیں کوئی پریشانی، کوئی پرالم ہے تو ہم سے ڈسکس کرو، ہم سے کہو..... مگر اس طرح مرنے کی کوشش کرنا؟..... تم نے کبھی سوچا ہے کہ اگر تم ان کوششوں میں کامیاب ہو جاؤ تو ہمارا کیا ہوتا۔" سالار خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ ان کی باتوں میں کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ خود کشی کی ہر کوشش کے بعد وہ ان سے اسی طرح کی باتیں سنتا تھا۔

"کچھ بولو، چپ کیوں ہو؟ کچھ مجھ میں آرہا ہے تمہیں؟" طیبہ نے جھنجھلا کر کہا۔ وہ انہیں دیکھنے لگا۔ "ماں باپ کو اس طرح ذلیل کر کے بڑی خوشی ملتی ہے تمہیں۔"

"اس قدر شاندار مستقبل ہے تمہارا اور تم اپنی اہم مقامات حرکتوں سے اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ لوگ ترستے ہیں اس طرح کے اکیڈمک ریکارڈ کے لئے۔" سکندر عثمان نے اسے اس کا اکیڈمک

ریکارڈ زیادہ دلانے کی کوشش کی۔ سالار نے بے اختیار ایک جھانکی لی۔ وہ جانتا تھا اب وہ اس کے بچپن سے لے کر اس کی اب تک کی کامیابیوں کو ذہن نشین کر رہا ہے۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ اگلے چند روز میں اس موضوع پر بولنے کے بعد انہوں نے تھک کر پوچھا۔

"آخر تم کچھ بول کیوں نہیں رہے، بولو؟"

"میں کیا بولوں، سب کچھ تو آپ دونوں نے کہہ دیا ہے۔" سالار نے کچھ اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ "میری زندگی میرا پرسل معاملہ ہے پھر بھی میں نے آپ کو بتایا ہے کہ دراصل میں مرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا....." سکندر نے اس کی بات کاٹی۔

"تم جو بھی کر رہے تھے، وہ مت کرو، ہم پر کچھ رحم کھاؤ۔" سالار نے ناراضی سے باپ کو دیکھا۔

"تم آخر یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تم آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔ فضول میں بحث کیوں کرتے جا رہے ہو؟" اس بار طیبہ نے اس سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے، نہیں کروں گا، ایسی کوئی بھی حرکت۔" سالار نے بے زاری سے جیسے ان دونوں سے جان چھڑانے کے لئے کہا۔ سکندر نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اس کے وعدے پر مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ نہ وہ..... نہ ان کی بیوی..... مگر ایسے وعدے لینے کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ بچپن سے اپنے اس بیٹے پر فخر کرتے آرہے تھے، مگر پچھلے کچھ سالوں سے ان کا وہ فخر ختم ہو گیا تھا۔ بتانا پریشان انہیں سالار نے کیا تھا اتنا ان کے باقی بچوں نے مل کر بھی نہیں کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

"اب کیسا ہے تمہارا دوست؟" گئے تھے تم اس کی خبریت دریافت کرنے؟" امامہ وسم کے ساتھ مارکیٹ جا رہی تھی کہ اچانک اسے سالار کا خیال آیا۔

"پہلے سے تو حالت کافی بہتر ہے اس کی۔ شاید گل پر سوں تک ڈسپارچ ہو جائے۔" وسم نے اسے سالار کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیا۔ "تم چلو گی وہ ابھی پر اس کو دیکھنے؟" وسم کو اچانک خیال آیا۔

"میں؟" امامہ حیران ہوئی۔ "میں کیا کروں گی جا کر....."

"خبریت دریافت کرنا اور کیا کرنا ہے تمہیں۔" وسم نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا۔" امامہ نے کچھ حائل سے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے، چلیں گے۔ حالانکہ اس طرح کے مریض کی عیادت کرنا فضول ہے۔" اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"دیسے مجھے تو یقین تھی کہ اس کے جوش ہمارے گھر آئیں گے، شکر یہ وغیرہ دوا کرنے کے ہم نے ان کے بیٹے کی جان بچالی۔ کس قدر بروقت مدد کی تھی ہم نے، مگر انہوں نے تو بھولے سے ہمارے گھر

کارخ نہیں کیا۔" امام نے تہرہ کیا۔

"تم ان بے چاروں کی کنڈیشن کا اندازہ ہی نہیں کر سکتیں۔ کس منہ سے وہ شکر یہ ادا کرنے آئیں اور پھر اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ آپ کے بیٹے نے ایسی حرکت کیوں کی ہے تو وہ دونوں کیا جواب دیں گے۔ کیا یہ کہیں گے کہ شوق کے ہاتھوں..... وہ بے چارے عجیب مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

وسیم نے قدرے افسوس کرنے والے انداز میں کہا۔ "ویسے اس کے جرنلس نے میرا بہت شکر یہ ادا کیا ہے اور امی اور بابا جب پرسوں ہاسپٹل میں اس کی خیریت دریافت کرنے گئے تھے تو انہوں نے وہاں بھی ان دونوں کا بہت شکر یہ ادا کیا ہے۔ یہ تو امی اور بابا کی سمجھ داری تھی کہ انہوں نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا سالار کے بارے میں، ورنہ تو ادھر بھی خاصی سخت کاسما کرنا پڑتا نہیں۔" وسیم نے گاڑی موڑتے ہوئے کہا۔

"مگر آخر تمہارے اس دوست کا مسئلہ کیا ہے، کیوں بیٹھے بٹھائے اس طرح کی اہمیت نہ دیتے؟"

"تم مجھ سے اس طرح پوچھ رہی ہو جیسے وہ مجھے سب کچھ بتا کر یہ سب کرتا ہو گا۔ مجھے کیا پتا، وہ کس لئے یہ سب کرتا ہے یا کیوں کرتا ہے۔"

"تمہارا اتنا گہرا دوست ہے، تم پوچھتے کیوں نہیں اس سے؟"

"اتنا گہرا دوست بھی نہیں ہے کہ ایسی باتوں کے بارے میں بھی مجھے بتانے لگے اور ویسے بھی میں کیوں اتنا کریدوں، ہو گا کوئی مسئلہ اس کا۔"

"تو پھر بہتر نہیں ہے کہ تم ایسے دوستوں سے کچھ فاصلے پر رہو، ایسے لوگوں سے دوستی اچھی نہیں ہوتی۔ اگر کل کو تم نے بھی اسی طرح کی حرکتیں شروع کر دیں تو.....؟"

"ویسے تم نے اس دن جو حرکت کی تھی وہ اگر اسے یاد رہی تو ہماری دوستی میں خود ہی ناموافق آ جائے گا۔" وسیم نے کچھ جتانے والے انداز میں کہا۔

"میں نہیں سمجھتی کہ اسے وہ تھپڑ یاد ہو گا۔ وہ صحیح طور پر ہوش میں تو نہیں تھا۔ تم سے ذکر کیا اس نے اس بارے میں؟" امام نے پوچھا۔

"نہیں، مجھ سے کہا تو نہیں مگر ہو سکتا ہے کہ اسے یاد ہو۔ تم نے اچھا نہیں کیا تھا۔"

"اس نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔ ایک تو اپنا ہاتھ سمجھ رہا تھا دوسرے کا لیاں دے رہا تھا اور اوپر سے میرا دوپٹہ بھی سمجھ لیا۔"

"اس نے دوپٹہ نہیں کھینچا تھا، اس کا ہاتھ لگا تھا۔" وسیم نے سالار کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔

"جو بھی تھا، اس وقت تو مجھے بہت فصد آیا تھا مگر بعد میں مجھے بھی افسوس ہوا تھا اور میں نے تو اللہ

کا بہت شکر ادا کیا کہ وہ سچ گیا۔ اگر کہیں وہ مر جاتا تو مجھے تو بہت ہی بچھتا ہوتا ہے اس تھپڑ کا۔" امام نے قدرے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"چلو تم آج جا رہی ہو تو معذرت کر لینا۔" وسیم نے مشورہ دیا۔

"کیوں ایکسپریز کروں، ہو سکتا ہے اسے کچھ یاد ہی نہ ہو پھر میں خودخواہ گڑے مردے اکھاڑوں۔ اسے یاد دلاؤں کہ میں نے اس کے ساتھ ایسا کیا تھا۔" امام نے فوراً کہا۔

"اور فرض کرو اسے سب کچھ یاد ہو تو.....؟"

"تو..... تو کیا ہو گا..... وہ کون سا ہمارا رشتے دار ہے کہ اس سے تعلقات خراب ہو جائیں گے یا میل جول میں فرق پڑے گا۔" امام نے لاپرواہی سے کہا۔

شاپنگ کرنے کے بعد وسیم اسے کلیئج لے آیا جہاں سالار زیر علاج تھا۔

وہ دونوں جس وقت اس کے کمرے میں داخل ہوئے اس وقت وہ سوپ پینے میں مصروف تھا۔

سالار نے وسیم کے ساتھ آنے والی لڑکی کو دیکھا اور فوراً پہچان لیا تھا۔ اگرچہ اس رات اس حالت میں وہ اسے شناخت نہیں کر سکا تھا مگر اس وقت اسے دیکھتے ہی وہ اسے پہچان گیا تھا۔ اپنی مٹی سے یہ بات وہ پہلے ہی جان چکا تھا کہ وسیم کی بہن نے اسے فرسٹ ایڈوی تھی مگر اسے وہ فرسٹ ایڈیڈ نہیں تھی، بس وہ زمانے دار تھپڑ یاد تھا جو اس رات اسے پڑا تھا، اس لئے امام کو دیکھتے ہی وہ سوپ پیتے پیتے رک گیا۔ اس کی جھپٹی ہوئی نظروں سے امام کو اندازہ ہو گیا کہ اسے یقیناً اس رات ہونے والے واقعات کسی نہ کسی حد تک یاد تھے۔

رکی ملیک ملیک کے بعد اس کی مٹی امام کا شکر یہ ادا کرنے لگیں، جبکہ سالار نے سوپ پیتے ہوئے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ وسیم سے اس کی دوستی کو کئی سال گزر چکے تھے اور اس نے وسیم کے گھر میں امام کو بھی کئی بار دیکھا تھا مگر اس نے پہلے کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ اس دن پہلی بار وہ اس پر قدرے تنقیدی انداز میں غور کر رہا تھا۔ اس کے دل میں امام کے لئے تشکر یا احسان مندی کے کوئی جذبہ بات نہیں تھے۔ اس کی وجہ سے اس کے سارے پلان کا بیڑا خرق ہو گیا تھا۔

امام اس کی مٹی سے گفتگو میں مصروف تھی مگر وہ وقتاً فوقتاً اپنے اوپر پڑنے والی اس کی نظروں سے بھی واقف تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے کسی کی نظریں اتنی بری لگی تھیں۔

ایک لمحہ کے لئے اس کا دل چاہا تھا۔ وہ اٹھ کر وہاں سے بھاگ جائے۔ سالار کے بارے میں اس کی رائے اور بھی خراب ہو گئی تھی۔ وہ اپنے اس تھپڑ کے لئے معذرت کے ارادے کے ساتھ وہاں آئی تھی مگر اس وقت اس کا دل چاہا تھا اسے دو چار اور تھپڑ لگا دے۔

تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد فوراً ہی وہ واپس جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور واپس جاتے

ہوئے اس نے سالار کے ساتھ علیک سلیمک کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔ وہ صرف اس کی مہی کے ساتھ سلام دعا کے بعد سالار کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل آئی تھی اور باہر آکر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔

”اس طرح کے دوست بنائے ہوئے ہیں تم نے؟“ اس نے باہر نکلنے ہی وہیم سے کہا جس نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا۔

”کیوں، اب کیا ہوا ہے؟“

”اسے دیکھنے تک کی تیز نہیں ہے۔ اس بات کا احساس تک نہیں ہے کہ میں اس کے دوست کی بہن ہوں اور اس کے دوست کے ساتھ اس کے کمرے میں موجود ہوں۔“

وہیم اس کی بات پر کچھ خفیف سا ہو گیا۔

”یہ آدمی اس قابل نہیں ہے کہ اس کی عیادت کے لئے جایا جائے اور تم اس کے ساتھ میل جول بند کرو۔“

”اچھا ٹھیک ہے، میں محتاط رہوں گا۔ اب تم باہر اس بات کو نہ دہراؤ۔“ وہیم نے موضوع گفتگو بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ امامہ دانستہ طور پر خاموش ہو گئی مگر سالار کے اس ناپسندیدہ افراد کی لست میں شامل ہو چکا تھا۔

یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ وہاں دونوں کچھ چھٹیاں گزارنے اسلام آباد آئی ہوئی تھی ورنہ شاید سالار سے اس کا اتنا قریبی اور اتنا ناپسندیدہ تعارف اور تعلق کبھی پیدا نہ ہوتا۔

☆.....☆.....☆

اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے پہلی بار جلال انصر کو تب قریب سے دیکھا جب ایک دن وہ چاروں کالج کے لان میں بیٹھی گفتگو میں مصروف تھیں، وہ وہاں کسی کام سے آیا تھا۔ رہی سی علیک سلیمک کے بعد وہ زینب کے ساتھ چند قدم دور جا کھڑا ہوا تھا۔ امامہ اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔ ایک عجیب سی مسرت اور سرخوشی کا احساس اسے گھیرے میں لے رہا تھا۔

وہ چند منٹ زینب سے بات کرنے کے بعد وہیں سے چلا گیا۔ امامہ اس کی پشت پر نظریں جمائے اس وقت تک اسے دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ اس کے ارد گرد بیٹھی اس کی فریڈز کیا باتیں کر رہی تھیں، اسے اس وقت اس کا کوئی احساس نہیں تھا جب وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوا تو یکدم جیسے دوبارہ اپنے ماحول میں واپس آ گئی۔

جلال انصر سے اس کی دوسری ملاقات زینب کے گھر ہوئی تھی۔ اس دن وہ کالج سے واپسی پر زینب کے ساتھ اس کے گھر آئی تھی۔ زینب کچھ دنوں سے ان سب کو اپنے ہاں آنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ باقی سب نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیا تھا، مگر امامہ اس دن اس کے ساتھ اس کے گھر چلی آئی تھی۔

اس کے گھر آکر اسے عجیب سے سکون کا احساس ہوا تھا۔ شاید اس احساس کی وجہ جلال انصر کی اس گھر سے بہت تھی۔

وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی اور زینب چائے تیار کرنے کے لئے کچن میں گئی تھی۔ جب جلال ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ امامہ کو وہاں دیکھ کر کچھ چونک گیا۔ شاید اسے امامہ کو وہاں دیکھنے کی توقع نہیں تھی۔

”السلام علیکم۔ کیا حال ہے آپ کا؟“ جلال نے شاید اس طرح بے وحشک اندر داخل ہونے پر اپنی بیوی منانے کے لئے کہا۔ امامہ نے رنگ بدلتے چہرے کے ساتھ اس کا جواب دیا۔

”زینب کے ساتھ آئی ہیں آپ؟“ اس نے پوچھا۔

”جی۔“

”زینب کہاں ہے، میں دراصل اس کو صوبتے ہوئے یہاں آ گیا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ اس کی کوئی دوست یہاں موجود ہے۔“ کچھ معذرت خواہانہ انداز میں کہتے ہوئے وہ پلٹ گیا۔

”آپ بہت اچھی نعت پڑھتے ہیں۔“ امامہ نے بے ساختہ کہا۔ وہ ٹھک گیا۔

”شکریہ۔“ وہ کچھ حیران نظر آیا۔ ”آپ نے کہاں سنی ہے؟“

”ایک دن میں نے زینب کو فون کیا تھا جب تک فون ہولڈر ہاتھ آپ کی آواز آتی رہی، پھر زینب سے آپ کے بارے میں پوچھا۔ میں اس نعتیہ مقابلے میں بھی گئی تھی جہاں آپ نے وہ نعت پڑھی تھی۔“

وہ بے اختیار کہتی چلی گئی۔ جلال انصر کی سمجھ میں نہیں آیا وہ حیران ہو پا خوش۔

”بہت اچھی تو نہیں، بس پڑھ لیتا ہوں۔ اللہ کا کرم ہے۔“ اس نے حیرت کے اس جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے سفید چادر میں لپیٹی اس دلچسپی دراز قامت لڑکی کو دیکھا جس کی گہری سیاہ آنکھیں کوئی بہت عجیب سا ساٹھ لگے ہوئے تھیں۔ اپنی آواز کی تعریف وہ بہت سوں سے سن چکا تھا مگر اس وقت اس لڑکی کی تعریف اس کے لئے قدرے غیر معمولی تھی اور جس انداز میں اس نے یہ کہا تھا وہ اس سے بھی زیادہ عجیب۔

وہ پلٹ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔ وہ ویسے بھی لڑکیوں سے گفتگو میں مہارت نہیں رکھتا تھا اور ہر ایک ایسی لڑکی سے گفتگو جس سے وہ صرف چہرے کی حد تک واقف تھا۔

امامہ ایک عجیب سی مسرت کے عالم میں وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے جلال انصر سے بات کی تھی۔ اپنے سامنے..... خود سے اتنے قریب..... وہ ڈرائنگ روم کے دروازے سے کچھ آگے کارپٹ پر اس جگہ کو دیکھتی رہی جہاں وہ کچھ دیر پہلے کھڑا تھا۔ تصور کی آنکھ سے وہ اسے ابھی بھی دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

ان کی انگی ملاقات ہاسٹل میں ہوئی۔ کچھلی وفد اگر امامہ دانت طور پر زینب کے گھر گئی تھی تو اس بار یہ ایک اتفاق تھا۔ امامہ راہبہ کے ساتھ وہاں آئی تھی جسے وہاں اپنی کسی دوست سے ملنا تھا۔ ہاسٹل کے ایک کوریڈور میں فاضل انیس کے اسٹوڈنٹس کے ایک گروپ میں اس نے جلال انصر کو دیکھا۔ اس کی ایک ہارٹ بیٹ مس ہوئی۔ کوریڈور میں اتار ش تھا کہ وہ اس کے پاس نہیں جا سکتی تھی اور اس وقت پہلی بار امامہ کو احساس ہوا کہ اسے سامنے دیکھ کر اس کے لئے رک جانا کتنا مشکل کام تھا۔ راہبہ کی دوست کے ساتھ بیٹھے ہوئے بھی اس کا حسیان مکمل طور پر باہر ہی تھا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ راہبہ کے ساتھ اس کی دوست کے کمرے سے باہر آئی تھی۔ اب وہاں فاضل انیس کے اسٹوڈنٹس کا وہ گروپ نہیں تھا۔ امامہ کو بے اختیار مایوسی ہوئی۔ راہبہ اس کے ساتھ ہاتھیں کرتے ہوئے باہر نکل رہی تھی جب بیڑھیوں پر ان دونوں کا سامنا جلال سے ہو گیا۔ امامہ کے جسم سے جیسے ایک کرنٹ سا گزر گیا تھا۔

”السلام علیکم۔ جلال بھائی! کیسے ہیں آپ؟ راہبہ نے پہلی ہی تھی۔
”اللہ کا شکر ہے۔“

اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگ یہاں کیسے آگئے؟“ اس بار جلال نے امامہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں اپنی ایک فرینڈ سے ملنے آئی تھی اور امامہ میرے ساتھ آئی تھی۔“ راہبہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی جبکہ امامہ خاموشی سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

دیکھیری میری تنہائی کی تو نے ہی تو کی
میں تو مر جاتا اگر ساتھ نہ ہوتا میرا

اس کی آواز سننے ہوئے وہ ایک بار پھر کسی ٹرانس میں آ رہی تھی۔ اس نے بہت کم لوگوں کو اسے شہتہ لہجے میں اردو بولتے ہوئے سنا تھا۔ جس لہجے میں وہ بات کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں ہر بار اس کی آواز سننے ہی اس کے کانوں میں اس کی پڑھی ہوئی وہ نعت گو بننے لگتی تھی۔ اسے عجیب سا رشک آ رہا تھا اسے دیکھتے ہوئے۔

جلال نے راہبہ سے بات کرتے ہوئے شاید اس کی محویت کو محسوس کیا تھا، اسی لئے بات کرتے کرتے اس نے امامہ کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ امامہ نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں۔ بے اختیار اس کا دل چاہا تھا وہ اس شخص کے اور قریب چلی جائے۔ جلال سے نظریں ہٹا کر ارادہ گرد گزرتے لوگوں کو دیکھتے ہوئے اس نے تین بار لا حول پڑھی۔ ”شاید اس وقت شیطان میرے دل میں آ کر مجھے اس کی طرف راغب کر رہا ہے۔“ اس نے سوچا مگر لا حول پڑھنے کے بعد بھی اس کے اندر کوئی تبدیلی نہیں

آئی۔ وہ اب بھی جلال کے لئے ویسی ہی کشش محسوس کر رہی تھی۔

امجد سے اتنے سالوں کی معافی کے بعد بھی کبھی اس نے اپنے آپ کو اس کے لئے اس طرح بے اختیار ہوتے نہیں دیکھا تھا جس طرح وہ اس وقت ہو رہی تھی۔ وہاں کھڑے اسے پہلی بار جلال سے بہت زیادہ خوف آیا۔ میں کیا کروں گی اگر میرا دل اس آدمی کو دیکھ کر اسی طرح بے اختیار ہوتا رہا، آخر اسے دیکھ کر مجھے۔ اس نے جیسے بے بسی کے عالم میں سوچا۔ میں اتنی کمزور تو کبھی بھی نہیں تھی کہ اس جیسے آدمی کو دیکھ کر اس طرح۔ اس نے اپنے وجود کو موم کا پلایا۔

☆.....☆.....☆

”بھائی! آپ فارغ ہیں۔“ اس رات زینب دروازے پر دستک دے کر جلال کے کمرے میں داخل ہوئی۔

”ہاں، آ جاؤ۔“ اس نے اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر زینب کو دیکھا۔

”آپ سے ایک کام ہے۔“ زینب اس کے پاس آتے ہوئے بولی۔

”کیا کام ہے؟“

”آپ ایک کیسٹ میں اپنی آواز میں کچھ نعتیں ریکارڈ کر دیں۔“ زینب نے کہا۔ جلال نے حیرت سے اس کی فرمائش سنی۔

”کس لئے؟“

”وہ میری دوست ہے امامہ اس کو آپ کی آواز بہت پسند ہے، اس لئے..... اس نے مجھ سے فرمائش کی اور میں نے ہاں بھری۔“ زینب نے تفصیل بتائی۔

جلال اس فرمائش پر مسکرایا۔ امامہ سے کچھ دن پہلے ہونے والی ملاقات اسے یاد آگئی۔

”یہ وہی لڑکی ہے جو اس دن یہاں آئی تھی؟“ جلال نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”ہاں، وہی لڑکی ہے۔ اسلام آباد سے یہاں آئی ہے۔“

”اسلام آباد سے؟ ہاسٹل میں رہ رہی ہے؟“ جلال نے کچھ دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاسٹل میں رہ رہی ہے۔ کافی اچھا خانہ ان ہے اس کا، بہت بڑے اخڑ شریٹس ہیں اس کے فادر۔ مگر امامہ سے مل کر ذرا محسوس نہیں ہوتا۔“ زینب نے بے اختیار امامہ کی تعریف کی۔

”کافی مذہبی لگتی ہے۔ میں نے اسے ایک دو بار تمہارے ساتھ کالج میں بھی دیکھا ہے۔ کالج میں بھی چادر اوڑھی ہوتی ہے اس نے۔ یہاں کالج کی ”آب و ہوا“ کا بھی اثر نہیں ہوا اس پر۔“ جلال نے کہا۔

”بھائی! اس کی فیملی بھی خاصی مذہبی ہے کیونکہ وہ جب سے یہاں آئی ہے اسی طرح ہی ہے۔ میرا

خیال ہے کہ خاصے کنز و بیو لوگ ہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی فعلی خاصی تعلیم یافتہ ہے۔ نہ صرف بھائی بلکہ بہنیں بھی۔ یہ گھر میں سب سے چھوٹی ہے۔ "زندہ نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "تو پھر آپ کب ریکارڈ کر کے دیں گے؟" "زندہ نے پوچھا۔

"تم کل لے لینا۔ میں ریکارڈ کر دوں گا۔" جلال نے کہا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ جلال کچھ دیر کبھی سوچ میں ڈوبا ہوا پھر وہ وہاں کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا جسے وہ پہلے چاہ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ان کی اگلی ملاقات لاہور میں ہوئی تھی۔ اس بار امام اسے وہاں موجود کچھ کر بے اختیار اس کی طرف چلی گئی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد امام نے کہا۔

"میں آپ کا شکر یہ ادا کرنا چاہتی تھی۔"

جلال نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ "کس لئے؟"

"اس کیسٹ کے لئے جو آپ نے ریکارڈ کر کے بھجوائی تھی۔" جلال مسکرایا۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کبھی کوئی مجھ سے ایسی فرمائش کر سکتا ہے۔"

"آپ بہت خوش قسمت ہیں۔" امام نے دم آواز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں..... کس حوالے سے؟" جلال نے ایک بار پھر حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہر حوالے سے۔ آپ کے پاس سب کچھ ہے۔"

"آپ کے پاس بھی تو بہت کچھ ہے۔"

وہ جلال کی بات پر عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ جلال کو شبہ ہوا کہ اس کی آنکھوں میں کچھ فی

نمودار ہوئی تھی مگر وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ اب نظریں جھکائے ہوئے تھی۔

"پہلے کچھ بھی نہیں تھا، اب واقعی سب کچھ ہے۔" جلال نے دم آواز میں اسے کہتے سنا وہ نہ سمجھنے

والے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"آپ اتنی محبت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لیتے ہیں تو میں سوچتی ہوں کہ....."

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ جلال خاموشی سے اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کرتا رہا۔

"مجھے آپ پر رشک آتا ہے۔" چند لمبے بعد وہ آہستہ سے بولی۔

"سب لوگوں کو تو اس طرح کی محبت نہیں ہوتی جیسی محبت آپ کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سے ہے۔ ہو بھی جائے تو ہر کوئی اس طرح اس محبت کا اظہار نہیں کر سکتا کہ دوسرے بھی رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں گرفتار ہونے لگیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی آپ سے بڑی

محبت ہوگی۔" اس نے نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں کوئی نمی نہیں تھی۔

"شاید مجھے وہم ہوا تھا۔" جلال نے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

"یہ میں نہیں جانتا، اگر ایسا ہو تو میں واقعی بہت خوش قسمت انسان ہوں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ مجھے واقعی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑی محبت ہے۔ مجھ جیسے لوگوں کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ ہر ایک کو اللہ اس محبت سے نہیں نوازتا۔"

وہ بڑی رسائیت سے کہہ رہا تھا۔ امام اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔ اسے کبھی کسی شخص کے سامنے اس طرح کا احساس کمتری نہیں ہوا تھا، جس طرح کا احساس کمتری وہ جلال انصر کے سامنے محسوس کرتی تھی۔

"شاید میں بھی نعت پڑھ لوں۔ شاید میں بھی بہت اچھی طرح اسے پڑھ لوں مگر میں..... میں جلال انصر کبھی نہیں ہو سکتی، کبھی بن ہی نہیں سکتی، کبھی میری آواز سن کر کسی کا وہ حال نہیں ہو سکتا جو جلال انصر کی آواز سن کر ہوتا ہے۔" وہ لاہور میں سے نکلنے ہوئے مسلسل مایوسی کے عالم میں سوچ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

جلال انصر کے ساتھ ہونے والی چند ملاقاتوں کے بعد امام نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ دوبارہ کبھی اس کا سامنا نہ کرے، نہ اس کے بارے میں سوچے، نہ زندہ رہنے کے گھر جائے۔ حتیٰ کہ اس نے زندہ رہنے کے ساتھ اپنے تعلقات کو بھی اپنی طرف سے بہت محدود کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی ہر حفاظتی تدبیر برے طریقے سے ناکام ہوتی گئی۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ امام کی بے بسی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور پھر اس نے کھٹے ٹیک دیئے تھے۔

"اس آدمی میں کوئی چیز ایسی ہے، جس کے سامنے میری ہر مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔" اور شاید اس کا یہ اعتراف ہی تھا جس نے اسے ایک بار پھر جلال کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ پہلے اس کے لئے اس کی بے اختیاری لا شعوری تھی پھر اس نے شعوری طور پر جلال کو اسجد کی جگہ دے دی۔

"آخر کیا برائی ہے اگر میں اس شخص کا ساتھ چاہوں جس کی آواز مجھے بار بار اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لوٹنے پر مجبور کرتی رہی۔ میں کیوں اس شخص کے حصول کی خواہش نہ کروں جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مجھ سے بھی زیادہ محبت رکھتا ہے۔ کیا مضائقہ ہے اگر میں اس شخص کو اپنا مقدر بنا لے جاؤں، جس کے لئے میں اُنس رکھتی ہوں اور جس کے کردار سے میں واقف ہوں۔ کیا برا ہے اگر میں یہ چاہوں کہ میں جلال انصر کے نام سے شناخت پاؤں۔ اس واحد آدمی کے نام سے جسے سنتے، جسے دیکھتے مجھے اس پر رشک آتا ہے۔" اس کے پاس ہر دلیل، ہر توجیہ موجود تھی۔ بہت غیر محسوس طور پر وہ ہر اس جگہ جانے لگی جہاں جلال کے پائے جانے کا امکان ہوتا اور وہ اکثر

وہاں پایا جاتا۔ وہ زینب کو اس وقت فون کرتی، جب جلال گھر پر ہوتا کیونکہ گھر پر موجود ہوتے ہوئے فون ہمیشہ وہی ریسیور کا تھا۔ دونوں کے درمیان چھوٹی موٹی گفتگو رفتہ رفتہ طویل ہونے لگی پھر وہ ملنے لگے۔ جویریہ، رابعہ یا زینب تینوں کو امامہ اور جلال کے درمیان بڑھتے ہوئے ان تعلقات کے بارے میں پتا نہیں تھا۔ جلال اب ہاؤس چاب کر رہا تھا اور امامہ اکثر اس کے ہاسٹل جانے لگی۔ ہاتھ دھو کر انٹھار میت نہ کرنے کے باوجود دونوں اپنے لئے ایک دوسرے کے جذبات سے واقف تھے۔ جلال جانتا تھا کہ امامہ اسے پسند کرتی تھی اور یہ پسندیدگی عام نوعیت کی نہیں تھی۔ خود امامہ بھی یہ جان چکی تھی کہ جلال اس کے لئے کچھ خاص قسم کے جذبات محسوس کرنے لگا ہے۔

جلال اس قدر مذہبی تھا کہ اس نے کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ کسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جائے گا، نہ صرف یہ کہ وہ محبت کرے گا بلکہ اس طرح اس سے ملا کرے گا۔ مگر یہ سب کچھ بہت غیر محسوس انداز میں ہوتا گیا تھا۔ اس نے زینب سے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ اس کے اور امامہ کے درمیان کسی خاص نوعیت کا تعلق تھا۔ اگر وہ یہ انکشاف کر دیتا تو زینب اسے یقیناً امامہ کی اسجد کے ساتھ ملے شدہ نسبت سے آگاہ کر دیتی۔ بہت شروع میں ہی وہ امامہ کی لڑکی کسی نسبت کے بارے میں جان لیتا تو وہ امامہ کے بارے میں بہت حفاطہ ہو جاتا پھر کم از کم امامہ کے لئے اس حد تک اٹراؤ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس حد تک وہ چکا تھا۔

ان کے درمیان ہونے والی ایسی ہی ایک ملاقات میں امامہ نے اسے پر پوز کیا تھا۔ اسے امامہ کی جرأت پر کچھ حیرانی ہوئی تھی کیونکہ کم از کم وہ خود بہت چاہنے کے باوجود ابھی یہ بات نہیں کہہ سکا تھا۔

”آپ کا ہاؤس چاب کچھ عرصے میں مکمل ہو جائے گا، اس کے بعد آپ کیا کریں گے؟“ امامہ نے اس دن اس سے پوچھا تھا۔

”اس کے بعد میں اسٹیلٹائزیشن کے لئے باہر جاؤں گا۔“ جلال نے بڑی سہولت سے کہا۔

”اس کے بعد؟“

”اس کے بعد وہاں آؤں گا اور اپنا ہاسٹل بناؤں گا۔“

”آپ نے اپنی شادی کے بارے میں سوچا ہے؟“ اس نے اگلا سوال کیا تھا۔ جلال نے حیران مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

”امامہ! شادی کے بارے میں ہر ایک ہی سوچتا ہے۔“

”آپ کس سے کریں گے؟“

”یہ ملے کرنا ابھی باقی ہے۔“

امامہ چند لمبے خاموش رہی۔ ”مجھ سے شادی کریں گے؟“

جلال دم بخود اسے دیکھنے لگا۔ اسے امامہ سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ ”آپ کو میری بات بری لگی ہے؟“

جلال دم بخود اسے دیکھنے لگا۔ اسے امامہ سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ ”آپ کو میری بات بری لگی ہے؟“

امامہ نے اسے گم سم دیکھ کر پوچھا۔ وہ ایک دم جیسے ہوش میں آ گیا۔

”نہیں، ایسا نہیں ہے۔“ اس نے بے اختیار کہا۔ ”یہ سوال مجھے تم سے کرنا چاہئے تھا۔ تم مجھ سے شادی کرو گی؟“

”ہاں۔“ امامہ نے بڑی سہولت سے کہا۔

”اور آپ؟“

”میں..... میں..... ہاں، آف کورس۔ تمہارے علاوہ میں اور کس سے شادی کر سکتا ہوں۔“ اس نے اپنے جملے پر امامہ کے چہرے پر ایک چمک آتے دیکھی۔

”میں ہاؤس چاب ختم ہونے کے بعد اپنے والدین کو تمہارے ہاں بھجواؤں گا۔“

وہ اس بار جواب میں کچھ کہنے کے بجائے چپ سی ہو گئی۔ ”جلال! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں آپ سے اپنے گھر والوں کی مرضی کے بغیر شادی کر لوں؟“

جلال اس کی بات پر ہکا بکارہ گیا۔ ”کیا مطلب؟“

”ہو سکتا ہے میرے پیرئٹس اس شادی پر تیار نہ ہوں۔“

”کیا تم نے اپنے پیرئٹس سے بات کی ہے؟“

”نہیں۔“

”تو پھر تم یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”کیوں میں اپنے پیرئٹس کو اچھی طرح جانتی ہوں۔“ اس نے رسائی سے کہا۔

جلال ایک دم کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ ”امامہ! میں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ تمہارے پیرئٹس کو ہم دونوں کی شادی پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ ایسا نہیں ہو گا۔“

”مگر ایسا ہو سکتا ہے۔ آپ مجھے صرف یہ بتائیں کہ کیا آپ اس صورت میں مجھ سے شادی کر لیں گے؟“

جلال کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ امامہ اضطراب کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد جلال نے اپنی خاموشی کو توڑا۔

”ہاں، میں تب بھی تم ہی سے شادی کروں گا۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اب کسی دوسری

لڑکی سے شادی کر سکوں۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارے بیٹے اس شادی پر رضامند ہو جائیں لیکن اگر وہ نہیں ہوتے تو پھر ہمیں ان کی مرضی کے بغیر شادی کرنی ہوگی۔

”کیا آپ کے بیٹے اس بات پر رضامند ہو جائیں گے؟“

”ہاں، میں انہیں منالوں گا۔ وہ میری بات نہیں ٹالتے۔“ جلال نے فخریہ انداز سے کہا۔

☆.....☆.....☆

وہ پہلو کی آواز پر بٹٹی۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر سالار کھڑا تھا۔ وہ اپنے اسی بے ڈھنگے طبع میں تھا۔ فی شرٹ کے سارے جن کھلے ہوئے تھے اور وہ خود جنیور کی میبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھا۔ ایک لمحہ کے لئے امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح کے روم عمل کا اظہار کرے۔

سالار کے ساتھ تیور بھی تھا۔

”آؤ، اس لڑکی سے ملاقات ہوں تمہیں۔“ سالار نے امامہ کو کتابوں کی دکان پر دیکھا تو قریب چلا آیا۔

تیور نے گردن موڑ کر دیکھا اور جہرائی سے کہا۔ ”اس چادر والی سے؟“

”ہاں۔“ سالار نے قدم بڑھائے۔

”یہ کون ہے؟“ تیور نے پوچھا۔

”یہ دوہیم کی بہن ہے۔“ سالار نے کہا۔

”دوہیم کی؟ مگر تم اس سے کیوں مل رہے ہو؟ دوہیم اور اس کی فیملی تو خاصی کمزور بیوہ ہے۔ اس سے مل کر کیا کرو گے؟“ تیور نے امامہ پر دور سے ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”جیکلی ہارن نہیں مل رہا ہوں، پہلے بھی مل چکا ہوں۔ بات کرنے میں کیا حرج ہے؟“ سالار نے اس

کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

امامہ نے میگزین ہاتھ میں پکڑے پکڑے ایک نظر سالار اور ایک نظر اس کے ساتھ کھڑے لڑکے کو دیکھا جو تقریباً سالار جیسے ہی طبع میں تھا۔

”ہاؤ آریو؟“ سالار نے اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر کہا۔

”فائن۔“ امامہ نے میگزین بند کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

”یہ تیور ہے، دوہیم سے اس کی بھی خاصی دوستی ہے۔“ سالار نے تعارف کر لیا۔

امامہ نے ایک نظر تیور کو دیکھا پھر ہاتھ کے اشارے سے شاہنگ سینٹر کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دوہیم وہاں ہے۔“

سالار نے گردن موڑ کر اس طرف دیکھا جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا اور پھر کہا۔

”مگر ہم دوہیم سے ملنے تو نہیں آئے۔“

”تو؟“ امامہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”آپ سے بات کرنے آئے ہیں۔“

”مگر میں تو آپ کو نہیں جانتی پھر آپ مجھ سے کیا بات کرنے آئے ہیں؟“

امامہ نے سرد مہری سے کہا۔ اسے سالار کی آنکھوں سے وحشت ہونے لگی تھی۔ کاش یہ کسی سے نظر چمکا کر بات کرنا سیکھ لیتا، خاص طور پر کسی لڑکی سے۔ اس نے میگزین دوبارہ کھول لیا۔

”آپ مجھے نہیں جانتیں؟“ سالار مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا۔ ”آپ کے گھر کے ساتھ ہی میرا گھر ہے۔“

”یقیناً ہے مگر میں آپ کو ”ذاتی“ طور پر نہیں جانتی۔“ اس نے اسی رکھائی کے ساتھ میگزین پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

”چند ماہ پہلے آپ نے ایک رات میری جان بچائی تھی۔“ سالار نے مذاق اڑانے والے انداز میں اسے یاد دلایا۔

”میڈیکل کے اسٹوڈنٹ ہونے کی حیثیت سے یہ میرا فرض تھا۔ میرے سامنے کوئی بھی مر رہا ہوتا، میں یہی کرتی۔ اب مجھے ایکسکیو ز کریں، میں کچھ مصروف ہوں۔“

سالار اس کے کہنے کے باوجود کس سے کس نہیں ہول۔ تیور نے اس کے بازو کو ہولے سے کھینچ کر اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ اسے شاید دوہیم کے حوالے سے امامہ کا لٹلا تھا مگر سالار نے اپنا بازو چھڑا لیا۔

”میں اس رات آپ کی مدد کے لئے آپ کا شکر یہ ادا کرنا چاہتا تھا، حالانکہ آپ نے مجھے پروفیشنل طریقے سے ٹریٹمنٹ نہیں دیا تھا۔“

اس بار سالار نے سنجیدگی سے کہا۔ امامہ نے اس کی بات پر میگزین سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

”آپ کا اشارہ اگر اس تھپڑ کی طرف ہے تو ہاں وہ بالکل پروفیشنل نہیں تھا اور میں اس کے لئے معذرت کرتی ہوں۔“

”میں نے اسے مانتا نہیں کیا۔ میرا اشارہ اس طرف نہیں تھا۔“ سالار نے لاپرواہی سے کہا۔

”مجھے توقع تھی کہ آپ تھپڑ کو مانتا نہیں کریں گے۔“ (کیونکہ اسی کے مستحق تھے اور ایک نہیں دس) اس نے جھلکے کا آدھا حصہ ضبط کر لیا۔

”ویسے آپ کا اشارہ کس طرف تھا؟“

”بے حد تھرڈ کلاس طریقے سے پیڑنگ کی تھی آپ نے میری اور آپ کو پراپر طریقے سے بلڈ پریشر تک چیک کرنا نہیں آتا۔“ سالار نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے چوٹم کی ایک اسٹک اپنے منہ میں ڈالی۔

امامہ کے کان کی لوئیں سرخ ہو گئیں۔ وہ پٹلیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتی رہی۔

"افسوس ناک بات ہے کہ ایک ڈاکٹر کو ایسے معمولی کام نہ آتے ہوں جو کسی بھی عام آدمی کو آتے ہیں۔"

اس بار اس کا انداز پھر مذاق اڑانے والا تھا۔

"میں ڈاکٹر نہیں ہوں، میڈیکل کے ابتدائی سالوں میں ہوں، پہلی بات اور جہاں تک unprofessional ہونے کا تعلق ہے تو انگی بار سکی، آپ نے تو ابھی اس طرح کی کئی کوششیں کرنی ہیں۔ میں آہستہ آہستہ آپ پر پریکٹس کر کے اپنا ہاتھ صاف کروں گی۔"

ایک لمحہ کے لئے وہ کچھ نہیں بول سکا پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ اُبھری۔ یوں جیسے وہ اس کی بات پر مٹھوٹا ہوا تھا مگر شرمندہ نہیں اور اس نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

"اگر آپ مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش....."

"کوشش کر رہی ہیں تو آپ اس میں ناکام ہوں گی۔ میں جانتی ہوں، آپ شرمندہ نہیں ہوتے، یہ صفت صرف انسانوں میں ہوتی ہے۔" امام نے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ کے خیال میں، میں کیا ہوں؟" سالار نے اسی انداز میں کہا۔

"پتا نہیں، ایک vet اس بارے میں آپ کو زیادہ بہتر جاننے کے لئے کہے گا۔" وہ اس بار اس کی بات پر ہنسا۔

"دو بیروں پر چلنے والے جانور کو ہر میڈیکل ڈسٹری انسان کہتی ہے اور میں دو بیروں پر چلتا ہوں۔"

"رہیجے سے لے کر کتے تک ہر چار بیروں والا جانور دو بیروں پر چل سکتا ہے۔ اگر اسے ضرورت پڑے یا اس کا دل چاہے تو۔"

"مگر میرے چار بیروں میں اور میں صرف ضرورت کے وقت نہیں، ہر وقت ہی دو بیروں پر چلتا ہوں۔" سالار نے مجھ سے انداز میں اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ کے چار بیروں میں، اسی لئے میں نے آپ کو vet سے ملنے کو کہا ہے۔ وہ آپ کو آپ کی خصوصیات کے بارے میں صحیح طرح بتا سکے گا۔"

امام نے سرد آواز میں کہا۔ وہ اسے زنج کرنے میں واقعی کامیاب ہو چکا تھا۔

"ویسے جتنی اچھی طرح سے آپ جانوروں کے بارے میں جانتی ہیں، آپ ایک بہت اچھی vet ثابت ہو سکتی ہیں۔ آپ کے علم سے خاصا متاثر ہوا ہوں میں۔" امام کے چہرے کی سمرنی میں کچھ اور

اضافہ ہو گیا۔ "اگر آپ میری vet بن جاتی ہیں تو میں آپ کے بتانے ہوئے مشورے کے مطابق آپ

ہی کے پاس آیا کروں گا تاکہ آپ میرے بارے میں ریسرچ کر کے مجھے بتائیں۔"

سالار نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ وہ اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہہ سکی، صرف اسے دیکھ

کر رہ گئی۔ وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی منہ پھٹ تھا اور ایسے شخص کے ساتھ لمبی گفتگو کرنا آہل مجھے مار

کے مزاحیہ تھا اور وہ یہ حماقت کر چکی تھی۔

"ویسے آپ کیا نہیں چارچ کریں گی؟" وہ بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"یہ وہیم آپ کو بتا دے گا۔" امام نے اس بار اسے دھمکانے کی کوشش کی۔

"تعلیم ٹھیک ہے، یہ میں وہیم سے پوچھ لوں گا۔ اس طرح تو خاصی آسانی ہو جائے گی۔"

وہ اس کی دھمکی کو سمجھنے کے باوجود مرعوب نہیں ہوا اور اس نے امام کو یہ جتا بھی دیا۔ تیمور نے ایک بار پھر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"آؤ سالار اچلتے ہیں، مجھے ایک ضروری کام یاد آرہا ہے۔" اس نے نکت کے عالم میں سالار کو اپنے ساتھ تقریباً گھیننے کی کوشش کی مگر سالار نے توجہ نہیں دی۔

"چلتے ہیں یا اس طرح سمجھو تو مت۔" وہ اس سے کہتے ہوئے ایک بار پھر امام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"بہر حال یہ سب مذاق تھا۔ میں واقعی آپ کا شکر یہ ادا کرنے آیا تھا۔ آپ نے اور وہیم نے کافی مدد کی میری، گڈ بائے۔"

وہ کہتے ہوئے واپس مڑ گیا۔ امام نے بے اختیار ایک سکون کا سانس لیا۔ وہ شخص واقعی کریک تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہیم جیسا شخص کیسے اس آدمی کے ساتھ دوستی رکھ سکتا ہے۔

وہ ایک بار پھر میگزین کے ورق اٹھنے لگی۔ "سالار آیا تھا تمہارے پاس؟" وہیم نے اس کے پاس آکر پوچھا۔ دور سے سالار اور تیمور کو دیکھ لیا تھا۔

"ہاں۔" امام نے ایک نظر اسے دیکھا اور ایک بار پھر میگزین دیکھنے لگی۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" وہیم نے کچھ تجسس سے پوچھا۔

"مجھے حیرت ہوتی ہے کہ تم نے اس جیسے شخص کے ساتھ دوستی کس طرح کر لی ہے۔ میں نے

زندگی میں اس سے زیادہ بے ہودہ اور بدتمیز لڑکا نہیں دیکھا۔" امام نے اکڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میرا

شکر یہ ادا کر رہا تھا اور ساتھ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ مجھے جینڈا تک ٹھیک طرح سے کرنی نہیں آتی، نہ میں

بلڈ پریشر چیک کر سکتی ہوں۔"

وہیم کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ "اس کو دفع کر دو، یہ عقل سے پیدل ہے۔"

"میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ میں اسے دو ہاتھ اور لگاؤں، اس کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔ منہ اٹھا کر

اپنے دوست کو لے کر بچھ گیا ہے یہاں۔" جی اگس نے کہا ہے تم سے شکر یہ ادا کرنے کو اور مجھے تو وہ

وہ سرالٹا کبھی خاصا برا لگا اور وہ کہہ رہا تھا کہ تمہاری اس کے ساتھ بھی دوستی ہے۔" امام کو اچانک یاد آیا۔

"دوستی تو نہیں، بس جان پہچان ہے۔" وہیم نے وضاحت پیش کی۔ "تمہیں ایسے لڑکوں کے

ساتھ جان پہچان رکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ حلیہ دیکھا تم نے ان دونوں کا۔ نہ انہیں بات کرنے کی تیز تھی، نہ لباس پہننے کا سلیقہ اور نہ اٹھا کر شکر یہ ادا کرنے آگئے ہیں۔ بہر حال تم اس سے مکمل طور پر قطع تعلق کر لو، کوئی ضرورت نہیں ہے اس طرح کے لڑکوں سے جان پہچان کی بھی تمہیں۔"

امام نے میگزین رکھتے ہوئے ایک بار پھر اسے سحمیہ کی اور پھر باہر جانے کے لئے قدم بڑھا دیئے۔ وسیم بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔

مگر میں ایک بات پر حیران ہوں یہ جس حالت میں تھا اسے یہ کیسے یاد ہے کہ میں نے اس کی بیڑتاج اچھی نہیں کی تھی یا بلڈ پریشر لینے میں مجھے دقت ہو رہی تھی۔" امام نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"میں یہ سمجھ رہی تھی کہ یہ ایسے ہی ہاتھ پاؤں جھٹک رہا ہے۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ارد گرد ہونے والی چیزوں کو بھی observe کر رہا ہے۔"

"ویسے بیڑتاج واقعی خراب کی تھی تم نے اور اگر میں تمہاری مدد نہ کرتا تو۔ بلڈ پریشر کی ریڈنگ بھی تمہیں لینا نہیں آتی۔ کم از کم اس بارے میں وہ جو بھی کہہ رہا تھا ٹھیک کہہ رہا تھا۔" وسیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں، مجھے پتا ہے۔" امام نے اعتراف کرنے والے انداز میں کہا۔ "مگر میں اس وقت بہت نروس تھی۔ میں پہلی بار اس طرح کی صورت حال کا شکار ہوئی تھی پھر اس کے ہاتھ سے نکلنے والا خون مجھے اور خوف زدہ کر رہا تھا اور اوپر سے اس کا رویہ..... کسی خود کشی کرنے والے انسان کو اس طرح کی حرکتیں کرتے نہیں دیکھا تھا میں نے۔"

"اور تم ڈاکٹر بننے جا رہی ہو، وہ بھی ایک قابل اور نامور ڈاکٹر، ناقابل یقین۔" وسیم نے تبصرہ کیا۔

"اب کم از کم تم اس طرح کی باتیں مت کرو۔" امام نے احتجاج کیا۔ "میں نے اس لئے تمہیں یہ سب نہیں بتایا کہ تم مذاق اڑاؤ۔ وہ لوگ پارکنگ ایریا میں پہنچ گئے تھے۔"

☆.....☆.....☆

کچھ دنوں سے وہ جلال اور زینب کے رویے میں عجیب سی تبدیلی دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں اس سے بہت اگھڑے اگھڑے رہنے لگے تھے۔ ایک عجیب سا تناؤ تھا، جو وہ اپنے اور ان کے درمیان محسوس کر رہی تھی۔

اس نے ایک دو بار جلال کو ہاسٹل فون کیا، مگر ہر بار اسے یہی جواب ملا کہ وہ مصروف ہے۔ وہ زینب کو اگر کالج سے لینے بھی آتا تو پیلے کی طرح اس سے نہیں ملتا تھا اور اگر ملتا بھی تو صرف رسمی سی علیک سلیک کے بعد واپس چلا جاتا۔ وہ شروع میں اس تبدیلی کو اپنا وہم سمجھتی رہی مگر پھر زیادہ پریشان ہونے پر وہ ایک دن جلال کے ہاسٹل پہلی آئی۔

جلال کا رویہ بے حد سرد تھا۔ امام کو دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ تک نہیں آئی تھی۔

"کھانی دن ہو گئے تھے ہمیں ملے ہوئے، اس لئے میں خود چلی آئی۔" امام نے اپنے سارے اندیشوں کو جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میری توشفت شروع ہو رہی ہے۔"

امام نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ "زینب بتا رہی تھی کہ اس وقت آپ کی شفٹ ختم ہوتی ہے، میں اسی لئے اس وقت آئی ہوں۔"

وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ "ہاں صحیح ہے مگر آج میری کوئی اور مصروفیت ہے۔" وہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ "جلال! آپ کسی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں؟" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا۔

"نہیں، میں کسی سے ناراض نہیں ہوں۔" جلال نے اسی رکھائی سے کہا۔

"کیا آپ دس منٹ باہر آکر میری بات سن سکتے ہیں؟"

جلال کچھ دیر اسے دیکھا رہا پھر اس نے اپنا اور آل اپنے بازو پر ڈال لیا اور کچھ کبے بغیر کمرے سے باہر نکل آیا۔

باہر آتے ہی جلال نے اپنی رست و اوج پر ایک نظر دوڑائی۔ یہ شاید اس کے لئے بات شروع کرنے کا اشارہ تھا۔ "آپ میرے ساتھ اس طرح مس ٹی ہو کیوں کر رہے ہیں؟"

"کیا مس ٹی ہو کر رہا ہوں؟" جلال نے اگھڑ انداز میں کہا۔

"آپ بہت دنوں سے مجھے اگھڑ کر رہے ہیں۔"

"ہاں، کر رہا ہوں۔"

امام کو توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی صفائی سے اس بات کا اعتراف کر لے گا۔

"کیونکہ میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔" وہ کچھ لمحوں کے لئے کچھ نہیں بول سکی۔ "کیوں؟"

"یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔" اس نے اسی طرح اگھڑ انداز میں کہا۔

"میں جانتا چاہتی ہوں کہ آپ کا رویہ یک دم کیوں تبدیل ہو گیا ہے۔" کوئی نہ کوئی وجہ تو ہو گی اس کی۔ "امام نے کہا۔

"ہاں وجہ ہے مگر میں تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح تم بہت سی باتیں مجھے بتانا ضروری نہیں سمجھتیں۔"

"میں؟" وہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔ "میں نے کون سی باتیں آپ کو نہیں بتائیں؟"

"یہ کہ تم مسلمان نہیں ہو۔" جلال نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔ امام سانس تک نہیں لے سکی۔

”کیا تم نے یہ بات مجھ سے چھپائی نہیں؟“

”جلال! میں بتانا چاہتی تھی۔“ امامہ نے ٹھکت خورہ انداز میں کہا۔

”چاہتی تھیں..... مگر تم نے بتایا تو نہیں..... دھوکا دینے کی کوشش کی تم نے۔“

”جلال! میں نے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی۔“ امامہ نے جیسے احتجاج کیا۔ ”میں آپ کو

کیوں دھوکا دوں گی؟“

”مگر تم نے کیا یہی ہے۔“ جلال نے سر جھکتے ہوئے کہا۔

”جلال میں.....“ جلال نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تم نے جان بوجھ کر مجھے ٹریپ کیا۔“ امامہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”ٹریپ کیا؟“ اس نے زرب جلال کے لفظوں کو ڈھرایا۔

”تم جانتی تھیں کہ میں اپنے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق کرتا ہوں۔“

وہ ٹھکت خورہ انداز میں اسے دیکھتی رہی۔

”شادی تو دور کی بات ہے۔ اب جب میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان گیا ہوں تو میں تم سے

کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ تم دوبارہ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔“ جلال نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”جلال! میں اسلام قبول کر چکی ہوں۔“ امامہ نے مدغم آواز میں کہا۔

”اوہ کم آن“ جلال نے تعقیر آمیز انداز میں اپنا ہاتھ جھٹکا۔ ”یہاں کھڑے کھڑے تم نے میرے

لئے اسلام قبول کر لیا۔“ اس بار وہ مذاق اُڑانے والے انداز میں ہنسا۔

”جلال! میں آپ کے لئے مسلم نہیں ہوئی۔ آپ میرے لئے ایک ذریعہ ضرور بنے ہیں، مجھے کئی

ماہ ہو گئے ہیں اسلام قبول کے اور اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں ہے تو میں آپ کو ثبوت دے سکتی

ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔“

اس بار جلال کچھ اُلجھے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

”میں مانتی ہوں میں نے آپ کی طرف پیش قدمی خود کی۔ آپ کے بقول میں نے آپ کو ٹریپ

کیا۔ میں نے ٹریپ نہیں کیا۔ میں صرف بے بس تھی۔ آپ کے معاملے میں مجھے خود پر قابو نہیں رہتا

تھا۔ آپ کی آواز کی وجہ سے، آپ جانتے ہیں میں نے آپ کو بتایا تھا میں نے پہلی بار آپ کو نصت پڑھتے

سنا تو میں نے کیا محسوس کیا تھا۔ آپ کو اگر میرے بارے میں پہلے ہی یہ سب کچھ پتہ چل جاتا تو آپ

میرے ساتھ یہی سلوک کرتے جو اب کر رہے ہیں..... مجھے صرف اس بات کا اندیشہ تھا جس کی وجہ

سے میں نے آپ سے بہت کچھ چھپائے رکھا۔ بعض باتوں میں انسان کو اپنے اوپر اختیار نہیں ہوتا۔ مجھے

بھی آپ کے معاملے میں خود پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔“

اس نے رنجیدگی سے کہا۔

”تمہارے گھر والوں کو اس بات کا پتا ہے؟“

”نہیں۔ میں انہیں نہیں بتا سکتی۔ میری منگنی ہو چکی ہے۔ میں نے آپ کو اس بارے میں بھی نہیں

بتایا۔“ وہ ایک لمحہ کے لئے زکی۔ ”مگر میں وہاں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میں آپ سے شادی کرنا چاہتی

ہوں۔ میں صرف اپنی تعلیم مکمل کرنے کا انتظار کر رہی ہوں۔ تب میں اپنے بیروں پر کھڑی ہو جاؤں گی

اور پھر میں آپ سے شادی کروں گی۔“

”چار پانچ سال بعد جب میں ڈاکٹر بن جاؤں گی تو شاید میرے بیٹھس آپ سے میری شادی پر اس

طرح اعتراض نہ کریں جس طرح وہ اب کریں گے۔ اگر مجھے یہ خوف نہ ہو کہ وہ میری تعلیم ختم کروا کر

میری شادی امجد سے کر دیں گے تو شاید میں انہیں ابھی اس بات کے بارے میں بتا دیتی کہ میں اسلام

قبول کر چکی ہوں مگر میں ابھی پوری طرح ان پر ڈپینڈنٹ ہوں۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ آپ

وہ واحد راستہ تھے جو مجھے نظر آیا۔ مجھے واقعی آپ سے محبت ہے پھر میں آپ کو شادی کی پیشکش نہ کرتی تو

اور کیا کرتی آپ اس صورت حال کا اندازہ نہیں کر سکتے جس کا سامنا میں کر رہی ہوں..... میری جگہ پر

ہوتے تو آپ کو اندازہ ہوتا کہ میں جھوٹ بولنے کے لئے کتنی مجبور ہو گئی تھی۔“

جلال کچھ کہے بغیر پاس موجود ٹکڑی کے بچا پر بیٹھ گیا وہ اب پریشان نظر آ رہا تھا۔ امامہ نے اپنی

آنکھیں پونچھ لیں۔

”کیا آپ کے دل میں میرے لئے کچھ بھی نہیں ہے؟ صرف اس لئے ساتھ انوالو ہیں،

کیونکہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں؟“

جلال نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے کہا۔

”امامہ! بیٹھ جاؤ..... پورا بیٹھو اور اہا کس مکمل گیا ہے میرے سامنے۔ اگر میں تمہاری صورت حال

کا اندازہ نہیں کر سکتا تو تم بھی میری پوزیشن کو نہیں سمجھ سکتیں۔“

امامہ اس سے کچھ فاصلے پر رکھی بچا پر بیٹھ گئی۔

”میرے والدین کبھی غیر مسلم لڑکی سے میری شادی نہیں کریں گے۔ قطع نظر اس کے کہ میں

اس سے محبت کرتا ہوں یا نہیں۔“

”جلال! میں غیر مسلم نہیں ہوں۔“

”تم اب نہیں ہو مگر پہلے تو تھیں اور پھر تمہارا خاندان.....“

”میں ان دونوں چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں کر سکتی۔“ امامہ نے بے بسی سے کہا۔

جلال نے جواب میں کچھ نہیں کہا کچھ دیر وہ دونوں خاموش رہے۔

"کیا آپ اپنے پیرئٹس کی مرضی کے بغیر مجھ سے شادی نہیں کر سکتے؟" کچھ دیر بعد امام نے کہا۔
 "یہ بہت بڑا قدم ہو گا۔" جلال نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور بالفرض میں یہ کام کرنے کا
 سوچ لوں تو بھی نہیں ہو سکتا۔ تمہاری طرح میں بھی اپنے پیرئٹس پر ڈیپنڈنٹ ہوں۔" جلال نے اپنی
 مجبوری بتائی۔

"مگر آپ ہاؤس جاب کر رہے ہیں اور چند سالوں میں اسٹیبلش ہو جائیں گے۔" امام نے کہا۔
 "میں ہاؤس جاب کے بعد اسوشلائزیشن کے لئے باہر جانا چاہتا ہوں اور یہ میرے پیرئٹس کی مالی
 مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اسوشلائزیشن کے بعد ہی میں واپس آ کر اپنی پیکش اسٹیبلش کر سکتا ہوں اور
 تین چار سال اپنی اسٹیڈیز ختم کرنے میں بھی لگ جائیں گے۔"

جلال نے اسے یاد دلایا۔

"پھر؟" امام نے اسے مایوسی سے دیکھا۔

"پھر یہ کہ مجھے سوچنے کا وقت دو۔ شاید میں کوئی رستہ نکال سکوں، میں تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتا
 مگر میں اپنا کیریئر بھی خراب نہیں کر سکتا۔ میرا پر اہم صرف یہ ہے کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے جو کچھ
 ہے ماں باپ کا ہے اور وہ اپنی ساری جمع پونجی مجھ پر خرچ کر رہے ہیں یہ سوچ کر کہ میں کل کو ان کے لئے
 کچھ کروں گا۔"

وہ بات کرتے کرتے رکا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمہارے والدین اپنی مرضی سے تمہاری شادی
 مجھ سے کر دیں۔ اس صورت میں کم از کم میرے والدین کو یہ اعتراض تو نہیں ہو گا کہ تم نے اپنے والدین
 کی مرضی کے خلاف انہیں بتائے بغیر مجھ سے شادی کی ہے؟"

وہ جلال کا چہرہ دیکھنے لگی۔ "میں نہیں جانتی..... ایسا ہو سکتا ہے یا نہیں۔ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔
 وہ میری بات مانیں گے یا نہیں۔ میں....." امام نے کچھ مایوسی کے عالم میں بات اور حوری چھوڑ دی۔
 جلال بات مکمل ہونے کا انتظار کرتا رہا۔

"میری فیملی میں آج تک کسی لڑکی نے اپنی مرضی سے باہر کسی لڑکے سے شادی نہیں کی۔ اس لئے
 میں یہ نہیں بتا سکتی کہ ان کا رد عمل کیا ہو گا مگر میں یہ ضرور بتا سکتی ہوں کہ ان کا رد عمل بہت برا ہو گا۔
 بہت برا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن مجھے یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ میں اتنا بڑا قدم اٹھاؤں۔
 آپ کو اندازہ ہونا چاہئے کہ میرے بابا کو کتنی شرمندگی اور بے عزتی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ صرف میرے
 لئے تو وہ سب کچھ نہیں بدل دیں گے۔"

"مگر مجھے اپنی فیملی سے مدد کی توقع ہوتی تو میں گھر سے باہر سہاروں کی تلاش میں ہوتی۔ نہ ہی
 آپ سے اس طرح مدد مانگ رہی ہوتی۔"

مجھے لہجے میں اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے اس نے جلال سے کہا۔
 "امام! میں تمہاری مدد کروں گا..... میرے پیرئٹس میری بات نہیں ٹالیں گے۔ سمجھانے میں
 کچھ وقت لگے گا مگر میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں انہیں منالوں گا۔ تم ٹھیک کہتی ہو کہ مجھے تمہاری مدد
 کرنی چاہئے۔"

وہ پر سوچ مگر کچھ اُلجھے ہوئے انداز میں اس سے کہہ رہا تھا۔ امام کو عجیب سی ڈھارس ہوتی۔ اسے
 جلال سے یہی توقع تھی۔

امام نے سوچا۔ "میرا احتساب فلا نہیں ہے۔"

☆.....☆.....☆

باب ۳

”میرا عقائد جو بڑا سجد کے علاوہ کسی دوسرے کی ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے احساس نہیں ہے کہ ابھی میں پڑھ رہی ہوں۔“ امام نے اپنی بھانجی سے کہا۔

”نہیں اسجد نے یا اس کے گھر والوں نے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ بابا خود تمہاری شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔“ امام کی بھانجی نے رسائیت سے جواب دیا۔

”بابا نے کہا ہے؟ مجھے یقین نہیں آرہا۔ جب میں نے میڈیکل میں ایڈمیشن لیا تھا تب ان کا دور دور تک ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ تو انگل اعظم سے بھی یہی کہتے تھے کہ وہ میرے ہاؤس جاب کے بعد ہی میری شادی کریں گے۔ پھر اب اچانک کیا ہوا؟“ امام نے بے یقینی سے کہا۔

”کوئی دباؤ ہو گا مگر مجھے تو امی نے یہی بتایا تھا کہ یہ خود بابا کی خواہش ہے۔“ بھانجی نے کہا۔

”آپ انہیں بتادیں کہ مجھے ہاؤس جاب سے پہلے شادی نہیں کرنی۔“

”ٹھیک ہے میں تمہاری بات ان تک پہنچا دوں گی مگر بہتر ہے تم اس سلسلے میں خود باہا سے بات کرو۔“ بھانجی نے اسے مشورہ دیا۔

بھانجی کے کمرے سے جانے کے بعد بھی وہ کچھ پریشانی سے وہیں بیٹھی رہی۔ یہ اطلاع اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ اس کے پیروں کے نیچے سے محاورے کا نہیں چھینتا زمین نکل گئی تھی۔ وہ مطمئن تھی کہ اس کی ہاؤس جاب تک اس کی شادی کا مسئلہ زیر بحث نہیں آئے گا اور ہاؤس جاب کرنے کے بعد وہ اس کاٹل ہو جائے گی کہ خود کو سپورٹ کر سکے یا اپنی جلال سے شادی کے بارے میں فیصلہ کر سکے۔ تب تک جلال بھی اپنی ہاؤس جاب تکمیل کر کے سیٹ ہو جاتا اور ان دونوں کے لئے کسی قسم کا کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہو تا مگر اب اچانک اس کے گھر والے اس کی شادی کی بات کر رہے تھے۔ آخر کیوں؟

”نہیں اسجد اور اس کے گھر والوں نے مجھ سے اس طرح کا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ میں نے خود ان سے بات کی ہے۔“

اس رات وہ ہاشم بیمن کے کمرے میں موجود تھی۔ اس کے استفسار پر ہاشم بیمن نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔

”بات بھی کر لی ہے؟ بابا! آپ مجھ سے پوچھے بغیر کس طرح میری شادی ارہنچ کر سکتے ہیں۔“ امام نے بے یقینی سے کہا۔

ہاشم بیمن نے کچھ سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ”یہ نسبت تمہاری مرضی سے ہی ملے ہوئی تھی۔ تم سے پوچھا گیا تھا۔“ انہوں نے جیسے اسے یاد دہانی کروائی۔

”منگنی کی بات اور تھی۔ شادی کی بات اور ہے..... آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ ہاؤس جاب سے پہلے آپ میری شادی نہیں کریں گے۔“ امام نے انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا۔

”تمہیں اس شادی پر اعتراض کیوں ہے۔ کیا تم اسجد کو پسند نہیں کرتیں؟“

”بات پسند یا ناپسند کی نہیں ہے۔ اپنی تعلیم کے دوران میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ آپ ابھی طرح جانتے ہیں کہ میں آئی اسپیشلسٹ بنا چاہتی ہوں۔ اس طرح آپ میری شادی کر دیں گے تو میرے تو سارے خواب ادھورے رہ جائیں گے۔“

”بہت سی لڑکیاں شادی کے بعد تعلیم تکمیل کرتی ہیں۔ تم اپنی فیملی میں دیکھو۔ کتنی.....“ ہاشم بیمن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

امام نے ان کی بات کاٹ لی۔ ”وہ لڑکیاں بہت ذہین اور کاٹل ہوتی ہوں گی۔ میں نہیں ہوں۔ میں ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتی ہوں۔“

”میں اعظم بھائی سے بات کر چکا ہوں، وہ تو تاریخ طے کرنے کے لئے والے ہیں۔“ ہاشم

مبین نے اس سے کہا۔

”آپ میری ساری محنت کو ضائع کر رہے ہیں۔ اگر آپ کو میرے ساتھ بی بی کرنا تھا تو آپ کو چاہئے تھا کہ آپ اس طرح کا کوئی وعدہ ہی نہ کرتے۔“ امامہ نے ان کی بات پر ناراضی سے کہا۔

”جب میں نے تم سے وعدہ کیا تھا تب کی بات اور تھی..... جب حالات اور تھے اب۔“

امامہ نے ان کی بات کاٹتی۔ ”اب کیا بدل گیا ہے..... حالات میں کون سی تبدیلی آئی ہے جو آپ میرے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں؟“

”میں تمہیں یقین دلانا ہوں کہ اسجد تمہاری تعلیم میں تمہارے ساتھ پورا تعاون کرے گا۔ وہ تمہیں کسی چیز سے منع نہیں کرے گا۔“ ہاشم مبین نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”بابا مجھے اسجد کے تعاون کی ضرورت نہیں ہے مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ آپ مجھے میری تعلیم مکمل کرنے دیں۔“ امامہ نے اس بار قدرے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

”امامہ تم فضول ضد مت کرو..... میں وہی کروں گا جو میں طے کر چکا ہوں۔“ ہاشم مبین نے وہ ٹوک انداز میں کہا۔ ”میں ضد نہیں کر رہی اور خواست کر رہی ہوں۔ پلیز بابا میں ابھی اسجد سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔“ اس نے ایک بار پھر اسی ملتجیانہ انداز میں کہا۔

”تمہاری نسبت کو چار سال ہونے والے ہیں اور یہ ایک بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ اگر انہوں نے خود کچھ عرصے کے بعد کسی نہ کسی وجہ سے منگنی توڑ دی تو۔“

”تو کوئی بات نہیں کوئی قیامت نہیں آئے گی وہ منگنی توڑنا چاہیں تو توڑ دیں بلکہ ابھی توڑ دیں۔“

”تمہیں اس شرمندگی اور بے عزتی کا احساس نہیں ہے، جس کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

”کیسی شرمندگی بابا! یہ ان لوگوں کا اپنا فیصلہ ہو گا۔ اس میں ہماری تو کوئی غلطی نہیں ہوگی۔“ اس نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے یا پھر تم عقل سے بیہل ہو۔“ ہاشم مبین نے اسے ہمزکتے ہوئے کہا۔

”بابا! کچھ نہیں ہو گا لوگ دو چار دن باتیں کریں گے پھر سب کچھ بھول جائیں گے۔ آپ اس بارے میں خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔“ امامہ نے قدرے بے لگاری اور لاپرواہی سے کہا۔

”تم اس وقت بہت فضول باتیں کر رہی ہو۔ فی الحال تم یہاں سے جاؤ، ہاشم مبین نے ناگواری سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

امامہ بادل ناخواستہ وہاں سے چلی آئی مگر اس رات وہ خاصی پریشان رہی۔ اگلے دن وہ وہاں لاہور چلی آئی ہاشم مبین نے اس سے اس سلسلے میں دو بارہ بات نہیں کی لاہور آ کر وہ قدرے مطمئن ہو گئی اور ہر خیال کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے اپنے امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔

ہاشم مبین نے اس واقعہ کو ذہن سے نہیں نکالا تھا، وہ ایک انتہائی محتاط طبیعت کے انسان تھے۔ وہ امامہ کے بارے میں پہلی بار اس وقت تشویش میں مبتلا ہوئے تھے، جب اسکول میں تحریم کے

ساتھ جھگڑے والا واقعہ پیش آیا تھا۔ اگرچہ وہ کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ نہیں تھا مگر اس واقعے کے بعد انہوں نے احتیاطی تدابیر کے طور پر امامہ کی نسبت اسجد کے ساتھ طے کر دی تھی۔ ان کا خیال تھا اس

طرح اس کا ذہن ایک نئے رشتے کی جانب مبذول ہو جائے گا اور اگر اس کے ذہن میں کوئی شبہ یا سوال پیدا ہو ابھی تو اس نئے تعلق کے بعد وہ اس بارے میں زیادہ تردد نہیں کرے گی۔ ان کا یہ خیال اور اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔

امامہ کا ذہن واقعی تحریم کی طرف سے ہٹ گیا تھا۔ اسجد میں وہ پہلے کچھ دلچسپی لیتی تھی مگر اس تعلق کے قائم ہونے کے بعد اس دلچسپی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ہاشم نے اسے بہت مطمئن اور رگن دیکھا تھا۔

وہ پہلے ہی کی طرح تمام مذہبی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتی تھی۔ مگر اس بار جو کچھ وہ سم نے انہیں بتایا تھا اس نے ان کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال دی تھی۔

وہ فوری طور پر یہ نہیں جان سکے مگر انہیں یہ ضرور علم ہو گیا کہ امامہ کے عقائد اور نظریات میں خاصی تبدیلی آچکی تھی اور یہ نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کے پورے خاندان کے لئے بڑی تشویش کا باعث تھا۔

وہ اپنی بڑی نشیبی کی طرح اسے بھی اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتے تھے اور یہ اس لئے بھی اہم تھا کہ اسے شادی کے بعد خاندان ہی میں جانا تھا۔ وہ خاندان بہت تعلیم یافتہ تھا۔ خود ان کا ہونے والا امامہ اسجد بھی

امامہ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتا تھا۔ ہاشم مبین کے لئے اس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے اسے گھر بٹھالینا آسان نہ تھا، کیونکہ اس صورت میں اسے اعظم مبین کو اس کی وجہ بتانی پڑتی اور امامہ سے سخت ناراض ہونے کے باوجود وہ نہیں چاہتے تھے کہ اعظم مبین اور ان کا خاندان امامہ کے ان بدلے ہوئے عقائد

کے بارے میں جان کر برگشتہ اور بدعین ہوں اور پھر شادی کے بعد وہ اسجد کے ساتھ بڑی زندگی گزارے۔ انہوں نے ایک طرف اپنے گھر والوں کو اس بات کو راز رکھنے کی تاکید کی تو دوسری طرف

امامہ کی منت سماجت پر اسے اپنی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ امامہ صبر کے ٹیکہ اٹھانے اور اس کے ہاں جانے یا اجلال سے ملنے کے معاملے میں اس قدر

مختار تھی کہ اس کا یہ میل جول ان لوگوں کی نظروں میں نہیں آسکا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ جو برے اور رابعد کو بھی ہر چیز کے بارے میں اندھیرے میں رکھے ہوئے تھی۔ ورنہ اس کے بارے

میں ضرور کوئی نہ کوئی خبر اور حیرانہ گردش کرتی اور ہاشم مبین تک بھی پہنچ جاتی مگر ایسا نہیں ہوا ہاشم مبین اس کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے، مگر امامہ کے اندر آنے والی ان تبدیلیوں نے انہیں تشویش

میں مبتلا کر دیا تھا۔

ان کے دماغ میں جو واحد عمل آیا تھا وہ اس کی شادی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس کی شادی کر دینے سے کم از کم وہ خود امامہ کی ذمہ داری سے مکمل طور پر آزاد ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اس طرح اپنا کام اس کی شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”جلال! میرے جیڑنٹس امجد سے میری شادی کر دینا چاہتے ہیں۔“ لاہور آنے کے بعد امامہ نے سب سے پہلے جلال سے ملاقات کی تھی۔

”مگر تم تو کہہ رہی تھیں کہ وہ تمہاری ہاؤس جا ب تک تمہاری شادی نہیں کریں گے۔“ جلال نے کہا۔
”وہ ایسا ہی کہتے تھے، مگر اب وہ کہتے ہیں کہ میں اپنی تعلیم شادی کے بعد بھی جاری رکھ سکتی ہوں۔“ امجد لاہور میں گھر لے لے گا تو میں زیادہ آسانی سے اپنی تعلیم مکمل کر سکوں گی۔“

جلال اس کے چہرے سے اس کی پریشانی کا اندازہ کر سکتا تھا۔ جلال بھی یک دم فکر مند ہو گیا۔
”جلال! میں امجد سے شادی نہیں کر سکتی۔ میں کسی صورت امجد سے شادی نہیں کر سکتی۔“ وہ بیڑائی۔
”پھر تم اپنے جیڑنٹس کو صاف صاف بتا دو۔“ جلال نے یک دم کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔
”کیا بتاؤں؟“

”یہی کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو۔“

”آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ وہ کس طرح ری ایکٹ کریں گے..... مجھے انہیں بھر سب کچھ ہی بتانا پڑے گا۔“ وہ بات کرتے کرتے کچھ سوچنے لگی۔

”جلال! آپ اپنے جیڑنٹس سے میرے سلسلے میں بات کریں۔ آپ انہیں میرے بارے میں بتائیں۔ اگر میرے جیڑنٹس نے مجھ پر اور دباؤ ڈالا تو پھر مجھے اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا، پھر مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔“

”امامہ! میں اپنے جیڑنٹس سے بات کروں گا۔ وہ رضامند ہو جائیں گے۔ میں جانتا ہوں میں انہیں مناسکتا ہوں۔“ جلال نے اسے یقین دلایا پوری انگٹو کے دوران کھلی بار امامہ کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔
انگلے چند ہفتے وہ اپنے بیچرے کے سلسلے میں مصروف رہی، جلال سے بات نہ ہو سکی۔ آخری بیچرے والے دن وہ سیم سے لینے کے لئے لاہور آ گیا تھا۔ وہ اسے وہاں یوں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”وسیم! میں ابھی تو نہیں جا سکتی۔ آج تو میں بیچرے سے فارغ ہوئی ہوں مجھے ابھی یہاں کچھ کام ہیں۔“
”میں کل تک یہیں ہوں۔ اپنے دوست کے ہاں ٹھہر جاتا ہوں جب تم تک اپنے کام نٹھالو پھر آکھٹے چلیں گے۔“ وسیم نے اس کے لئے معافیت کا آخری راستہ بھی بند کر دیا۔

”میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔“ امامہ نے کچھ بے دلی سے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ اسے اندازہ تھا کہ وسیم اسے ساتھ لے کر ہی جائے گا۔

”تم اپنی چیزیں بیک کر لوں۔ اب تم ساری چھٹیاں وہاں گزار کر ہی آنا۔“ اسے واپس مڑتے دیکھ کر وہ سیم نے کہا۔

اس نے سر ہلادیا مگر اس کا اپنی تمام چیزیں بیک کرنے یا اسلام آباد میں ساری چھٹیاں گزارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے طے کیا تھا کہ وہ چند دن وہاں گزار کر کسی نہ کسی بہانے سے واپس لاہور آ جائے گی اور یہ ہی اس کی غلط فہمی تھی۔

رات کے کھانے پر وہ سب گھر والوں کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی اور سب خوش گپوں میں مصروف تھے۔

”بیچرے کیسے ہوئے تمہارے؟“ ہاشم مبین نے کھانا کھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”بہت اچھے ہوئے۔ ہمیشہ کی طرح۔“ اس نے چاول کا چمچ منہ سے ڈالتے ہوئے کہا۔

”دیری گڈ۔ چلو کم از کم بیچرے کی ٹینشن تو ختم ہوئی۔ اب تم کل سے اپنی ٹاپنگ شروع کر دو۔“

امامہ نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ ”ٹاپنگ؟ کیسی ٹاپنگ؟“

”فرنیچر کی اور جیولرز کے پاس پہلے چلے جانا تم لوگ۔ باقی چیزیں تو آہستہ آہستہ ہوتی رہیں گی۔“

ہاشم مبین نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس بار اپنی بیوی سے کہا۔

”بابا! مگر کس لئے؟“ امامہ نے ایک بار پھر پوچھا۔ ”تمہاری امی نے بتایا نہیں تھیں کہ ہم نے

تمہاری شادی کی تاریخ طے کر دی ہے۔“

امامہ کے ہاتھ سے چمچ چھوٹ کر پیٹ میں جاگرا۔ ایک لمحہ میں اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

”میری شادی کی تاریخ؟“ اس نے بے یقینی سے باری باری سسلی اور ہاشم کو دیکھا جو اس کے

تاثرات پر حیران نظر آ رہے تھے۔

”ہاں تمہاری شادی کی تاریخ.....“ ہاشم مبین نے کہا۔

”یہ آپ کیسے کر سکتے ہیں؟ مجھ سے پوچھے بغیر۔ مجھے بتائے بغیر۔“ ہوتی چہرے کے ساتھ انہیں

دیکھ رہی تھی۔

”تم سے گھٹی دفعہ بات ہوئی تھی، اس سلسلے میں۔“ ہاشم مبین یک دم سنجیدہ ہو گئے۔

”اور میں نے انکار کر دیا تھا۔ میں۔“

ہاشم مبین نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ ”میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ مجھے تمہارے انکار کی

کوئی پروا نہیں ہے۔ میں امجد کے گھر والوں سے بات کر چکا ہوں۔“ ہاشم مبین نے تیز آواز میں کہا۔

ڈانٹنگ ٹھیل پر یک دم گہری خاموشی چھا گئی تھی کوئی بھی کھانا نہیں کھا رہا تھا۔

امامہ یک دم اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ ”آئی ایم سوری بابا، مگر میں امجد سے ابھی شادی نہیں کر

سکتی۔ آپ نے یہ شادی طے کی ہے۔ آپ ان سے بات کر کے اسے ملتوی کر دیں۔ ورنہ میں خود ان سے بات کر لوں گی۔" ہاشم مبین کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"تم اسجد سے شادی کرو گی اور اسی تاریخ کو جو میں نے طے کی ہے۔ تم نے سنا؟" وہ بے اختیار چلائے۔
"It's not fair" امامہ نے بھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم اب مجھے یہ بتاؤ گی کیا فیصلہ ہے اور کیا نہیں۔ تم بتاؤ گی مجھے؟" ہاشم مبین کو اس کی بات پر اور غصہ آیا۔

"بابا! جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی تو آپ زبردستی کیوں کر رہے ہیں میرے ساتھ۔" امامہ بے اختیار رونے لگی۔

"گر رہا ہوں زبردستی پھر میں حق رکھتا ہوں۔" وہ چلائے۔ امامہ اس بار کچھ کہنے کے بجائے اپنے ہونٹ جھپٹتے ہوئے سرخ چہرے کے ساتھ تیزی سے ڈانٹنگ روم سے نکل گئی۔

"میں اس سے بات کرتی ہوں، آپ پلیز کھانا کھائیں۔ اتنا غصہ نہ کریں۔ وہ جذباتی ہے اور کچھ نہیں۔" سلمیٰ نے ہاشم مبین سے کہا اور خود وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ان کے کمرے سے نکلنے ہی وہیم کو دیکھ کر امامہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔
"تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ نکل جاؤ۔" اس نے تیزی سے وہیم کے پاس جا کر اسے دھکا دینے کی

کوشش کی۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔
"کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے؟"

"جھوٹ بول کر اور دھوکا دے کر تم مجھے یہاں لے کر آئے ہو۔ مجھے اگر لاہور میں پتہ چل جاتا کہ تم اس لئے مجھے اسلام آباد لا رہے ہو تو میں کبھی یہاں نہ آتی۔" وہ حاضری۔

"میں نے وہی کیا جو مجھ سے بابا نے کہا۔ بابا نے کہا تھا میں تمہیں نہ بتاؤں۔" وہیم نے وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی۔

"پھر تم یہاں میرے پاس کیوں آئے ہو۔ بابا کے پاس جاؤ۔ ان کے پاس بیٹھو۔ بس یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" وہیم ہونٹ جھپٹتے اسے دیکھتا رہا پھر کچھ کہے بنا کمرے سے نکل گیا۔

امامہ اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کے بیروں کے نیچے سے صحیح معنوں میں زمین نکل چکی تھی۔ یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر والے اس کے ساتھ اس طرح

کر سکتے ہیں۔ وہ اسے قدامت پرست یا کٹر نہیں تھے جتنے وہ اس وقت ہو گئے تھے۔ اسے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ مجھے اس صورت حال کا سامنا کرنا ہے۔ مجھے ہمت نہیں ہارنی۔ مجھے کسی نہ کسی طرح فوری طور جلال سے کالمیکٹ کرنا ہے۔ وہ یقیناً اب تک

اپنے بیٹرس سے بات کر چکا ہو گا۔ اس سے بات کر کے کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔

وہ بے چینی سے کمرے میں بیٹھتے ہوئے سوچتی رہی۔ اس کے کمرے میں دوبارہ کوئی نہیں آیا۔

رات بارہ بجے کے بعد وہ اپنے کمرے سے نکلی۔ وہ جانتی تھی۔ اس وقت تک سب سونے کے لئے جا چکے ہوں گے۔ اس نے جلال کے گھر کا نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا۔ فون کسی نے نہیں اٹھایا۔ اس نے

یکے بعد دیکرے کئی بار نمبر ملایا۔ آدھ گھنٹہ تک اسی طرح کالز کرتے رہنے کے بعد اس نے ماہوسی کے ساتھ فون رکھ دیا۔ وہ جو یہ یاد ابھارے فون نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دونوں اس وقت ہاسٹل میں تھیں۔ کچھ

دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے صبیحہ کا نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا۔ اس کے والد نے فون اٹھایا تھا۔
"بیٹا! صبیحہ تو پشاور گئی ہے اپنی امی کے ساتھ۔" صبیحہ کے والد نے امامہ کو بتایا۔

"پشاور؟" امامہ کے دل کی دھڑکن رک گئی۔

"اس کے کزن کی شادی ہے، وہ لوگ ذرا پہلے چلے گئے ہیں۔ میں بھی نکل چلا جاؤں گا۔" اس کے والد نے بتایا۔ "کوئی پیغام ہو تو آپ مجھے دے دیں میں صبیحہ کو پتہ چاؤں گا۔"

"نہیں شکریہ اٹھلا!" وہ ان کے ساتھ اس سارے معاملے کے بارے میں کیا بات کر سکتی تھی۔
اس نے فون رکھ دیا۔ اس کے ڈپریشن میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ اگر میرا جلال سے کالمیکٹ نہ ہو تو اس کا

دل ایک بار پھر ڈوبنے لگا۔
ایک بار پھر اس نے جلال کا نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا اور تب ہی کسی نے اس کے ہاتھ سے

ریسیور لے لیا۔ وہ سن ہو گئی ہاشم مبین اس کے پیچھے کھڑے تھے۔
"کس کو فون کر رہی ہو؟" ان کے لہجے میں بے حد غمراہی تھا۔

"دوست کو کر رہی تھی۔" امامہ نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ ان سے نظریں ملا کر جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔

"میں ملتا ہوں۔" انہوں نے سرد آواز میں کہتے ہوئے ری ڈائل کا فن دہا دیا اور ریسیور کان سے لگا لیا۔ امامہ زرد چہرے کے ساتھ انہیں دیکھنے لگی۔ وہ کچھ دیر تک اسی طرح ریسیور کان سے لگائے

کھڑے رہے پھر انہوں نے ریسیور کرڈیل پر رکھ دیا۔ یقیناً دوسری طرف سے کال رہا ہو نہیں کی گئی تھی۔
"کون سی دوست ہے یہ تمہاری جس کو تم اس وقت فون کر رہی ہو۔" انہوں نے درشت لہجے

میں امامہ سے پوچھا۔

"نہیں....." فون کی اسکرین پر نہیب کا نمبر تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ ہاشم مبین کو نہیب پر کسی قسم کا شک ہو اور وہ جلال تک جا پہنچیں، اس لئے اس نے ان کے استفسار پر جلدی سے اس کا نام بتا دیا۔

"کس لئے کر رہی ہو؟"

"میں اس کے ذریعے جویر یہ تک ایک پیغام پہنچانا چاہتی ہوں۔" اس نے جمل سے کہا۔
 "تم مجھے وہ پیغام دے دو، میں جویر یہ تک پہنچا دوں گا، بلکہ ذاتی طور پر خود لاہور دے کر آؤں گا۔
 اماں! مجھے صاف صاف بتاؤ کسی اور لڑکے میں انٹرنلڈ ہو تم؟" انہوں نے کسی تمہید کے بغیر
 اچانک اس سے پوچھا۔ وہ انہیں کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔
 "ہاں!"

ہاشم مبین دم بخود رہ گئے۔ "کسی اور لڑکے میں انٹرنلڈ ہو؟" انہوں نے بے یقینی سے اپنا جملہ
 دہرایا۔ اماں نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہاشم مبین نے بے اختیار اس کے چہرے پر تھپڑ کھینچ کر کہا۔
 "مجھے اسی بات کا اندیشہ تھا تم سے، مجھے اسی بات کا اندیشہ تھا۔" وہ غصے میں تنک سے گئے۔ اماں
 گم صم اپنے گال پر ہاتھ رکھے انہیں دیکھ رہی تھی۔ یہ پہلا تھپڑ تھا جو ہاشم مبین نے اس کی زندگی میں اسے
 مارا تھا اور اماں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ تھپڑ اسے مارا گیا تھا۔ وہ ہاشم مبین کی سب سے لاڈلی بیٹی تھی پھر
 بھی انہوں نے۔ اس کے گالوں پر آنسو بہہ نکلے تھے۔

"اسجد کے علاوہ میں تمہاری شادی کبھی اور نہیں ہونے دوں گا۔ تم اگر کسی اور لڑکے میں انٹرنلڈ
 ہو بھی تو اسے ابھی اور اسی وقت بھول جاؤ۔ میں کبھی..... کبھی..... کبھی تمہاری کبھی اور شادی نہیں ہونے
 دوں گا۔ اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ اور دوبارہ اگر میں نے تمہیں فون کے پاس بھی دیکھا تو میں
 تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

وہ اسی طرح گال پر ہاتھ رکھے میکانگی انداز میں چلتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی۔ اپنے کمرے
 میں آکر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "کیا بابا مجھے..... مجھے اس طرح مار سکتے ہیں؟"
 اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ بہت دیر تک اسی طرح روتے رہنے کے بعد اس کے آنسو خود بخود خشک ہونے
 لگے۔ وہ اٹھ کر اضطراب کے عالم میں اپنے کمرے کی کھڑکی کی طرف آگئی اور خالی الذہنی کے عالم میں بند
 کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر دیکھنے لگی۔

نیچے اس کے گھر کا لان نظر آ رہا تھا جو نیم تاریک تھا اور پھر لاشوری طور پر اس کی نظر دوسرے
 گھر پر پڑی۔ وہ سالار کا گھر تھا۔ اس کا کمرہ ٹھلی منزل پر تھا۔ دور سے کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے
 باوجود وہ اس گھر میں ایک دفعہ جانے کے بعد اس کی لوکیشن اور کمرے میں پھرنے والے کے طبعے اور
 جسامت سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ سالار کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

"ہاں! یہ شخص میری مدد کر سکتا ہے۔ اگر میں اسے ساری صورت حال بتاؤں اور اس سے کہوں کہ
 لاہور جا کر جلال سے رابطہ کرے تو..... تو میرا مسئلہ حل ہو سکتا ہے مگر اس سے رابطہ کیسے.....؟"

اس کے ذہن میں یک دم اس کی گاڑی کے پچھلے شیشے پر لکھا ہوا اس کا موبائل نمبر اور نام یاد آیا۔
 اس نے ذہن میں موبائل نمبر کو دہرایا، اسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ کاغذ کا ایک ٹکڑا لے کر اس نے احتیاط
 کے طور پر اس نمبر کو لکھ لیا۔ تین بیجے کے قریب وہ آہستہ آہستہ ایک بار پھر لاؤنج میں آگئی اور اس نے
 وہ نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا۔

☆.....☆.....☆

سالار نے نیند میں اپنے موبائل کی صیپ سنی تھی۔ جب لگا چار موبائل جتارہا تو اس نے آنکھیں
 کھول دیں اور قدرے ناگواری کے عالم میں بیڈ سائیڈ ٹیبل کو ٹٹولتے ہوئے موبائل اٹھایا۔
 "ہیلو!" اماں نے سالار کی آواز پہچان لی تھی، وہ فوری طور پر کچھ نہیں بول سکی۔
 "ہیلو۔" اس کی خوابیدہ آواز دوبارہ سنائی دی۔ "سالار!" اس نے اس کا نام لیا۔
 "بول رہا ہوں۔" اس نے اسی خوابیدہ آواز میں کہا۔

"میں اماں بول رہی ہوں۔" وہ کہنے والا تھا۔ "کون اماں..... میں کسی اماں کو نہیں جانتا۔" مگر اس
 کے دماغ نے کرنت کی طرح اسے شکل دیا تھا اس نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں۔ وہ نام کے ساتھ
 اس آواز کو بھی پہچان چکا تھا۔

"میں وہم کی بہن بول رہی ہوں۔" اس کی خاموشی پر اماں نے اپنا تعارف کرایا۔
 "میں پہچان چکا ہوں۔" سالار نے ہاتھ بڑھا کر بیڈ سائیڈ لیپ کو آن کر دیا۔ اس کی نیند غائب ہو
 چکی تھی۔ ٹیبل پر پڑی ہوئی اپنی رست واپس آٹھا کر وقت دیکھا۔ گھڑی تین بج کر دس منٹ بجا رہی تھی۔
 اس نے قدرے بے یقینی سے ہونٹ سکڑتے ہوئے گھڑی کو دوبارہ ٹیبل پر رکھ دیا۔ دوسری طرف اب
 خاموشی تھی۔

"ہیلو!" سالار نے اسے مخاطب کیا۔

"سالار! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" سالار کے ماتھے پر کچھ بل آئے۔ "میں نے ایک بار
 تمہاری زندگی پہچانی تھی، اب میں چاہتی ہوں تم میری زندگی بچاؤ۔" وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی
 بات سنتا رہا۔ "میں لاہور میں کسی سے رابطہ کرنا چاہتی ہوں مگر کون نہیں پتا رہی۔"
 "کیوں؟"

"وہاں سے کوئی فون نہیں آٹھا رہا۔"

"تم رات کے اس وقت....."

اماں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "پلیز! اس وقت صرف میری بات سنو، میں دن کے وقت فون
 نہیں کر سکتی اور شاید کل رات کو بھی نہ کر سکوں۔ میرے گھر والے مجھے فون نہیں کرنے دیں گے، میں

چاہتی ہوں کہ تم ایک ایڈریس اور فون نمبر نوٹ کر لو اور اس پر ایک آدمی سے کاٹیکٹ کرو۔ اس کا نام جلال انصر ہے، تم اس سے صرف یہ پوچھ کر بتا دو کہ کیا اس نے اپنے پیرٹس سے بات کی ہے اور اگر کی ہے تو ان کا کیا ریسپانس ہے، اسے یہ بھی بتا دو کہ میرے پیرٹس نے یہاں میری شادی طے کر دی ہے اور وہ مجھے اب شادی کے بغیر لاہور آنے نہیں دیں گے۔“

سالار کو اچانک اس سارے معاملے سے دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ کبل کو اپنے گھنٹوں سے اوپر تک کھینچتے ہوئے وہ امامہ کی بات سنتا رہا۔ وہ ایک ایڈریس اور فون نمبر دہرا رہی تھی۔ سالار نے اس نمبر اور ایڈریس کو نوٹ نہیں کیا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس نے پوچھا۔

”اور اگر میرے فون کرنے پر بھی کسی نے فون نہیں اٹھایا تو؟“ جب وہ خاموش ہو گئی تو اس

نے پوچھا۔

دوسری طرف لمبی خاموشی رہی پھر امامہ نے کہا۔ ”تم لاہور جا کر اس آدمی سے مل سکتے ہو۔۔۔۔۔

پلیز۔۔۔۔۔ یہ میرے لئے بہت ضروری ہے۔۔۔۔۔“ اس بار امامہ کی آواز ملتجیانہ تھی۔

”اور اگر اس نے پوچھا کہ میں کون ہوں تو؟“

”تم جو چاہے اسے بتا دینا۔۔۔۔۔ مجھے اس سے دلچسپی نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں صرف اس مصیبت سے چھٹکارا

چاہتی ہوں۔“

”کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم اس آدمی سے خود بات کرو۔“ سالار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ شاید مجھے وہ بارہ فون کا موقع نہ ملے اور فی الحال تو آدمی فون ریسپو نہیں کر رہا۔“

سالار نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا اور اس نے مایوسی کے عالم میں مزید کچھ کہے بغیر فون رکھ دیا۔

سالار موٹا بلبل بند کرنے کے بعد کچھ دیر اسے ہاتھ میں لے کر بیٹھا رہا۔ جلال انصر۔۔۔۔۔ امامہ ہاشم۔۔۔۔۔ رابطہ۔۔۔۔۔ پیرٹس سے بات۔۔۔۔۔ زبردستی کی شادی۔۔۔۔۔ اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے اس جکسا پزل کے ٹکڑوں کو جوڑنا شروع کر دیا۔ اس نے امامہ سے جلال کے بارے میں پوچھا نہیں تھا مگر وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس سے امامہ کا تعلق کس طرح کا ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی داہنی ٹانگ ہلاتے ہوئے ان دونوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے یہ صورت حال خاصی دلچسپ محسوس ہو رہی تھی کہ امامہ جیسی لڑکی اس طرح کے کسی انصر میں الوانو ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے لئے اس کی ٹائپنگ سے بھی واقف تھا اور اسے یہ بات بھی حیران کر رہی تھی کہ اس کے باوجود وہ اس سے مدد مانگ رہی تھی۔

”یہ کیا کر رہی ہیں خاتون۔۔۔۔۔؟ مجھے استعمال کرنے کی کوشش۔۔۔۔۔ یا پھسانے کی کوشش۔۔۔۔۔؟“

اس نے دلچسپی سے سوچا۔

کبل اپنے سینے تک کھینچتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں، مگر نیند اس کی آنکھوں سے مکمل طور پر دور تھی۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے وہیں اور اس کے سارے گھروالوں کو جانتا تھا۔ وہ امامہ کو بھی سرسری طور پر دیکھ چکا تھا۔۔۔۔۔ مگر ان ملاقاتوں میں اس نے امامہ پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کے اپنے گھروالوں کے برعکس وہیم کا گھرانہ خاصا راہبیت پرست تھا اور وہ کبھی بھی اس طرح کبلے عام ان کے گھر نہیں جا سکا، جس طرح وہ اپنے دوسرے دوستوں کے گھروں میں جاتا تھا۔ مگر اس نے اس بات پر بھی کبھی زیادہ غور و خوض نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ اس کا خیال تھا کہ ہر خاندان کا اپنا ماحول اور روایات ہوتی ہیں، اسی طرح وہیم کے خاندان کی بھی اپنی روایات تھیں۔ اسے امامہ کے موڈ اور ٹیمپریمنٹ کا تھوڑا اندازہ تھا۔

مگر اس طرح اچانک امامہ کی کال وصول کر کے وہ اس حیرت کے جھٹکے سے سنبھل نہیں پارہا تھا جو اسے لگا تھا۔

جب وہ کافی دیر تک سونے میں کامیاب نہیں ہوا تو وہ کچھ جھنجھکا گیا۔

To hell with Imama and all the rest (بھاڑ میں جائے امامہ اور یہ سارا قصہ) وہ بڑبڑایا

اور کروٹ لے کر اس نے تکیہ اپنے چہرے کے اوپر رکھ لیا۔

☆.....☆.....☆

امامہ اپنے کمرے میں آ کر بھی اسی طرح بیٹھی رہی، اسے اپنے پیٹ میں گرہیں پڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ صرف چند گھنٹوں میں سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ پوری رات سو نہیں سکی۔ صبح وہ ناشتہ کے لئے باہر آئی، اس کی بھوک یک دم جیسے غائب ہو گئی تھی۔

دس ساڑھے دس بجے کے قریب اس نے پوریات میں کچھ گاڑیوں کے اشارت ہونے اور جانے کی آوازیں سیں۔ وہ جانتی تھی اس وقت ہاشم مینن اور اس کے بڑے بھائی آفس چلے جاتے تھے اور اسے ان کے آفس جانے کا انتظار تھا۔ ان کے جانے کے آدھ گھنٹے بعد وہ اپنے کمرے سے باہر آئی۔ لاؤنج میں اس کی امی اور بھابھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ خاموشی سے فون کے پاس چلی گئی۔ اس نے فون کا ریسیور اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا تھا کہ اسے اپنی امی کی آواز سنائی دی۔

”تمہارے بابا کہہ کر گئے ہیں کہ تم کہیں فون نہیں کر دو گی۔“ اس نے گردن موڑ کر اپنی امی کو دیکھا۔

”میں امجد کو فون کر رہی ہوں۔“

”کس لئے؟“

”میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

"وہی فضول باتیں جو تم رات کو کر رہی تھیں۔" سہلی نے تیز لہجے میں کہا۔

"میں آپ کے سامنے بات کر رہی ہوں، آپ مجھے بات کرنے دیں۔ اگر میں نے کوئی غلط بات کی تو آپ فون بند کر سکتی ہیں۔" اس نے پرسکون انداز میں کہا اور شاید یہ اس کا انداز ہی تھا جس نے سہلی کو کچھ مطمئن کر دیا۔

امامہ نے نمبر ڈائل کیا مگر وہ اسجد کو فون نہیں کر رہی تھی۔ چند ہار بیل بچنے کے بعد دوسری طرف فون اٹھا لیا گیا۔ فون اٹھانے والا جلال ہی تھا۔ خوشی کی ایک لہر امامہ کے اندر سے گزر گئی۔

"ہیلو، میں امامہ بول رہی ہوں۔" اس نے جلال کا نام لئے بغیر احماد سے کہا۔

"تم بتائے بغیر اسلام آباد کیوں چلی گئیں میں کل تم سے ملنے ہاٹل گیا تھا۔" جلال نے کہا۔

"میں کل اسلام آباد آئی ہوں اسجد! امامہ نے کہا۔

"اسجد! دوسری طرف سے جلال کی آواز آئی۔ "تم کس سے کہہ رہی ہو؟"

"مجھے بابا نے رات ہی بتایا کہ میری شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے۔"

"امامہ؟" جلال کو جیسے ایک کرنٹ لگا۔ "شادی کی تاریخ۔" امامہ اس کی بات سنے بغیر اسی

پرسکون انداز میں بولتی رہی۔ "میں جانتا چاہتی ہوں کہ تم نے اپنے ہوش سے بات کی ہے؟"

"امامہ! میں ابھی بات نہیں کر سکا۔"

"تو پھر تم بات کرو، میں تمہارے علاوہ کس دوسرے سے شادی نہیں کر سکتی یہ تم جانتے ہو۔"

میں اس طرح کی شادی نہیں کروں گی۔ تم اپنے ہوش سے بات کرو اور پھر مجھے بتاؤ کہ وہ کیا کہتے ہیں۔"

"امامہ! کیا تمہارے پاس کوئی ہے؟" جلال کے ذہن میں اچانک ایک جھماکا ہوا۔

"ہاں۔"

"اس لئے تم مجھے اسجد کہہ رہی ہو؟"

"ہاں!"

"میں اپنے ہوش سے بات کرتا ہوں، تم مجھے دوبارہ تک کب کرو گی؟"

"تم مجھے بتاؤ کہ میں تمہیں کب تک کروں؟"

"کل فون کرو، تمہاری شادی کی تاریخ کب طے کی گئی ہے۔" جلال کی آواز میں پریشانی تھی۔

"یہ مجھے نہیں پتا۔" امامہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے امامہ! میں آج ہی اپنے ہوش سے بات کرتا ہوں۔ اور تم پریشان مت ہونا۔"

سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے امامہ کو تسلی دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔

امامہ نے شکر ادا کیا تھا کہ اس کی بھابھی باہمی کو یہ شک نہیں ہو سکا کہ وہ اسجد سے نہیں کسی اور سے

بات کر رہی تھی۔

"یہ شادی تمہارے باپ اور اعظم بھائی نے مل کر طے کی ہے۔ تمہارے یا اسجد کے کہنے پر وہ اس ملتوی نہیں کریں گے۔" سہلی نے اس بار قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"امی! میں مارکیٹ تک جا رہی ہوں، مجھے کچھ ضروری چیزیں ملنی ہیں۔" امامہ نے ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

"فون کی بات دوسری ہے مگر میں تمہیں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ تمہارے باپانہ صرف مجھے بلکہ چوکیدار کو بھی ہدایت کر گئے ہیں کہ تمہیں باہر جانے نہ دے۔"

"امی! آپ لوگ میرے ساتھ آخر اس طرح کیوں کر رہے ہیں؟" امامہ نے کچھ بے بسی کے عالم میں صوفے پر بیٹھے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کو اپنی شادی سے تو منع نہیں کیا۔ میری ہاؤس چاب تک انتظار کر لیں، اس کے بعد میری شادی کر دیں۔"

"میری کچھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم شادی سے انکار کیوں کر رہی ہو، تمہاری شادی جلدی ہو رہی ہے مگر تمہاری مرضی کے خلاف تو نہیں ہو رہی۔" اس بار اس کی بھابھی نے اسے سمجھانے کی

کوشش کی۔

"خود اتوار کل رات سے پورا گھر ٹینشن کا شکار ہے اور میں تو تمہیں دیکھ کر حیران ہوں تم تو کبھی بھی اس طرح ضد نہیں کرتی تمہیں پھر اب کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" جب سے تم لاہور گئی ہو بہت عجیب ہو گئی ہو تم۔"

"اور ہمارے چاہنے سے ویسے بھی کچھ نہیں ہو گا۔ میں نے تمہیں بتایا ہے، تمہارے باپانے طے کیا ہے یہ سب کچھ۔"

"آپ انہیں سمجھا تو سکتی تھیں۔" امامہ نے سہلی کی بات پر احتجاج کیا۔

"کس بات پر؟" سمجھاتی تو تب اگر مجھے کوئی بات قابل اعتراض لگتی اور مجھے کوئی بات قابل اعتراض نہیں لگتی۔" سہلی نے بڑے آرام سے کہا۔ امامہ ہنسنے کے عالم میں وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆.....☆.....☆

سالار صبح خلاف معمول دیر سے اٹھا۔ گھڑی دیکھتے ہوئے اس نے کانٹا نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ سکندر اور طیبہ کراچی گئے ہوئے تھے اور وہ گھر پر اکیلا ہی تھا۔ ملازم جس وقت ناشتہ لے کر آیا وہ بیوی آن کے بیٹھا تھا۔

"ذرا نامصرہ کو اندر بھیجنا۔" اسے ملازم کو دیکھ کر کچھ یاد آیا۔ اس کے جانے کے چند منٹ بعد نامصرہ اندر داخل ہوئی۔

”صاحب جی! آپ نے بلایا ہے؟“ ادھیڑ عمر ملازم نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں، میں نے بلایا ہے۔ تم سے ایک کام کروانا ہے۔“ سالار نے نیوی کا جینیل بدلتے ہوئے کہا۔
 ”ناصرہ! تمہاری بیٹی و سہم کے گھر کام کرتی ہے نا؟“ سالار اب ریٹوٹ دکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”ہاں صاحب کے گھر؟“ ناصرہ نے کہا۔

”ہاں، ان ہی کے گھر۔“
 ”ہاں جی کرتی ہے۔“ وہ کچھ حیران ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”کس وقت جاتی ہے وہ ان کے گھر؟“

”اس وقت ان کے گھر پر ہی ہے۔ کیا ہوا ہے۔ سالار صاحب؟“ ناصرہ اب کچھ پریشان نظر آنے لگی۔

”کچھ نہیں..... میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اس کے پاس جاؤ، یہ موبائل اسے دو اور اس سے کہو کہ یہ امامہ کو دے دے۔“ سالار نے بڑے لاپرواہ انداز میں اپنا موبائل اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

ناصرہ ہکا بکار ہو گئی۔ میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔

”یہ موبائل اپنی بیٹی کو دو اور اس سے کہو کسی کو بتائے بغیر یہ امامہ تک پہنچا دے۔“
 ”مگر کیوں؟“

”یہ جاننا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے، تمہیں جو کہا ہے وہی کرو۔“ سالار نے ناگواری کے عالم میں اسے جھڑکا۔

”لیکن اگر کسی کو وہاں پتا چل گیا تو.....“ ناصرہ کی بات کو اس نے درشتی سے کاٹ دیا۔

”کسی کو پتا چلے گا جب تم اپنا منہ کھولو گی..... اور تم اپنا منہ کھولو گی تو صرف تمہیں اور تمہاری بیٹی کو نقصان ہو گا اور کسی کو نہیں۔ لیکن اگر تم اپنا منہ بند رکھو گی تو نہ صرف کسی کو پتا نہیں چلے گا بلکہ تمہیں بھی خاصا فائدہ ہو گا۔“

ناصرہ نے اس بار کچھ کہے بغیر خاموشی سے وہ موبائل پکڑ لیا۔ ”میں پھر کہہ رہا ہوں۔ کسی کو اس موبائل کے بارے میں پتا نہیں چلنا چاہئے۔“ وہ اپنا دالٹ نکال رہا تھا۔

ناصرہ سر ہلاتے ہوئے جانے لگی۔ ”ایک منٹ ٹھہرو۔“ سالار نے اسے روکا۔ وہ اب اپنے دالٹ سے کچھ کرنسی نوٹ نکال رہا تھا۔

”یہ لے لو۔“ اس نے انہیں ناصرہ کی طرف بڑھا دیئے۔ ناصرہ نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ نوٹ پکڑ لئے۔ وہ جن گھروں میں کام کرتی رہی تھی وہاں کے بچوں کے ایسے بہت سے رازوں سے واقف تھی، اسے بھی پیسے کمانے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے فوری اندازہ بھی لگایا تھا کہ امامہ اور سالار

کا چکر چل رہا تھا اور یہ موبائل وہ تحفہ تھا جو اسے امامہ کو دینا تھا، مگر اسے حیرانی اس بات پر ہو رہی تھی کہ اس سب کا اسے پہلے پتا کیوں نہیں چلا..... اور پھر امامہ..... اس کی خوشامدی ہو رہی تھی..... پھر وہ کیوں اس طرح کی حرکتیں کر رہی تھی۔
 ”اور دیکھو ذرا مجھے، میں امامہ بی بی کو کتنا سیدھا سمجھتی رہی۔“ ناصرہ کو اب اپنا بے خبری پر افسوس ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

”ابو! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔“ جلال رات کو اپنے والد کے کمرے میں چلا آیا۔ اس کے والد اس وقت اپنی ایک فائل دیکھنے میں مصروف تھے۔

”ہاں آؤ، کیا بات ہے۔“ انہوں نے جلال کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر وہ اسی طرح خاموش بیٹھا رہا، اس کے والد نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا، انہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ ”کیا بات ہے جلال؟“ انہیں یک دم تشویش ہونے لگی۔

”ابو! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ جلال نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

”کیا؟“ ناصرہ جاوید کو اس کے منہ سے اس بیٹے کی توقع نہیں تھی۔ ”تم کیا کرنا چاہتے ہو۔“
 ”میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”یہ فیصلہ تم نے یک دم کیسے کر لیا، کل تک تو تم باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے اور اب آج تم شادی کا ذکر لے بیٹھے ہو۔“ ناصرہ جاوید مسکرائے۔

”بس..... معاملہ ہی کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ مجھے آپ سے بات کرنی پڑ رہی ہے۔“
 ناصرہ جاوید سنجیدہ ہو گئے۔

”آپ نے زینب کی دوست امامہ کو دیکھا ہے۔“ اس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔
 ”ہاں! تم اس میں اتار چلتے ہو۔“ ناصرہ جاوید نے فوراً اندازہ لگایا۔

جلال نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”مگر وہ لوگ تو بہت امیر ہیں..... اس کا باب بڑا صنعت کار ہے اور وہ مسلمان بھی نہیں ہے۔“ ناصرہ جاوید کا لہجہ بدل چکا تھا۔

”ابو! وہ اسلام قبول کر چکی ہے، اس کی فیملی قادیانی ہے۔“ جلال نے وضاحت کی۔
 ”اس کے گھر والوں کو پتا ہے؟“

”نہیں۔“

”تمہارا خیال ہے وہ یہ پروپوزل قبول کر لیں گے؟“ ناصرہ جاوید نے چپتے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔
 ”ابو! اس کی فیملی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ ان لوگوں کی اجازت کے بغیر ہم شادی کرنا

چاہتے ہیں۔“

”تمہارا دامغان ٹھیک ہے؟“ اس بار اصرار جاوید نے بلند آواز میں کہا۔ ”میں تمہیں کسی حالت میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

جلال کا چہرہ اتر گیا۔ ”ابو امیری اس کے ساتھ کنٹنٹ ہے۔“ اس نے مدہم آواز میں کہا۔

”مجھ سے پوچھ کر کنٹنٹ نہیں کی تھی تم نے۔ اور اس عمر میں بہت ساری کمسنٹس ہوتی رہتی

ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بندہ اپنی زندگی خراب کر لے۔“ مجھے اس کے خاندان کے اثر و رسوخ کا پتا ہے۔ انہیں اپنے پیچھے لگا کر ہم سب پر باد ہو جائیں گے۔“

”ابو امیری خفیہ طور پر شادی کر لیتا ہوں۔ کسی کو بتائیں گے نہیں تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔“

”اور اگر بچ چل گیا تو۔۔۔ میں ویسے بھی تمہاری تعلیم کے مکمل ہونے تک تمہاری شادی کرنا نہیں

چاہتا۔ ابھی تمہیں بہت کچھ کرنا ہے۔“

ابو ایلیز۔۔۔ میں اس کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کر سکتا۔“ جلال نے مدہم آواز میں اپنی

بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔۔۔ ایسا ہے تو تم اس سے کہو کہ وہ اپنے والدین سے اس سلسلے میں بات کرے۔ اگر اس کے

والدین مان جاتے ہیں تو میں تم دونوں کی شادی کر دوں گا۔“ انہوں نے تیز مگر حتمی لہجے میں کہا۔ ”مگر

میں تمہاری شادی کسی ایسی لڑکی سے قطعی نہیں کروں گا جو اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف تم سے

شادی کرنا چاہے۔“

”ابو! آپ اس کا مسئلہ سمجھیں، وہ بیری لڑکی نہیں ہے۔۔۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بس وہ کسی

مسلمان سے شادی کرنا چاہتی ہے جس پر اس کے گھر والے راضی نہیں ہوں گے۔“ جلال نے دانستہ طور

پر اسجد اور اس کی منگنی کا ذکر گول کر دیا۔

”مجھے کسی دوسرے کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور تمہیں بھی نہیں ہونی چاہئے۔ یہ امامہ کا

مسئلہ ہے، وہ جانے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو۔“ اصرار جاوید نے

دو ٹوک انداز میں کہا۔

”ابو ایلیز۔۔۔ میری بات سمجھیں۔ اس کو مدد کی ضرورت ہے۔“

”بہت سے لوگوں کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے تم کس کس کی مدد کرو گے۔۔۔ اور ویسے بھی ہمارے

اور ان کے ایشیٹس میں اتنا فرق ہے کہ ان سے کوئی دشمنی یا مخالفت مول لینا ہمارے بس کی بات نہیں،

کچھ تم اور پھر میں ایک غیر مسلم لڑکی سے شادی کر کے اپنے خاندان والوں کا سامنا کیسے کروں گا۔“

”ابو! وہ مسلمان ہو چکی ہے۔۔۔ میں نے آپ کو بتایا ہے۔“ جلال نے جھنجھلا کر کہا۔

”چار ماہ قاتوں میں وہ تم سے اتنی متاثر ہو گئی کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔“

”ابو! اس نے مجھے ملنے سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔“

”تم نے اسلام قبول کرتے دیکھا تھا اے؟“

”میں اس سے مذہب کے بارے میں تفصیلاً بات کرتا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اسلام قبول

کر چکی ہے۔“

”بالفرض وہ ایسا کر بھی چکی ہے۔۔۔ تو پھر اسے اپنے مسائل سے خود نموننا چاہئے۔ تمہیں سچ میں

نہیں گھیننا چاہئے۔ اپنے والدین سے دو ٹوک بات کرے، انہیں بتائے کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتی

ہے۔۔۔ پھر میں اور تمہاری امی دیکھیں گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ دیکھو جلال اگر اس کا خاندان اپنا

مرضی اور خوشی سے اس کی شادی تمہارے ساتھ کرنے پر تیار ہو جائے تو میں اسے بخوشی قبول کر لوں

گا۔۔۔ مگر کسی بے نام و نشان لڑکی سے میں تمہاری شادی نہیں کروں گا۔ مجھے اس معاشرہ میں رہنا

ہے۔۔۔ لوگوں کو منہ دکھانا ہے۔ بہو کے خاندان کے بارے میں کیا کہوں گا میں کسی سے۔۔۔ یہ کہ وہ

گھر چھوڑ کر آئی ہے اور اس نے اپنی مرضی سے میرے بیٹے سے شادی کر لی ہے۔“

”ابو! یہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے کہ ہم اس کی مدد کریں اور۔۔۔ اصرار جاوید نے تلخی سے اس کی بات

کات دی۔

”مذہب کو سچ میں مت لے کر آؤ، ہر چیز میں مذہب کی شرکت ضروری نہیں ہوتی۔ صرف تم ہی

یہ مذہبی فریضہ ادا کرنے والے رہ گئے ہو، باقی سارے مسلمان مر گئے ہیں۔“

”ابو! اس نے مجھ سے مدد مانگی ہے، میں اس لئے کہہ رہا ہوں۔“

”بیٹا! یہاں بات مدد کی یا مذہب کی نہیں ہے، یہاں صرف نسلی حقائق کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

بہت اچھی بات ہے کہ تم میں مدد کا جذبہ ہے اور تمہیں اپنے مذہبی فرائض کا احساس ہے مگر انسان پر کچھ

حق اس کے والدین کا بھی ہوتا ہے اور یہ حق بھی مذہب نے ہی فرض کیا ہے اور اس حق کے تحت میں

چاہتا ہوں کہ تم اس کے خاندان کی مرضی کے بغیر اس سے شادی نہ کرو۔ فرض کرو تم اس سے شادی

کر بھی لیتے ہو۔ تو کیا ہو گا۔ تم تو چند ماہ میں امریکہ ہو گے۔ اور وہ یہاں گھر بنی ہوگی۔ میرے

پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ میں تم چاروں کی تعلیم پر بھی خرچ کروں اور اس کی تعلیم پر بھی۔ تم اچھی طرح

جانتے ہو کہ تم پر میرا کتنا پیسہ خرچ ہو رہا ہے۔۔۔ تو وہ ڈاکٹر تو نہیں بنے گی۔۔۔ یہاں گھر میں کتنے سال تم

اسے بٹھا سکتے ہو۔ اور اگر اس کے خاندان نے تم پر یا ہم پر کس کر دیا تو اس صورت میں تم بھی پابند ہو

کر رہ جاؤ گے اور میں بھی۔۔۔ تم کو اپنی بہن کا احساس ہونا چاہئے، تم یہ چاہتے ہو کہ اس عمر میں، میں ٹیبل

چاہاؤں۔۔۔ اور شاید تم بھی۔۔۔“

جلال کچھ بول نہیں سکا۔

”ان چیزوں کے بارے میں اتنا جذبہ بانی ہو کر نہیں سوچنا چاہئے۔ میں نے تمہیں راستہ بتا دیا ہے۔ اس سے کیوں اپنے والدین سے بات کر کے انہیں رضامند کرے۔ ہو سکتا ہے وہ رضامند ہو جائیں پھر مجھے کیا اعتراض ہو گا تم دونوں کی شادی پر لیکن اگر وہ یہ نہیں کرتی تو پھر اس سے کہو کہ وہ کسی اور سے شادی کر لے اور تم ٹھنڈے دل سے سوچو۔ تمہیں خود پتا چل جائے گا کہ تمہارا فیصلہ کتنا نقصان دہ ہے۔“

☆.....☆.....☆

”ہائی! میں آپ کا کمرہ صاف کر دوں؟“ ملازمہ نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے امام

سے پوچھا۔

”نہیں، تم جاؤ۔“ امام نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کے لئے کہا۔ ملازمہ باہر جانے کے بجائے دروازہ بند کر کے اس کے پاس آگئی۔

”میں نے تم سے کہا ہے تاکہ تم۔۔۔“ امام نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر پھر اس کی بات حلق میں ہی رہ گئی۔ ملازمہ نے اپنی چادر کے اندر سے ایک موبائل نکالا تھا۔ امام حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”ہائی! یہ میری ماں نے دیا ہے، وہ کہہ رہی تھی کہ ساتھ والے سالار صاحب نے آپ کے لئے دیا ہے۔“ اس نے امام کی طرف تجلّت کے عالم میں وہ موبائل بڑھایا۔ امام نے تیزی سے موبائل کو بچھٹ لیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

”دیکھو، تم کسی کو بتانا مت کہ تم نے مجھے کوئی موبائل لا کر دیا ہے۔“ امام نے اسے تاکید کی۔

”نہیں ہائی! آپ بے فکر رہیں، میں نہیں بتاؤں گی۔ اگر آپ کو بھی کوئی چیز سالار صاحب کے لئے دینی ہو تو مجھے دے دیا۔“

”نہیں، مجھے کچھ نہیں دینا، تم جاؤ۔“ اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

ملازمہ کے کمرے سے نکلنے ہی اس نے کمرے کو لاک کر لیا۔ کانپتے ہاتھوں اور دل کی بے قابو ہوتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ اس نے دراز سے موبائل نکالا اور اس پر جلال کا نمبر ڈائل کرنا شروع کیا۔ وہ اسے تحصیل سے ساری بات بتانا چاہتی تھی۔ فون جلال کی امی نے اٹھایا۔

”بیٹا! جلال تو باہر گیا ہوا ہے، وہ تو رات کو ہی آئے گا۔ تم زینب سے بات کر لو۔ اسے بلا دوں؟“

جلال کی امی نے کہا۔

”نہیں آنٹی! مجھے کچھ جلدی ہے، میں زینب سے پھر بات کر لوں گی۔ بس میں نے ان سے چند

کرتے ہوئے کہا۔

امام نے اس دن دوپہر کو بھی کھانا نہیں کھایا۔ وہ صرف رات ہونے کا انتظار کر رہی تھی تاکہ جلال گھر آجائے اور وہ اس سے دوبارہ بات کر سکے۔ شام کے وقت ملازمہ نے اسے امجد کے فون کی اطلاع دی۔

وہ جس وقت نیچے آئی اس وقت لاؤنج میں صرف دو سیم بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے فون کی طرف چلی گئی۔ فون کارمیو ر اٹھا ہے ہی دوسری طرف امجد کی آواز سنائی دی تھی۔ بے اختیار امام کا خون کھولنے لگا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اس شادی کو طے کرنے میں امجد سے زیادہ خود ہاشم بین کا ہاتھ تھا۔ امام کو اس پر غصہ آ رہا تھا۔

وہ اس کا حال احوال دریافت کر رہا تھا۔

”امجد! تم نے اس طرح میرے ساتھ دھوکا کیوں کیا ہے؟“

”کیسا دھوکا امام!“

”شادی کی تاریخ طے کرنا۔ تم نے اس سلسلے میں مجھ سے بات کیوں نہیں کی۔“ وہ کھولتے ہوئے بولی۔

”کیا انکل نے تم سے بات نہیں کی۔“

”انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا اور میں نے ان سے کہا تھا کہ میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔“

”بہر حال اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔۔۔ اور پھر کیا فرق پڑتا ہے کہ شادی اب ہو یا کچھ سالوں کے بعد۔“ امجد نے قدرے لا پر وائی سے کہا۔

”امجد! تمہیں فرق پڑتا ہوا نہیں، مجھے پڑتا ہے۔ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے تک شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے تھے۔“

”ہاں، میں جانتا ہوں مگر اس سارے معاملے میں، میں تو کہیں بھی انوالو نہیں ہوں۔ تمہیں بتا رہا ہوں، شادی انکل کے اصرار پر ہو رہی ہے۔“

”تم اسے رکو دو۔“

”تم کیسی باتیں کر رہی ہو امام! میں اسے کیسے رکو دوں۔“ امجد نے کچھ جراتی سے کہا۔

”امجد پلیز!“

”امام! میں ایسا نہیں کر سکتا، تم میری پوزیشن سمجھو۔ اب تو ویسے بھی کارڈ چھپ چکے ہیں، دونوں گھروں میں تیاریاں ہو رہی ہیں اور۔۔۔“

امام نے اس کی بات سننے بغیر ریسیور کو ٹھنڈا دیا۔ وہ سیم نے اس پوری گفتگو میں کوئی مداخلت نہیں کی

تھی۔ وہ خاموشی سے امجد کے ساتھ ہونے والی اس کی گفتگو سنتا رہا تھا جب امام نے فون بند کر دیا تو وہ سم نے اس سے کہا۔

”تم خواہو تو ایک فضول بات پر اتنا ہنگامہ کھڑا کر رہی ہو۔ کل بھی تو ہمیں شادی امجد کے ساتھ ہی کرنی ہے پھر اس طرح کر کے تم خود اپنے لئے مساکل پیدا کر رہی ہو۔ باپ تم سے بہت ناراض ہیں۔“

”میں نے تم سے تمہاری رائے نہیں مانگی، تم اپنے کام سے کام رکھو۔ جو کچھ تم میرے ساتھ کر چکے ہو وہ کافی ہے۔“

امام اس پر غزائی اور پھر واپس اپنے کمرے میں آگئی۔

☆.....☆.....☆

دو رات کو بھی اپنے کمرے سے نہیں نکلی تھی مگر ملازم کے کھانا لانے پر اس نے کھانا کھالیا۔ رات کو گیارہ بجے کے قریب اس نے جلال کو فون کیا۔ فون جلال نے ہی اٹھایا تھا۔ شاید وہ امام کے فون کی توقع کر رہا تھا۔ مختصر سی تمہید کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آگیا۔

”امام! میں نے ابو سے کچھ دیر پہلے بات کی ہے۔“ اس نے امام سے کہا۔

”پھر؟“ وہ اس کے استفسار پر چند لمبے خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

”ابو اس شادی پر رضامند نہیں ہیں۔“

امام کا دل ڈوب گیا۔ ”مگر آپ تو کہہ رہے تھے کہ انہیں اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“

”ہاں، میرا یہی خیال تھا مگر انہیں بہت ساری باتوں پر اعتراض ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تمہارے اور ہمارے گھرانے کے ایشیوں میں بہت فرق ہے۔ اور وہ تمہارے خاندان کے بارے میں بھی جانتے ہیں اور انہیں سب سے بڑا اعتراض اس بات پر ہے کہ تم اپنے گھر والوں کی مرضی کے بغیر مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ انہیں یہ خوف ہے کہ اس صورت میں تمہارے گھر والے ہمیں تنگ کریں گے۔“

وہ ساکت بیٹھی موبائل کان سے لگائے اس کی آواز سنتی رہی۔ ”آپ نے انہیں رضامند کرنے کی کوشش نہیں کی۔“ ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

”میں نے بہت کوشش کی۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر تمہارے گھر والے اس شادی پر تیار ہو جاتے ہیں تو پھر وہ بھی راضی ہو جائیں گے۔ اس بات کی پروا اس کے بغیر کہ تمہارا خاندان کیا ہے لیکن تمہارے گھر والوں کی مرضی کے بغیر وہ میری اور تمہاری شادی کو تسلیم نہیں کریں گے۔“ جلال نے اس سے کہا۔

”اور آپ۔۔۔ آپ کیا کہتے ہیں؟“

”امام! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ جلال نے کچھ بے بسی کے عالم میں کہا۔

”جلال! میرے بیٹے کسی بھی آپ سے میری شادی پر تیار نہیں ہوں گے، بصورت دیگر ہماری پوری کمیونٹی ان کا بائیکاٹ کر دے گی اور وہ یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے اور پھر آپ امجد سے میری منگنی کو کیوں بھول رہے ہیں۔“

”امام! تم پھر بھی اپنے والدین سے بات تو کرو، ہو سکتا ہے کوئی راستہ نکل آئے۔“

”میں کل باپ سے تمہیں کھا چکی ہوں۔ صرف یہ بتا کر کہ میں کسی دوسرے میں اعتراض ہوں۔“ امام کی آواز بھڑانے لگی۔ ”اگر انہیں یہ پتا چل گیا کہ میں جسے پسند کرتی ہوں وہ ان کے مذہب کا نہیں ہے تو وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ پلیز آپ انکل سے بات کریں۔ آپ انہیں میرا پرالہم بتائیں۔“ اس نے ملتھیانہ لہجے میں کہا۔

”میں ابو سے کل دو بار وہ بات کروں گا اور امی سے بھی۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ وہ کیا کہتے ہیں۔“ جلال پریشان تھا۔

امام نے جس وقت اس سے بات کرنے کے بعد فون بند کیا وہ بے حد دل گرفتہ تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ جلال کے والدین کو اس شادی پر اعتراض ہو گا۔

موبائل ہاتھ میں لئے وہ بہت دیر تک خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی رہی۔

☆.....☆.....☆

”تمہارے ابو مجھ سے پہلے ہی اس سلسلے میں بات کر چکے ہیں اور جو وہ کہہ رہے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے۔ تم کو اس طرح کے خطروں میں کودنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ جلال کی امی نے تعلق لہجے میں اس سے کہا۔ وہ امام کے کہنے پر ان سے بات کر رہا تھا۔

”مگر امی! اس میں خطرے والی کیا بات ہے۔ کچھ بھی نہیں ہو گا، آپ خواہو تو خوف زدہ ہو رہی ہیں۔“ جلال نے کچھ احتجاجی انداز میں کہا۔

”تم حماقت کی حد تک بے وقوف ہو۔“ اس کی امی نے اس کی بات پر اسے ہلکا کر کے خاندان اور اس کے والد کو تمہارے ابو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارے ساتھ شادی ہونے کی صورت میں وہ تمہارا چھپا چھوڑ دیں گے یا نہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“

”امی! ہم اس شادی کو خفیہ رکھیں گے، کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔ میں اسپتھلائزیشن کے لئے باہر جانے کے کچھ عرصہ کے بعد اسے بھی وہاں بلاؤں گا۔ سب کچھ خفیہ ہی رہے گا کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا۔“

”ہم آخر امام کے لئے کیوں اتنا بڑا خطرہ مول لیں اور تمہیں ویسے بھی یہ پتا ہونا چاہئے کہ ہمارے یہاں اپنی بیٹی میں ہی شادی ہوتی ہے۔ ہمیں امام یا کسی اور کی ضرورت نہیں ہے۔“ امی نے موضوع ہارنے ہوئے کہا۔

”مجھے اگر یہ اندازہ ہوتا کہ تم اس طرح اس لڑکی میں دلچسپی لینا شروع کر دو گے تو میں اس سے پہلے ہی تمہاری کہیں نسبت طے کر دیتا۔“ اس کی امی نے قدرے ناراضی سے کہا۔

”امی! میں امامہ کو پسند کرتا ہوں۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم اسے پسند کرتے ہو یا نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس بارے میں، میں اور تمہارے ابو کیا سوچتے ہیں۔ اور ہم دونوں کو تو وہ پسند ہے اور نہ ہی اس کا خاندان۔“ امی نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”امی! وہ بہت اچھی لڑکی ہے، آپ اسے اچھی طرح جانتی ہیں، وہ یہاں آتی رہی ہے اور تب تو آپ اس کی بہت زیادہ تعریف کرتی تھیں۔“ جلال نے انہیں یاد دلایا۔

”تعریف کرنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں اسے اپنی بہنوں میں سے دیکھتی ہوں۔“

”امی! کم از کم آپ تو اب بھی جانتی ہیں کہ تمہارے ہاں سے سوچیں۔“ اس بار جلال نے لجاجت آمیز انداز میں کہا۔

”جلال! تمہیں احساس ہونا چاہئے کہ تمہاری اس ضد اور فیصلے سے ہمارے پورے خاندان پر کس طرح کے اثرات مرتب ہوں گے۔ ہمارا بھی خواب ہے کہ ہم تمہاری شادی کسی اچھے اور اونچے خاندان میں کریں۔ تمہارے ابو اگر تمہیں اس شادی کی اجازت دے بھی دیں تو بھی میں کبھی نہیں دوں گی۔ نہ ہی میں امامہ کو اپنی بہن کے طور پر قبول کروں گی۔“

”امی! آپ اس کی صورت حال کو سمجھیں، وہ کتنا بڑا قدم اٹھا رہی ہے۔ اس وقت اسے عدوی ضرورت ہے۔“

”اگر وہ اتنا بڑا قدم اٹھا رہی ہے تو پھر اسے کم از کم دوسرے کے لئے کوئی پریشانی کھڑی نہیں کرنی چاہئے۔ میں اسے برا نہیں کہہ رہی۔ وہ بہت اچھا فیصلہ کر رہی ہے مگر ہم لوگوں کی اپنی کچھ مجبوریاں ہیں۔“

تم کچھ حائل سے کام لو۔ تمہیں اسپوشل ٹرینیشن کے لئے باہر جانا ہے۔ اپنا بائیکاٹ بنانا ہے۔“ اس کی امی نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”یہاں اچھے خاندان میں شادی ہو تو انسان کو آگے بڑھنے کے لئے بہت سے مواقع ملتے ہیں اور تمہارے لئے تو پہلے ہی بہت سے خاندانوں کی طرف سے پیغام آرہے ہیں۔ جب اسپوشل ٹرینیشن کر لو گے تو کتنے اونچے خاندان میں تمہاری شادی ہو سکتی ہے۔ تمہیں اس کا اندازہ بھی نہیں ہے۔ خود سوچو، صرف امامہ سے شادی کر کے تمہیں کیا ملے گا۔۔۔۔۔ خاندان اس کا بائیکاٹ کر چکا ہو گا۔“

معاشرے میں جو بدنامی ہوگی، وہ اولگ۔ اور تم سے شادی ہو بھی جائے تو کل کو تمہارے بچے تمہارے اور امامہ کے بارے میں کیا سوچیں گے۔۔۔۔۔ یہ کوئی ایک دو دن کی بات نہیں ہے ساری عمر کی بات ہے۔“ امی اسے سنجیدہ لہجے میں سمجھا رہی تھیں۔ جلال کسی اعتراض یا احتجاج کے بغیر خاموشی سے ان کی باتیں

سن رہا تھا۔

اس کے چہرے سے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کمال ہوا ہے یا نہیں۔

☆.....☆.....☆

امامہ نے اگلی رات جلال کو پھر فون کیا۔ فون جلال نے ہی اٹھایا تھا۔

”امامہ! میں نے امی سے بھی بات کی ہے۔ وہ ابو سے زیادہ ناراض ہوئی ہیں میری بات پر۔“

امامہ کا دل گویا مکمل ڈوب گیا۔

”وہ کہہ رہی ہیں کہ مجھے ایک فضول معاملے میں خود کو انوار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

جلال نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ”میں نے انہیں تمہارے پر اہم کے بارے میں بھی بتایا ہے مگر ان کا کہنا ہے کہ یہ تمہارا پر اہم ہے، ہمارا نہیں۔“

امامہ کو اس کے لفظوں سے شدید تکلیف ہوئی تھی۔

”میں نے انہیں بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ رخصت نہیں ہیں اور تیرے ہی ہوں گی۔“ جلال کی آواز بھی ہو گئی تھی۔

”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے جلال! میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کسی موہوم سی امید پر کہا۔“

”میں جانتا ہوں امامہ! مگر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے والدین اس پر پوزل پر رخصت نہیں ہیں۔“

”کیا تم ان کی مرضی کے بغیر مجھ سے شادی نہیں کر سکتے؟“

”نہیں، یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ مجھے ان سے اتنی محبت ہے کہ میں انہیں ناراض کر کے تم سے شادی نہیں کر سکتا۔“

”پلیز جلال! وہ گڑبگڑائی۔ تمہارے علاوہ میرے پاس اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔“

”میں اپنے والدین کی نافرمانی نہیں کر سکتا، تم مجھے اس کے لئے مجبور نہ کرو۔“

”میں آپ کو نافرمانی کے لئے نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں تو آپ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہوں۔“

اس کے اعصاب سچ رہے تھے۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے زندگی میں کبھی کسی سے اتنے اچھا پیے

اور منت بھرے انداز میں بات کی ہو۔

”آپ مجھ سے صرف نکاح کر لیں، اپنے والدین کو اس کے بارے میں نہ بتائیں۔ بے شک آپ

بعد میں ان کی مرضی سے بھی شادی کر لیں، میں اعتراض نہیں کروں گی۔“

”تم اب بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ خود سوچو کہ اگر ایسے کسی نکاح کے بارے میں ابھی میرے

والدین کو پتا چل جاتا ہے تو وہ کیا کریں گے۔ وہ تو مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ اور پھر تم اور میں کیا

کر رہے۔“

”ہم محنت کر لیں گے، کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔“

”تمہارے اس کچھ نہ کچھ سے میں باہر پڑھنے جا سکوں گا؟“ اس بار جلال کا لہجہ چہکتا ہوا تھا، وہ بول نہیں سکی۔

”نہیں امام! میرے اتنے خواب اور خواہشات ہیں کہ میں انہیں تمہارے لئے یا کسی کے لئے بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے تم سے محبت ہے اس میں کوئی شک نہیں مگر میں اس جذبہ تہمت کا مظاہرہ نہیں کر سکتا جس کا مظاہرہ تم کر رہی ہو۔ تم دو بار مجھے فون مت کرنا کیونکہ میں اب اس سارے معاملے کو ہمیں شرم کر دینا چاہتا ہوں، مجھے تم سے ہمہ روی ہے مگر تم اپنے اس مسئلے کا حل خود نکالو، میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا، نہ امانت۔“

جلال نے فون بند کر دیا۔

رات دس بج کر پچاس منٹ پر اسے اپنے ارد گرد کی پوری دنیا دھوکے میں چھیل جاتی نظر آئی۔ کسی چیز کے صفحے میں ہونے اور پھر دور دور تک نہیں نہ ہونے کا فرق کوئی امام سے بہتر نہیں بتا سکتا تھا۔ ماؤف ذہن اور شل ہوتے ہوئے اعصاب کے ساتھ وہ بہت دیر تک کسی بات کی طرح اپنے بیڈ پر ناگھیں لٹکائے بیٹھی رہی۔

مجھے بتا دینا چاہئے اب بابا کو سب کچھ۔۔۔ اس کے سوا اب اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔۔۔ شاید وہ خود ہی مجھے اپنے گھر سے نکال دیں۔۔۔ کم از کم مجھے اس گھر سے توراہائی مل جائے گی۔

☆.....☆.....☆

”میں اسجد سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تو شاپنگ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ امام نے محکم لہجے میں امی سے کہا۔ سلمیٰ اسے اگلے روز اپنے ساتھ ملا کرٹ جانے کا کہنے کے لئے آئی تھیں۔

”پہلے تمہیں شادی پر اعتراض تھا، اب تمہیں اسجد سے شادی پر اعتراض ہے، آخر تم چاہتی کیا ہو۔“ سلمیٰ اس کی بات پر مشتعل ہو گئیں۔

”صرف یہ کہ آپ اسجد سے میری شادی نہ کریں۔“

”تو پھر کس سے کرنا چاہتی ہو تم۔“ ہاشم مبین اچانک کھلے دروازے سے اندر آ گئے تھے۔ یقیناً انہوں نے باہر کو ریڈ ورن میں امام اور سلمیٰ کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تھی اور وہ اپنے فصر پر قابو نہیں رکھ پائے تھے۔ امام یک دم چپ ہو گئی۔

”بولو، کس سے کرنا چاہتی ہو۔۔۔ اب منہ بند کیوں ہو گیا ہے، آخر تم اسجد سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی۔۔۔ کیا تکلیف ہے تمہیں۔“ انہوں نے بلند آواز میں کہا۔

”بابا! شادی ایک بار ہوتی ہے اور وہ میں اپنی پسند سے کروں گی۔“ وہ ہمت کر کے بولی۔

”کل تک اسجد تمہاری پسند تھا۔“ ہاشم مبین نے دانت پیٹتے ہوئے کہا۔

”کل تھا، اب نہیں ہے۔“

”کیوں، اب کیوں نہیں ہے؟“ امام کچھ کہے بغیر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”بولو، اب کیوں پسند نہیں ہے وہ تمہیں۔“ ہاشم مبین نے بلند آواز میں پوچھا۔

”بابا! میں کسی مسلمان سے شادی کروں گی۔“ ہاشم مبین کو لگا آسمان ان کے سر پر گر پڑا تھا۔

”کیا۔۔۔ کہا تم نے۔۔۔؟“ انہوں نے بے یقینی سے کہا۔

”میں کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کروں گی کیونکہ میں اسلام قبول کر چکی ہوں۔“

گھر سے میں اگلے کئی منٹ تک مکمل خاموشی رہی۔ سلمیٰ کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا اور ہاشم مبین۔۔۔ وہ

ایک پتھر کے مجستے کی طرح اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کا منہ کھلا ہوا تھا وہ جیسے سانس لینا بھول گئے تھے۔

ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی انہیں زندگی میں اپنی اولاد اور وہ بھی اپنی سب سے لاڈلی بیٹی

کے سامنے اس طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کے چالیس سال مکمل طور پر بھنور کی زد

میں آ گئے تھے۔

”تم کیا بکواس کر رہی ہو۔“ ہاشم مبین کے اندر اشتعال کی ایک لہر اٹھی تھی۔

”بابا! آپ جانتے ہیں میں کیا کہہ رہی ہوں۔ آپ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”تم باگل ہو گئی ہو۔“ انہوں نے آپ سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔ امام نے کچھ کہنے کے بجائے

نچی میں گردن ہلائی۔ وہ ہاشم مبین کی ذہنی کیفیت کو سمجھ سکتی تھی۔ ”اس لئے تمہیں پیدا کیا۔ تمہاری

پرورش کی کہ تم۔۔۔ تم۔“ ہاشم مبین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا کہیں۔ ”صرف اسجد سے

شادی نہ کرنے کے لئے تم یہ سب کر رہی ہو، صرف اس لئے کہ تمہاری شادی اس آدمی سے کر دیں

جس سے تم چاہتی ہو۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہے۔“

”ایسا ہی ہے۔ تم بے وقوف سمجھتی ہو مجھے۔“ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

”آپ میری شادی کسی بھی آدمی سے کریں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس وہ آپ کی کیوبنی سے نہ

ہو۔۔۔ پھر آپ کم از کم یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ میں کسی خاص آدمی کے لئے یہ سب کر رہی ہوں۔“

ہاشم مبین اس کی بات پر دانت پیٹنے لگے۔

”تم جمعہ جمعہ آنحضرت دن کی پیداوار۔۔۔ تمہیں بتا گیا ہے۔“

”میں سب جانتی ہوں بابا! میری عمر بیس سال ہے، میں آپ کی اٹھی پکڑ کر چلنے والی بیٹی نہیں

ہوں۔ میں جانتی ہوں آپ کے اس مذہب کی وجہ سے ہمارے خاندان پر بڑی برکات نازل کی گئی ہیں۔“

وہ بڑے مستحکم اور ہموار انداز میں کہتی گئی۔ ”تم..... تم..... تم..... بخشش نہیں ہوگی تمہاری۔ تم.....“
ہاشم مبین غصے کے عالم میں انگلی اٹھا کر بولنے لگے۔ امامہ کو ان پر ترس آنے لگا۔ اسے دوزخ میں کھڑے ہو کر دوزخ سے ڈرانے والے شخص پر ترس آیا، اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر پھرنے والے شخص پر ترس آیا، اسے مہر شدہ دل والے آدمی پر ترس آیا، اسے نفس زدہ آدمی پر ترس آیا، اسے گمراہی کی سب سے اوپر والی بیڑھی پر کھڑے آدمی پر ترس آیا۔

”تم گمراہی کے رستے پر چل پڑی ہو..... چند کتابیں پڑھ کر تم.....“ امامہ نے ان کی بات کاٹ دی۔
”آپ اس بارے میں مجھ سے بحث نہیں کر سکیں گے، میں سب کچھ جانتی ہوں، تحقیق کر چکی ہوں، تصدیق کر چکی ہوں۔ آپ مجھے کیا بتائیں گے، کیا سمجھائیں گے۔ آپ نے اپنی مرضی کا راستہ چن لیا ہے میں نے اپنی مرضی کا راستہ چن لیا۔ آپ وہ کر رہے ہیں جو آپ صحیح سمجھتے ہیں میں وہ کر رہی ہوں جو میں صحیح سمجھتی ہوں۔“ آپ کا عقیدہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ میرا عقیدہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ کیا اب یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ میرے اس فیصلے کو قبول کر لیں، جذباتی حماقت کے بجائے بہت سوچ سمجھ کر اٹھایا جانے والا قدم سمجھ کر۔“

اس نے بڑی رسائیت اور شہیدگی کے ساتھ کہا۔ ہاشم مبین کی ناراضی میں اور اضافہ ہوا۔

”میں..... میں اپنا بیٹی کو مذہب بدلنے دوں تاکہ پوری کیونٹی میرا باپکاٹ کر دے۔ میں فٹ پاٹھ پر آ جاؤں۔ نہیں امامہ! یہ نہیں ہو سکتا۔ تمہارا اگر دماغ بھی خراب ہو گیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرا دماغ بھی خراب ہو جائے۔ کوئی بھی مذہب اختیار کرو مگر تمہاری شادی میں امجد سے ہی کروں گا، تمہیں اسی کے گھر جانا ہو گا۔ اس کے گھر چلی جاؤ اور پھر وہاں جا کر ملے کرنا کہ تمہیں کیا کرنا ہے کیا نہیں۔ ہو سکتا ہے تمہیں غسل آجائے۔“
وہ غصے کے عالم میں کمرے سے نکل گئے۔

”مجھے پتا ہو تاکہ تمہاری وجہ سے ہمیں اتنی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا تو میں پیدا ہوتے ہی تمہارا گلا و بادیتی۔“ ہاشم مبین کے جانتے ہی سہلی نے کھڑے ہوتے ہوئے دانت چس کر کہا۔ ”تم نے ہماری عزت خاک میں ملانے کا تہیہ کر لیا ہے۔“

امامہ کچھ کہنے کے جائے خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔ وہ کچھ دیر اسی طرح بولتی رہیں پھر کمرے سے چلی گئیں۔

انہیں اس کے کمرے سے گئے ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا جب دروازے پر دستک دے کر امجد اندر

داخل ہوا۔ امامہ کو اس کے اس وقت وہاں آنے کی توقع نہیں تھی۔ امجد کے چہرے پر پریشانی بہت نمایاں تھی۔ یقیناً اسے ہاشم مبین نے بلوایا تھا اور وہ اسے سب کچھ بتا چکے تھے۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے امامہ؟“ اس نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ وہ اپنے بیٹے پر مٹھی اسے دیکھتی رہی۔
”تم کیوں کر رہی ہو یہ سب کچھ۔“

”امجد! تمہیں اگر یہ بتا دیا گیا ہے کہ میں کیا کر رہی ہوں تو پھر یہ بھی بتا دیا گیا ہو گا کہ میں کیوں کر رہی ہوں۔“

”تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کیا کر رہی ہو۔“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”مجھے اندازہ ہے۔“

”اس عمر میں جذبات میں آکر انسان بہت سے غلط فیصلے کر لیتا ہے.....“

امامہ نے تڑپ سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”جذبات میں آکر.....؟ کوئی جذبات میں آکر مذہب تبدیل کرتا ہے؟ کبھی نہیں۔ میں چار سال سے اسلام کے بارے میں پڑھ رہی ہوں، چار سال کم نہیں ہوتے۔“

”تم لوگوں کی باتوں میں آگئی ہو۔ تم.....“

”نہیں، میں کسی کی باتوں میں نہیں آئی۔ میں نے جس چیز کو غلط سمجھا اسے چھوڑ دیا اور بس۔“

وہ کچھ دیر بے چارگی کے عالم میں اسے دیکھتا رہا پھر سر جھٹکتے ہوئے اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے ان سب باتوں کو چھوڑو، شادی پر کیوں اعتراض ہے تمہیں۔ تمہارے عہدہ کم میں جو تبدیلی آئی ہے وہ ایک طرف۔ کم از کم شادی تو ہونے دو۔“

”میری اور تمہاری شادی جائز نہیں۔“

وہ اس کی بات پر ہکا بکا رہ گیا۔ ”کیا میں غیر مسلم ہوں؟“

”ہاں، تم ہو۔“

”انگل ٹھیک کہہ رہے تھے کسی نے واقعی تمہارا برین واٹش کر دیا ہے۔“ اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

”پھر تم ایک ایسی لڑکی سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو۔ بہتر ہے تم کسی اور سے شادی کرو۔“ اس نے تڑکی بہ تڑکی کہا۔

”میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی زندگی برباد کر لو۔“ وہ اس کی بات پر عجیب سے انداز میں ہنسی۔

”زندگی برباد..... کون سی زندگی۔ یہ زندگی جو میں تم جیسے لوگوں کے ساتھ گزار رہی ہوں۔ جنہوں نے پیسے کے لئے اپنے مذہب کو چھوڑ دیا.....“

"Beveve yourself"۔ تم بات کرنے کے تمام میمز بھول گئی ہو۔ کس کے بارے میں کیا کہنا چاہتے اور کیا نہیں، تم نے سرے سے ہی فراموش کر دیا ہے۔ "اسجد اسے ڈالنے لگا۔

"میں ایسے کسی شخص کا احترام نہیں کر سکتی جو لوگوں کو گمراہ کر رہا ہو۔" امام نے دو لوگ انداز میں کہا۔

"جس عمر میں تم ہو..... اس عمر میں ہر کوئی اسی طرح کٹیفوز ہو جاتا ہے جس طرح تم کٹیفوز ہو رہی ہو۔ جب تم اس عمر سے لگو گی تو تمہیں احساس ہو گا کہ ہم لوگ صحیح تھے یا غلط۔" اسجد نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اگر تم لوگوں کو یہ لگتا ہے کہ میں غلط ہوں، جب بھی تم لوگ مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ اس طرح مجھے گھر میں قید کر کے کیوں رکھا ہوا ہے اگر تم لوگوں کو اپنے مذہب کی صداقت پر اتنا یقین ہے تو مجھے اس گھر سے چلے جانے دو..... حقیقت کو چاٹتے دو....."

"اگر کوئی اپنا اپنے آپ کو نقصان پہنچانے پر تل جائے تو اسے اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا اور وہ بھی ایک لڑکی کو..... امام! تم اس مسئلے کی نزاکت اور اہمیت کو سمجھو، اپنی فیملی کا خیال کرو، تمہاری وجہ سے سب کچھ داؤ پر لگ گیا ہے۔"

"میری وجہ سے کچھ بھی داؤ پر نہیں لگا..... کچھ بھی نہیں..... اور اگر کچھ داؤ پر لگا بھی ہے تو میں اس کی پروا کیوں کروں۔ میں تم لوگوں کے لئے دوزخ میں کیوں جاؤں، صرف خاندان کے نام کی خاطر اپنا ایمان کیوں گنواؤں۔ نہیں اسجد! میں تم لوگوں کے ساتھ گمراہی کے اس راستے پر نہیں چل سکتی۔ مجھے وہ کرنے دو جو میں کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

"مجھ سے اگر تم نے زبردستی شادی کر بھی لی تو بھی تمہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میں تمہاری بیوی نہیں بنوں گی، میں تم سے وفا نہیں کروں گی۔ مجھے جب بھی موقع ملے گا، میں بھاگ جاؤں گی۔ تم آخر کتنے سال مجھے اس طرح قید کر کے رکھ سکو گے، کتنے سال مجھ پر پیرے بھڑاؤ گے..... مجھے صرف چند لمبے چاہئے ہوں گے تمہارے گھر، تمہاری قید سے بھاگ جانے کے لئے..... اور میں..... میں تمہارے بچوں کو بھی ساتھ لے جاؤں گی۔ تم ساری عمر انہیں دو بارہ دو کچھ نہیں سکو گے۔"

دوا سے مستقبل کا نقشہ دکھا کر غرور و کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اگر میں تمہاری جگہ پر ہوتی تو میں کبھی امامہ ہاشم جیسی لڑکی سے شادی نہ کروں..... یہ سراسر خسارے کا سودا ہو گا..... حماقت اور بے وقوفی کی انتہا ہو گی..... تم اب بھی سوچو لو..... اب بھی پیچھے ہٹ جاؤ..... تمہارے سامنے تمہاری ساری زندگی پڑی ہے..... تم کسی بھی لڑکی کے ساتھ شادی کر کے پرسکون زندگی گزار سکتے ہو..... کسی پریشانی..... کسی بے سکونی کے بغیر گھر میرے ساتھ نہیں..... میں تمہارے لئے بدترین بیوی ثابت ہوں گی، تم اس سارے معاملے سے الگ ہو جاؤ، شادی سے انکار کرو،

انگل اعظم سے کہہ دو کہ تم مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتے یا کچھ عرصے کے لئے گھر سے غائب ہو جاؤ۔ جب تمام معاملہ ختم ہو جائے تو پھر آ جانا۔"

"تم مجھے اس طرح کے احمقانہ مشورے مت دو، میں کسی بھی قیمت پر تم سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی قیمت پر نہ میں انکار کروں گا نہ اس معاملے سے الگ ہوں گا، نہ ہی گھر سے کہیں جاؤں گا..... میں تم سے ہی شادی کروں گا امامہ! اب یہ ہمارے خاندان کی عزت اور ساکھ کا معاملہ ہے۔ یہ شادی نہ ہونے اور تمہارے گھر سے چلے جانے سے ہمارے پورے خاندان کو جتنا نقصان اٹھانا پڑے گا اس کا تمہیں بالکل اندازہ نہیں ورنہ تم مجھے کبھی یہ مشورہ نہ دیتیں۔ جہاں تک بری بیوی ثابت ہوئے یا گھر سے بھاگ جانے کا تعلق ہے..... تو یہ سب بعد کا مسئلہ ہے۔ میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں، تم اس طرح کے سپر امنٹ کی مالک نہیں ہو کہ دوسروں کو بے جا پریشان کرتی رہو..... اور وہ بھی مجھے، جس سے تمہیں محبت ہے۔" اسجد بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

"تمہیں غلط فہمی ہے، مجھے کبھی بھی تم سے محبت نہیں رہی..... کبھی بھی..... میں ذہنی طور پر تمہارے ساتھ اپنے تعلق اور رشتے کو اس وقت سے ذہن سے نکال چکی ہوں جب میں نے اپنا مذہب چھوڑا تھا۔ تم میری زندگی میں اب کہیں نہیں ہو، کہیں بھی نہیں..... اگر میں اپنے گھر والوں کے لئے مسائل کھڑے کر سکتی ہوں تو کل تمہارے لئے کتنے مسائل کھڑے کروں گی تمہیں اس کا احساس ہونا چاہئے اور اس غلط فہمی سے باہر نکل آنا چاہئے..... ہم دونوں کبھی بھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ میں تم لوگوں کے خاندان کا حصہ کبھی نہیں بنوں گی۔"

نہیں اسجد! تمہارے اور میرے درمیان بہت فاصلہ ہے، اتنا فاصلہ کہ میں تمہیں دیکھ تک نہیں سکتی اور میں اس فاصلے کو کبھی ختم نہیں ہونے دوں گی۔ میں کبھی بھی تم سے شادی کے لئے تیار نہیں ہوں گی۔"

اسجد بدلتی ہوئی رنگت کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

☆.....☆.....☆

"کیا تم میرا ایک کام کر سکتے ہو؟"

"تمہارا کیا خیال ہے اب تک میں اس کے علاوہ اور کیا کر رہا ہوں۔" سالار نے پوچھا۔

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی، پھر اس نے کہا۔ "کیا تم لاہور جا کر جلال سے مل سکتے ہو؟ سالار نے ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کیں۔

"کس لئے۔" اسے امامہ کی آواز بہت بھاری لگ رہی تھی۔ یوں جیسے اسے فلو تھا پھر اچانک اس کو خیال آیا کہ وہ یقیناً روتی رہی ہو گی۔ یہ اسی کا اثر تھا۔

"تم میری طرف سے اس سے ریکوریٹ کرو کہ وہ مجھ سے شادی کر لے..... بیٹھ کے لئے نہیں

تو کچھ دنوں کے لئے ہی..... میں اس گھر سے نکلنا چاہتی ہوں اور میں کسی کی مدد کے بغیر یہاں سے نہیں نکل سکتی۔ بس وہ مجھ سے نکل کر لے۔“

”تمہارا تو فون پر اس سے رابطہ ہے پھر تم یہ سب خود اس سے فون پر کیوں نہیں کہہ دیتیں۔“ سالار نے چہس کھاتے ہوئے بڑے اطمینان سے اسے مشورہ دیا۔

”میں کہہ چکی ہوں۔“ اسے امامہ کی آواز پہلے سے زیادہ بھڑائی ہوئی تھی۔

”پھر؟“

”اس نے انکار کر دیا ہے۔“

”ویری سٹیڈ۔“ سالار نے افسوس کا اظہار کیا۔

”تو یہ دن سائیڈ ڈولومیر تھا۔“ اس نے کچھ تجسس کے عالم میں پوچھا۔

”نہیں۔“

”تو پھر اس نے انکار کیوں کر دیا؟“

”تم یہ جان کر کیا کرو گے۔“ وہ کچھ چڑ کر بولی۔ سالار نے ایک اور چہس اپنے منہ میں ڈالا۔

”میرے وہاں جا کر اس سے بات کرنے سے کیا ہوگا، بہتر ہے تم ہی وہاں جا کر اس سے بات کرو۔“

”وہ مجھ سے بات نہیں کر رہا، وہ فون نہیں اٹھاتا۔ ہاسٹل میں بھی کوئی اسے فون پر نہیں بلاتا۔ وہ جان بوجھ کر کتھار ہے۔“ امامہ نے کہا۔

”تو پھر تم اس کے پیچھے کیوں پڑی ہو، جانے دو اسے۔ وہ تم سے محبت نہیں کرتا۔“

”تم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتے، تم صرف میری مدد کرو، ایک بار جا کر اسے میری صورت حال کے بارے میں بتاؤ، وہ مجھ سے اس طرح نہیں کر سکتا۔“

”اور اگر اس نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کر دیا تو۔“

”پھر بھی تم اس سے بات کرنا، شاید..... شاید کوئی صورت نکل آئے، میرا مسئلہ حل ہو جائے۔“

سالار کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی، اسے امامہ کے حال پر ہنسی آرہی تھی۔

فون بند کرنے کے بعد چہس کھاتے ہوئے بھی وہ اس سارے معاملے کے بارے میں سوچتا رہا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ اس سارے معاملے میں زیادہ سے زیادہ انوکھو ہوتا جا رہا تھا۔ یہ اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا ایڈونچر محسوس ہو رہا تھا۔ پہلے امامہ تک فون پینچانا اور اب جلال سے رابطہ..... امامہ کا بوائے فرینڈ..... اس نے چہس کھاتے ہوئے زیر لب دہرایا۔ امامہ نے اسے اس کے ہاسٹل اور گھر کے تمام کوائف سے آگاہ کر دیا تھا اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے جلال انصر سے مل کر کیا کہنا ہے۔

☆.....☆.....☆

سالار نے اس شخص کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور وہ خاصا ماہجوس ہوا۔ سامنے کھڑا لڑکا بڑی عام سی شکل و صورت کا تھا۔ سالار کے لئے قد اور خوبصورت جسم نے اسے صنف مخالف کے لئے کسی حد تک پرکشش بنا دیا تھا مگر سامنے کھڑا ہوا وہ شخص ان دونوں چیزوں سے محروم تھا۔ وہ نارٹل قد و قامت کا مالک تھا۔ اس کے چہرے پر ڈاڑھی نہ ہوتی تو وہ پھر بھی قدرے بہتر نظر آتا۔ سالار سکندر کو جلال انصر سے مل کر باہمی ہوئی تھی۔ امامہ اب اسے پہلے سے زیادہ بے وقوف لگی۔

”میں جلال انصر ہوں، آپ ماننا چاہتے ہیں مجھ سے؟“

”میرا نام سالار سکندر ہے۔“ سالار نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

”معاف کیجئے گا مگر میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”ظاہر ہے آپ پہچان بھی کیسے سکتے ہیں۔ میں پہلی بار آپ سے مل رہا ہوں۔“

سالار اس وقت جلال کے ہاسٹل میں اسے ڈھونڈتے ہوئے آیا۔ چند لوگوں سے اس کے بارے میں دریافت کرنے پر وہ اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس وقت وہ ڈیوٹی روم کے باہر کھڑے تھے۔

”کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟“ جلال اب کچھ حیران نظر آیا۔

”بیٹھ کر بات..... مگر کس سٹیلے میں۔“

”امامہ کے سٹیلے میں۔“

جلال کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”میں اس کا دوست ہوں۔“ جلال کے چہرے کا رنگ ایک بار پھر بدل گیا۔ وہ چپ چاپ ایک طرف چلنے لگا۔ سالار اس کے ساتھ تھا۔

”پارکنگ میں میری گاڑی کھڑی ہے، وہاں چلتے ہیں۔“ سالار نے کہا۔

گاڑی تک پہنچنے اور اس کے اندر بیٹھنے تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔

”میں اسلام آباد سے آیا ہوں۔“ سالار نے کہنا شروع کیا۔

”امامہ چاہتی تھی کہ میں آپ سے بات کروں۔“

”امامہ نے کبھی مجھ سے آپ کا ذکر نہیں کیا۔“ جلال نے کچھ عجیب سے انداز میں کہا۔

”آپ امامہ کو کب سے جانتے ہیں؟“

”تقریباً بیچپن سے..... ہم دونوں کے گھر ساتھ ساتھ ہیں۔ بڑی گہری دوستی ہے ہماری۔“

سالار نہیں جانتا اس نے آخری جملہ کیوں کہا۔ شاید یہ جلال کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ تھے جن سے وہ کچھ اور محظوظ ہونا چاہتا تھا۔ وہ جلال کے چہرے پر نمودار ہونے والی ناپسندیدگی دیکھ چکا تھا۔

”امامہ سے میری بہت تفصیلی بات ہو چکی ہے، اتنی تفصیلی بات کے بعد اور کیا بات ہو سکتی ہے۔“

جلال نے سہلے میں کہا۔

”امام چاہتی ہے کہ آپ اس سے شادی کر لیں۔“ سالار نے جیسے نیوڈیلٹس پڑھتے ہوئے کہا۔

”میں اپنا جواب اسے تاپکا ہوں۔“

”وہ چاہتی ہے آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“

”وہ اس گھر میں اپنے والدین اور گھر والوں کی قید میں ہے۔ وہ چاہتی ہے آپ اگر ہمیشہ کے لئے

نہیں تو وقتی طور پر اس سے نکاح کریں اور پھر ایلیٹ کی مدد سے اسے چھڑالیں۔“

”یہ ممکن ہی نہیں ہے، وہ ان کی قید میں ہے تو نکاح ہی کیسے سکتا ہے۔“

”فون پر۔“

”نہیں، میں اتنا بزار سک نہیں لے سکتا۔ میں ایسے معاملات میں انوالو ہونا ہی نہیں چاہتا۔“ جلال

نے کہا۔ ”میرے والدین مجھے اس شادی کی اجازت نہیں دیں گے اور پھر وہ امام کو قبول کرنے پر تیار

بھی نہیں ہیں۔“

جلال کی نظریں اب سالار کے بالوں کی پونی پر جمی ہوئی تھیں، یقیناً سالار کی طرح اس نے بھی

اسے تاپسندیدہ قرار دیا ہوگا۔

”اس نے کہا کہ آپ وقتی طور پر اس سے صرف نکاح کر لیں تاکہ وہ اپنے گھر سے نکل سکے، بعد

میں آپ چاہیں تو اسے طلاق دے دیں۔“

”میں نے کہا میں اس کی مدد نہیں کر سکتا اور پھر اس طرح کے معاملات..... آپ خود اس سے

شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ اگر وقتی شادی کی بات ہے تو آپ کر لیں۔ آخر آپ اس کے دوست ہیں۔“

جلال نے کچھ چھینٹے ہوئے انداز میں سالار سے کہا۔ ”آپ اسلام آباد سے لاہور اس کی مدد کے لئے آ

سکتے ہیں تو پھر یہ کام بھی کر سکتے ہیں۔“

”اس نے مجھ سے شادی کا نہیں کہا، اس لئے میں نے اس بارے میں نہیں سوچا۔“ سالار نے

کندھے جھٹکتے ہوئے بے تاثر لہجے میں کہا۔ ”ویسے بھی وہ آپ سے محبت کرتی ہے، مجھ سے نہیں۔“

”مگر عارضی شادی یا نکاح میں تو محبت کا ہونا ضروری نہیں۔ بعد میں آپ بھی اسے طلاق دے

دیں۔“ جلال نے مسئلے کا حل نکال لیا تھا۔

”آپ کا مشورہ میں اسے پہنچا دوں گا۔“ سالار نے سنجیدگی سے کہا۔

”اور اگر یہ ممکن نہیں ہے تو پھر امام سے کہیں کہ وہ کوئی اور طریقہ اپنائے..... بلکہ آپ کسی

نیوڈیلٹس کے آفس میں پہلے جائیں اور انہیں امام کے بارے میں بتائیں کہ کس طرح اس کے خاندان نے

اسے زبردستی قید کر رکھا ہے۔ جب میڈیا اس معاملے کو ہائی لائٹ کرے گا تو خود ہی وہ امام کو چھوڑنے پر

مجبور ہو جائیں گے یا پھر آپ پولیس کو اس معاملے کی اطلاع دیں۔“

سالار کو حیرانی ہوئی۔ جلال کی تجویز بری نہیں تھی، واقعی امام اس بارے میں کیوں نہیں سوچ رہی

تھی۔ یہ راستہ زیادہ محفوظ تھا۔

”میں آپ کا یہ مشورہ بھی اسے پہنچا دوں گا۔“

”آپ دوبارہ میرے پاس نہ آئیں بلکہ امام سے بھی یہ کہہ دیں کہ وہ مجھ سے کسی بھی طریقے یا

ذریعے سے دوبارہ رابطہ نہ کرے۔ میرے والدین ویسے بھی میری مکلفی کرنے والے ہیں۔“ جلال نے

ہیسے انکشاف کیا۔

”ٹھیک ہے، میں یہ ساری باتیں اس تک پہنچا دوں گا۔“ سالار نے لاپرواہی سے کہا۔ جلال مزید

کچھ کہے بغیر گاڑی سے اتر گیا۔

اگر امام کو یہ توقع تھی کہ سالار جلال کو اس سے شادی کرنے کے لئے قائل کرے گا تو یہ اس کی

سب سے بڑی بھول تھی۔ وہ امام سے کوئی ہمدردی رکھتا تھا نہ ہی کسی خوف خدا کے تحت اس سارے

معاملے میں کودا تھا..... اس کے لئے یہ سب کچھ ایک ایڈوکیٹ تھا اور ایڈوکیٹ میں یقیناً جلال سے امام کی

شادی شامل نہیں تھی۔ اگر جلال سے اس کی شادی کے لئے دلائل دینے بھی پڑتے تو وہ کیا جتا۔ اس کے

پاس صرف ایک دلیل کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں تھی کہ جلال اور امام ایک دوسرے سے محبت کرتے

ہیں اور یہ وہ دلیل تھی جسے جلال پہلے ہی رو کر چکا تھا۔ وہ مذہبی یا اخلاقی حوالوں سے جلال کو قائل نہیں کر

سکتا تھا کیونکہ وہ خود ان دونوں چیزوں سے نااہل تھا۔ مذہب اور اخلاقیات سے اس کا دور دورے سے بھی کوئی

واسطہ نہیں تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آخر وہ امام کے لئے ایک دوسرے آدمی سے اتنی لمبی بحث

کرتا کیوں۔ وہ بھی ایسا آدمی جسے دیکھتے ہی اس نے تاپسند کر دیا تھا۔

اور یہ تمام وہ باتیں تھیں جو وہ اسلام آباد سے لاہور آتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ وہ آیا اس لئے تھا

کیونکہ وہ جلال سے ملنا چاہتا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ امام کے پیغام پر اس کا رد عمل کیا رہتا تھا۔ اس نے

امام کا پیغام اسی کے لفظوں میں کسی اضافے یا ترمیم کے بغیر پہنچا دیا تھا اور اب وہ جلال کا جواب لے کر

واپس جا رہا تھا اور خاصاً محفوظ ہو رہا تھا۔ آخر اس پیغام کے جواب میں وہ کیا کرے گی، کہے گی۔ امجد سے

شادی تو وہ نہیں کرے گی، جلال اس سے شادی کرنے پر تیار نہیں، گھر سے وہ نکل نہیں سکتی، کوئی اور ایسا

آدمی نہیں جو اس کی مدد کے لئے آسکے پھر آخر وہ اب آگے کیا کرے گی۔ عام طور پر لڑکیاں ان حالات

میں خودکشی کرتی ہیں۔ اوہ یس۔ وہ یقیناً اب مجھ سے زہر یا ریوٹور پہنچانے کی خواہش کرے گی۔

سالار متوقع صورت حال کے بارے میں سوچ کر پر جوش ہو رہا تھا۔ ”خودکشی..... ویری ایکسٹنگ۔“

آخر اس کے علاوہ وہ اور کبھی کیا کہتی ہے۔

☆.....☆.....☆

”تم مجھ سے شادی کرو گے؟“ سالار کو جیسے شاک لگا۔ ”فون پر نکاح؟“ وہ کچھ دیر کے لئے بول نہیں سکا۔

لاہور سے واپس آنے کے بعد اس نے امامہ کو جلال کا جواب بالکل اسی طرح سے پہنچا دیا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ اب رونا و سونا شروع کرے گی اور پھر اس سے کسی ہتھیار کی فرمائش کرے گی، مگر وہ کچھ دیر کے لئے خاموش رہی پھر اس نے سالار سے جو کہا تھا اس نے چند ثانیوں کے لئے سالار کے ہوش گم کر دیئے تھے۔

”مجھے صرف کچھ دیر کے لئے تمہارا ساتھ چاہئے تاکہ میرے والدین امجد کے ساتھ میری شادی نہ کر سکیں اور پھر تم ہیلتھ کے ذریعے مجھے یہاں سے نکال لو۔ اس کے بعد مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہے گی اور میں کبھی بھی اپنے والدین کو تمہارا نام نہیں بتاؤں گی۔“ وہ اب کہہ رہی تھی۔

”او کے کر لیتا ہوں۔۔۔۔۔ مگر یہ ہیلتھ والا کام تھوڑا مشکل ہے۔ اس میں بہت سی legalities انوالو ہو جاتی ہیں۔ وکیل کو ہار کرنا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ امامہ نے دوسری طرف سے اس کی بات کاٹ دی۔“ تم اپنے فرینڈز سے اس سلسلے میں مدد لے سکتے ہو۔ تمہارے فرینڈز تو اس طرح کے کاموں میں ماہر ہوں گے۔“

سالار کے ماتھے پر کچھ بل نمودار ہوئے۔ ”کس طرح کے کاموں میں۔“

”اسی طرح کے کاموں میں۔“

”تم کیسے جانتی ہو۔“

”وسم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری کینٹی اچھی نہیں ہے۔“

امامہ کے منہ سے بے اختیار نکلا اور پھر وہ خاموش ہو گئی۔ یہ جملہ مناسب نہیں تھا۔

”میری کینٹی بہت اچھی ہے، کم از کم جلال انصر کی کینٹی سے بہتر ہے۔“ سالار نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ اس بار بھی خاموش رہی۔

”بہر حال میں دیکھتا ہوں، میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔“ سالار کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد بولا۔ ”مگر تمہیں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ یہ کام بہت رنجش ہے۔“

”میں جانتی ہوں مگر ہو سکتا ہے میرے والدین صرف یہ بتا چکے ہوں گے کہ تم سے نکال دیں کہ میں شادی کر چکی ہوں اور مجھے ہیلتھ کی مدد لینا نہ پڑے یا ہو سکتا ہے وہ میری شادی کو قبول کر لیں اور پھر میں تم سے طلاق لے کر جلال سے شادی کر سکوں۔“

سالار نے سر کو قدرے افسوس کے عالم میں جھکا۔ ”اس نے دنیا میں اس طرح کا احمق پہلے کبھی

نہیں دیکھا۔ وہ احمقوں کی جنت کی ملکہ تھی یا شاید ہونے والی تھی۔

”چلو دیکھتا ہوں، کیا ہوتا ہے۔“ سالار نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

”میں ایک لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔“ حسن نے سالار کے چہرے کو غور سے دیکھا اور پھر بے اختیار ہنسا۔

”یہ اس سال کا نیا ایڈوچر ہے یا آخری ایڈوچر۔“

”آخری ایڈوچر۔“ سالار نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ تبصرہ کیا۔ ”یعنی تم شادی کر رہے ہو۔“ حسن نے ہر گز کھاتے ہوئے کہا۔

”شادی کا کون کہہ رہا ہے۔“ سالار نے اسے دیکھا۔

”تو پھر؟“

”میں ایک لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ اس کو مدد کی ضرورت ہے، میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“ حسن اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”آج تم مذاق کے موڈ میں ہو؟“

”نہیں، بالکل بھی نہیں۔“ میں نے حتمی یہاں مذاق کرنے کے لئے تو نہیں بولا۔

”پھر کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔۔۔۔۔ نکاح۔۔۔۔۔ لڑکی کی مدد۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔“ اس بار حسن نے قدرے ناگواری سے کہا۔ ”محبت وغیرہ ہو گئی ہے تمہیں کسی سے؟“

”مائی فٹ۔۔۔۔۔ میرا دماغ خراب ہے کہ میں کسی سے محبت کروں گا اور وہ بھی اس عمر میں۔“ سالار نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔

”بہی تو۔۔۔۔۔ میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ پھر تم کیا کر رہے ہو۔“

سالار نے اس بار اسے تفصیل سے امامہ اور اس کے مسئلہ کے بارے میں بتایا۔ اس نے حسن کو صرف یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ لڑکی وسیم کی بہن ہے کیونکہ حسن وسیم سے بہت اچھی طرح واقف تھا لیکن اس سے تفصیلات سننے کے بعد حسن نے پہلا سوال ہی یہ کیا تھا۔

”وہ لڑکی کون ہے؟“ سالار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔

”وسیم کی بہن۔“

”واٹ۔“ حسن بے اختیار اچھلا۔ ”وسیم کی بہن۔۔۔۔۔ وہ جو میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے۔“

”ہاں۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا، تم کیوں خواہ مخواہ اس طرح کی حماقت کر رہے ہو۔ وسیم کو تادوا اس

سارے معاملے کے بارے میں۔“

”میں تم سے مدد مانگنے آیا ہوں، مشورہ مانگنے نہیں۔“ سالار نے ناگواری سے کہا۔

”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔“ حسن نے کچھ اٹھے ہوئے انداز میں کہا۔

”تم نکاح خواں اور کچھ گواہوں کا انتظام کرو، تاکہ میں اس سے فون پر نکاح کر سکوں۔“ سالار نے فوراً ہی کام کی بات کی۔

”مگر تمہیں یہ نکاح کر کے فائدہ کیا ہوگا۔“

”کچھ بھی نہیں، مگر میں کسی فائدے کے بارے میں سوچ بھی کب رہا ہوں۔“

”دفع کرو سالار اس سب کو۔ تم کیوں کسی دوسرے کے معاملے میں کود رہے ہو اور وہ بھی وہم کی بہن کے معاملے میں۔ بہتر۔“

سالار نے اس بار درشتی سے اس کی بات کاٹی۔ ”تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ میری مدد کرو گے یا نہیں۔ باقی چیزوں کے بارے میں پریشان ہونا تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔“

”نہیک ہے، میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں مدد کرنے سے انکار نہیں کر رہا ہوں، مگر تم یہ سوچ لو کہ یہ سب بہت خطرناک ہے۔“ حسن نے ہتھیار ڈالنے والے انداز میں کہا۔

”میں سوچ چکا ہوں، تم مجھے تفصیلات بتاؤ۔“ سالار نے اس بار فریج فرائیز کھاتے ہوئے کچھ مطمئن انداز میں کہا۔

”بس ایک بات۔۔۔ اگر انکل اور آئی کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا۔“

”انہیں پتا نہیں چلے گا، وہ یہاں نہیں ہیں، کراچی گئے ہوئے ہیں اور ابھی کچھ دن وہاں نہیں گئے۔ وہ یہاں ہوتے پھر میرے لئے یہ سب کچھ کرنا بہت مشکل ہوتا۔“ سالار نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنا برگر تقریباً ختم کر چکا تھا۔ حسن اب اپنا برگر کھاتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبا

ہوا نظر آ رہا تھا مگر سالار اس کے تاثرات کی طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔ وہ ہانسا تھا کہ حسن اس وقت اپنا لالچہ عمل طے کرنے میں مصروف ہے۔ اسے حسن سے کسی قسم کا کوئی خوف یا خطرہ نہیں تھا۔ وہ اس کا

بھترین دوست تھا۔

☆—☆—☆

حسن نے نکاح کے انتظامات بہت آسانی سے کر لئے تھے۔ سالار نے اسے کچھ رقم دی تھی جس سے اس نے تمین گواہوں کا انتظام کر لیا تھا۔ چوتھے گواہ کے طور پر وہ خود موجود تھا۔ نکاح خواں کو اندازہ

تھا کہ اس نکاح میں کوئی غیر معمولی کہانی تھی۔ مگر اسے بھاری رقم کے ساتھ اتنی دھمکیاں بھی دے دی گئی تھیں کہ وہ خاموش ہو گیا۔

حسن سہ پہر کے وقت اس نکاح خواں اور تمینوں گواہوں کو لے آیا تھا۔ وہ سب سالار کے کمرے میں چلے گئے تھے۔ وہیں بیٹھ کر نکاح نامہ پھاڑا گیا تھا۔ سالار امامہ کو پہلے ہی اس بارے میں اظہار کر چکا

تھا۔ مقررہ وقت پر فون پر نکاح خواں نے ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا تھا۔ سالار نے ملازمہ کے ذریعے امامہ کو بیچر بھجوا دیے تھے۔ امامہ نے بیچر زلیخے ہی برقی رفتار سے ان پر سائن کر کے ملازمہ کو واپس

دے دیے تھے۔ ملازمہ ان بیچر زکو واپس سالار کے پاس لے آئی تھی، مگر وہ بری طرح تجسس کا شکار تھی۔ آخر وہ لوگ کون تھے جو سالار کے کمرے میں تھے اور یہ بیچر کیسے تھے جن پر امامہ نے سائن کیا

تھا۔ اس کا تھا لنگ رہا تھا اور اسے شہرہ پورہ تھا کہ ہونہ ہو وہ دونوں آپس میں شادی کر رہے تھے۔ سالار کو بیچر زکو واپس دیتے ہوئے وہ پوچھے بغیر وہ نہیں نکلی تھی۔

”یہ کس چیز کے فائدے میں سالار صاحب؟“ اس نے بظاہر بڑی سادگی اور معصومیت سے پوچھا۔

”تمہیں اس سے کیا..... جیسے بھی بیچر زکو ہوں..... تم اپنے کام سے کام رکھو۔“ سالار نے درشتی سے اسے جھڑک دیا۔

”اور ایک بات تم کان کھول کر سن لو، اس سارے معاملے کے بارے میں اگر تم اپنا منہ بند رکھو گی تو یہ تمہارے لئے بہتر ہو گا بلکہ بہت بہتر ہو گا۔“

”مجھے کیا ضرورت ہے جی کسی سے بھی اس بارے میں بات کرنے کی۔ میں نے تو ویسے ہی پوچھ لیا۔ آپ اطمینان رکھیں صاحب جی امیں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔“

ملازمہ فوراً گھبرا گئی تھی۔ سالار ویسے بھی اتنا اکڑ مزاج تھا کہ اسے اس سے بات کرتے ہوئے خوف آیا کرتا تھا۔ سالار نے کچھ نخرت بھرے انداز میں سر کو جھٹکا۔ اسے اس بات کا کوئی خوف نہیں تھا کہ

ملازمہ یہ سب کسی کو بتا سکتی تھی۔ اگر بتا بھی دیتی تو اسے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔

☆—☆—☆

”تم ایک بار پھر جلال سے ملو، ایک بار پھر پلیز۔“ وہ اس دن فون پر اس سے کہہ رہی تھی۔ سالار اس کی بات پر چڑ گیا۔ ”وہ تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا امامہ! وہ کتنی بار کہہ چکا ہے۔ آخر تم

کبھی کیوں نہیں ہو کہ وہ بارہ بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ اس کی کوئی مہنگی وغیرہ کرنا چاہ رہے ہیں۔“

”وہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ امامہ نے بے اختیار اس کی بات کاٹ دی۔ ”صرف اس لئے کہ میں اس سے دو بارہ کالمیکٹ نہ کروں، ورنہ اس کے پیرنس اتنی جلدی اس کی مہنگی کری نہیں سکتے۔“

”تو جب وہ نہیں چاہتا تم سے شادی کرنا اور کالمیکٹ کرنا..... تو تم کیوں خوار ہو رہی ہو اس کے پیچھے۔“

"کیونکہ میری قسمت میں خواری ہے۔" اس نے دوسری طرف سے ہجرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"اس کا کیا مطلب ہے۔" وہ ابھرا۔

"کوئی مطلب نہیں ہے۔ نہ تم سمجھ سکتے ہو۔۔۔۔ تم بس اس سے جا کر کہو کہ میری مدد کرے، وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتنی محبت کرتا ہے۔۔۔۔ اس سے کہو کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہی مجھ سے شادی کر لے۔" وہ بات کرتے کرتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"یہ کیا بات ہوئی۔" وہ اس کے آنسوؤں سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔ "کیا یہ بات کہنے سے وہ تم سے شادی کر لے گا۔"

امام نے جواب نہیں دیا، وہ لنگھتیوں سے رو رہی تھی۔ وہ بیزار ہو گیا۔
"تم یا تو رولو۔۔۔۔ یا پھر مجھ سے بات کر لو۔"

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ سالار نے فوراً کال کی۔ کال ریسیو نہیں کی گئی۔
پندرہ بیس منٹ کے بعد امام نے اسے دوبارہ کال کی۔ "اگر تم یہ وعدہ کرتی ہو کہ تم رہو گی نہیں تو مجھ سے بات کرو، ورنہ فون بند کر دو۔" سالار نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

"پھر تم لاہور جا رہے ہو۔" اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے اس سے پوچھا۔
سالار کو اس کی مستقل مزاجی پر حیرانی ہوئی۔ وہ واقعی ڈھیٹ تھی۔ وہ اب بھی اپنی ہی بات پر اٹکی ہوئی تھی۔
"اچھا، میں چلا جاؤں گا۔ تم نے اپنے گھر والوں کو شادی کے بارے میں بتایا ہے۔" سالار نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ابھی نہیں بتایا۔" وہ اب خود پر قابو پا چکی تھی۔

"کب بتاؤ گی؟" سالار کو پیسے ڈرامے کے اگلے سین کا انتظار تھا۔

"پتا نہیں۔" وہ کچھ ابھی۔ "تم کب لاہور جاؤ گے؟"

"بس جلد ہی چلا جاؤں گا۔ ابھی یہاں مجھے کچھ کام ہے ورنہ فوراً ہی چلا جاتا۔"

اس بار سالار نے جھوٹ بولا تھا۔ نہ تو اسے کوئی کام تھا اور نہ ہی وہ اس بار لاہور جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

"جب تم ہیٹل کے ڈریسے اپنے گھر سے نکل آؤ گی تو اس کے بعد تم کیا کرو گی۔۔۔۔ آئی میں کہاں جاؤ گی؟" سالار نے ایک بار پھر اسے اس موضوع سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "اس صورت میں جب جلال بھی تمہاری مدد کرنے پر تیار نہ ہوا تو۔۔۔۔"

"میں ابھی ایسا کچھ فرض نہیں کر رہی، وہ ضرور میری مدد کرے گا۔" امام نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پر زور انداز میں کہا۔ سالار نے کندھے اچکائے۔

"تم کچھ بھی فرض کرنے پر تیار نہیں ہو، ورنہ میں تم سے ضرور کہتا کہ شاید وہ نہ ہو جو تم چاہتی ہو پھر تم کیا کرو گی۔۔۔۔ تمہیں دو بارہ اپنے عیش کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔۔۔۔ تو زیادہ بہتر یہی ہے کہ تم ابھی یہاں سے نہ جانے کا سوچو۔۔۔۔ نہ ہی بیٹا اور کورٹ کی مدد لو۔ بعد میں بھی تو تمہیں یہاں ہی آنا پڑے گا۔"

"میں دوبارہ کبھی یہاں نہیں آؤں گی، کسی صورت میں نہیں۔"

"یہ جذباتیت ہے۔" سالار نے تہرہ کیا۔

"تم ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتے۔" امام نے ہمیشہ کی طرح اپنا مخصوص جملہ دہرایا۔ سالار کچھ بڑبڑا ہوا۔

"اوکے۔۔۔۔ کرو جو کرنا چاہتی ہو۔" اس نے لاپرواہی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

"کل شام کو ہم لوگ مسجد کے ساتھ تمہارا نکاح کر رہے ہیں۔ تمہاری رخصتی بھی ساتھ ہی کر دیا گے۔"

ہاشم مبین نے رات کو اس کے کمرے میں آکر اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پاپا! میں انکار کر دوں گی۔۔۔۔ آپ کے لئے بہتر ہے آپ اس طرح زبردستی میری شادی نہ کریں۔"
"تم انکار کرو گی تو میں تمہیں اسی وقت شوٹ کر دوں گا، یہ بات تم یاد رکھنا۔" وہ سر اٹھائے انہیں دیکھتی رہی۔

"پاپا! میں شادی کر چکی ہوں۔" ہاشم مبین کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ "میں اسی لئے اس شادی سے انکار کر رہی تھی۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"نہیں، میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ میں بیسے ماہ پہلے شادی کر چکی ہوں۔"

"کس کے ساتھ۔"

"میں یہ آپ کو نہیں بتا سکتی۔"

ہاشم مبین کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس اولاد کے ہاتھوں اتنا خوار ہوں گے۔ آگ بگولہ ہو کر وہ امام پر لپکے اور انہوں نے یکے بعد دیگرے اس کے چہرے پر تھپڑ مارنے شروع کر دیے۔ وہ چہرے کے سامنے دونوں ہاتھ کرتے ہوئے خود کو بچانے کی کوشش کرنے لگی مگر وہ اس میں بری طرح ناکام رہی۔ کمرے میں ہونے والا شور سن کر وہیم سب سے پہلے وہاں آیا تھا اور اسی نے ہاشم مبین کو پکڑ کر زبردستی امام سے دور کیا۔ وہ دیوار کے ساتھ پشت ٹکائے روٹی رہی۔

”بابا! آپ کیا کر رہے ہیں، سارا معاملہ آرام سے حل کیا جاسکتا ہے۔“ وسیم کے پیچھے گھر کے باقی لوگ بھی اندر چلے آئے تھے۔

”اس نے۔۔۔ اس نے شادی کر لی ہے کسی سے۔“ ہاشم مبین نے غم و غصہ کے عالم میں کہا۔

”بابا! جھوٹ بول رہی ہے، شادی کیسے کر سکتی ہے۔ ایک بار بھی گھر سے نہیں نکلی۔“ یہ وسیم تھا۔

”مجھے ماہ پہلے شادی کر لی ہے اس نے۔“ امام نے سر نہیں اٹھایا۔

”نہیں، میں نہیں مانتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا، یہ ایسا کر ہی نہیں سکتی۔“ وسیم اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ امام نے دو جھنڈائی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا اور کہا۔

”ایسا ہو چکا ہے۔“

”کیا ثبوت ہے۔۔۔ نکاح نامہ ہے تمہارے پاس؟“ وسیم نے اکڑ لیجے میں کہا۔

”یہاں نہیں ہے، لاہور میں ہے، میرے سامان میں۔“

”بابا! میں کل لاہور سے اس کا سامان لے آتا ہوں۔ دیکھ لیتے ہیں۔“ وسیم نے ہاشم مبین سے کہا۔

امام بے اختیار ہنسنے لگا۔ سامان سے کیا مل سکتا تھا۔

”شادی کر بھی لی ہے تو کوئی بات نہیں، طلاق دلو اور تمہاری شادی احمد سے کرواؤں گا اور اس

آدمی نے طلاق نہ دی تو پھر اسے قتل کروادوں گا۔“ ہاشم مبین نے سرخ چہرے کے ساتھ وہاں سے جاتے

ہوئے کہا۔ کمرہ آہستہ آہستہ خالی ہو گیا۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اسے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ جال میں

پھنسنے کے بعد کے احساسات کیا ہوتے ہیں۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ نکاح نامے کی کاپی سالار نے اس کو نہیں

بجھوائی تھی۔ اگر اس کے پاس ہوتی بھی تو تب بھی وہ اسے ہاشم مبین کو نہیں دے سکتی تھی ورنہ سالار سکندر کا

نام نکاح نامے پر دیکھنے کے بعد ان کے لئے اس تک پہنچنا اور اس سے پھٹکارا حاصل کرنا منٹوں کا کام تھا اور

اس کے سامان سے نکاح نامہ نہیں ملے گا تو اس کے اس بیان پر کسی کو یقین نہ آسکتا کہ وہ نکاح کر چکی تھی۔

اس نے کمرے کے دروازے کو لاک کر دیا اور صوبائل پر سالار کو کال کرنے لگی۔ اس نے ساری

صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

”تم ایک بار پھر لاہور جاؤ اور جلال کو میرے بارے میں بتاؤ۔ میں اب اس گھر میں نہیں رہ

سکتی۔ مجھے یہاں سے لگانا ہے اور اس کے علاوہ میں کہیں نہیں جا سکتی۔ تم میرے لئے ایک وکیل کو ہاؤز کرو

اور اس سے کہو کہ وہ میرے پیش کو میرے شوہر کی طرف سے مجھے جس جہے چاہیں رکھنے کے خلاف

ایک کورٹ نوٹس بجھوائے۔“

”تمہارے شوہر، یعنی میری طرف سے۔“

”تم وکیل کو اپنا نام مت بتانا بلکہ یہ بہتر ہے کہ اپنے کسی دوست کے ذریعے وکیل ہاؤز کرو اور

میرے شوہر کا کوئی بھی فرضی نام دے سکتے ہو۔ تمہارا نام وکیل کے ذریعے انہیں پتا چلے گا تو وہ تم تک پہنچ جائیں گے اور میں یہ نہیں چاہتی۔“

امام نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اسے کیا حد شہ ہے اور نہ ہی سالار نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

اس سے بات کرنے کے بعد امام نے فون بند کر دیا۔ اگلے روز دس گیارہ بجے کے قریب کسی وکیل

نے فون کر کے ہاشم مبین سے امام کے سلسلے میں بات کی اور انہیں امام کو زبردستی اپنے گھر رکھنے کے

بارے میں اس کے شوہر کی طرف سے کئے جانے والے کیس کے بارے میں بتایا۔ ہاشم مبین کو مزید کسی

ثبوت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ دو ہفتے میں پھٹکارتے ہوئے اس کے کمرے میں گئے اور اسے بری

طرح مارا۔

”تم دیکھنا امام! تم کس طرح برباد ہو گی۔۔۔ ایک ایک شے کے لئے ترسو گی تم۔۔۔ جو لڑکیاں

تمہاری طرح اپنے ماں باپ کی عزت کو نیلام کرتی ہیں ان کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ تم ہمیں کورٹ تک

لے گئی ہو۔۔۔ تم نے وہ سارے احسان فراموش کر دیئے، جو ہم نے تم پر کئے۔ تمہارے جیسی بیٹیوں کو

واقعی پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دینا چاہئے۔“

وہ بڑی خاموشی سے جتنی رہی۔ اپنے باپ کی کیفیات کو سمجھ سکتی تھی مگر وہ اپنی کیفیات اور اپنے

احساسات انہیں نہیں سمجھا سکتی تھی۔

”تم نے ہمیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا، کسی کو نہیں۔ ہمیں زندہ درگور کر دیا ہے

تم نے۔“

سہیلی اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی تھیں مگر انہوں نے ہاشم مبین احمد کو روکنے کی کوشش

نہیں کی۔ وہ خود بھی بری طرح مشتعل تھیں، وہ جانتی تھیں کہ امام کا یہ قدم کس طرح ان کے پورے

خاندان کو متاثر کرنے والا تھا اور خاص طور پر ان کے شوہر کو۔

”تم نے ہمارے احماد کا خون کیا ہے۔ کاش تم میری اولاد نہ ہوتیں۔ کبھی میرے خاندان میں پیدا نہ

ہوئی ہوتیں۔ پیدا ہو ہی گئی تھی تو تب ہی مر جاتی۔۔۔ یا میں ہی تمہیں مار دیتا۔“ امام آج ان کی باتوں اور

پٹائی پر نہیں روئی تھی۔ اس نے مدافعت کی کوئی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ صرف خاموشی کے ساتھ جتنی

رہی پھر ہاشم مبین احمد جیسے تھک سے گئے اور اسے مارتے مارتے ڈک گئے۔ ان کا سانس پھول گیا تھا۔ وہ

بالکل خاموشی سے ان کے سامنے دباؤ کے ساتھ گئی کھڑی تھی۔

”تمہارے پاس ابھی بھی وقت ہے، سب کچھ چھوڑ دو۔ اس لڑکے سے طلاق لے لو اور احمد سے

شادی کر لو۔ ہم اس سب کو معاف کر دیں گے، بھلا دیں گے۔“ اس بار سہیلی نے تیز لہجے میں اس سے کہا۔

”نہیں، واپس آنے کے لئے اسلام قبول نہیں کیا مجھے واپس نہیں آنا۔“ امام نے دم مگر مستحکم

آواز میں کہا۔ ”آپ مجھے اس گھر سے چلے جانے دیں، مجھے آزاد کر دیں۔“

”اس گھر سے نکل جاؤ گی تو دنیا تمہیں بہت ٹھوکرے مارے گی۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ باہری دنیا میں کیسے مگرچھ تمہیں ہڑپ کرنے کے لئے بیٹھے ہیں۔ جس لڑکے سے شادی کر کے تم نے ہمیں ذلیل کیا ہے وہ تمہیں بہت غور کرے گا۔ ہمارے خاندان کو دیکھ کر اس نے تمہارے ساتھ اس طرح چوری چھپے رشتہ جوڑا ہے، جب ہم تمہیں اپنے خاندان سے نکال دیں گے اور تم پائی پائی کی محتاج ہو جاؤ گی تو وہ بھی تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ تمہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی، کوئی ٹھکانہ نہیں ملے گا۔“ سلسلی اب اسے ڈرا رہی تھی۔ ”ابھی بھی وقت ہے امام! تمہارے پاس ابھی بھی وقت ہے۔“

”نہیں امی! میرے پاس کوئی وقت نہیں ہے، میں سب کچھ ملے کر لچکی ہوں۔ میں اپنا فیصلہ آپ کو بتا چکی ہوں۔ مجھے یہ سب قبول نہیں۔ آپ مجھے جانے دیں، اپنے خاندان سے الگ کرنا چاہتے ہیں، کر دیں۔ جائیداد سے محروم کرنا چاہتے ہیں، کر دیں۔ میں کوئی اعتراض نہیں کروں گی مگر میں کروں گی وہی جو میں آپ کو بتا رہی ہوں۔ میں اپنی زندگی کے راستے کا انتخاب کر چکی ہوں۔ آپ یا کوئی بھی اسے بدل نہیں سکتا۔“

”ایسی بات ہے تو تم اس گھر سے نکل کر دکھاؤ، میں تمہیں جان سے مار دوں گا لیکن اس گھر سے تمہیں جانے نہیں دوں گا۔ اور اس ذلیل کو تو میں اچھی طرح دیکھ لوں گا۔ تمہیں اگر یہ خوش فہمی ہے کہ کوئی کورٹ یا عدالت تمہیں میری تحویل سے نکال سکتی ہے تو یہ تمہاری بھول ہے، میں تمہیں کبھی بھی کہیں بھی جانے نہیں دوں گا۔ میں ایف کے آنے سے پہلے اس گھر سے کہیں اور منتقل کر دوں گا پھر میں دیکھوں گا کہ تم کس طرح اپنے فیصلے کو تبدیل نہیں کرتیں اور مجھے اگر وہ لڑکانہ صاحب سے تم نے شادی کی ہے تو پھر میں اس بات کی پروا کئے بغیر کہ تمہارا نکاح ہو چکا ہے احمد سے تمہاری شادی کر دوں گا۔ میں اس شادی کو سر سے سامنے سے انکار کرتا ہوں۔ تمہاری شادی صرف وہ ہو گی جو میری مرضی سے ہو گی، اس کے علاوہ نہیں۔“ وہ مشتعل انداز میں کہتے ہوئے سلسلی کے ساتھ باہر نکل گئے۔ وہ ہیں دیوار کے ساتھ کمری خوفزدہ اور پریشان نظروں سے دروازے کو دیکھتی رہی۔ اس نے جس مقصد کے لئے شادی کی تھی اس کا کوئی فائدہ ہو گا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہاشم مبین احمد اپنی بات پر چہان کی طرح اڑے ہوئے تھے۔

☆.....☆.....☆

”بے چاری امام! بی بی! امام! ناصرو نے سالار کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اچانک بلند آواز میں افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ سالار نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اپنی اسٹڈی ٹیبل پر پڑی ہوئی کتابوں کو سمیٹ رہا تھا۔ ناصرو اسے متوجہ دیکھ کر تیزی سے بولی۔

”بڑی مار پڑی ہے جی کل رات کو۔“

”کس کو مار پڑی ہے؟“ سالار نے کتابیں ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

”امام! بی بی کوئی اور کئے۔“ وہ کتابیں ایک طرف کرتے کرتے ڈک گیا اور ناصرو کو دیکھا جو کمرے میں موجود ایک شیلف کی جھماڑ پونچھ کر رہی تھی۔

”ہاشم مبین نے کل بہت مارا ہے۔“

سالار بے حد محظوظ ہوا۔ ”واقعی؟“

”ہاں جی، بہت زیادہ پٹائی کی ہے، میری بیٹی بتا رہی تھی۔“ ناصرو نے کہا۔

”وہ بری ٹائٹس۔“ سالار نے بے اختیار تبصرہ کیا۔

”جی۔۔۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ ناصرو نے اس سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ مارا کس لئے؟“ سالار نے پوچھا۔

اس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ ناصرو کو عجیب لگی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اس خبر پر مسکرائے گا۔ اس کے ذاتی ”قیافوں“ اور ”اندازوں“ کے مطابق ان دونوں کے درمیان جیسے تعلقات تھے اس پر سالار کو بہت زیادہ افسردہ ہونا چاہئے تھا مگر یہاں صورت حال بالکل برعکس تھی۔

”بے چاری امام! بی بی کو پتا چل جائے کہ سالار صاحب اس خبر پر مسکرا رہے تھے تو وہ تو صدمے سے ہی مر جائیں۔“ ناصرو نے دل میں سوچا۔

”کس بات پر مارنا ہے جی!“ سنا ہے وہ احمد صاحب سے شادی پر تیار نہیں ہیں کسی اور ”لڑکے“ سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔“ ناصرو نے لڑکے پر زور دیتے ہوئے معنی خیز انداز میں سالار کو دیکھا۔

”بس اس بات پر۔“ سالار نے لاپرواہی سے کہا۔

”یہ کوئی چھوٹی بات تھوڑی ہے جی، ان کے پورے گھر میں طوفان مچا ہوا ہے۔ شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے، کارڈ آچکے ہیں اور اب امام! بی بی بھند ہیں کہ وہ احمد صاحب سے شادی نہیں کریں گی۔ بس اسی بات پر ہاشم صاحب نے ان کی پٹائی کی۔“

”یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ اس پر کسی کو مارا جائے۔“ وہ اپنی کتابوں میں مصروف تھا۔

”یہ تو آپ کہہ رہے ہیں نا۔۔۔۔۔ ان لوگوں کے لئے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔“ ناصرو نے اسی طرح صفائی کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔ ”میں تو بڑی ڈبھی ہوں امام! بی بی کے لئے۔ بڑی اچھی ہیں، ادب لحاظ والی۔ اور اب دیکھیں۔۔۔ کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے ان پر۔ ہاشم صاحب نے گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دی ہے۔ میری بیٹی روزانہ کاکمرہ صاف کرتی ہے۔ اور وہ بتاتی ہے کہ ان کا تو چہرہ ہی آئز کر رہ گیا ہے۔“

ناصرو اسی طرح بول رہی تھی۔ شاید وہ شعوری طور پر یہ کوشش کر رہی تھی کہ سالار اسے اپنا اور

امامہ کا ساتھی اور طرف دار سمجھے ہوئے کوئی راز کہہ دے مگر سالار احمق نہیں تھا اور اسے نامصرہ کی اس نام نہاد ہمدردی سے کوئی دلچسپی تھی بھی نہیں۔ اگر امامہ کی پٹائی ہو رہی تھی اور اسے کچھ تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا تو اس سے اس کا کیا تعلق تھا، مگر اسے اس صورت حال پر ہنسی ضرور آ رہی تھی۔ کیا اس دور میں بھی کوئی اس عمر کی اولاد پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے اور وہ بھی ہاشم بنین احمد جیسے امیر طہنے کا آدمی۔ حیرانی کی بات تھی۔۔۔

سوچ کی ایک ہی رو میں بہت سے متضاد خیالات بہ رہے تھے۔

نامصرہ کچھ دیر اسی طرح بولتی اپنا کام کرتی رہی مگر پھر جب اس نے دیکھا کہ سالار اس کی گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا اور اپنے کام میں مصروف ہو چکا ہے تو وہ قدرے مایوس ہو کر خاموش ہو گئی۔ "یہ پہلے محبت کرنے والے تھے، جن کا رویہ بے حد عجیب تھا۔۔۔ کوئی اضطراب۔۔۔ بے چینی اور پریشانی تو ان دونوں کے درمیان نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔۔۔ ایک دوسرے کی تکلیف کا بھی سن کر۔۔۔ شاید امامہ بی بی بھی ان کے بارے میں اس طرح کی کوئی بات سن کر اسی طرح مسکرائیں، کون جانتا ہے۔"

نامصرہ نے شبلیت پر پڑی ایک تصویر اٹھا کر صاف کی۔

☆.....☆.....☆

گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ اس کی زندگی کے سب سے مشکل اور تکلیف دہ فیصلوں میں سے ایک تھا مگر اس کے علاوہ اس کے پاس اب دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہاشم بنین احمد اسے کہاں لے جاتے اور پھر کس طرح اسے طلاق دلوگا اس کی شادی مجدد سے کرتے، وہ نہیں جانتی تھی۔ واحد چیز جو وہ جانتی تھی وہ یہ حقیقت تھی کہ ایک بار وہ اسے کہیں اور لے گئے تو پھر اس کے پاس رہائی اور فرار کا کوئی راستہ نہیں بچے گا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اسے جان سے بھی نہیں ماریں گے مگر زندہ رہ کر اس طرح کی زندگی گزارنا زیادہ مشکل ہو جاتا، جیسی زندگی کی وہ اس وقت توقع اور تصور کر رہی تھی۔

ہاشم بنین احمد کے چلنے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک بیٹھ کر روتی رہی اور پھر اس نے پہلی بار اپنے حالات پر غور کرنا شروع کیا۔ اسے گھر سے صبح ہونے سے پہلے پہلے لگانا تھا اور نکل کر کسی محفوظ جگہ پر پہنچنا تھا۔ محفوظ جگہ۔۔۔؟ اس کے ذہن میں ایک بار پھر جہاں انصر کا خیال آیا، اس وقت صرف وہی شخص تھا جو اسے صحیح معنوں میں تحفظ دے سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کا فیصلہ اور رویہ بدل جائے، وہ اپنے فیصلے پر غور کرنے پر مجبور ہو جائے، ہو سکتا ہے وہ مجھے سہارا اور تحفظ دینے پر تیار ہو جائے، اس کے والدین کو مجھ پر ترس آجائے۔

ایک موم ہوسمی امید اس کے دل میں ابھر رہی تھی۔ وہ مدد نہیں بھی کرتے جب بھی کم از کم میں آزاد تو ہوں گی۔ اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے گزارا تو سکوں گی مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں یہاں سے

کیسے نکلوں گی اور جاؤں گی کہاں۔؟

وہ بہت دیر تک پریشانی کے عالم میں بیٹھی رہی، اسے ایک بار پھر سالار کا خیال آیا۔

"اگر میں کسی طرح اس کے گھر پہنچ جاؤں تو وہ میری مدد کر سکتا ہے۔"

اس نے سالار کے موبائل پر اس کا نمبر ملا یا۔ موبائل آف تھا، کئی بار کال ملائی لیکن اس سے رابطہ نہ ہو سکا۔ امامہ نے موبائل بند کر دیا۔ اس نے ایک بیگ میں اپنے چند جوڑے، کپڑے اور دوسری چیزیں رکھ لیں۔ اس کے پاس کچھ زچہ رات اور رقم بھی تھی، اس نے انہیں بھی اپنے بیگ میں رکھ لیا پھر جتنی بھی قیمتی چیزیں اس کے پاس تھیں، جنہیں وہ آسانی سے ساتھ لے جا سکتی تھی اور بعد میں بیچ کر پیسے حاصل کر سکتی تھی وہ انہیں اپنے بیگ میں رکھتی گئی۔ بیگ بند کرنے کے بعد اس نے اپنے کپڑے تبدیل کئے اور پھر دو نعل ادا کئے۔

اس کا دل بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔ بے سکونی اور اضطراب نے اس کے پورے وجود کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ آنسو بہا کر بھی اس کے دل کا بوجھ کم نہیں ہوا تھا۔ نواخل ادا کرنے کے بعد جتنی آیات اور سورتیں اسے زبانی یاد تھیں اس نے وہ ساری پڑھ لیں۔

بیگ لے کر اپنے کمرے کی لائٹ بند کر کے وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ لاؤنج کی ایک لائٹ کے علاوہ ساری لائٹیں آف تھیں، وہاں زیادہ روشنی نہیں تھی۔ وہ محتاط انداز میں چلتے ہوئے بیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی اور پھر بیگ کی طرف چلی گئی۔ لیکن تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ محتاط انداز میں چیزوں کو ٹٹولتے ہوئے لیکن اسے اس دروازے کی طرف بڑھ گئی جو باہر لان میں کھلتا تھا۔ جتنی لان کے اس حصے میں کچھ سبزیاں لگائی گئی تھیں اور اس گھر میں لیکن کا دروازہ واحد دروازہ تھا جسے لاک نہیں کیا جاتا تھا، صرف چھتھی لگادی جاتی تھی۔ دروازہ اس رات بھی لاک نہیں تھا۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ کچھ فاصلے پر سردنٹ کو اترتے تھے، وہ بے حد محتاط انداز میں چلتے ہوئے لان عبور کر کے اپنے اور سالار کے گھر کی درمیانی دیوار تک پہنچ گئی۔ دیوار بہت زیادہ بلند نہیں تھی، اس نے آہستگی سے بیگ دوسری طرف پھینک دیا اور پھر کچھ جدوجہد کے بعد خود بھی دیوار پھلانگنے میں کامیاب ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

گھبرائی نیند کے عالم میں سالار نے کھٹکے کی آواز سنی تھی پھر وہ آواز تک کی آواز میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ڈک ڈک کر۔۔۔ مگر مسلسل کی جانے والی دھتک کی آواز۔۔۔ وہ اندھ سے منہ پیٹتے کے بل سو رہا تھا۔ دھتک کی اس آواز نے اس کی نیند توڑ دی تھی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بیڈ پر بیٹھے بیٹھے اس نے تاریکی میں اپنے چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ خوف کی ایک لہر اس کے اندر سرایت کر گئی۔ وہ آواز کھڑکیوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ یوں جیسے کوئی

ان کھڑکیوں کو بھارا تھا مگر بہت آہستہ آہستہ..... یا پھر شاید کوئی ان کھڑکیوں کو ٹوٹتے ہوئے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سالار کے ذہن میں پہلا خیال کسی چور کا آیا تھا، وہ سلائیڈنگ ونڈوز تھیں اور بد قسمتی سے وہاں کوئی گرل نہیں تھی۔ اس کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں کی تھی کیونکہ وہ اہمپور ٹڈگلاس کی بنی ہوئی تھیں جنہیں آسانی سے توڑا جاسکتا تھا اور انہیں صرف اندر سے کھولا جاسکتا تھا۔ گھر کے چاروں طرف موجود لان میں ویسے بھی رات کو کتے کھلے ہوتے تھے اور ان کے ساتھ تین گارڈز بھی ہوتے تھے..... مگر ان تمام حفاظتی اقدامات کے باوجود اس وقت اس کھڑکی کے دوسری طرف موجود چھوٹے سے برآمدے میں کوئی موجود تھا جو اس کھڑکی کو کھولنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

اپنے بیڈ سے دبے قدموں اٹھ کر وہ تاریکی میں ہی کھڑکی کی طرف آیا جس طرف سے آواز آرہی تھی، وہ اس کے بالکل مخالف سمت گیا اور بہت احتیاط کے ساتھ اس نے پردے کے ایک سرے کو تھوڑا سا اٹھاتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ لان میں گئی روشنیوں میں اس نے اپنی کھڑکی کے سامنے جسے کھڑکیوں کا نام تھا اس نے اسے ہکا بکا کر دیا تھا۔

”یہ پاگل ہے۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اس وقت اگر لان میں پھرتے چار غیر ملکی نسل کے کتے اسے دیکھ لیتے تو سالار یا کسی بھی دوسرے کے کھینچنے سے پہلے وہ اسے چیر پھاڑ چکے ہوتے اور اگر کہیں گارڈز میں سے کسی نے اسے وہاں دیکھا ہوتا تو بھی وہ تفتیش یا تحقیق پر وقت ضائع کرنے سے پہلے اسے شوٹ کر بیٹھے ہوتے مگر وہ اس وقت بالکل محفوظ رہا کھڑکی تھی اور یقیناً اپنے گھر کی دیوار پھلانگ کر یہاں آئی تھی۔

ہونٹ کھینچنے، اس نے کمرے کی لائٹ آن کی۔ لائٹ آن ہوتے ہی دھک کی آواز زک مچی۔ کتے کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ پردے کھینچتے ہی اس نے سلائیڈنگ ونڈوز کو ہٹا دیا۔

”اندرا آؤ جلدی۔“ سالار نے تجزی سے امام سے کہا۔ وہ کچھ زروس ہو کر کھڑکی سے اندر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ بھی تھا۔

پردے برابر کرتے ہی سالار نے مڑ کر اس سے کہا۔
”فار گاڈ سیک امام! تم پاگل ہو۔“ امام نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنا بیگ اپنے پیروں میں رکھ رہی تھی۔

”تم دیوار کر اس کر کے آئی ہو؟“

”ہاں۔“

”تمہیں گارڈز یا کتوں میں سے کوئی دیکھ لیتا تو..... اس وقت باہر تمہاری لاش پڑی ہوتی۔“
”میں نے تمہیں بہت دفعہ رنگ کیا، تمہارا موہاگل آف تھا، کوئی دوسرا دستہ نہیں تمہارے پاس۔“

سالار نے جھپٹی ہار اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سوئی ہوئی اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ وہ بڑی سی سفید چادر لپیٹے ہوئے تھی مگر اس چادر اور اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ مٹی کے داغ تھے۔

”تم مجھے لاہور چھوڑ کر آسکتے ہو؟“ وہ کمرے کے وسط میں کھڑکی اس سے پوچھ رہی تھی۔
”اس وقت؟“ اس نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں، ابھی اسی وقت۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

سالار نے تعجب کے عالم میں وال کلاک پر ایک نظر ڈالی۔ ”وکیل نے تمہارے گھر فون کیا تھا، تمہارا مسئلہ حل نہیں ہوا؟“

امام نے فحشی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، وہ لوگ مجھے صبح کہیں بھجوا رہے ہیں۔ میں تمہیں اسی لئے سارا دن فون کرتی رہی مگر تم نے موہاگل آن نہیں کیا۔ میں چاہتی تھی تم وکیل کو کہو کہ وہ ہالٹ کے ساتھ آ کر مجھے وہاں سے آزاد کروائے مگر تم سے کالمیکٹ نہیں ہوا اور کل اگر تم سے کالمیکٹ ہوتا بھی تو کچھ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ لوگ اس سے پہلے ہی مجھے کہیں شفٹ کر دیتے اور یہ ضروری تو نہیں کہ مجھے یہ پتا ہوتا کہ وہ مجھے کہاں شفٹ کر رہے ہیں۔“

سالار نے ہنسی لی۔ اسے نیند آرہی تھی۔ ”تم بیٹھ جاؤ۔“ اس نے امام سے کہا۔ وہ ابھی تک کھڑکی تھی۔

”تم اگر مجھے لاہور نہیں پہنچا سکتے تو کم از کم بس اسٹینڈنگ پہنچا دو، میں وہاں سے خود لاہور چلی جاؤں گی۔“ اس نے سالار کو نیند میں دیکھ کر کہا۔ ”میرا اندازہ ہے کہ اس وقت تو کوئی گاڑی لاہور نہیں چارہی ہوگی۔“

”میں تمہیں صبح.....“ امام نے اس کی بات کاٹ دی۔

”نہیں، صبح نہیں۔ میں صبح تک یہاں سے نکل جانا چاہتی ہوں۔ اگر لاہور کی گاڑی نہیں ملی تو میں کسی اور شہر کی گاڑی میں بیٹھ جاؤں گی پھر وہاں سے لاہور چلی جاؤں گی۔“

”تم بیٹھو تو سہی۔“ سالار نے اس سے ایک بار پھر کہا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے چٹکپٹائی پھر صوف پر جا کر بیٹھ گئی۔ سالار خود بھی اپنے بیڈ کی پانچٹی پر بیٹھ گیا۔

”لاہور تم کہاں جاؤ گی؟“ اس نے پوچھا۔

”جلال کے پاس۔“

”مگر وہ تو تم سے شادی سے انکار کر چکا ہے۔“

”میں پھر بھی اس کے پاس جاؤں گی، اسے مجھ سے محبت ہے۔ وہ مجھ کو اس طرح بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اس سے اور اس کے گھر والوں سے ریکوریٹ کروں گی۔ میں جانتی ہوں وہ میری

بات مان لیں گے، وہ میری صورت حال کو سمجھ لیں گے۔“

”مگر تم تو مجھ سے شادی کر چکی ہو۔“ امام چونک کر سالار کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”بہتر میری ہے وہ۔۔۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں مجبوراً نکاح کر رہی ہوں، شادی تو نہیں ہے یہ۔“ وہ اسے پلکیں جھپکائے بغیر گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ ”تم جانتی ہو، میں آج لاہور گیا تھا جلال کے پاس۔“

امام کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ ”تم نے اسے میری پریشانی اور صورت حال کے بارے میں بتایا؟“

”نہیں۔“ سالار نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیوں؟“

”جلال نے شادی کر لی ہے۔“ سالار نے لاپرواہی سے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ وہ سانس لینا بھول گئی۔ پلکیں جھپکائے بغیر وہ کسی بات کی طرح اسے دیکھنے لگی۔

”تین دن ہو گئے ہیں اس کی شادی کو، کل برسوں تک وہ سیر و تفریح کے لئے ناوردن ایریاز کی طرف جا رہا ہے۔ اس نے میری کوئی بات سننے سے پہلے ہی مجھے یہ سب کچھ بتانا شروع کر دیا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ میں اب تمہارے بارے میں بات نہ کروں۔ اس کی بیوی بھی ڈاکٹر ہے۔“ سالار بات کرتے کرتے رُک گیا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس کے گھر والوں نے تمہارے مسئلے کی وجہ سے ہی اس کی اس طرح اچانک شادی کی ہے۔“ وہ یکے بعد دیگرے جھوٹ پر جھوٹ بولتا جا رہا تھا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ جیسے کسی غلامے آواز آئی تھی۔

”ہاں، مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا اور مجھے توقع تھی کہ تمہیں بھی یقین نہیں آئے گا مگر یہ سچ ہے۔ تم فون کر کے اس سے بات کر سکتی ہو اس بارے میں۔“ سالار نے کندھے جھٹکتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔ امام کو لگا وہ پہلی بار صحیح معنوں میں گھپ اندھیرے میں آکھڑی ہوئی ہے۔ روشنی کی وہ کرن جس کے تقاب میں وہ اتنا عرصہ چلتی آئی ہے، یک دم گل ہو گئی ہے۔ راستہ تو ایک طرف، وہ اپنے وجود کو بھی نہیں دیکھ پار ہی تھی۔

”اب تم خود سوچ لو کہ لاہور جا کر تم کیا کرو گی۔ وہ تو اب تم سے شادی کر سکتا ہے، نہ اس کے گھر والے تمہیں پناہ دے سکتے ہیں۔ بہتر ہے تم واپس چلی جاؤ، ابھی تمہارے گھر والوں کو پتا نہیں چلا ہو گا۔“ امام نے کہیں بہت دور سے سالار کی آواز آتی سنی۔ وہ کچھ نہ سمجھے والے انداز میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”مجھے لاہور چھوڑ آؤ۔“ وہ بڑبڑائی۔

”جلال کے پاس جاؤ گی؟“

”نہیں۔ اس کے پاس نہیں جاؤں گی مگر میں اپنے گھر نہیں رہ سکتی۔“

وہ یک دم صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سالار نے ایک سانس لے کر اُلجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”یا پھر مجھے گیٹ تک چھوڑ آؤ، میں خود چلی جاتی ہوں۔ تم چوکیدار سے کہو، وہ مجھے باہر جانے دے۔“ اس نے بیگ اٹھالیا۔

”تمہیں اندازہ ہے کہ یہاں سے بس اسٹینڈ کتنی دور ہے۔ اتنی ڈھند اور سردی میں تم پیدل وہاں تک جا سکو گی۔“

”جب اور کچھ نہیں رہا میرے پاس تو ڈھند اور سردی سے مجھے کیا ہو گا۔“ سالار نے اسے گہلی آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں کو رگڑ رہی تھی۔ سالار اس کے ساتھ کہیں جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ لاہور تو بہت دور کی بات تھی، اسے ابھی بھی نیند آر ہی تھی اور وہ سامنے کھڑی لڑکی کو ناپسند کرتا تھا۔

”ظہر و، میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔“ وہ نہیں جانتا اس کی زبان سے یہ جملہ کیوں اور کیسے نکلا۔ امام نے اسے ڈرینگ روم کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ کچھ دیر بعد باہر نکلا تو شبِ خوابی کے لباس کے بجائے ایک جینز اور سویٹر میں لبوس تھا۔ اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے اس نے کی چین اور گھڑی کے ساتھ ساتھ اپنا والٹ بھی اٹھالیا۔ امام کے قریب آ کر اس نے بیگ لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

”نہیں، میں خود اٹھالوں گی۔“

”اٹھا لیتا ہوں۔“ اس نے بیگ لے کر کندھے پر ڈال لیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے پورچ میں آ گئے۔ سالار نے اس کے لئے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا تھا اور بیگ کو کچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔

گاڑی گیٹ کی طرف آتے دیکھ کر چوکیدار نے خود ہی گیٹ کھول دیا تھا مگر اس کے قریب سے گزرتے ہوئے سالار نے اس کی آنکھوں میں اس حیرت کو دیکھ لیا تھا جو اس کی نظروں میں رات کے اس وقت فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی امام کو دیکھ کر آئی تھی۔ یقیناً وہ حیران ہوا ہو گا کہ وہ لڑکی اس وقت اس گھر میں کہاں سے آئی تھی۔

”تم مجھے بس اسٹینڈ چھوڑو گے؟“ تین روڈ پر آتے ہی امام نے اس سے پوچھا۔ سالار نے ایک نظر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”نہیں، میں تمہیں لاہور لے جا رہا ہوں۔“ اس کی نظریں سڑک پر مرکوز تھیں۔

گاڑی اس بڑی سڑک پر دوڑ رہی تھی جو تقریباً سنان تھی۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اسٹریٹنگ پر دایاں ہاتھ رکھے اس نے بائیں ہاتھ کو منہ کے سامنے دکھ کر بجایا روکی اور نیند کے نلبے کو بھگانے کی کوشش کی۔ اس کے برابر کی سیٹ پر چٹھی ہوئی امامہ بے آواز رو رہی تھی اور سالار اس بات سے باخبر تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنے ہاتھ میں پکڑے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتی اور ناک رگڑ لیتی اور پھر سامنے وٹا اسکرین سے باہر سڑک پر نظریں بٹا کر روٹا شروع کر دیتی۔

سالار وقتے وقتے سے اس پر اچھتی نظر ڈالتا رہا۔ اس نے امامہ کو کوئی تسلی دینے یا چپ کروانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ خود ہی کچھ دیر آنسو بہا کر خاموش ہو جائے گی، مگر جب آدھ گھنٹہ گزر جانے کے بعد بھی وہ اسی رفتار سے روٹی رہی تو وہ کچھ اتارنے لگا۔

”اگر تمہیں گھر سے اس طرح بھاگ آنے پر اتنا بچھتا ہوا ہوتا تو پھر تمہیں گھر سے بھاگنا ہی نہیں چاہئے تھا۔“

سالار نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ امامہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا، ابھی تو شاید تمہارے گھر میں کسی کو تمہاری غیر موجودگی کا پتا بھی نہیں چلا ہو گا۔“ اس نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد اسے مشورہ دیا۔

”مجھے کوئی بچھتا ہوا نہیں ہے۔“ اس بار اس نے چند لمبے خاموش رہنے کے بعد قدرے بھرائی ہوئی مگر مستحکم آواز میں کہا۔

”تو پھر تم رو کیوں رہی ہو؟“ سالار نے فوراً پوچھا۔

”تمہیں بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ وہ ایک بار پھر آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ سالار نے گردن موڑ کر اسے غور سے دیکھا اور پھر گردن سیدھی کر لی۔

”لاہور میں کس کے پاس جاؤ گی؟“

”پتا نہیں۔“ امامہ کے جواب پر سالار نے قدرے جبرانی سے اسے دیکھا۔

”کیا مطلب..... تمہیں پتا نہیں ہے کہ تم کہاں جا رہی ہو؟“

”نی ائیال تو نہیں۔“

”تو پھر تم آخر لاہور جا ہی کیوں رہی ہو؟“

”تو پھر اور کہاں جاؤں؟“

”تم اسلام آباد میں ہی رہ سکتی تھیں۔“

”کس کے پاس؟“

”لاہور میں بھی تو کوئی نہیں ہے جس کے پاس تم رہ سکو..... اور وہ بھی مستقل..... جلال کے

علاوہ۔“ سالار نے آخری تین لفظوں پر زور دیتے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”اس کے پاس جا رہی ہو تم۔“ کچھ دیر بعد اس نے قدرے چپتے ہوئے انداز میں کہا۔

”نہیں، جلال میری زندگی سے نکل چکا ہے۔“ سالار اندازہ نہیں کر سکا کہ اس کی آواز میں مایوسی زیادہ تھی یا فردگی۔ ”اس کے پاس کیسے جا سکتی ہوں میں۔“

”تو پھر اور کہاں جاؤ گی؟“ سالار نے ایک بار پھر تجسس کے عالم میں پوچھا۔

”یہ تو میں لاہور جانے پر ہی طے کروں گی کہ مجھے کہاں جانا ہے، کس کے پاس جانا ہے۔“ امامہ نے کہا۔

سالار نے کچھ بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھا۔ کیا واقعی وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کہاں جانا تھا یا پھر وہ اسے بتانا نہیں جانتی تھی۔ گاڑی میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

”تمہارا فیاضی..... کیا نام ہے اس کا..... ہاں اسجد..... کافی اچھا، منڈم آدمی ہے۔“ ایک بار پھر سالار نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔ ”اور یہ جو دوسرا آدمی تھا..... جلال..... اس کے مقابلے میں تو کچھ

بھی نہیں ہے..... کچھ زیادتی نہیں کر دی تم نے اسجد کے ساتھ؟“

امامہ نے اس کے سوال کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ صرف سامنے سڑک کو دیکھتی رہی۔ سالار کچھ دیر گردن موڑ کر اس کے جواب کے انتظار میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا مگر پھر اسے احساس ہو گیا کہ وہ

جواب دینا نہیں چاہتی۔

”میں تمہیں سمجھ نہیں پایا..... جو کچھ تم کر رہی ہو اسے بھی نہیں..... تمہیں حرکتیں بہت بہت جیب ہیں..... اور تم اپنی حرکتوں سے زیادہ عجیب ہو۔“ سالار نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

اس بار امامہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”کیا تمہاری حرکتوں سے زیادہ عجیب ہیں میری حرکتیں..... اور کیا میں تم سے زیادہ عجیب ہوں.....“

بوسے دھجے مگر مستحکم لہجے میں پوچھتے گئے اس سوال نے چند لمحوں کے لئے سالار کو لاجواب کر دیا تھا۔

”میری کون سی حرکتیں عجیب ہیں..... اور میں کس طرح عجیب ہوں؟“ چند لمبے خاموش رہنے کے بعد سالار نے کہا۔

”تم جانتے ہو، تمہاری کون سی حرکتیں عجیب ہیں۔“ امامہ نے واہس وٹا اسکرین کی طرف گردن موڑتے ہوئے کہا۔

”یقیناً میری خود کشی کی ہی بات کر رہی ہو تم۔“ سالار نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”حالانکہ میں خود کشی نہیں کرنا چاہتا، نہ ہی میں خود کشی کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں تو صرف ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا۔“

”کیسا تجربہ۔“

”میں ہمیشہ لوگوں سے ایک سوال پوچھتا ہوں، مگر کوئی بھی مجھے اس کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکا، اس لئے میں اس سوال کا جواب خود ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ وہ بولتا رہا۔

”کیا پوچھتے ہو تم لوگوں سے؟“

”بہت آسان سا سوال ہے مگر ہر ایک کو مشکل لگتا ہے۔“ What is next to ecstasy? اس

نے گردن موڑ کر امامہ سے پوچھا۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے مدغم آواز میں کہا۔ ”Pain“

”And what is next to pain?“ سالار نے بلا توقف ایک اور سوال کیا۔

”-Nothingness“

”What is next to nothingness?“ سالار نے اسی انداز میں ایک اور سوال کیا۔

”Hell“ امامہ نے کہا۔

”And what is next to hell?“ اس بار امامہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”What is next to hell?“ سالار نے پھر اپنا سوال ڈہرایا۔

”تھیں خوف نہیں آتا۔“ سالار نے امامہ کو قدرے عجیب سے انداز میں پوچھتے سنا۔

”کس چیز سے۔“ سالار حیران ہوا۔

”Hell سے..... اس جگہ سے جس کے آگے اور کچھ بھی نہیں ہوتا..... سب کچھ اس کے پیچھے ہی

ردہ جاتا ہے۔۔۔۔۔ معتوب اور مغضوب ہو جانے کے بعد باقی بچتا کیا ہے جسے جاننے کا تمہیں شہس ہے۔“ امامہ نے قدرے افسوس سے کہا۔

”میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔۔۔۔۔ سب کچھ میرے سر کے اوپر سے گزرا ہے۔“ سالار نے

یسے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

”فکر مت کرو۔۔۔۔۔ آجائے گی۔۔۔۔۔ ایک وقت آئے گا۔۔۔۔۔ جب تمہیں ہر چیز کی سمجھ آجائے گی

پھر تمہاری اپنی ختم ہو جائے گی۔۔۔۔۔ جب تمہیں خوف آنے لگے گا۔۔۔۔۔ موت سے بھی اور دوزخ سے

بھی۔۔۔۔۔ اللہ تمہیں سب کچھ دکھا اور بتا دے گا۔۔۔۔۔ پھر تم کسی سے یہ کبھی نہیں پوچھا کرو گے۔

”What is next to ecstasy?“ امامہ نے بہت رسانیت سے کہا۔

”یہ تمہاری پیش گوئی ہے؟“ سالار نے اس کی بات کے جواب میں کچھ چپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں۔“ امامہ نے اسی انداز میں کہا۔

”تجربہ؟“ سالار نے گردن سیدھی کر لی۔

”ہاں، یہ تمہارا تجربہ ہی ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ کی تو تم نے بھی خود کشی ہی ہے۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔۔۔ میں نے اپنے طریقے سے یہ کوشش کی تھی۔۔۔۔۔ تم نے اپنے طریقے سے کی ہے۔“ سالار نے سرد مہری سے کہا۔

امامہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آگئے۔ گردن موڑ کر اس نے سالار کو دیکھا۔

”میں نے کوئی خود کشی نہیں کی ہے۔“

”کسی لڑکے کے لئے گھر سے بھاگنا ایک لڑکی کے لئے خود کشی ہی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ وہ بھی اس

صورت میں جب وہ لڑکا شادی پر تیار ہی نہ ہو۔۔۔۔۔ دیکھو، میں خود ایک لڑکا ہوں۔۔۔۔۔ بہت برا ڈیمانڈ اور

لبرل ہوں اور میں بالکل برا نہیں سمجھتا اگر ایک لڑکی گھر سے بھاگ کر کسی لڑکے کے ساتھ کورٹ میرج

یا شادی کر لے۔۔۔۔۔ مگر وہ لڑکا اس کا ساتھ تو دے، ایک ایسے لڑکے کے لئے گھر سے بھاگ جانا جو شادی

کر چکا ہو۔۔۔۔۔ سچ سچ۔۔۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اور پھر تمہاری عمر میں بھاگنا۔۔۔۔۔ بالکل حماقت ہے۔

”میں کسی لڑکے کے لئے نہیں بھاگی ہوں۔“

”جال انفر!“ سالار نے اس کی بات کاٹ کر اسے یاد دلایا۔

”میں اس کے لئے نہیں بھاگی ہوں۔“ وہ بے اختیار بلند آواز میں چلائی۔ سالار کا پاؤں بے اختیار

بریک پر جا پڑا۔ اس نے حیرانی سے امامہ کو دیکھا۔

”توجھ پر کیوں چلا رہی ہو، مجھ پر چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ سالار نے ناراضی سے کہا۔ وہ

کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”یہ جو تمہاری مذہب والی تصیوری یا فلسفی یا پوائنٹ یا جو بھی ہے I don't get it کیا فرق پڑتا ہے۔

اگر کوئی کسی اور پیغمبر کو ماننا شروع ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ زندگی ان فضول بحثوں کے علاوہ بھی کچھ ہے۔

مذہب، عقیدے یا فرقے پر لڑنا۔۔۔۔۔ What rubbish!“

امامہ نے گردن موڑ کر ناراضی کے عالم میں اسے دیکھا۔ ”جو چیزیں تمہارے لئے فضول ہیں،

ضروری نہیں وہ ہر ایک کے لئے فضول ہوں۔ میں اپنے مذہب پر قائم رہنا نہیں چاہتی اور نہ ہی اس

مذہب کے کسی شخص سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ تو یہ میرا حق ہے کہ میں ایسا کروں، میں تم سے ایسی

چیزوں کے بارے میں بحث نہیں کرنا چاہتی جسے تم نہیں سمجھتے۔ اس لئے تم ان معاملات کے بارے

میں اس طرح کے تبصرے مت کرو۔“

”مجھے حق ہے کہ میں جو چاہے Freedom of expression (اظہار کی آزادی)“ سالار

نے کدھے اچکاتے ہوئے کہا۔ امامہ نے جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کی۔ وہ کھڑکی سے باہر

دیکھنے لگی۔ سالار بھی خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔

”یہ جلال انصر..... میں اس کی بات کر رہا تھا۔“ وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ایک بار پھر اپنے اسی موضوع کی طرف آیا۔

”اس میں کیا خاص بات ہے؟“ اس نے گردن موڑ کر امامہ کو دیکھا۔ وہ اب وڈا سکرین سے باہر سڑک کو دیکھ رہی تھی۔

”جلال انصر اور تمہارا کوئی جوڑ نہیں ہے..... وہ بالکل بھی پنڈم نہیں ہے۔ تم ایک خوب صورت لڑکی ہو، میں حیران ہوں تم اس میں کیسے دلچسپی لینے لگیں..... کیا وہ بہت زیادہ..... intelligent ہے؟“ اس نے امامہ سے پوچھا۔

امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ ”intelligent..... کیا مطلب؟“

”دیکھو یا تو کسی کی شکل اچھی لگتی ہے..... میں نہیں سمجھتا تمہیں جلال کی شکل اچھی لگی ہوگی یا پھر کسی کا فیملی بیک گراؤنڈ..... پیسہ وغیرہ کسی میں دلچسپی کا باعث بنتا ہے..... اب جلال کا فیملی بیک گراؤنڈ یا مالی حالت کے بارے میں، میں نہیں جانتا مگر خود تمہارا فیملی بیک گراؤنڈ جتنا ساؤنڈ ہے، یہ بھی تمہارے لئے اس میں دلچسپی کا باعث نہیں بن سکتا..... واحد فرق جانے والی وجہ کسی کی ذہانت، قابلیت وغیرہ ہے..... اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ کیا وہ بہت intelligent ہے..... کیا بہت آڈٹ اسٹینڈنگ اور brilliant ہے؟“

”نہیں.....“ امامہ نے مدہم آواز میں کہا۔

سالار کو مایوسی ہوئی۔ ”تو پھر..... تم اس کی طرف متوجہ کیسے ہوئیں امامہ وڈا سکرین سے باہر بیٹے لائسنس کی روشنی میں نظر آنے والی سڑک دیکھتی رہی۔ سالار نے اپنا سوال دوبارہ نہیں دہرایا۔ صرف کندھے اچکاتے ہوئے وہ دوبارہ ڈرائیونگ پر توجہ دینے لگا۔ گاڑی میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

”وہ نعت بہت اچھی پڑھتا ہے۔“ تقریباً پانچ منٹ بعد خاموشی ٹوٹی تھی۔ وڈا سکرین سے باہر دیکھتے ہوئے مدہم آواز میں امامہ یوں بڑبڑاتی تھی جیسے خود کلامی کر رہی ہو۔ سالار نے اس کا جملہ سن لیا تھا مگر اسے وہ ناقابل یقین لگا۔

”کیا؟“ اس نے جیسے تصدیق چاہی۔

”جلال نعت بہت اچھی پڑھتا ہے۔“ اسی طرح وڈا سکرین سے باہر جھانکتے ہوئے کہا مگر اس بار اس کی آواز کچھ بلند تھی۔

”بس آواز کی وجہ سے..... سگر ہے؟“ سالار نے تہرہ کیا۔

امامہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر؟“

”بس وہ نعت ہی پڑھتا ہے..... اور بہت خوب صورت پڑھتا ہے۔“

سالار ہنسا۔ تم صرف اس کے نعت پڑھنے کی وجہ سے اس کی محبت میں گرفتار ہو گئیں۔ میں کم از کم اس پر یقین نہیں کر سکتا۔“

امامہ نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تومت کرو..... تمہارے یقین کی کس کو ضرورت ہے۔“ اس کی آواز میں سرد مہری تھی۔ گاڑی میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

”فرض کرو یہ مان لیا جائے کہ تم واقعی اس کے نعت پڑھنے سے کچھ متاثر ہو کر اتنا آگے بڑھ گئیں..... تو یہ تو کوئی زیادہ پریکٹیکل بات نہیں ہے..... بار بار اکاٹ لینڈ کے ناؤ لڑوا لارو مانس ہی ہو گیا یہ تو..... اور تم ایک میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہو کر اتنا مچھو رڈ بن رکھتی ہو۔“ سالار نے بے رحمی سے تہرہ کیا۔

امامہ نے ایک بار پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”میں بہت مچھو رہوں..... بہت زیادہ..... پچھلے دو چار سالوں میں مجھ سے زیادہ پریکٹیکل ہو کر کسی نے چیزوں کو نہیں دیکھا ہو گا۔“

”میری رائے محفوظ ہے..... ہو سکتا ہے تمہارا پریکٹیکل ہونا میرے پریکٹیکل ہونے سے مختلف ہو۔ اپنی دوسے میں جلال کی بات کر رہا تھا..... وہ جو تم نعت وغیرہ کا ذکر کر رہی تھیں اس کی بات۔“

”بعض چیزوں پر اپنا اختیار نہیں ہوتا..... میرا بھی نہیں ہے۔“ اس بار امامہ کی آواز میں شگفتگی تھی۔

”میں پھر تم سے اتفاق نہیں کرتا۔ ہر چیز اپنے اختیار میں ہوتی ہے..... کم از کم اپنی فیلنگو، ایسوشن اور ایکشن پر انسان کو کنٹرول ہوتا ہے..... ہمیں پتا ہوتا ہے کہ ہم کس شخص کے لئے کس طرح کی فیلنگو

ڈویپ کر رہے ہیں..... کیوں کر رہے ہیں، اس کا بھی پتا ہوتا ہے..... اور جب تک ہم باقاعدہ ہوش و حواس میں رہتے ہوئے ان فیلنگو کو ڈویپ نہیں ہونے دیتے..... وہ نہیں ہوتیں..... اس لئے یہ نہیں مان سکتا کہ ایسی چیزوں پر اپنا کنٹرول ہی نہ رہے۔“

اس نے بات کرتے ہوئے دوسری بار امامہ کو دیکھا اور اسے احساس ہوا کہ وہ اس کی بات نہیں سن رہی تھی۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر وڈا سکرین کو دیکھ رہی تھی یا شاید وڈا سکرین سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں اور اس وقت بھی ان میں نفی نظر آ رہی تھی..... وہ ذہنی طور پر کہیں دور تھی.....

کہاں یہ وہ نہیں جان سکتا تھا۔ اسے وہ ایک بار پھر اہٹار مل گئی۔

بہت دیر تک خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتے رہنے کے بعد سالار نے قدرے آگٹا کر ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔

”نعت پڑھنے کے علاوہ اس میں اور کون سی کوالٹی ہے؟“ اس کی آواز بلند تھی۔ امامہ بے اختیار چونک گئی۔

”نعت پڑھنے کے علاوہ اس میں اور کیا کوالٹی ہے؟“ سالار نے اپنے سوال کو دہرایا۔

”ہر وہ کوالٹی جو ایک اچھے انسان..... اچھے مسلمان میں ہوتی ہے۔“ امامہ نے کہا۔

”شاذ“ سالار نے جھنوں اچکاتے ہوئے کہا۔

”اور اگر نہ بھی ہو تمیں تو بھی وہ شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتنی محبت کرتا ہے کہ میں اسے اسی ایک کوالٹی کی خاطر کسی بھی دوسرے شخص پر ترجیح دیتی۔“

سالار عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ”what a logic ایسی باتوں کو میں واقعی ہی نہیں سمجھ سکتا۔“ اس نے گردن کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

”تم اپنی پسند سے شادی کرو گے یا اپنے بیٹھس کی پسند سے؟“ امام نے اچانک اس سے پوچھا۔ وہ حیران ہوا۔

”آف کورس اپنی پسند سے۔۔۔۔۔ بیٹھس کی پسند سے شادی والا زمانہ تو نہیں ہے یہ۔“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

”تم بھی تو کسی کوالٹی کی وجہ سے ہی کوئی لڑکی پسند کرو گے۔۔۔۔۔ شکل و صورت کی وجہ سے۔۔۔۔۔ یا پھر جس سے تمہاری انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے گی اس سے۔۔۔۔۔ ایسا ہی ہو گا۔“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”یقیناً۔“ سالار نے کہا۔

”میں بھی تو یہی کر رہی ہوں۔ اپنی اپنی ترجیحات کی بات ہوتی ہے۔ تم ان چیزوں کی بنا پر کسی سے شادی کرو گے، میں بھی ایسی ہی ایک وجہ کی بنا پر شادی کرنا چاہتی تھی جلال انصر سے۔۔۔۔۔“ وہ ڈکی۔

”میری خواہش ہے، میری شادی اس سے ہو جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مجھ سے زیادہ محبت رکھتا ہو۔ جلال انصر! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مجھ سے زیادہ محبت کرتا تھا۔۔۔۔۔ مجھے لگا، مجھے اسی شخص سے شادی کرنی چاہئے۔۔۔۔۔ میں نے تم سے کہا بعض چیزوں پر اختیار نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ بعض خواہشات۔۔۔۔۔ بس ان سے بچنا کرنا ناممکن نہیں ہوتا۔“ اس نے افسردگی سے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

”اور اب جب وہ شادی کر چکا ہے تو اب تم کیا کرو گی؟“

”پتا نہیں۔“

”تم ایسا کرو۔۔۔۔۔ کہ تم کسی اور نعمت پڑھنے والے کو ڈھونڈ لو، تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بڑھا۔

امامہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتی رہی۔ وہ سفاکی کی حد تک بے حس تھا۔ ”اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو تم۔۔۔۔۔ میں مذاق کر رہا ہوں۔“ وہ اب اپنی ہنسی پر قابو پا چکا تھا۔ امامہ نے کچھ کہنے کے بجائے گردن موڑ لی۔

”تمہیں تمہارے فادر نے مارا ہے۔“ سالار نے پہلے کی طرح کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولنے کا معمول جاری رکھا۔

”تمہیں کس نے بتایا۔“ امامہ نے اسے دیکھے بغیر کہا۔

”ملازمہ نے۔“ سالار نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”بے چاری یہ سمجھ رہی ہے کہ تم جو شادی سے انکار کر رہی ہو وہ میری وجہ سے کر رہی ہو۔ اس لئے اس نے مجھ تک تمہاری ”حالت زار“ بڑے

دردناک انداز میں پہنچائی تھی۔۔۔۔۔ مارا ہے تمہارے فادر نے؟“

”ہاں۔“ اس نے بے تاثر انداز میں کہا۔

”کیوں؟“

”میں نے پوچھا نہیں۔۔۔۔۔ شاید وہ ناراض تھے اس لئے۔“

”تم نے کیوں مارنے دیا۔“

امامہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”وہ میرے بابا ہیں، انہیں حق ہے، وہ مار سکتے ہیں مجھے۔“

سالار نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ ”ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا، وہ اس صورت حال میں یہی کرتا۔۔۔۔۔ مجھے یہ قابل اعتراض نہیں لگا۔“ وہ بڑے ہموار لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”اگر مارنے کا حق ہے انہیں تو پھر تمہاری شادی کرنے کا بھی حق ہے۔ اس پر اتنا ہنگامہ کیوں کھڑا کر رہی ہو تم۔“ سالار نے چپختے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کسی مسلمان سے کرتے۔ اور چاہے جہاں مرضی کر دیتے۔۔۔۔۔ میں کروا لیتی۔“

”چاہے وہ جلال انصر نہ ہوتا۔“ استہزائیہ انداز میں کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ اب بھی آخر کون سا ہو گئی ہے اس سے۔“ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی جھللا رہی تھی۔

”تو تم ان سے یہ کہہ دیتیں۔“

”کہا تھا۔ تم سمجھتے ہو میں نے نہیں کہا ہو گا۔“

”مجھے ایک بات پر بہت حیرانی ہے۔“ سالار نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ ”آخر تم نے مجھ سے مدد لینے کا فیصلہ کیوں کیا۔۔۔۔۔ بلکہ کیسے کر لیا، تم مجھے خاصا نا پسند کرتی تھیں۔“ اس نے امامہ کے جواب کا انتظار کئے بغیر بات جاری رکھی۔

”میرے پاس تمہارے علاوہ دوسرا کوئی آپشن تھا ہی نہیں۔“ امامہ نے مدہم آواز میں کہا۔ ”میری اپنی کوئی فریڈ اس طرح میری مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی جس طرح کوئی لڑکا کر سکتا تھا۔ اسجد کے علاوہ میں صرف جلال اور تم سے واقف تھی۔۔۔۔۔ اور سب سے قریب ترین صرف تم تھے جس سے میں

فوری رابطہ کر سکتی تھی، اس لئے میں نے تم سے رابطہ کیا۔“ وہ مدہم آواز میں زک زک کر بولتی رہی۔

”تمہیں یقین تھا کہ میں تمہاری مدد کروں گا؟“

نہیں..... میں نے صرف ایک رسک لیا تھا۔ یقین کیسے ہو سکتا تھا مجھے کہ تم میری مدد کرو گے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا! میرے پاس تمہارے علاوہ اور کوئی آپشن تھا ہی نہیں۔“

”یعنی تم نے ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنا لیا ہے۔“ اس کے بے حد عجیب لہجے میں کئے گئے تبصرے نے امام کو یک دم خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ بات منہ پر مارنے میں ماہر تھا مگر اس نے غلط بھی نہیں کہا تھا۔

”دیر ہی انٹرننگ۔“ اس نے امام کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا وہ جیسے اپنے تبصرے پر خود ہی محظوظ ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

”میں گاڑی کچھ دیر کے لئے یہاں روکنا چاہ رہا ہوں۔ سالار نے سڑک کے کنارے بنے ہوئے ایک سستے قسم کے ہوٹل اور سروس اسٹیشن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں ذرا آڑ پیچ کر وانا چاہ رہا ہوں۔“ گاڑی میں دوسرا سائز نہیں ہے، ارستے میں اگر کہیں سائز فلیٹ ہو گیا تو بہت مسئلہ ہو گا۔“

امام نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ گاڑی موڑ کر اندر لے گیا۔ اس وقت دور کہیں بھڑکی اذان ہو رہی تھی۔ ہوٹل میں کام کرنے والے دو چار لوگوں کے علاوہ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ اسے گاڑی اندر لاتے دیکھ کر ایک آدمی باہر نکل آیا۔ شاید وہ گاڑی کی آواز سن کر آیا تھا۔ سالار گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

وہ کچھ دیر سیٹ کی پشت سے سر نکالے آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی۔ اذان کی آواز کچھ زیادہ بلند ہو گئی تھی۔ امام نے آنکھیں کھول دیں۔ کار کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکل آئی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔

”یہاں کتنی دیر رکتا ہے۔“ وہ سالار سے پوچھ رہی تھی۔

”دس چندرہ منٹ۔ میں انجن بھی ایک دفعہ چیک کروانا چاہتا ہوں۔“

”میں نماز پڑھنا چاہتی ہوں، مجھے وضو کرنا ہے۔“ اس نے سالار سے کہا۔ اس سے پہلے کہ سالار کچھ کہتا۔

اس آدمی نے بلند آواز میں اسے پکارتے ہوئے کہا۔

”باقی اوضو کرنا ہے تو اس ڈرم سے پانی لے لیں۔“

”اور وہ نماز کہاں پڑھے گی؟“ سالار نے اس آدمی سے پوچھا۔

”یہ سامنے والے کمرے میں..... میں جائے نماز دے دیتا ہوں۔“ وہ اب باپ اٹار رہا تھا۔

”پہلے جائے نماز دے دوں پھر انجن آکر چیک کرتا ہوں۔“ اس آدمی نے اس کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

سالار نے دور سے امام کو اس ڈرم کے پاس کچھ تذبذب کی حالت میں کھڑے دیکھا۔ وہ لاشعوری طور پر آگے چلا آیا۔ وہ تار کول کا ایک بہت بڑا داخلی ڈرم تھا جسے ایک ڈسکلن سے کوڑ کیا گیا تھا۔

”اس میں سے پانی کیسے لوں؟“ امام نے قدموں کی چاپ پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سالار نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کچھ فاصلے پر ایک بالٹی پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس بالٹی کو اٹھا لیا۔

”میرا خیال ہے یہ اسی بالٹی کو پانی نکالنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔“ اس نے امام سے کہتے ہوئے ڈرم کا ڈسکلن اٹھا لیا اور اس میں سے پانی بالٹی میں بھر لیا۔

”میں کروا دیتا ہوں وضو۔“ سالار کو اس کے چہرے پر تذبذب نظر آیا مگر پھر کچھ کہنے کے بجائے وہ اپنے سوئیٹر کی آستین اوپر کرنے لگی۔ اپنی گھڑی اُتار کر اس نے سالار کی طرف بڑھادی اور بچوں کے مثل زمین پر بیٹھ گئی۔ سالار نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں پر کچھ پانی ڈالا۔ امام کو بے اختیار جیسے کرنٹ لگا۔ اس نے یک دم اپنے ہاتھ پیچھے کر لئے۔

”کیا ہوا؟“ سالار نے کچھ حیرانی سے کہا۔

”کچھ نہیں، پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ تم پانی ڈالو۔“ وہ ایک بار پھر ہاتھ پھیلا رہی تھی۔

سالار نے پانی ڈالنا شروع کر دیا۔ وہ وضو کرنے لگی۔ پہلی بار سالار نے اس کے ہاتھوں کو کہیں تک دیکھا۔ کچھ دیر کے لئے وہ اس کی کلائیوں سے نظر نہیں ہٹا سکا۔ پھر اس کی نظر اس کی کلائیوں سے اس کے چہرے پر چلی گئی۔ وہ اپنی چادر کو ہٹانے بغیر بڑی احتیاط کے ساتھ سر، کانوں اور گردن کا مسح کر رہی تھی اور سالار کی نظریں اس کے ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ سڑ کر رہی تھیں۔ اس کی گردن میں موجود سونے کی چین اور اس میں نکلنے والے موتی کو بھی اس نے پہلی بار دریافت کیا تھا۔ سالار نے اسے جتنی بار دیکھا تھا اسی طرح کی چادر میں دیکھا تھا۔ چادر کا رنگ مختلف ہوتا مگر وہ ہمیشہ اسے ایک ہی انداز میں لپیٹے ہوتی۔ وہ کبھی اس کے خدو خال پر غور نہیں کر سکا۔

”پاؤں پر پانی میں خود ڈال لیتی ہوں۔“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے سالار کے ہاتھ سے اس بالٹی کو پکڑ لیا جو اب تقریباً خالی ہونے والی تھی۔ سالار چند قدم پیچھے ہٹ کر محویت سے دیکھنے لگا۔

وہ وضو کر چکی تو سالار کی محویت ختم ہوئی۔ اس نے گھڑی اس کی طرف بڑھادی۔

آگے پیچھے چلتے ہوئے وہ اس کمرے تک آئے جہاں وہ آدمی گیا تھا۔ وہ آدمی جب تک کمرے میں ایک طرف مصیقت بچھا چکا تھا۔ امام خاموشی سے جائے نماز کی طرف بڑھ گئی۔

کمرے میں چند کرسیاں اور ایک چھوٹی سی تپائی بھی پڑی ہوئی تھی۔ سالار فوری طور پر اس کمرے

باب ۴

لاہور کی حدود میں داخل ہوتے ہی امامہ نے اس سے کہا۔ ”اب تم مجھے کسی بھی اسٹاپ پر اتار دو..... میں چلی جاؤں گی۔“

”تم جہاں جانا چاہتی ہو، میں تمہیں وہاں چھوڑ دیتا ہوں۔ اتنی دھند میں کسی ٹرانسپورٹ کا انتظار کرتے تمہیں بہت وقت لگے گا۔“ سڑکیں اس وقت تقریباً ویران تھیں، حالانکہ صبح ہو چکی تھی مگر دھند نے ہر چیز کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

”مجھے نہیں پتا، مجھے کہاں جانا ہے پھر تمہیں میں کس جگہ کا پتا بتاؤں۔ ابھی تو شاید میں ہاسٹل جاؤں اور پھر وہاں.....“ سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تو پھر میں تمہیں ہوسٹل چھوڑ دیتا ہوں۔“ کچھ فاصلہ اسی طرح خاموشی سے طے ہوا پھر ہاسٹل سے کچھ فاصلے پر امامہ نے اس سے کہا۔

”بس تم یہاں گاڑی روک دو، میں یہاں سے خود چلی جاؤں گی۔ میں تمہارے ساتھ ہاسٹل نہیں جانا چاہتی۔“ سالار نے سڑک کے کنارے گاڑی روک دی۔

”بچھلے کچھ ہفتوں میں تم نے میری بہت مدد کی ہے، میں اس کے لئے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ تم میری مدد نہ کرتے تو آج میں یہاں نہ ہوتی۔“ وہ ایک لمحہ کے لئے رُکی۔ ”تمہارا موبائل ابھی میرے پاس ہے، مگر مجھے ابھی اس کی ضرورت ہے، میں کچھ عرصہ بعد اسے واپس بھجوادوں گی۔“

”اس کی ضرورت نہیں، تم اسے رکھ سکتی ہو۔“

”میں کچھ دنوں بعد تم سے دوبارہ رابطہ کروں گی پھر تم مجھے طلاق کے بچے نہ بھجوادو۔“ وہ رُکی۔

”میں امید کرتی ہوں کہ تم میرے پیرش کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔“

”یہ کہنے کی ضرورت تھی؟“ سالار نے ہنسی اچکاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کچھ بتانا ہوتا تو میں بہت پہلے بتا چکا ہوتا۔“ سالار نے قدرے سرد مہری سے کہا۔ ”تم مجھے بہت برا لگا سمجھتی تھیں، کیا ابھی بھی تمہاری میرے بارے میں وہی رائے ہے یا تم نے اپنی رائے میں کچھ تبدیلی کی ہے۔“ سالار نے اچانک تیلی منسکراہٹ کے ساتھ اس سے پوچھا۔

”تمہیں نہیں لگتا کہ میں دراصل بہت اچھا لڑکا ہوں۔“

”ہو سکتا ہے۔“ امام نے مدغم آواز میں کہا۔ سالار کو اس کی بات پر جیسے شاک لگا۔

”ہو سکتا ہے۔“ وہ بے یقینی سے مسکرایا۔ ”ابھی بھی ہو سکتا ہے۔ تم بہت ناشکری ہو امام، میں نے تمہارے لئے اتنا کچھ کیا ہے جو اس زمانے میں کوئی لڑکا نہیں کرے گا اور تم پھر بھی مجھے اچھا ماننے پر تیار نہیں۔“

”میں ناشکری نہیں ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم نے مجھ پر بہت احسان کئے ہیں اور شاید تمہاری جگہ کوئی دوسرا کبھی نہ کرتا۔“

سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تو میں اچھا ہوا۔“

وہ کچھ نہیں بولی، صرف اسے دیکھتی رہی۔

”نہیں، مجھے پتا ہے تم یہی کہنا چاہتی ہو، حالانکہ مشرقی لڑکی کی خاموشی اس کا اقرار ہوتی ہے مگر تمہاری خاموشی تمہارا انکار ہوتی ہے۔“ لہجہ کہہ رہا ہوا۔

”ہم ایک فضول بحث کر رہے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے۔“ سالار نے کندھے اچکائے۔ ”مگر مجھے حیرانی ہے کہ تم۔“

اس بار امام نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم نے میرے لئے یقیناً بہت کچھ کیا ہے۔ اور اگر میں تمہیں جانتی نہ ہوتی تو یقیناً میں تمہیں ایک بہت اچھا انسان سمجھتی اور کہہ بھی دیتی۔ مگر میں تمہیں اتنی

ابھی طرح جانتی ہوں کہ میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ تم ایک اچھے انسان ہو۔“

وہ رُکی۔ سالار پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔

”جو آدمی خودکشی کی کوشش کرتا ہو، شراب پیتا ہو جس نے اپنا کمرہ عورتوں کی برہنہ تصویروں سے بھر رکھا ہو۔ وہ اچھا آدمی تو نہیں ہو سکتا۔ امام نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”تم کسی ایسے آدمی کے پاس جاتیں جو یہ تینوں کام نہ کرتا مگر تمہاری مدد بھی نہ کرتا تو کیا تمہارے لئے وہ اچھا آدمی ہوتا؟“ سالار نے تیز آواز میں کہا۔ ”جیسے جلال العصر؟“

امام کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ”ہاں، اس نے میری مدد نہیں کی، مجھ سے شادی نہیں کی مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ برا ہو گیا ہے۔ وہ اچھا آدمی ہے۔ ابھی بھی میرے نزدیک اچھا آدمی ہے۔“

”اور میں نے تمہاری مدد کی۔ تم سے شادی کی مگر یقیناً اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اچھا ہو گیا ہوں، میں برا آدمی ہوں۔“ وہ عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے مسکرایا۔ ”تمہارا خود اپنے بارے میں کیا خیال ہے امام۔ کیا تم اچھی لڑکی ہو؟“

اس نے اچانک جیسے ہوئے انداز میں پوچھا اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر کہنے لگا۔

”میرے نزدیک تم بھی اچھی لڑکی نہیں ہو، تم بھی ایک لڑکے کے لئے اپنے گھر سے بھاگی ہو۔ اپنے منگیتر کو دھوکہ دیا ہے تم نے۔ اپنی فیملی کی عزت کو خراب کیا ہے تم نے۔“ سالار نے ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے صاف گوئی سے کہا۔

امام کی آنکھوں میں ہلکی سی ٹہنی آگئی۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو، میں واقعی اچھی لڑکی نہیں ہوں۔ ابھی مجھے یہ جملہ بہت سے لوگوں سے سنا ہے۔“

”میں تمہیں بہت لمبی چوڑی وضاحت دے سکتی ہوں مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں، تم ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتے۔“

”فرض کرو، میں تمہیں لاہور نہ لے کر آتا کہیں اور لے جاتا پھر۔۔۔۔۔ مگر میں تمہیں بحفاظت یہاں لے آیا۔۔۔۔۔ یہ میرا تم پر کتنا بڑا احسان ہے، تمہیں اندازہ ہے اس کا۔“

امام گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”مجھے یقین تھا تم مجھے کہیں اور نہیں لے جاؤ گے۔“

وہ اس کی بات پر ہنسا۔ ”مجھ پر یقین تھا۔۔۔۔۔ کیوں؟ میں تو ایک برا لڑکا ہوں۔“

”مجھے تم پر یقین نہیں تھا۔ اللہ پر یقین تھا۔“ سالار کے ماتھے پر کچھ بل پڑ گئے۔

”میں نے اللہ اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے سب کچھ چھوڑ دیا ہے، یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے تمہارے جیسے آدمی کے ہاتھوں زسوا کرتے، یہ ممکن ہی نہیں تھا۔“

”فرض کرو ایسا ہو جاتا۔“ سالار مصر ہوا۔ ”میں ایسی بات کیوں فرض کروں جو نہیں ہوئی۔“ وہ اپنی بات پر قائم تھی۔

”یعنی تم مجھے کسی قسم کا کوئی کرڈٹ نہیں دو گی۔“ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں مسکرایا۔

”اچھا فرض کرو میں اب تمہیں جانے نہیں دیتا تو تم کیا کرو گی۔ گاڑی کا دروازہ جب تک میں نہیں کھولوں گا، نہیں کھلے گا۔ یہ تم جانتی ہو۔ اب بتاؤ تم کیا کرو گی۔“

وہ ایک ننگ اسے دیکھتی رہی۔ ”یامیں یہ کرتا ہوں۔“ سالار نے ڈینٹس پورڈ پر پڑا ہوا اپنا موبائل اٹھایا اور اس پر ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ”کہ تمہارے گھر فون کر دیتا ہوں۔“ اس نے موبائل کی اسکرین کو اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ اس پر امامہ کے گھر کا نمبر تھا۔

”میں انہیں تمہارے بارے میں بتاتا ہوں کہ تم کہاں ہو، کس کے ساتھ ہو۔ پھر یہاں سے تمہیں سیدھا پولیس اسٹیشن لے جا کر ان کی تحویل میں دے دیتا ہوں۔“ تو پھر تمہارے اعتقاد اور اختیار کا کیا ہوا۔“ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

امامہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ سالار کو بے حد خوشی محسوس ہوئی۔ سالار نے موبائل آف کرتے ہوئے ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

”گنتا بڑا احسان کر رہا ہوں میں تم پر کہ ایسا نہیں کر رہا۔“ اس نے موبائل کو دو بار وڈیشن پورڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”حالانکہ تم بے بس ہو، کچھ بھی نہیں کر سکتیں، اسی طرح رات کو میں تمہیں کہیں اور لے جاتا تو تم کیا کر لیتیں۔“

”میں تمہیں شوٹ کر دوں گی۔“ سالار نے حیرانی سے اسے دیکھا پھر قہقہہ مار کر ہنسا۔

”کیا کر دیتیں۔ میں تمہیں شوٹ کر دوں گی۔“

اس نے اسی انداز میں زک زک کر اس سے کہا۔ وہ اسٹیرنگ پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھٹکھٹلا کر ہنسا۔ ”کبھی زندگی میں ہسل دیکھا بھی ہے تم نے۔“ اس نے امامہ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ سالار نے اسے جھٹکتے اور اپنے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھا۔ جب وہ سیدھی ہوئی تو اس نے سالار سے کہا۔ ”شاید اسے کہتے ہیں۔“

سالار ہنستا بھول گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں چھوٹے سائز کا ایک بہت خوب صورت اور قیمتی لہیزہ ہتھوڑا تھا۔ سالار ہتھوڑا پر اس کے ہاتھ کی گرفت دیکھ کر جان گیا تھا کہ وہ کسی انارڈی کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اس نے بے چینی سے امامہ کو دیکھا۔

”تم مجھے شوٹ کر سکتی تھیں؟“

”ہاں، میں تمہیں شوٹ کر سکتی تھی مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ تم نے مجھے کوئی دھوکا نہیں دیا۔“

اس نے مستحکم آواز میں کہا۔ اس نے ہتھوڑا سالار کی طرف نہیں کیا تھا، صرف اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ ”گاڑی کا لاک۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے سالار سے کہا۔ سالار نے غیر ارادوی طور پر اپنی طرف موجود ڈینٹس ہاتھ لاک کھول دیا۔ امامہ نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اب ہتھوڑا اپنی گود میں موجود بیگ میں رکھ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان مزید کوئی بات نہیں ہوئی۔ امامہ نے گاڑی سے باہر نکل کر اس کا دروازہ بند کر دیا۔ سالار نے اسے تیز قدموں کے ساتھ ایک قریب آتی ہوئی دین کی طرف چلتے اور پھر اس میں سوار ہوتے دیکھا۔

اس کی قوت مشاہدہ بہت تیز تھی۔ وہ کسی بھی شخص کے چہرے کو پڑھ سکتا تھا۔ اور اسے اس چیز پر براہِ عملہ تھا۔ مگر وہاں اس دھند آلود سڑک پر گاڑی پر بیٹھے ہوئے اس نے اعتراف کیا۔ وہ امامہ ہاشم کو نہیں جان سکتا تھا۔ وہ اگلے کئی منٹ اسٹیرنگ پر دونوں ہاتھ رکھے بے چینی کے عالم میں وہیں بیٹھا رہا تھا۔ امامہ ہاشم کے لئے اس کی ناپسندیدگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

وہ وہاں ہی پر دھند کی پروا کئے بغیر پوری رفتار سے گاڑی چلا کر آیا تھا۔ پورا رات اس کا ذہن اسی ادھیڑ بین میں لگا ہوا تھا کہ اس نے ہتھوڑا آخر کہاں سے نکالا تھا۔ وہ پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ جس وقت وہ وضو کے لئے پاؤں دھو رہی تھی اس وقت وہ ہتھوڑا اس کی ہتھوڑا کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ ضرور اسے دیکھ لیتا۔ بعد میں غماز پڑھنے کے دوران بھی وہ بخور اسے سر سے پاؤں تک دیکھتا رہا تھا، ہتھوڑا شب بھی اس کی ہتھوڑا کے ساتھ بندھا ہوا نہیں تھا۔ وہ برگر کھانے اور چائے پینے کے بعد گاڑی میں آکر بیٹھ گئی تھی اور وہ کچھ دیر بعد گاڑی میں آیا تھا۔ یہ یقیناً گاڑی میں موجود اس کے بیگ میں ہی ہو گا۔ وہ اندازے لگا رہا۔

وہ جس وقت اپنے گھر پہنچا اس کا موبائل آف تھا۔ گیٹ سے گاڑی اندر لے جاتے ہوئے اس نے چونک کر اپنی طرف بلایا۔ ”رات کو میں جس لڑکی کے ساتھ یہاں سے گیا تھا تم اس کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گے بلکہ میں رات کو کہیں نہیں گیا، مجھ میں آیا۔“ اس نے حکمانہ انداز میں کہا۔ ”جی۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔“ چونکہ اس نے فرمانبرداری سے سر بلایا۔ وہ اسحق نہیں تھا کہ ایسی چیزوں کے بارے میں کسی کو بتاتا پھرتا۔

اپنے کمرے میں آکر وہ اطمینان کے ساتھ سو گیا۔ اس کا اس دن کہیں جانے کا ارادہ نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ اس وقت گہری نیند میں تھا، جب اس نے اچانک کسی کو اپنے کمرے کے دروازے کو زور زور سے بجاتے سنا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دروازہ کھلی ہوئی رہا تھا۔ اس نے مندی ہوئی نظروں سے وال کھاک کو دیکھا جو چار بھار ہاتھ تھا۔ اپنی آنکھوں کو مرگرتے ہوئے وہ اپنے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے دروازہ

بجانے والے پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ اسی غصے کے عالم میں اس نے بڑبڑاتے ہوئے ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ باہر ملازم کھڑا تھا۔

”کیا تکلیف ہے تمہیں۔۔۔ کیوں اس طرح دروازہ بجا رہے ہو؟ دروازہ توڑنا چاہتے ہو تم؟“ وہ دروازہ کھولتے ہی ملازم پر چلا آیا۔

”سالار صاحب باہر پولیس کھڑی ہے۔“ ملازم نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ سالار کا غصہ اور نیند ایک منٹ میں غائب ہو گئے۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں وہ پولیس کے وہاں آنے کی وجہ جان گیا تھا اور اسے ان کی اور امام کے گھر والوں کی اس مستعدی پر حیرت ہوئی تھی۔ آخر وہ چند گھنٹوں میں سید سے اس تک کیسے پہنچ گئے تھے۔

”کس لئے آئی ہے پولیس؟“ اس نے اپنی آواز کو پرسکون رکھتے ہوئے بے تاثر چہرے کے ساتھ پوچھا۔

”یہ تو بی بی نہیں، وہ بس کہہ رہے ہیں کہ آپ سے ملنا ہے، مگر چونکہ آپ نے گیسٹ نہیں کھولا۔ اس نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آپ گھر پر نہیں ہیں مگر ان کے پاس آپ کے وارنٹ ہیں اور وہ کہہ رہے ہیں کہ اگر انہیں اندر نہیں آنے دیا گیا تو وہ زبردستی اندر آ جائیں گے اور تمام لوگوں کو گرفتار کر کے لے جائیں گے۔“

سالار نے بے اختیار اطمینان بھرا سانس لیا۔ چونکہ اس نے واقعی بڑی عقل مندی کا مظاہر کیا تھا۔ اسے یقیناً یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ پولیس رات والی لڑکی کے معاملے میں ہی تفتیش کے لئے وہاں آئی تھی اس لئے اس نے نہ تو پولیس کو اندر آنے دیا، نہ ہی انہیں یہ بتایا کہ سالار گھر پر موجود تھا۔

”تم فکر مت کرو۔ میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔“ سالار نے ملازم سے کہا اور وہ انہیں اپنے بیڈروم میں آ گیا، وہ کسی عام شہری کا گھر ہوتا تو پولیس شاید دیواریں پھلانگ کر بھی اندر موجود ہوتی مگر اس وقت وارنٹ ہونے کے باوجود اس گھر کا ساڑھ اور جس علاقے میں وہ واقع تھا انہیں خوف میں مبتلا کر رہے تھے۔ اگر امام کا خاندان بھی اثر و سوغ والا نہیں ہوتا تو شاید اس وقت پولیس اس سیکٹر میں آنے اور خاص طور پر وارنٹ کے ساتھ آنے کی جرأت ہی نہ کرتی مگر اس وقت پولیس کے سامنے آگے کتوں پیچھے کھائی والی صورت تھی۔

سالار نے بیڈروم کے اندر آتے ہی فون اٹھا کر کراچی سکندر عثمان کو فون کیا۔

”پاپا! ایک چھوٹا سا پراہلم ہو گیا ہے۔“ اس نے چھوٹے ہی کہا۔

”یہاں ہمارے گھر کے باہر پولیس کھڑی ہے اور ان کے پاس میرے گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔“ سکندر عثمان کے ہاتھ سے موبائل گرتے گرتے بچا۔

”کیوں؟“

”یہ تو بتا نہیں پایا۔۔۔ میں سو رہا تھا، ملازم نے جگا کر مجھے بتایا، کیا میں جا کر پولیس والوں سے پوچھوں کہ وہ کس سلسلے میں مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہیں؟“ سالار نے بڑی فرمانبرداری اور مصومیت کے ساتھ سکندر عثمان سے پوچھا۔

”تمہیں باہر نکلنے یا پولیس کو اندر بلوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے کمرے میں ہی رہو۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہیں رنگ کرتا ہوں۔“ سکندر عثمان نے قلت کے عالم میں موبائل بند کر دیا۔ سالار نے مطمئن ہو کر فون رکھ دیا وہ جانتا تھا کہ اب کچھ دیر بعد پولیس وہاں نہیں ہوگی اور واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔ دس چندرہ منٹ کے بعد ملازم نے آکر اسے پولیس کے جانے کے بارے میں بتایا۔ ملازم ابھی اس سے بات کر ہی رہا تھا جب سکندر نے دوبارہ کال کی تھی۔

”پولیس چلی گئی ہے؟“ سکندر نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

”ہاں چلی گئی ہے۔“ سالار نے بڑے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

”اب تم میری بات ٹھیک طرح سنو۔ میں اور تمہاری بی بی رات کو کراچی سے اسلام آباد پہنچ رہے ہیں۔ تم جب تک گھر سے کہیں نہیں نکلو گے۔“ سالار نے۔۔۔ سالار کو ان کے بات کرنے کا انداز بہت عجیب سا لگا۔ انہوں نے بہت اکھڑا انداز اور سرد مہری سے اس سے بات کی تھی۔

”سن لیا۔“ وہ دوسری طرف سے فون بند کر چکے تھے۔

سالار ابھی فون بند کر رہا تھا جب اس کی نظر اپنے کمرے کے کارپٹ پر پڑی۔ وہاں جوتے کے نشانات تھے اور اس نے دیکھا کہ ملازم بھی قدرے حیرانی کے عالم میں ان نشانات کو دیکھ رہا تھا جو کھڑکی سے قطار کی صورت میں بڑھ رہے تھے۔

”جوتے کے ان نشانات کو صاف کرو۔“ سالار نے حکیمانہ انداز میں کہا۔

ملازم کمرے سے باہر چلا گیا، سالار اٹھ کر کھڑکی کی طرف آ گیا اور اس نے وہ سلائیڈنگ ونڈو پوری طرح کھول دی۔ اس کا اندازہ ٹھیک تھا، جوتے کے وہ نشانی والے نشانات باہر برآمدے میں بھی موجود تھے۔ امام اپنی کھوپڑیوں سے گزر کر دیوار پھلانگ کر ان کی کھوپڑیوں میں کودی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس کے جوتے کے نشانی سے بھر گئے تھے۔ اس کی وجہ سے وہ نشانی کم اور کچھ زیادہ تھی اور اس کے برآمدے کے سفید ماربل پر وہ نشانات بالکل ایک قطار کی صورت میں آ رہے تھے۔ وہ ایک گہری سانس لیتا ہوا اندر آ گیا، ملازم کمرے میں ان نشانات کو صاف کرنے میں مصروف تھا۔

”باہر برآمدے میں بھی بیروں کے کچھ نشانات ہیں انہیں بھی صاف کر دینا۔“ سالار نے اس سے کہا۔

"یہ کس کے نشان ہیں۔ ملازم زیادہ دیر اپنے جنس پر قابو نہیں رکھ سکا۔"
"میرے....." سالار نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

☆.....☆.....☆

وہ رات کو کھانا کھانے میں مصروف تھا جب سکندر عثمان اور طیبہ آگئے تھے۔ ان دونوں کے چہرے سے ہونے والے تھے۔ سالار اطمینان سے کھانا کھاتا رہا۔ وہ دونوں اسے مخاطب کئے بغیر اس کے پاس سے گزر کر چلے گئے تھے۔

"کھانا ختم کر کے میرے کمرے میں آؤ۔" سکندر عثمان نے جاتے جاتے اس سے کہا تھا۔ سالار نے جواب دینے کے بجائے فروٹ ٹرانسکل اپنی پیٹ میں نکال لی۔

پندرہ منٹ بعد وہ جب ان کے کمرے میں گیا تو اس نے سکندر کو کمرے میں ٹپکتے ہوئے پایا جب کہ طیبہ فگر مندی کے عالم میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

"پاپا! آپ نے بلوایا تھا؟" سالار نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو پھر تمہیں بتاتا ہوں کیوں بلایا ہے۔" سکندر عثمان نے اسے دیکھتے ہی جھلنا بند کر دیا۔ وہ بڑے اطمینان سے طیبہ کے برابر بیٹھ گیا۔

"امامہ کہاں ہے؟" سکندر نے لمحہ ضائع کئے بغیر پوچھا۔

"کون امامہ؟" اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کے چہرے پر تھوڑی بہت گھبراہٹ ضرور ہوتی، مگر وہ اپنے نام کا ایک ہی تھا۔

سکندر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "تمہاری بہن....." وہ فرمائی۔

"میری بہن کا نام امیتا ہے پاپا۔" سالار کے اطمینان میں کوئی کمی نہیں آئی۔

"مجھے تم صرف ایک بات بتاؤ۔ آخر تم مجھے اور کتنی بار اور کتنے طریقوں سے ڈیل کرواؤ گے۔" اس بار سکندر عثمان دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں، پاپا! میری سمجھ میں نہیں آرہا۔" سالار نے حیرانی سے کہا۔ "حالانکہ تمہاری سمجھ میں سب کچھ آرہا ہے۔" انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "دیکھو، مجھے آرام سے بتا دو کہ امامہ کہاں ہے۔ یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے جتنا تم نے سمجھ لیا ہے۔"

"پاپا! آپ کس امامہ کی بات کر رہے ہیں۔ میں کسی امامہ کو نہیں جانتا۔"

"میں وسیم کی بہن کی بات کر رہا ہوں۔" سکندر عثمان اس بار فرمائے۔

"وسیم کی بہن؟" وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ "اچھا..... یاد آیا۔ وہ جس نے مجھے ٹریسٹ دیا تھا لاسٹ ایئر۔"

"ہاں وہی..... اب چونکہ تمہاری یادداشت واپس آگئی ہے اس لئے مجھے یہ بھی بتا دو کہ وہ کہاں ہے۔"

"پاپا! وہ اپنے گھر میں ہوگی یا میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں۔ میرا اس سے کیا تعلق؟" اس نے حیرانی سے سکندر سے کہا۔ "اس کے باپ نے تمہارے خلاف اپنی بیٹی کے اغوا کا کیس کروا دیا ہے۔"

"میرے خلاف..... I don't believe it! میرا امامہ سے کیا تعلق ہے؟" اس نے پرسکون لہجے اور بے تاثر چہرے کے ساتھ کہا۔

"یعنی تو میں جانتا چاہتا ہوں کہ تمہارا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"

"پاپا! میں اس کو جانتا تک نہیں ہوں۔ ایک دو بار کے علاوہ میں اس سے ملا تک نہیں۔ پھر اس کے اغوا سے میرا کیا تعلق اور مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ وہ اغوا ہو گئی ہے۔"

"سالار! اب یہ ایکٹنگ بند کرو۔ مجھے بتا دو کہ وہ بیٹی کہاں ہے۔ میں نے ہاشم عین سے وعدہ کیا ہے کہ میں ان کی بیٹی کو ان تک پہنچاؤں گا۔"

"تو آپ اپنا وعدہ پورا کریں اگر ان کی بیٹی کو ان تک پہنچا سکتے ہیں تو ضرور پہنچائیں، مگر مجھے کیوں ڈسٹرب کر رہے ہیں۔" اس بار سالار نے ناگواری سے کہا۔

"دیکھو سالار! تمہاری اور امامہ کے درمیان اگر کسی قسم کی اندر اسٹینڈنگ ہے تو ہم اس معاملے کو حل کر لیں گے۔ میں خود تمہاری اس کے ساتھ شادی کروا دوں گا۔ تم فی الحال یہ بتا دو کہ وہ کہاں ہے۔"

سکندر عثمان نے اس بار اپنے لب و لہجے میں تبدیلی لاتے ہوئے کہا۔

"فار گاڈ سیک پاپا..... اسٹاپ!..... کون سی اندر اسٹینڈنگ، کبھی شادی..... میری کسی کے ساتھ اندر اسٹینڈنگ ہوتی تو میں اسے اغوا کروں گا اور میں اندر اسٹینڈنگ ڈیولپ کروں گا امامہ جیسی لڑکی کے ساتھ۔"

وہ میری ٹائپ ہے؟" اس بار سالار نے بلند آواز میں کہا۔

"تو پھر وہ تم پر اس کے اغوا کا الزام کیوں لگا رہے ہیں؟"

"یہ آپ ان سے پوچھیں۔ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اس نے اسی ناگواری سے جواب دیا۔

"آج ہاشم عین کہہ رہے ہیں کل کو کوئی اور آکر کہے گا اور آپ پھر مجھ پر چلانا شروع کر دیں گے..... میں نے آپ کو بتایا ہے میں سو رہا تھا جب پولیس آکر باہر کھڑی ہو گئی اور اب آپ آگئے ہیں اور آتے ہی مجھ پر..... مجھے تو یہ تک نہیں پتا کہ وسیم کی بہن اغوا ہوئی ہے یا نہیں..... آخر وہ لوگ مجھ پر الزام کیوں لگا رہے ہیں۔ کیا ثبوت ہے ان کے پاس کہ میں نے ان کی بیٹی کو اغوا کیا ہے اور بالفرض میں نے اغوا کیا بھی ہے تو کیا میں یہاں اپنے گھر بیٹھا ہوں گا۔ مجھے اس وقت اس لڑکی کے ساتھ ہونا چاہئے۔"

سالار عثمانی سے بولتا رہا۔

”مجھے ایسی پنی سے تمہارے کیس کی تفصیلات کا پتا چلا ہے، پھر میں نے کراچی سے ہاشم مبین کو فون کیا، وہ مجھ سے بات کرنے پر تیار نہیں تھا۔ مجھے اس سے بات کرنے کے لئے تئیں کرنی پڑیں۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا ہے..... اس کی بیٹی رات کو غائب ہوئی ہے..... اور تم بھی رات کو گئے ہو اور صبح آئے ہو۔“

”تو پاپا! اس میں انہو کہاں سے آگیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں رات کو کہیں نہیں گیا اور دوسری بات یہ ہے کہ انہو کرنے کے لئے کسی کے گھر جا کر لڑکی کو زبردستی لے جانا ضروری ہے اور میں کسی کے گھر نہیں گیا۔“

”ہاشم مبین کے چوکیدار نے رات کو تمہیں جاتے اور صبح آتے دیکھا ہے۔“

”اس کا چوکیدار جوتا ہے۔“ سالار نے بلند آواز میں کہا۔

”میرے چوکیدار نے تمہیں رات کو ایک لڑکی کو کار میں لے جاتے دیکھا ہے۔“ سکندر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ سالار چند لمبے کچھ بول نہ سکا۔ سکندر یقیناً گھر آتے ہی چوکیدار سے بات کر چکے تھے۔

”وہ میری ایک فریڈ تھی جسے میں گھر چھوڑنے گیا تھا۔“ اس نے طیبہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کون ہے وہ فریڈ؟ اس کا نام اور پتہ بتاؤ۔“

”سوری پاپا میں نہیں بتا سکتا۔ It's personal۔“

”یہاں اسلام آباد چھوڑنے گئے تھے؟“

”ہاں.....“

”تم اسے لاہور چھوڑ کر آئے ہو۔ ایسی پنی نے مجھے خود بتایا ہے۔ تم چار ٹاکوں سے گزرے ہو۔ چاروں پر تمہارا نمبر نوٹ کیا گیا ہے۔ رستے میں تم نے اس سروس اسٹیشن پر ڈک کر گاڑی چیک کروائی ہے..... اس لڑکی کے ساتھ وہاں کھانا کھایا ہے۔“ سکندر نے اس سروس اسٹیشن اور ہوٹل کا نام بتاتے ہوئے کہا۔ سالار کچھ دیر سکندر کو دیکھتا رہا مگر اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ ”ایسی پنی نے مجھے یہ سب کچھ خود بتایا ہے۔ اس نے ابھی ہاشم مبین کو یہ سب کچھ نہیں بتایا۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تم سے بات کروں اور خاموشی کے ساتھ لڑکی کو واپس پہنچا دوں یا اس کے گھر والوں کو اس لڑکی کا پتا بتا دوں تاکہ یہ معاملہ خاموشی سے کسی مسئلے کے بغیر ختم ہو جائے مگر وہ کب تک ہاشم مبین کو نہیں بتائے گا۔ وہ دوستی کا ٹیلا کر کے سب کچھ چھپا بھی گیا تب بھی ہاشم مبین کے اور بہت سے ذرائع ہیں۔ اسے وہاں سے پتا چل جائے گا اور پھر تمہاری پوری زندگی تیش میں گزرے گی۔“

سکندر نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔ وہ متاثر ہوئے بغیر انہیں دیکھتا رہا۔

”اب جھوٹ بولنا چھوڑو اور مجھے بتاؤ کہ وہ لڑکی کہاں ہے۔“

”وہ لڑکی ریڈ لائٹ ایریا میں ہے۔“ سکندر کو اس کی بات پر کرنٹ لگا۔

”واٹ.....؟“

”میں اسے وہاں سے لایا تھا، وہاں چھوڑ آیا ہوں۔“

وہ سفید چہرے کے ساتھ سالار کو دیکھتے رہے۔

”مگر وہ امامہ نہیں تھی، میں پرسوں لاہور گیا ہوا تھا وہاں سے میں رات گزارنے کے لئے اس لڑکی کو لایا تھا، آج میں اسے وہاں چھوڑ آیا۔ میرے پاس اس کا کوئی کاٹیکٹ نمبر تو نہیں ہے، مگر آپ میرے ساتھ لاہور چلیں تو میں آپ کو اس لڑکی کے پاس لے جاتا ہوں یا پتا بتاتا ہوں آپ خود یا پولیس کو کہیں کہ وہ اس لڑکی سے تصدیق کر لیں۔“

کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ طیبہ اور سکندر بے یقینی سے سالار کو دیکھ رہے تھے جب کہ وہ بڑے مطمئن انداز میں کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہا تھا۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ تم..... تم اس طرح کی حرکت کر سکتے ہو۔ تم ایسی جگہ جا سکتے ہو؟“ ایک لمبی خاموشی کے بعد سکندر نے کہا۔

”آئی ایم سوری پاپا! مگر میں جانتا ہوں..... اور اس بات کا امامہ کے بھائی وسم کو بھی پتا ہے۔ میں کئی بار ویک اینڈ پر اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں جاتا رہا ہوں اور وسم یہ بات جانتا ہے، آپ اس سے پوچھ لیں۔“

”ایڈریس دو اس لڑکی کا۔“ وہ کچھ دیر بعد غراٹے۔

”میں اپنے کمرے سے لے کر آتا ہوں۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے موبائل اٹھایا اور لاہور میں رہنے والے اپنے ایک دوست کو فون کرنے لگا۔ اسے ساری صورت حال بتانے کے بعد اس نے کہا۔

”اکمل! میں اپنے پاپا کو ریڈ لائٹ ایریا کے اس گھر کا پتہ دے رہا ہوں جہاں ہم جاتے رہتے ہیں۔ تم وہاں کسی بھی ایسی لڑکی کو جو مجھے جانتی ہے اس کو اس بارے میں بتا دو، میں ابھی کچھ دیر تک تمہیں وہ بارہ فون کرتا ہوں۔“

وہ کہتے ہوئے تیزی سے ایک چٹ پر ایک ایڈریس لکھنے لگا اور پھر اسے لے کر سکندر کے کمرے میں آگیا۔ اس نے چٹ سکندر کے سامنے کر دی، جسے انہوں نے تقریباً چھین لیا۔ ایک نظر اس چٹ پر ڈال کر انہوں نے چشمیں نظروں سے اسے دیکھا۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ اطمینان سے انداز میں وہاں سے آگیا۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے اکمل کو وہ بارہ فون کیا۔

”میں تمہیں وہاں پہنچ کر فون کرتا ہوں۔“ اکمل نے اس سے کہا وہ بیڈ پر لیٹ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ منٹ کے بعد اکمل نے اسے فون کیا۔

”سالار! میں نے سعیہ کو تیار کیا ہے۔ اسے میں نے سارا معاملہ سمجھا دیا ہے۔“ اکمل نے اسے بتا دیا وہ سعیہ کو جانتا تھا۔

”اکمل! اب تم ایک کاغذ اور ہینسل لو اور میں کچھ چیزیں لکھوا رہا ہوں اسے لکھو۔“ اس نے اکمل سے کہا اور پھر اسے اپنے گھر کے بیرونی منظر اور لوکیشن کی تفصیلات لکھوانے لگا۔

”یہ کیا میں نے دیکھا ہے تمہارا گھر۔“ اکمل نے کچھ حیرانی سے اس سے پوچھا۔

”تم نے دیکھا ہے سعیہ نے تو نہیں دیکھا۔ یہ ساری تفصیلات میں سعیہ کے لئے لکھوا رہا ہوں اگر پولیس اس کے پاس آئی تو وہ یہ ساری چیزیں اس سے پوچھے گی صرف یہ تصدیق کرنے کے لئے کہ کیا وہ واقعی میرے ساتھ یہاں اسلام آباد میں تھی۔ وہ گاڑی میں چھپ کر آئی تھی اور رات کے وقت آئی تھی

اس لئے اسے زیادہ تفصیل کا نہیں پتا، مگر گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے دائیں اور بائیں دونوں طرف لان ہے۔ میری گاڑی کا رنگ سبز تھا۔ اسپورٹس کار اور نمبر..... وہاں سے لکھواتا گیا۔

”ہم پولیس کے چار ناکوں سے گزرے تھے۔ اس نے سفید شلوار قمیص، سفید چادر اور سیاہ سوئچر پہنا ہوا تھا۔ رستے میں ہم اس نام کے سروس اسٹیشن پر بھیڑے تھے۔“ سالار نے نام بتایا، سروس اسٹیشن اور ہوٹل، وہ دھند کی وجہ سے صحیح طرح نہیں دیکھ سکی۔“ سالار یکے بعد دیگرے ہر چیز کی تفصیل لکھواتا

گیا۔ سروس اسٹیشن پر گاڑی ٹھیک کرنے والے آدمی سے لے کر چائے بنانے والے لڑکے کے محلے اور اس کمرے کی تفصیلات۔ انہوں نے کیا کہا تھا، سالار اور لڑکے کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی۔ اس نے چھوٹی چھوٹی تفصیلات اسے لکھوائی تھیں۔ اس نے اپنے گھر کے پورچ سے لے کر اپنے کمرے تک

کے راستے اور اپنے کمرے کا تمام حلیہ بھی اسے نوٹ کروا دیا تھا۔

”سعیہ سے کہو یہ سب کچھ رٹ لے۔“ اس نے اکمل کو آخری ہدایت دی اور فون بند کر دیا۔ فون بند کر کے وہ بیڈ پر بیٹھا ابھی کچھ سوچ رہا تھا جب سکندر عثمان اچانک دروازہ کھول کر اس کے کمرے

میں آئے۔

”اس لڑکی کا کیا نام ہے؟“

”سعیہ! سالار نے بے اختیار کہا۔ سکندر عثمان مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گئے۔

☆.....☆.....☆

ان کے جانے کے بعد سالار کو اس وکیل کا خیال آیا جس کے ذریعے انہوں نے ہاشم مبین احمد سے رابطہ کیا تھا۔ اس وکیل کو ہانڈ کرنے والا بھی حسن ہی تھا اور سالار سکندر کے نام سے وہ وکیل بھی واقف

نہیں تھا، مگر سالار کے لئے قابل تشویش بات اس میں حسن کا انوالو ہونا تھا، ہاشم مبین احمد اس وکیل سے حسن اور حسن سے اس تک بہت آسانی سے پہنچ سکتے تھے۔

اس نے اگلا فون حسن کو کیا اور حسن کو سارے معاملے کی نوعیت سے آگاہ کیا۔

”میں تمہیں پہلے ہی اس سب سے متنب کر رہا تھا۔“ اس نے چھوٹے ہی سالار سے کہا۔ ”میں وہیم اور اس کی فیملی کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور ان کے اثر و رسوخ سے بھی بخوبی واقف ہوں۔“ وہ بولا جا رہا تھا۔

سالار نے کچھ آتاہٹ بھرے لہجے میں اسے ٹوکا۔ ”میں نے تمہیں فون اپنے مستقبل کا حال جاننے کے لئے نہیں کیا۔ میں صرف ایک خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”کس خطرے سے؟“ حسن چونکا۔ ”تم نے جو وکیل ہانڈ کیا تھا وہ اس کے ذریعے تم تک اور پھر مجھ تک با آسانی پہنچ سکتے ہیں۔“ سالار نے اس سے کہا۔

”نہیں وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔“ حسن نے اس کی بات پر قدرے لاپرواہی سے کہا۔

”کیوں.....؟“

”کیوں کہ میں نے سارا کام پہلے ہی بہت محتاط ہو کر کیا ہے۔“ وہ وکیل بھی میرے اصلی نام اور پتے سے واقف نہیں ہے۔ اسے جو ایڈریس اور فون نمبر میں نے دیا تھا وہ جعلی تھا۔

سالار بے اختیار مسکرایا۔ اسے حسن سے ایسی عقلمندی اور چالاک کی توقع رکھنی چاہئے تھی۔ وہ ہر کام بڑی صفائی سے سرانجام دینے کا ماہر تھا۔

”میں صرف اس کے پاس ایک بار گیا تھا پھر فون پر ہی رابطہ کیا اور اس ملاقات میں بھی میرا حلیہ بالکل مختلف تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ صرف حلیہ سے ہاشم مبین احمد مجھ تک پہنچ سکتے ہیں؟“

”اور اگر وہ پہنچ گئے تو.....؟“

”تو..... پتا نہیں..... اس تو کے بارے میں میں نے نہیں سوچا۔“ حسن نے صاف گوئی سے کہا۔

”کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم کچھ دنوں کے لئے کہیں غائب ہو جاؤ اور یوں ظاہر کرو کہ جیسے تمہاری یہ غیر موجودگی کچھ ضروری کاموں کے لئے تھی۔“ سالار نے اسے مشورہ دیا۔

”اس سے بہتر مشورہ بھی میرے پاس ہے۔ میں اس وکیل کو کچھ روپے پہنچا کر یہ ہدایت دے دیتا ہوں کہ ہاشم مبین یا پولیس کے پہنچنے پر وہ انہیں میرا غلط حلیہ بتائے۔ کم از کم اس طرح فوری طور پر میں کسی پریشانی کا شکار نہیں ہوں گا اور ان ہی دنوں میں ویسے بھی چند ہفتوں کے لئے انگلینڈ جا رہا ہوں۔“ حسن نے بتایا۔ ”پولیس اگر پہنچ بھی گئی تو تب بھی میں ان کی پہنچ سے بہت دور رہوں گا، مگر مجھے یہ یقین نہیں ہے کہ وہ مجھ تک پہنچ سکیں گے۔ اس لئے تم اطمینان رکھو۔“

”اگر تم واقعی اتنے بے فکر اور مطمئن ہو تو ٹھیک ہے، ہو سکتا ہے وہ تم تک نہ ہی آئیں، مگر میں نے پھر بھی سوچا کہ میں تمہیں بتا دوں۔“ سالار نے فون بند کرتے ہوئے اس سے کہا۔

”ویسے تم اس لڑکی کو اب لاہور میں کہاں چھوڑ کر آئے ہو؟“

”لاہور کی ایک سڑک پر چھوڑ آیا ہوں اس کے علاوہ اور کہاں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے اپنے محل وقوع اور حدود و اربعہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وہ بس چلی گئی۔“

”مجیب بے وقوف ہو، کم از کم تم تو اس سے اس کا ٹھکانہ پوچھنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔“

”ہاں! مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑی۔“ سالار نے دانستہ انداز میں اس سے آخری بار ہونے والی اپنی گفتگو گول کر دی۔

”میں حیران ہوں کہ تم اب کس طرح کے معاملات میں انوالو ہونے لگے ہو۔ اپنی ناپ کی لڑکیوں کے ساتھ انوالو ہونا دوسری بات ہے مگر وہ سیم کی بہن جیسی لڑکیوں کے ساتھ انوالو ہو جانا — تمہارا ٹیٹ بھی دن بہ دن گرتا جا رہا ہے۔“

”میں ”انوالو“ ہوا ہوں.....؟ تم واقعی عقل سے پیدل ہو اور نہ کم از کم اس طرح کی بات مجھ سے نہ کرتے۔ ایڈوچر اور انوالو منٹ میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے حسن صاحب! سالار نے طنز لہجے میں کہا۔

”اور آپ نے یہ قاصد ایک ہی چھٹانگ میں طے کر لیا ہے سالار صاحب!“ حسن نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔

”تمہارا دماغ خراب ہے اور کچھ نہیں۔“

”اور تمہارا دماغ مجھ سے زیادہ خراب ہے۔ ورنہ اس طرح کی حماقت کو ایڈوچر کبھی نہ کہتے۔“ حسن بھی قدرے جھٹایا ہوا تھا۔

”اگر تم نے میری مدد کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمہارے منہ میں جو آئے تم مجھے کہہ دو۔“ سالار کو اس کی بات پر اچانک غصہ آ گیا۔

”ابھی میں نے تمہیں کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ تم کس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہو۔ یہ ٹیٹ والی بات کی طرف یا دماغ خراب ہونے والی بات کی طرف؟“ حسن نے اسی انداز میں اس کے غصے سے حناڑ ہوئے بغیر پوچھا۔

”اچھا اب منہ بند کر لو۔ فضول بحث مت کرو۔“

”اس وقت ان تمام باتوں کو کرنے کا مطلب گڑے مردے اٹھا ڈالنا ہے۔“ حسن اب سنجیدہ تھا۔

”فرض کرو پولیس کسی صورت ہم تک پہنچ جاتی ہے اور پھر وہ امامہ کا اتا پاتا جانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم

کیا بتائیں گے اور میں نہیں سمجھتا کہ وہ کبھی بھی اس بات پر یقین کریں گے کہ امامہ کے بارے میں تمہیں کچھ پتا نہیں ہے۔ اس وقت تم کیا کرو گے؟“

”کچھ بھی نہیں کروں گا۔ میں ان سے بھی وہی کہوں گا جو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔“ اس نے بلند آواز میں کہا۔

”ہاں اور سالار مسئلہ تمہارے اس بیان سے ہی شروع ہو گا۔ میں امامہ کے بارے میں نہیں جانتا ہوں۔“ حسن نے اس کا جملہ ڈہرایا۔ ”تمہیں اچھی طرح اندازہ ہونا چاہئے کہ وہ ہر قیمت پر امامہ تک پہنچنا چاہیں گے۔“

”یہ بہت بعد کی بات ہے، میں امکانات اور ممکنات پر غور کر کے پریشان نہیں ہوتا۔ جب وقت آئے گا، دیکھا جائے گا۔“ سالار نے لاپرواہی سے کہا۔

”تم سے مجھے صرف یہ مدد چاہئے کہ تم اس سارے معاملے کو ریزی رکھو اور پولیس کے ہتھے نہ لگو۔“

”تمہارے کہے بغیر بھی میں یہ ہی کرتا۔ ویسے بھی میں اگر پکڑا گیا تو وہ سب کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ اس بار تم نے مجھے واقعی بڑی embarrassing صورت حال سے دوچار کیا ہے۔“

”اوکے میں فون بند کر رہا ہوں کیونکہ تم پر پھر وہی دورہ پڑنے والا ہے۔ وہی نصیحتیں اور بچھتاؤ۔“

”you are acting like my father.“

”سالار نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ اس کا ذہن الجھلی رات کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کے ماتھے کی تیریاں اور بل بہت نمایاں تھے۔

☆.....☆.....☆

”میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اس حد تک گر جائے گا۔“

”ریڈ لائٹ ایریا، مانی فنٹ، کبھی میرے خاندان کی الجھلی سات لسلوں سے بھی کوئی وہاں نہیں گیا اور یہ لڑکا..... کیا ہے جو میں نے اسے نہیں دیا..... کیا ہے جس کی کمی رہنے دی ہے اور اسے دیکھو کبھی یہ خود کشی کی کوشش کرتا پھر تا ہے اور کبھی ریڈ لائٹ ایریا، میرے اللہ..... آخر کس حد تک جائے گا یہ؟“

سکندر عثمان نے اپنا سر تھام لیا۔

”مجھے تو گھر کے ملازموں پر بھی بہت زیادہ اعزاز ملتا ہے۔ آخر کیوں اس لڑکی کو انہوں نے اندر آنے دیا۔ گھر کے معاملات پر نظر رکھنی چاہئے انہیں۔“ طیبہ نے بات کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”گھر کے معاملات اور مالک کے معاملات پر نظر رکھنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یہاں معاملہ گھر کا نہیں تھا، مالک کا تھا۔“ سکندر نے طنز لہجے میں کہا۔ ”اور پھر اس میں سے کسی نے بھی کسی لڑکی کو یہاں آتے نہیں دیکھا۔ وہ کہتا ہے وہ اسے اسی دن لایا تھا، پوچھو کہ کیا کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا اس نے

اس کے ساتھ کسی لڑکی کو آتے نہیں دیکھا۔ ہاں اجاتے ضرور دیکھا ہے ملازموں کا بھی یہی کہنا ہے۔ انہوں نے تو نہ کسی لڑکی کو آتے دیکھا ہے نہ ہی جاتے دیکھا ہے۔" سکندر نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ یقیناً اس لڑکی کو اچھی طرح چھپا کر لایا ہو گا۔"

"شیطان دماغ ہے اس کا..... یہ تم جانتی ہو تم صرف یہ دعا کرو کہ یہ سارا معاملہ ختم ہو جائے۔ ہاشم مبین کی بیٹی مل جائے اور ہماری جان چھوٹ جائے تاکہ ہم اس کے بارے میں کچھ سوچ سکیں۔" سکندر عثمان نے کہا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مجھ سے ایسی کون سی غلطی ہو گئی ہے، جس کی مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟" وہ بے حد بے بس نظر آ رہے تھے۔

☆.....☆

وہ اگلے روز صبح معمول کے مطابق اٹھا اور کالج جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔ ناشتہ کرنے کے لئے وہ ڈائننگ ٹیبل پر آیا تو اس نے خلاف معمول وہاں سکندر عثمان کو موجود پایا۔ وہ عام طور پر اس وقت ناشتہ نہیں کیا کرتے تھے۔ ڈراویر سے فیکٹری جایا کرتے تھے۔ سالار کو اس وقت انہیں وہاں موجود پا کر کچھ حیرت ہوئی، مگر ان کے ستے ہوئے چہرے اور سرخ آنکھوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید وہ ساری رات نہیں سو سکے۔

سالار کو صبح صبح باہر نکلنے کے لئے تیار دیکھ کر انہوں نے قدر درستی سے اس سے کہا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"کالج۔"

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا..... میرے گلے میں یہ مصیبت ڈال کر تم خود کالج جا رہے ہو۔ جب تک یہ معاملہ ختم نہیں ہو جاتا تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ تمہیں پتا ہے کہ تم کتنے خطرے میں ہو؟"

"کیسا خطرہ؟" وہ ٹٹکا۔

"میں نہیں چاہتا ہاشم مبین تمہیں کوئی نقصان پہنچائے۔ اس لئے فی الحال تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم گھر پر رہو۔" سکندر عثمان نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "اس کی بیٹی مل جائے پھر تم دوبارہ کالج جانا شروع کرو۔"

"اس کی بیٹی اگر ایک سال نہیں ملے گی تو کیا میں ایک سال تک اندر بیٹھا رہوں گا۔ آپ نے اسے میرے بیان کے بارے میں بتایا نہیں ہے۔" سالار نے تیز لہجے میں کہا۔

"میں اسے بتا چکا ہوں۔ سچی لہجے میں تمہاری بات کی تصدیق کر دی تھی۔" ان کے لہجے میں سچی کانام لیتے ہوئے تلخی تھی۔ "مگر ہاشم مبین ابھی بھی مصر ہے کہ اس کی بیٹی کو تم نے ہی اغوا کیا ہوا ہے۔"

"تو میں کیا کروں..... اسے یقین نہیں آتا تو نہ آئے۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ سالار نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے ناشتہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"تمہیں فرق نہیں پڑتا، مجھے پڑتا ہے۔ تم ہاشم مبین احمد کو نہیں جانتے۔ وہ کتنے اثرورسوخ والا آدمی ہے اور کس حد تک جاسکتا ہے اس کا اندازہ صرف مجھے ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچائے۔ اس لئے ابھی تم گھر پر ہی رہو۔"

سکندر عثمان نے اس بار کچھ نرم لہجے میں کہا۔ شاید انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی تلخی کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ وہ ان کی بات نہیں مانے گا۔

"پاپا! میری اسٹڈیز کا حرج ہو گا۔ سواری امیں گھر پر نہیں بیٹھ سکتا۔" سالار سکندر عثمان کے لہجے کی نرمی سے متاثر نہیں ہوا تھا۔

"تمہارا حرج ہوتا ہے یا نہیں مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں گھر پر چاہتا ہوں۔ کبھی تم۔" اس بار انہوں نے اپنا کھڑک کر بلند آواز میں اس سے کہا۔

"تم از کم آج تو مجھے جانے دیں۔ آج مجھے بہت سے ضروری کام نپنانے ہیں۔" سالار ایک دم ان کے فٹے پر کچھ پزل ہوا۔

"تم وہ کام ڈرائیور کو بتا دو، وہ کر دے گا یا پھر کسی دوست سے فون پر بات کر لو۔" سکندر نے حتمی انداز میں کہا۔

"مگر پاپا..... آپ مجھے اس طرح....." سکندر عثمان نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ ڈائننگ روم سے نکل رہے تھے۔ وہ کچھ دیر بلند آواز میں بڑبڑاتا پھر نکل آ کر خاموش ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ سکندر عثمان اسے باہر نکلنے نہیں دیں گے مگر اسے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ سچی کو سامنے لانے پر اس کی اپنی فیملی کے ساتھ ہاشم مبین بھی مطمئن ہو جائیں گے اور کم از کم یہ مصیبت اس کے کندھوں سے اتر جائے گی، مگر اس کے لئے سکندر عثمان کا یہ انکشاف حیران کن تھا کہ ہاشم مبین نے ابھی بھی اس کے بیان پر یقین نہیں کیا تھا۔

سالار وہاں بیٹھنا ناشتہ کرتے ہوئے کچھ دیر ان تمام معاملات کے بارے میں سوچتا رہا۔ کالج نہ جانے کا مطلب گھر میں بند ہو جانا تھا اور وہ گھر میں بند نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کا موڈ ایک دم آف ہو گیا۔ ناشتہ کرتے کرتے اس نے اسے اوجھڑا چھوڑ دیا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

☆.....☆

"سکندر صاحب! میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔" وہ لاؤنج میں بیٹھی تھی جب ملازمہ کچھ جھجکتے ہوئے ان کے پاس آئی۔

”ہاں کہو..... بیویوں کی ضرورت ہے؟“ سکندر عثمان نے اخبار پڑھتے ہوئے کہا۔ وہ اس معاملے میں خاصے فریخ دل تھے۔

”نہیں صاحب جی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں کچھ اور کہنا چاہتی ہوں آپ سے۔“

”بولو.....“ وہ ہنوز اخبار میں منہمک تھے۔ ملازمہ کچھ پریشان ہونے لگی۔ ناصرہ نے بہت سوچ بچھ کر سالار اور امامہ کے بارے میں سکندر عثمان کو بتانے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ اسے یہ سب کچھ اب بہت پریشان کن لگ رہا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ جلد یا بدیر یہ پناہ چل جائے کہ ان دونوں کے درمیان رابطہ کا ذریعہ وہ تھی اور پھر اسے اور اس کے پورے خاندان کو پولیس کا سامنا کرنا پڑے۔ اسی لئے اپنے شوہر سے مشورے کے بعد اس نے سکندر عثمان کو سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ کم از کم وہ دونوں گھرانوں میں سے کسی ایک کی ہمدردی اپنے ساتھ رکھے۔

”چپ کیوں ہو، بولو۔“ سکندر عثمان نے اسے خاموش پا کر ایک بار پھر اس سے کہا۔ ان کی نظریں ابھی ابھی اخبار پر جمی ہوئی تھیں۔

”سکندر صاحب! میں آپ کو سالار صاحب کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“ ناصرہ نے بالآخر ایک طویل توقف کے بعد کہا۔

سکندر عثمان نے بے اختیار اخبار اپنے چہرے کے سامنے سے ہٹا کر اسے دیکھا۔

”سالار کے بارے میں..... کیا کہنا چاہتی ہو؟“ انہوں نے اخبار کو سامنے سینئر ٹیبل پر پھینکتے ہوئے بہت سنجیدگی سے کہا۔

”سالار صاحب اور امامہ بی بی کے بارے میں کچھ باتیں بتانا چاہتی ہوں۔“ سکندر عثمان کا دل بے اختیار اچھل کر طلق میں آ گیا۔

”کیا.....؟“

”بہت دن پہلے ایک دن سالار صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کا موبائل اپنی بیٹی کے ہاتھ امامہ بی بی کو پہنچا دوں۔“ سکندر عثمان کو لگا وہ دوبارہ کبھی مل نہیں سکیں گے۔ تو ہاشم بین احمد کا خیال اور اصرار ٹھیک تھا، ان کے بدترین قیاس اور اندازے درست تھے۔

”پھر.....؟“ انہیں اپنی آواز کسی کھائی سے آتی لگی۔ ”میں نے انکار کر دیا کہ یہ کام میں نہیں کر سکتی مگر انہوں نے مجھے بہت دھمکایا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ جس پر مجبوراً میں وہ موبائل امامہ بی بی تک پہنچانے کے لئے تیار ہو گئی۔“

اپنی پوزیشن کو محفوظ رکھنے کے لئے ناصرہ نے اپنے بیان میں جھوٹ کی آمیزش کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر اس کے کچھ دن بعد ایک دن سالار صاحب نے کہا کہ میں کچھ کاغذات امامہ بی بی تک پہنچاؤں اور

پھر اسی وقت ان کاغذات کو وہاپس لے آؤں۔ میں نے اپنی بیٹی کے ذریعے وہ کاغذات بھی امامہ بی بی کے پاس پہنچا کر وہاپس منگوائے اور سالار صاحب کو دے دیئے۔ میں نے سالار صاحب سے ان کاغذات کے بارے میں پوچھا مگر انہوں نے نہیں بتایا مگر مجھے شک تھا کہ شاید وہ نکاح نامہ تھا کیونکہ اس وقت سالار صاحب کے کمرے میں پانچ لوگ موجود تھے۔ ان میں سے ایک کوئی مولوی بھی تھا۔“

سکندر عثمان کو وہاں بیٹھے بیٹھے ٹھنڈے پیسے آنے لگے تھے۔ ”اور یہ کب کی بات ہے؟“

”امامہ بی بی کے جانے سے چند دن پہلے۔“ ناصرہ نے کہا۔

”تم نے مجھے اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟“ سکندر عثمان نے درشت لہجے میں کہا۔

”میں بہت خوفزدہ تھی صاحب جی..... سالار صاحب نے مجھے دھمکیاں دی تھیں کہ اگر میں نے آپ کو یا کسی اور کو اس سارے معاملے کے بارے میں بتایا تو وہ مجھے یہاں سے باہر پھینکا دیں گے۔“ ناصرہ نے کہا۔

”وہ کون لوگ تھے، انہیں پہچانتی ہو؟“ سکندر عثمان نے بے حد اضطراب کے عالم میں کہا۔

”بس ایک کو..... حسن صاحب تھے۔“ اس نے سالار نے ایک دوست کا نام لیا۔ ”باقی اور کسی کو میں نہیں پہچانتی۔“ ناصرہ نے کہا۔

”میں بہت پریشان تھی۔ آپ کو بتانا چاہتی تھی مگر ڈرتی تھی کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچیں گے مگر اب مجھ سے برداشت نہیں ہوں۔“

”اور کون کون اس کے بارے میں جانتا ہے؟“ سکندر عثمان نے کہا۔

”کوئی بھی نہیں۔ بس میں، میری بیٹی اور میرا شوہر۔“ ناصرہ نے جلدی سے کہا۔

”ملازموں میں سے کسی اور کو کچھ پتا ہے؟“

”توہ کریں جی! میں کیوں کسی کو کچھ بتاتی..... میں نے کسی کو کچھ بھی نہیں بتایا۔“

”تم نے جو کچھ کہا اس کے بارے میں تو میں بعد میں ملے کر دوں گا مگر فی الحال تم ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو تم کسی کو بھی اس سارے معاملے کے بارے میں نہیں بتاؤ گی۔ اپنا منہ ہمیشہ کے لئے بند کر لو۔ ورنہ اس بار میں نہ صرف تمہیں واقعی اس گھر سے نکال دوں گا بلکہ میں ہاشم بین احمد اور پولیس سے کہہ دوں گا کہ یہ سب کچھ تم نے کروا لیا ہے۔ تم نے ہی ان دونوں کو گمراہ کیا تھا اور تم ہی ان دونوں کے بیانات ایک دوسرے تک پہنچاتی رہیں، پھر پولیس تمہارے ساتھ اور تمہارے خاندان کے ساتھ کیا کرنے کی تمہیں یاد رکھنا چاہئے۔ تمہاری ساری عمر جیل کے اندر ہی گزر جائے گی۔“ وہ فحشے کے عالم میں اسے دھمکا رہے تھے۔

”نہیں صاحب جی! میں کیوں کسی کو کچھ بتاؤں گی۔ آپ میری زبان کنواں تہمتے گا۔ اگر میرے من

سے دوبارہ اس کے بارے میں ذکر نہیں۔

ناصرہ گھبرا گئی مگر سکندر عثمان نے رکھائی کے ساتھ اس کی بات کاٹ دی۔

”بس کافی ہے۔ اب تم جاؤ یہاں سے۔ میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔“ انہوں نے اسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سکندر عثمان پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر ٹھٹھکے لگے۔ اس وقت ان کے سر پر واقعی آسمان ٹوٹ پڑا تھا اور اس وقت انہیں پہلی بار سالار کے ہاتھوں بے وقوف بننے کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ کس ڈھنڈائی، مہارت اور بے ہودگی سے ان سے جھوٹ پر جھوٹ بولتا اور انہیں دھوکا دیتا گیا تھا اور انہیں اس کا احساس تک نہیں ہو سکا تھا اور اگر غلام نہ انہیں یہ سب کچھ نہ بتاتی تو وہ ابھی بھی ٹانگ پر ٹانگ رکھے مطمئن بیٹھے ہوتے۔ یہی سوچ کر کہ سالار امامہ کے ساتھ انوالو نہیں ہے اور نہ ہی اس کی گمشدگی میں اس کا کوئی حصہ تھا۔ وہ چند دن گھر پر رہ کر ایک بار پھر کانچ جانا شروع کر چکا تھا۔

وہ جانتے تھے کہ سالار کی گھرائی کروائی جا رہی تھی اور ہاشم مبین احمد کو سب کچھ بتا چلنے کا مطلب کیا تھا۔ یہ وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کا کچھ دیر پہلے کا اطمینان یک دم ختم ہو گیا تھا۔ وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ وہ کاغذات کیسے تھے۔ ان پانچ آدمیوں کی موجودگی کا مطلب کیا تھا، سالار اور امامہ کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا تھی اور اس وقت ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کا گلہ دبا دیں یا پھر اسے شوٹ کر دیں مگر وہ جانتے تھے وہ یہ دونوں کام نہیں کر سکتے تھے۔ سالار سکندر ان کا وہ بیٹا تھا جس سے وہ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبت کرتے تھے اور اس طرح بے وقوف بننے کے بعد پہلی بار وہ سوچ رہے تھے کہ وہ اب سالار سکندر کی کسی بات پر یقین نہیں کریں گے۔ وہ اسے عملی طور پر ہر معاملے کے بارے میں اندھیرے میں رکھیں گے ویسے ہی جیسے وہ کر رہا تھا۔

”اس کی امامہ سے جان بچان کیسے ہوئی؟“ سکندر عثمان نے اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹھٹھکتے ہوئے طیبہ سے پوچھا۔

”مجھے کیا پتا کہ اس کی جان بچان امامہ سے کیسے ہوئی۔ کوئی بچہ تو ہے نہیں کہ میری انگلی پکڑ کر چلا ہو۔“ طیبہ نے قدرے خشکی سے کہا۔

”میں نے تم سے بہت بار کہا تھا کہ اس پر نظر رکھا کرو مگر تم..... تمہیں اپنی ایکلوئیز سے فرصت ملے تو تم کسی اور کے بارے میں سوچو۔“

”اس پر توجہ دینا صرف میرا ہی فرض کیوں ہے۔“ طیبہ یک دم بھڑک اٹھیں۔ ”آپ کو بھی تو اپنی ایکلوئیز چھوڑ دینی چاہئیں۔ سالار امامہ میرے ہی سر کیوں۔“

”میں تم کو کوئی الزام نہیں دے رہا اور اس بحث کو ختم کرو۔ امامہ کے ساتھ شادی..... تم اندازہ

کر سکتی ہو کہ ہاشم مبین کو جب اس تعلق کا پتا چلے گا تو وہ کیا تماشاکر کریں گے۔ مجھے یہ سوچ کر شاک لگ رہا ہے کہ اس نے ایسی حرکت کرنے کا سوچ کیسے لیا۔ اسے بالکل بھی احساس نہیں ہو کہ ہماری اور ہماری فیملی کی سوسائٹی میں کتنی عزت ہے۔“ سکندر عثمان طیبہ کے قریب صوفے پر بیٹھے ہوئے بولے۔ ”ایک پر اہم شخص ہوتی ہے تو ہمارے لئے دوسری پر اہم شروع کر دیتا ہے۔ یہ سارا پھر اسی وقت شروع ہوا ہو گا جب پچھلے سال اس نے خود بخود کی کوشش کے بعد اس کی جان بچائی تھی۔ ہم بے وقوف تھے کہ ہم نے اس معاملے پر نظر نہیں رکھی، ورنہ شاید یہ سب بہت پہلے سامنے آ جاتا۔“ سکندر عثمان اپنی کینیسی مسلتے ہوئے کہنے لگے۔

”اور یقیناً یہ لڑکی بھی اس کے ساتھ اپنی مرضی سے انوالو ہوئی ہوگی ورنہ اس طرح کوئی کسی کے ساتھ مرضی کے خلاف تو نکاح نہیں کر سکتا اور ہاشم مبین احمد کو دیکھیں، وہ یوں شور مچا رہا ہے جیسے اس کی بیٹی کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، جو کیا ہے سالار نے ہی کیا ہے۔ انہوں نے تو ایف آئی آر بھی انوالو کی درج کروائی ہے۔“ طیبہ نے سر سے سے سٹگنے لگیں۔

”جو بھی ہے، قصور تمہارے بیٹے کا ہے۔ نہ وہ ایسے کاموں میں پڑتا نہ اس طرح پختہ۔ اب تو تم صرف یہ سوچو کہ تمہیں اس صورت حال سے کس طرح بچنا ہے۔“

”ابھی ہم اتنی بری طرح سے نہیں سمجھنے، جس طرح آپ سوچ رہے ہیں۔ اس پر یہ جرم ثابت نہیں ہوا۔ پولیس یا ہاشم مبین احمد کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے اور ثبوت کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتے۔“

”اور جس دن ان تک کوئی ثبوت کچھ گیا اس دن کیا ہو گا۔ تم نے یہ سوچا ہے۔“ سکندر عثمان نے کہا۔

”آپ پھر امکانات کی بات کر رہے ہیں۔ ایسا ہوا تو نہیں ہے اور ہو سکتا ہے..... ہو بھی نا۔“

”اس نے ہمیں اگر اتنا بڑا دھوکا دے دیا ہے تو ہو سکتا ہے ایک اور دھوکا یہ ہو کہ اس کا رابطہ اس لڑکی کے ساتھ نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ ابھی بھی اس لڑکی کے ساتھ رابطہ میں ہو۔“ سکندر عثمان کو خیال آیا۔

”ہاں ہو سکتا ہے۔ پھر کیا کیا جانے۔“

”میں اس سے بات کروں گا تو کچھ پتہ کے ساتھ اپنا سر پھوڑوں گا، وہ پھر جھوٹ بول دے گا، جھوٹ بولنے میں تو ماہر ہو چکا ہے۔“ انہوں نے تنفر آمیز لہجے میں کہا۔

”بس چند ماہ میں اس کا بی اے مکمل ہو جائے گا پھر میں اسے باہر بھجوا دوں گا۔ کم از کم ہر وقت ہاشم مبین احمد کی طرف سے جن اہم بیٹوں کا میں شکار رہتا ہوں وہ تو ختم ہوں گے۔“ انہوں نے سگریٹ کا ایک کش لگایا۔

”مگر آپ ایک چیز بھول رہے ہیں سکندر!“ طیبہ نے بڑی سنجیدگی سے چند لمحوں کی خاموشی کے

بعد کہا۔

”کیا؟“ سکندر نے انہیں چونک کر دیکھا۔

”سالار کی امامہ کی ساتھ خفیہ شادی۔۔۔ اس شادی کے بارے میں جو کچھ بھی کرنا ہے وہ آپ کو خود ہی کرنا ہے۔ آپ کیا کریں گے، اس شادی کے بارے میں۔“

”طلاق کے علاوہ اس شادی کا اور کیا کیا جاسکتا ہے۔“ سکندر عثمان نے قطعی لہجے میں کہا۔

”وہ شادی مانتے پر تیار نہیں ہے تو طلاق دینے پر رضامند ہو جائے گا۔“

”جب میں اسے ثبوت پیش کروں گا تو اسے اپنی شادی کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔“

”اور اگر شادی کا اعتراف کرنے کے بعد بھی اس نے امامہ کو طلاق دینے سے انکار کر دیا تو۔“

”کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا پڑے گا اور وہ میں نکال لوں گا۔ چاہے وہ اپنی مرضی سے اسے طلاق دے یا

پھر مجھے زبردستی کرنا پڑے۔ میں یہ معاملہ ختم کروں گا، اس طرح کی شادی انسان کو ساری عمر خوار کرتی

ہے۔ اس سے تو بچنا چھڑانا ہی پڑے گا، ورنہ میں اسے اس بار مکمل طور پر اپنا جائیداد سے عاق کر دینے کا

ارادہ رکھتا ہوں۔“ سکندر عثمان نے دونوں انداز میں کہا۔

☆.....☆.....☆

حسن کچھ دیر پہلے اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں تھا، جب اچانک اسے اپنے والد کی کال ملی، وہ

جلد از جلد اپنے گھر پہنچنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ ان کا لہجہ بے حد عجیب تھا مگر حسن نے توجہ نہیں دی،

لیکن جب پندرہ منٹ بعد اپنے گھر پہنچا تو پورے چالیس منٹ میں سکندر عثمان کی گاڑی دیکھ کر چونکا ہوا گیا۔ وہ

سالار کے گھر کی تمام گاڑیوں اور ان کے نمبرز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔

”سکندر انکل کو میرے اس معاملے میں انوار ہونے کے حوالے سے کوئی ثبوت نہیں ملے ہیں اس

لئے مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ سالار کا دوست سمجھ کر پوچھ گچھ کے

لئے آئے ہوں گے۔ میں بڑے اطمینان سے ان کی باتوں کا جواب دوں گا اور کسی بھی الزام کی تردید کر

دوں گا لیکن میری پریشانی پاپا کے سامنے میری پوزیشن مشکوک کر دے گی، اس لئے انکل سکندر کو دیکھ کر

مجھے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کرنا چاہئے۔“ اس نے پہلے اپنا لائحہ عمل طے کیا اور پھر بڑے اطمینان کے ساتھ

اسٹڈی میں داخل ہو گیا۔ اس کے والد قاسم فاروقی اور سکندر عثمان کافی پی رہے تھے، لیکن ان کے

چہرے کی غیر معمولی سنجیدگی اور اضطراب وہ ایک لمحے میں بھانپ گیا تھا۔

”کیسے ہیں انکل سکندر آپ اس بار بہت دنوں کے بعد آپ ہماری طرف آئے۔“ باوجود اس

کے کہ سکندر یا قاسم نے اس کی ہیلو کا جواب نہیں دیا۔ حسن نے بہت بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ اسے اس بار

بھی جواب نہیں ملا تھا۔ سکندر عثمان اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔

”بھئیو۔“ قاسم فاروقی نے قدرے درشتی سے کہا۔

”سکندر تم سے کچھ باتیں پوچھنے آیا ہے تمہیں ہر بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا ہے۔ اگر تم نے

جھوٹ بولا تو میں سکندر سے کہہ چکا ہوں کہ وہ تمہیں پولیس کے پاس لے جائے۔ میری طرف سے تم بھڑ

میں جاؤ۔ میں تمہیں کسی بھی طرح بچانے کی کوشش نہیں کروں گا۔“

قاسم فاروقی نے اس کے بیٹھنے ہی با تمہید کہا۔

”پاپا! آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔“ حسن نے حیرت کا مظاہرہ کیا مگر اس کا

دل دھڑکنے لگا تھا۔ معاملہ اتنا سیدھا نہیں تھا جتنا اس نے سمجھ لیا تھا۔

”اور اسرارٹ بننے کی کوشش مت کرو۔ سکندر اچھو اس سے، کیا پوچھنا چاہتے ہو اور میں دیکھتا

ہوں یہ کیسے جھوٹ بولتا ہے۔“

”امامہ کے ساتھ سالار کی شادی میں شرکت کی ہے تم نے؟“

”انکل..... آپ..... آپ کیا بات کر رہے ہیں..... کون سی شادی..... کبھی شادی.....“ حسن

نے مزید حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”وہی شادی جو میری عدم موجودگی میں میرے گھر پر ہوئی جس کے لئے امامہ کو بیچ کر بھجوانے

کئے تھے۔“

”پلیز انکل! آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔ آپ کے گھر میں ضرور آتا جاتا رہتا ہوں مگر مجھے

سالار کی کسی شادی کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے اور نہ ہی میری معلومات کے مطابق اس نے شادی کی

ہے۔ مجھے تو اس لڑکی کا بھی پتا نہیں ہے، جس کا آپ نام لے رہے ہیں..... ہو سکتا ہے سالار کی کسی

لڑکی کے ساتھ انوار منٹ ہو، مگر میں اس کے بارے میں نہیں جانتا، وہ ہر بات مجھے نہیں بتاتا۔“

سکندر عثمان اور قاسم فاروقی خاموشی سے اس کی بات سنتے رہے۔ وہ خاموش ہوا تو سکندر عثمان

نے اپنے سامنے ٹیبل پر پڑا ہوا ایک لٹاف اٹھایا اور اس میں موجود چند کاغذ نکال کر اس کے سامنے رکھ

دئے۔ حسن کا رنگ کبلی بار آڑا، وہ امامہ و سالار کا نکاح نامہ تھا۔

”اس پر دیکھو۔ تمہارے ہی signatures ہیں نا۔“ سکندر نے سر دلیجے میں پوچھا۔ اگر یہ سوال

انہوں نے قاسم فاروقی کے سامنے نہ کیا ہوتا تو وہ ان دستخط کو اپنے دستخط ماننے سے انکار کر دیتا مگر اس

وقت وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

”یہ میرے signatures ہیں، مگر میں نے نہیں کئے۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”پھر کس نے کئے ہیں، تمہارے فرشتوں نے یا سالار نے۔“ قاسم فاروقی نے طنز لہجے میں کہا۔

حسن کچھ بول نہیں سکا۔ وہ جو اس بائیس ساہاری باری انہیں دیکھنے لگا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا

کہ سکندر عثمان اس طرح اس کے سامنے وہ نکاح نامہ نکال کر رکھ دیں گے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ انہوں نے وہ نکاح نامہ کہاں سے حاصل کیا تھا، سالار سے یا پھر..... اس کی ساری حلقہ بندی اور چالاکا دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

”تم یہ نہیں مانو گے کہ سالار کا امامہ کے ساتھ نکاح تمہاری موجودگی میں ہوا ہے۔“ قاسم فاروقی نے اکھڑے ہوئے لہجہ میں اس سے کہا۔

”پاپا! اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ سب سالار کی ضد پر ہوا تھا، اس نے مجھے مجبور کیا تھا۔“ حسن نے یکدم سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کچھ بھی چھپانے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ جھوٹ بولنا تو اپنی پوزیشن اور خراب کرتا۔

”میں نے اسے بہت سمجھایا تھا مگر.....“

قاسم فاروقی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس وقت یہاں تمہیں صفائیاں اور وضائیاں پیش کرنے کے لئے نہیں بلایا۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اس لڑکی کو اس نے کہاں رکھا ہوا ہے؟“

”پاپا! مجھے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔“ حسن نے تیزی سے کہا۔

”تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔“

”آئی سو بیڑا پاپا! مجھے واقعی کچھ پتا نہیں ہے۔ وہ اسے لاہور چھوڑ آیا تھا۔“

”یہ جھوٹ تم کسی اور سے بولنا، مجھے صرف سچ بتاؤ۔“ قاسم فاروقی نے ایک بار پھر اسی تند و تیز لہجے میں کہا۔

”میں جھوٹ نہیں بول رہا پاپا!“ حسن نے احتجاج کیا۔

”لاہور کہاں چھوڑ آیا تھا؟“

”کسی سڑک پر۔ اس نے کہا تھا کہ وہ خود چلی جائے گی۔“

”تم مجھے یا سکندر کو بے وقوف سمجھ رہے ہو، اس نے اس لڑکی سے شادی کی اور پھر اسے ایک سڑک پر چھوڑ دیا۔ بے وقوف مت بناؤ ہمیں۔“ قاسم فاروقی ہلکا ہلکا لہجے میں کہنے لگا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں پاپا! اس نے کم از کم مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ اس لڑکی کو سڑک پر چھوڑ آیا تھا۔“

”تم نے اس سے پوچھا نہیں کہ پھر اس نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کی کیوں، اگر اسے یہی کرنا تھا۔“

”پاپا! اس نے یہ شادی اس لڑکی کی مدد کے لئے کی تھی۔ اس کے گھر والے زبردستی اس کی شادی کسی لڑکے سے کرنا چاہتے تھے وہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سالار سے رابطہ کیا اور مدد مانگی اور سالار اس کی مدد پر تیار ہو گیا۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ سالار واقعی طور پر اس سے نکاح کر لے تاکہ اگر اس کے

والدین زبردستی اس کی شادی کرنا چاہیں تو وہ اس نکاح کا تارا نہیں روک سکے۔“

حسن اب سچائی پر پردہ نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس نے پوری بات بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

”اور اگر ضرورت پڑے تو بیاب کے ذریعے اس کو رہائی دلائی جاسکے مگر یہ کوئی محبت و غیرت کی شادی نہیں تھی۔ وہ لڑکی ویسے بھی کسی اور لڑکے کو پسند کرتی تھی۔ آپ اس نکاح نامے کو دیکھیں تو اس میں بھی اس نے طلاق کا حق پہلے ہی لے لیا ہے، تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ سالار سے رابطہ کئے بغیر ہی طلاق حاصل کر لے۔“

”بس یا کچھ اور؟“ قاسم فاروقی نے اس سے کہا۔ حسن کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔

”میں قطعاً تمہاری کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ تم نے بہت اچھی کہانی بتائی ہے مگر میں کوئی پچ نہیں ہوں کہ اس کہانی پر یقین کر لوں۔ تمہیں اب امامہ تک پہنچنے میں سکندر کی مدد کرنی ہے۔“ قاسم فاروقی نے قطعی لہجے میں کہا۔

”پاپا! میں یہ کیسے کر سکتا ہوں۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔“ حسن نے احتجاج کیا۔

”تم یہ کیسے کرو گے۔ یہ تم خود جان سکتے ہو۔ مجھے صرف یہ بتانا تھا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔“

”پاپا پلیز، آپ مجھ پر یقین کریں، میں امامہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ نکاح کروانے کے علاوہ میں نے اور کچھ نہیں کیا۔“ حسن نے کہا۔

”تم اس کے اگلے قریب ہو کہ اپنی خفیہ شادی میں وہ تمہیں گواہ کے طور پر لے رہا ہے مگر تمہیں یہ نہیں پتا کہ اس کی بیوی گھر سے بھاگنے کے بعد اب کہاں ہے۔ میں یہ ماننے پر تیار نہیں ہوں حسن! کسی صورت میں بھی نہیں۔“ قاسم فاروقی نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”تمہیں اگر پتا نہیں ہے تو بھی تم اس کا پتا کرواؤ..... کہ وہ کہاں ہے۔ سالار تم سے کچھ نہیں چھپائے گا۔“

”پاپا! وہ بہت سی باتیں مجھے بھی نہیں بتا جا۔“

”وہ سب باتیں تمہیں بتانا ہے یا نہیں، میں فی الحال صرف ایک چیز میں دلچسپی رکھتا ہوں اور وہ امامہ کے بارے میں معلومات ہیں۔ تم ہر طریقے سے اس سے امامہ کا پتا حاصل کرو اور سالار کو کسی بھی طرح یہ پتا نہیں چلنا چاہئے کہ سکندر کو اس کی شادی کی اطلاع مل چکی ہے، یا اس نے اس سلسلے میں تم سے کوئی ملاقات کی ہے۔ اگر مجھے یہ پتا چلا کہ سالار یہ بات جان گیا ہے تو میں تمہارا کیا مشر کروں گا یہ تمہیں یاد رکھنا چاہئے۔ میں سکندر کو تو پہلے ہی اجازت دے چکا ہوں کہ وہ ہاشم بنین کو تمہارا نام دے دے، اس کے بعد ہاشم بنین تمہارے ساتھ پولیس کے ذریعے نینے یا کسی اور طریقے سے، میں بالکل پروا نہیں کروں گا۔ اب تم یہ طے کر لو کہ تم نے سالار کے ساتھ دوستی بھائی ہے یا پھر اس گھر میں رہتا ہے۔“ قاسم

فاروقی نے تقلید سے کہا۔

”پاپا! میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح امامہ کے بارے میں کچھ معلومات مل جائیں۔ میں سالار سے اس کے بارے میں بات کروں گا۔ میں اسے یہ نہیں بتاؤں گا کہ سکندر اکل کو اس سارے معاملے کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔“ وہ میکانگی انداز میں دہراتا جا رہا تھا۔

وہ اس بار واقعی بری طرح اور خائف توقع پھنسا تھا۔

☆.....☆.....☆

سالار چند دن گھر بیٹھا رہا تھا مگر پھر ضد کر کے اس نے کانٹ چاٹا شروع کر دیا۔ ہاشم مبین اور اس کے گھر والے امامہ کی تلاش میں زمین آسمان ایک کئے ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ یہ سب کچھ بڑی رازداری کے ساتھ کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے ملازمین اور پولیس کے ذریعے سکندر کو ان کی کوششوں کی خبر مل رہی تھی۔ وہ لاہور میں بھی امامہ کی ہر اس کبتلی سے رابطہ کر رہے تھے جسے وہ جانتے تھے۔

سالار نے ایک دن اخبار میں باہر جاوید نامی ایک شخص کا خاکہ دیکھا۔ اس کے بارے میں معلومات دینے والے کے لئے انعام کا اعلان تھا۔ وہ اس نام سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہی وہ فرضی نام تھا جو حسن نے وکیل کو امامہ کے شوہر کا دیا تھا اور وہ اشتیاق یقیناً امامہ کے گھر والوں کی طرف سے تھا حالانکہ نیچے دیا گیا فون نمبر امامہ کے گھر کا نہیں تھا، وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ پولیس اس وکیل کے پاس پہنچ گئی ہوگی اور اس کے بعد اس وکیل نے اس آدمی کے کوائف انہیں بتائے ہوں گے۔ اب یہ حقیقت صرف وہ وکیل، حسن اور خود وہ جانتا تھا کہ باہر جاوید سر سے کوئی وجود نہیں رکھتا مگر وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ ہاشم مبین کے گھر والوں کو کسی حد تک بھگانے میں کامیاب رہا تھا۔

اس پورے عرصہ کے دوران سالار، امامہ کی کال کا منتظر رہا۔ اس نے کئی بار امامہ کو اس کے موبائل پر کال بھی کیا مگر ہر بار اسے موبائل آف ملتا۔ اسے یہ تجسس ہو رہا تھا کہ وہ کہاں تھی۔ اس تجسس کو ہوا دینے میں کچھ ہاتھ حسن کا بھی تھا جو بار بار اس سے امامہ کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا، بعض دفعہ وہ چڑھتا۔

”مجھے کیا پتا کہ وہ کہاں ہے اور مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کر رہی۔ بعض دفعہ مجھے لگتا ہے اسے مجھ سے زیادہ تمہیں دلچسپی ہے۔“

اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ حسن کا یہ تجسس اور دلچسپی کسی مجبوری کی وجہ سے تھی۔ وہ بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ سالار کا خیال تھا کہ امامہ اب تک جلال کے پاس جا چکی ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے شادی بھی کر چکی ہو اگرچہ اس نے امامہ سے جلال کی شادی کے بارے میں جھوٹ بولا تھا مگر اسے یقین تھا کہ امامہ نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا ہوگا۔ وہ اس کے پاس دوبارہ ضرور گئی ہوگی۔ خود سالار

بھی چاہتا تھا کہ وہ خود جلال سے رابطہ قائم کرے یا پھر ذاتی طور پر جا کر ایک بار اس سے ملے۔ وہ چاہتا تھا کہ امامہ اس کے ساتھ رہ رہی ہے یا نہیں، مگر فی الحال یہ دونوں کام اس کے لئے ناممکن تھے۔ سکندر عثمان مسلسل اس کی گھرائی کر رہا ہے تھے اور وہ اس بات سے بھی واقف تھا کہ وہ یہ گھرائی کروانے والے واحد نہیں ہیں۔ ہاشم مبین احمد بھی یہی کام کر رہا ہے تھے اور اگر وہ لاہور جانے کا ارادہ کرتا تو ذرا تو سکندر عثمان اسے جانے ہی نہ دیتے اور بالفرض جانے کی اجازت دے بھی دیتے تو شاید خود بھی اس کے ساتھ چل پڑتے اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس سارے معاملے میں اس کی دلچسپی کم سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اب یہ سب کچھ ایک حماقت لگ رہا تھا۔ ایسی حماقت جو اسے کافی مہنگی پڑ رہی تھی۔ سکندر اور طیبہ اب ہمہ وقت گھر پر رہتے تھے اور اسے کہیں بھی جانے کے لئے ان سے باقاعدہ اجازت یعنی پڑتی تھی حسن اس سے اب کم کم ملنے لگا تھا۔ وہ اس کی وجہ بھی نہیں جانتا تھا۔ اس صورت حال سے وہ بہت بے یار و مددگار تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ اس رات گھپوٹر پر بیٹھا تھا جب اس کے موبائل پر ایک کال آئی۔ اس نے کی بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے لاہور والی سے موبائل اٹھا کر دیکھا اور پھر اسے ایک بھونکا لگا تھا۔ اسکرین پر موجود نمبر اس کے اپنے موبائل کا تھا۔ امامہ اسے کال کر رہی تھی۔

”تو بالآخر آپ نے ہمیں یاد کر لی۔“ اس نے بے اختیار سینی بھائی۔ اس کا موبائلک دم فریش ہو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے والی بورت بکسر عائب ہو گئی تھی۔

”میں تو سمجھ بیٹھا تھا کہ اب تم مجھے کبھی کال نہیں کرو گی۔ اتنا لمبا عرصہ لگا دیا تم نے۔“ رسمی ملکہ سلیک کے بعد اس نے پوچھا۔

”میں بہت دنوں سے تمہیں فون کرنا چاہ رہی تھی مگر نہیں پاری تھی۔“ دوسری طرف سے امامہ نے کہا۔

”کیوں، ایسی کیا مجبوری آگئی تھی۔ فون تو تمہارے پاس موجود تھا۔“ سالار نے کہا۔

”بس کوئی مجبوری تھی۔“ اس نے مختصر کہا۔

”تم اس وقت کہاں ہو؟“ سالار نے کچھ تجسس آمیز انداز میں پوچھا۔

”بچکانہ سوال مت کرو سالار! جب تم جانتے ہو کہ میں تمہیں یہ نہیں بتاؤں گی تو پھر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”بھیرے گھر والے کیسے ہیں؟“

سالار کچھ حیران ہوا۔ اسے امامہ سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

”بالکل ٹھیک ہیں، خوش و خرم ہیں، پیش کر رہے ہیں۔“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ”تم واقعی بہت اچھی بیٹی ہو، گھر سے جا کر بھی تمہیں گھر اور گھر والوں کا کتنا خیال ہے۔ ہاؤنکس۔“
دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی پھر امامہ نے کہا۔ ”وہیم کیسا ہے؟“
”یہ تو میں نہیں بتا سکتا مگر میرا خیال ہے ٹھیک ہی ہو گا۔ وہ خراب کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس کے انداز اور لہجے میں اب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

”انہیں یہ تو پتا نہیں چلا کہ تم نے میری مدد کی تھی؟“ سالار کو امامہ کا لہجہ کچھ عجیب لگا۔

”پتا لگا۔۔۔؟ مائی ڈیئر امامہ! پولیس اسی دن میرے گھر پہنچ گئی تھی جس دن میں تمہیں لاہور چھوڑ کر آیا تھا۔“ سالار نے کچھ استہزاء سے انداز میں کہا۔ ”تمہارے فادر نے میرے خلاف ایف آئی آر کوا دی تھی تمہیں انخا کرنے کے سلسلے میں۔“ وہ ہنسا۔ ”ڈرا سو پو میرے جیسا بندہ کسی کو انخا کر سکتا ہے اور وہ بھی تمہیں۔۔۔ جو کسی بھی وقت کسی کو شوٹ کر سکتی ہے۔“

اس کے لہجے میں اس بار مٹھ تھا۔ ”تمہارے فادر نے پوری کوشش کی ہے کہ میں جیل پہنچ جاؤں اور باقی کی زندگی وہاں گزاروں مگر بس میں کچھ خوش قسمت واقع ہوا ہوں کہ بچ گیا ہوں۔ گھر سے کالج تک میری نگرانی کی جاتی ہے۔ ڈمب کالز ملتی ہیں اور بھی بہت کچھ ہو رہا ہے۔ اب تمہیں کیا کیا تاؤں۔ بہر حال تمہاری فلیٹی ہمیں خاصا مزاج کر رہی ہے۔“ اس نے جتانے والے انداز میں کہا۔

”میں نہیں جانتی تھی کہ وہ تم تک پہنچ جائیں گے۔“ اس بار امامہ کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ ”میرا خیال تھا کہ انہیں کسی بھی طرح تم پر شک نہیں ہو گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں اتنے پرالہز کا سامنا کرنا پڑا ہے۔“

”واقعی تمہاری وجہ سے مجھے بہت سے پرالہز کا سامنا کرنا پڑا ہے۔“

”میری کوشش تھی کہ میں پہلے خود کو محفوظ کر لوں پھر ہی تمہیں فون کروں اور اب میں واقعی

محفوظ ہوں۔“

سالار نے کچھ تجسس آمیز دلچسپی کے ساتھ اس کی بات سنی۔ ”تمہارا موبائل میں اب استعمال نہیں کروں گی اور میں اسے واپس بھیجنا چاہتی ہوں، مگر میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔“ وہ اسے بتا رہی تھی۔ ”میں تمہیں کچھ پیسے بھی بھجواؤں گی۔ ان تمام اخراجات کے لئے جو تم نے میرے لئے کئے۔“
سالار نے اس بار اس کی بات کاٹی۔ ”نہیں، پیسے رہنے دو۔ مجھے ضرورت نہیں ہے۔ موبائل کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس دوسرا ہے۔ تم چاہو تو اسے استعمال کرتی رہو۔“

”نہیں، میں اب اسے استعمال نہیں کروں گی۔ میری ضرورت ختم ہو چکی ہے۔“

اس نے کہا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ تم اب مجھے طلاق کے

بچے زنجبجو اور اور طلاق کے بچے زکے ساتھ نکاح نامہ کی ایک کاپی بھی جو میں پہلے تم سے نہیں لے سکی۔“
”کہاں بھجواؤں؟“ سالار نے اس کے مطالبے کے جواب میں کہا۔ اس کے ذہن میں یک دم ایک جھماکا ہوا تھا۔ وہ اگر اب طلاق کا مطالبہ کر رہی تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے ابھی تک کسی سے شادی نہیں کی تھی نہ ہی طلاق کے اس حق کو استعمال کیا تھا، جو نکاح نامہ میں وہ اس کی خواہش پر اسے تصدیق کر چکا تھا۔

”تم اسی وکیل کے پاس وہ بچے زنجبجو اور جس کو تم نے ہائر کیا تھا اور مجھے اس کا نام اور پتا لکھوادو، میں وہ بچے زاس سے لے لوں گی۔“

سالار مسکرایا۔ وہ بے حد محتاط تھی۔ ”مگر میرا تو اس وکیل کے ساتھ ڈائریکٹ کوئی رابطہ نہیں ہے۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں ہوں پھر بچے زاس تک کیسے پہنچاؤں۔“

”جس دوست کے ذریعے تم نے اس وکیل سے رابطہ کیا تھا اسی دوست کے ذریعے وہ بچے زاس تک پہنچا دو۔“ یہ تو طے تھا کہ وہ اسے کسی بھی طرح اپنا کوئی اتا پتا نہ دینے کا فیصلہ کر چکی تھی اور اس پر پوری طرح قائم تھی۔

”تم طلاق لینا کیوں چاہتی ہو؟“ وہ اس وقت بہت موڑ میں تھا۔

دوسری طرف یک دم خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ اس سے اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

”طلاق کیوں لینا چاہتی ہوں؟ تم کتنی عجیب بات کر رہے ہو۔ یہ تو پہلے ہی طے تھا کہ میں تم سے طلاق لوں گی پھر اس سوال کی کیا تک بنتی ہے۔“ امامہ کے لہجے میں حیرانی تھی۔

”وہ جب کی تھی، اب تو خاصا لمبا وقت گزر گیا ہے اور میں تمہیں طلاق دینا نہیں چاہتا۔“ سالار نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ دوسری طرف اس وقت امامہ کے بیروں کے نیچے سے حقیقتاً زمین نکل گئی ہو گی۔

”تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں یہ کہہ رہا ہوں امامہ ڈیئر اکہ میں تمہیں طلاق دینا نہیں چاہتا، نہ ہی دوں گا۔“ اس نے ایک اور ڈھماکا کیا۔

”تم۔۔۔ تم طلاق کا حق پہلے ہی مجھے دے چکے ہو۔“ امامہ نے بے اختیار کہا۔

”ب کہاں۔۔۔ کس وقت۔۔۔ کس صدی میں۔“ سالار نے اطمینان سے کہا۔

”تمہیں یاد ہے، میں نے نکاح سے پہلے تمہیں کہا تھا کہ نکاح نامے میں طلاق کا حق چاہتی ہوں میں۔ اب اگر تم طلاق نہیں دیتے تو میں خود ہی وہ حق استعمال کر سکتی ہوں۔ تمہیں یہ یاد ہونا چاہئے۔“
وہ جتا رہی تھی۔

”اگر میں تمہیں یہ حق دیتا تو تم یہ حق استعمال کر سکتی تھی مگر میں نے تمہیں ایسا کوئی حق دیا ہی نہیں۔ تم نے نکاح نامہ دیکھا وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ خیر تم نے دیکھا ہی ہو گا ورنہ آج طلاق کی بات کیوں کر رہی ہو تھی۔“

دوسری طرف ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ سالار نے ہوا میں تیر چلایا تھا مگر وہ نشانے پر بیٹھا تھا۔ امام نے یقیناً بچے زسائن کرتے ہوئے انہیں دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ سالار بے حد مخلوط ہو رہا تھا۔

”تم نے مجھے دعو کا دیا۔“ بہت دیر بعد اس نے امام کو کہتے سنا۔

”ہاں، بالکل اسی طرح جس طرح تم نے بدل دکھا کر مجھے دعو کا دیا۔“ وہ برحسگی سے بولا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ تم اور میں بہت اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔ ہم دونوں میں اتنی برائیاں اور اتنی خامیاں ہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو مکمل طور پر complement کرتے ہیں۔“ وہ اب ایک بار پھر سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”زندگی۔۔۔ سالار! زندگی اور تمہارے ساتھ۔۔۔ یہ ناممکن ہے۔“ امام نے تند لہجے میں کہا۔

”مجھے یونین کی بات ذہن پرانی چاہئے کہ میری دشمنی میں ناممکن کا لفظ نہیں ہے یا مجھے تم سے یہ ریکویسٹ کرنی چاہئے کہ آؤ اس ناممکن کو مل کر ممکن بنائیں۔“ وہ اب مذاق ڈڑا رہا تھا۔

”تم نے مجھ پر بہت احسان کئے ہیں، ایک احسان اور کرو۔ مجھے طلاق دے دو۔۔۔۔۔“

”نہیں، میں تم پر احسان کرتے کرتے تھک گیا ہوں، اب اور نہیں کر سکتا اور یہ والا احسان۔۔۔ یہ تو ناممکن ہے۔“ سالار ایک بار پھر سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”میں تمہاری چاپ کی لڑکی نہیں ہوں سالار! تمہارا اور میرا لائف اسٹائل بہت مختلف ہے، ورنہ شاید میں تمہاری پیشکش پر غور کرتی مگر اب اس صورت میں یہ ممکن نہیں ہے۔ تم پلیز، مجھے طلاق دے دو۔“

وہ اب نرم لہجے میں کہہ رہی تھی۔ سالار کا دل بے اختیار ہنسنے کو چاہا۔

”تم اگر میری پیشکش پر غور کرنے کا وعدہ کرو تو میں اپنا لائف اسٹائل بدل لینا ہوں۔“ سالار نے اسی انداز میں کہا۔

”تم مجھے کی کوشش کرو، تمہاری اور میری ہر چیز مختلف ہے۔ زندگی کی فلاسفی ہی مختلف ہے۔ ہم دونوں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔“ اس بار وہ جھنجھائی تھی۔

”نہیں۔۔۔ نہیں میری اور تمہاری فلاسفی آف لائف بہت ملتی ہے۔ تمہیں اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر یہ ملتی نہ بھی ہوئی تو بھی ذرا سے ایڈجسٹمنٹ کے بعد ملنے لگے گی۔“

وہ اس طرح بولا جیسے اپنے بہترین دوست سے گفتگو کر رہا ہو۔

”ویسے بھی مجھ میں کمی کیا ہے۔ میں تمہارے پرانے منگیتر امجد جیسا خوب صورت نہ سہی مگر

جلال انصر جیسا معمولی شکل و صورت کا بھی نہیں ہوں۔ میری فیملی کو تم اچھی طرح جانتی ہو۔ کیرئیر میرا کتنا برا ہے ہو گا، اس کا تمہیں اندازہ ہے۔ میں ہر لحاظ سے جلال سے بہتر ہوں۔“ وہ اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ٹانچ رہی تھی۔ وہ امام کو بری طرح زچ کر رہا تھا اور وہ ہو رہی تھی۔

”میرے لئے کوئی بھی شخص جلال جیسا نہیں ہو سکتا اور تم۔ تم تو کسی صورت بھی نہیں۔“ اس کی آواز میں پچلی بار نمایاں خشکی تھی۔

”کیوں؟“ سالار نے بے حد مصومیت سے پوچھا۔

”تم مجھے اچھے نہیں لگتے ہو۔ آخر تم یہ بات کیوں نہیں سمجھتے۔ دیکھو، تم نے اگر مجھے طلاق نہ دی تو میں کورٹ میں چلی جاؤں گی۔“ وہ اب اسے دھمکا رہی تھی۔ سالار اس کی بات پر بے اختیار ہنسا۔

”یو آر موسٹ ویلکم۔ جب چاہیں جائیں۔ کورٹ سے اچھی جگہ میل ملاقات کے لئے اور کون سی ہوگی۔ آئے سامنے کھڑے ہو کر بات کرنے کا مزہ ہی اور ہو گا۔“ وہ مخلوط ہو رہا تھا۔

”ویسے تمہیں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ کورٹ میں صرف میں نہیں پہنچوں گا، بلکہ تمہارے پش بھی پہنچیں گے۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

”سالار! میرے لئے پہلے ہی بہت سے پراہم ہیں تم ان میں اضافہ نہ کرو۔ میری زندگی بہت مشکل ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ کم از کم تم تو میری مشکلات کو مت بڑھاؤ۔“

اس بار امام کے لہجے میں رنجیدگی اور بے چارگی تھی۔ وہ کچھ اور مخلوط ہوا۔

”میں تمہارے مسائل میں اضافہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ مائی ڈیئر! میں تو تمہاری بہن ہوں میں گھل رہا ہوں، تمہارے مسائل کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم خود سوچو، میرے ساتھ رہو کہ تم کتنی اچھی اور مخلوط زندگی گزار سکتی ہو۔“ وہ اظہار بڑی سنجیدگی سے بولا۔

”تم جانتے ہو نا، میں نے اتنی مشکلات کس لئے سہی ہیں۔ تم سمجھتے ہو، میں ایک ایسے شخص کے ساتھ رہنے پر تیار ہو جاؤں گی جو ہر وہ کبیرہ گناہ کرتا ہے جسے میرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناپسند کرتے ہیں۔ نیک عورتیں نیک مردوں کے لئے ہوتی ہیں اور بری عورتیں برے مردوں کے لئے۔ میں نے زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہیں مگر میں اتنی بری نہیں ہوں کہ تمہارے جیسا برآمد میری زندگی میں آئے۔ جلال مجھے نہیں ملا مگر میں تمہارے ساتھ بھی زندگی نہیں گزاروں گی۔“ اس نے بے حد تلخ انداز میں تمام لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

”شاید اسی لئے جلال نے بھی تم سے شادی نہیں کی، کیونکہ نیک مردوں کے لئے نیک عورتیں ہوتی ہیں، تمہارے جیسی نہیں۔“

سالار نے اسی ٹکڑا توڑا انداز میں جواب دیا۔

دوسری طرف خاموشی رہی۔ اتنی لمبی خاموشی کہ سالار کو اسے مخاطب کرنا پڑا۔ ”ہیلو۔ تم سن رہی ہو؟“

”سالار! مجھے طلاق دے دو۔“ اسے امامہ کی آواز بھڑائی ہوئی تھی۔ سالار کو ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔

”تم کورٹ میں جا کر لے لو، جیسے تم مجھ سے کہہ چکی ہو۔“ سالار نے تڑکی پہ تڑکی کہا اور دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔

حسن نے ان چند ماہ میں سالار سے امامہ کے بارے میں جاننے کی بے حد کوشش کی تھی (حسن کے اپنے بیان کے مطابق) مگر وہ ناکام رہا تھا۔ وہ اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھے کہ سالار اور امامہ کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا۔ سالار کی طرح خود انہوں نے موبائل پر بار بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔

سکندر نے سالار کو امریکہ میں مختلف یونیورسٹیز میں اپنائی کرنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کا ایڈمیٹریک ریکارڈ ایسا تھا کہ کوئی بھی یونیورسٹی اسے لینے میں خوشی محسوس کرے گی۔

امامہ نے سالار کو دوبارہ فون نہیں کیا تھا حالانکہ سالار کا خیال تھا کہ وہ اسے دوبارہ فون کرے گی اور جب وہ اسے بتا دے گا کہ وہ اسے نکاح نامے میں پہلے ہی طلاق کا حق دے چکا ہے اور وہ نکاح نامے کی کاپی بھی اس کے حوالے کر دے گا۔ وہ اس سے یہ بھی کہہ دے گا کہ اس نے اس کے ساتھ صرف ایک مذاق کیا تھا مگر امامہ نے دوبارہ اس سے رابطہ قائم نہیں کیا، نہ ہی سالار نے اپنے پیچھے زمین اس نکاح نامے کو دوبارہ دیکھنے کی زحمت کی، اور نہ وہ بہت پہلے وہاں اس کی عدم موجودگی سے واقف ہو جاتا۔

جس دن وہ آخری بار پیچھے دے کر واپس گھر آیا۔ سکندر عثمان کو اس نے اپنا منظر پایا۔

”تم اپنا سامان بیک کر لو، آج رات کی فلائٹ سے تم امریکہ جا رہے ہو، کامران کے پاس۔“

”کیوں بیٹا اس طرح اچانک۔۔۔ سب کچھ ٹھیک تو ہے؟“

”تمہارے علاوہ سب کچھ ٹھیک ہے۔“ سکندر نے تکی سے کہا۔

”مگر پھر آپ مجھے اس طرح اچانک کیوں بھیج رہے ہیں؟“

”یہ میں تمہیں رات کو ایئر پورٹ چھوڑنے کے لئے جانتے ہوئے بتاؤں گا۔ فی الحال تم جا کر اپنا سامان بیک کرو۔“

”پاپا بیٹا! آپ مجھے بتائیں آپ اس طرح مجھے کیوں بھجوا رہے ہیں؟“ سالار نے کمزور احتجاج کیا۔

”میں نے کہا میں تمہیں بتا دوں گا۔ تم جا کر اپنا سامان بیک کرو، ورنہ میں تمہیں سامان کے بغیر ہی

ایئر پورٹ چھوڑ آؤں گا۔“

سکندر نے اسے دھمکیاں دیں کچھ دیر نہیں دیکھا رہا پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اپنا سامان بیک کرتے ہوئے اُلٹھے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ سکندر عثمان کے اس اچانک فیصلے کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس نے اپنی دراز کھول کر اپنے پیچڑ نکالنا شروع کر دیئے۔ وہاں نکاح نامہ نہیں تھا۔ اسے ان کے اس فیصلے کی کچھ آگئی تھی اور اسے بچھتا ہوا کہ اس نے نکاح نامے کو اتنی لاپرواہی سے وہاں کیوں رکھا تھا۔ وہ نکاح نامہ سکندر عثمان کے علاوہ کسی اور کے پاس ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ ان کے علاوہ کوئی اور اس کے کمرے میں آنے اور اس کی دراز کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے ذہن میں اب کوئی اُلٹھن نہیں تھی۔ اس نے بڑی خاموشی کے ساتھ اپنا سامان بیک کیا۔ وہ اب صرف یہ سوچ رہا تھا سکندر عثمان سے ایئر پورٹ جاتے ہوئے کیا بات کرے گا۔

رات کو ایئر پورٹ چھوڑنے کے لئے صرف سکندر اس کے ساتھ آئے تھے، طیبہ نہیں۔ ان کا لہجہ اور انداز بے حد روکھا اور خشک تھا۔ سالار نے بھی اس بار کوئی سوال نہیں کیا۔ ایئر پورٹ جاتے ہوئے سکندر عثمان نے اپنا ہریف کیس کھول کر ایک سادہ کاغذ اور قلم نکالا اور ہریف کیس کے اوپر رکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”اس پر سائن کر دو۔“

”یہ کیا ہے؟“ سالار نے حیرانی سے اس سادہ کاغذ کو دیکھا۔

”تم صرف سائن کرو، سوال مت کرو۔“ انہوں نے بے حد روکھے انداز میں کہا۔ سالار نے مزید کچھ کہے بغیر ان کے ہاتھ میں پکڑا ہوا قلم لے کر اس کاغذ پر سائن کر دیئے۔ سکندر نے اس کاغذ کو تہہ کر کے ہریف کیس میں رکھا اور ہریف کیس کو دوبارہ بند کر دیا۔

”جو کچھ تم کر چکے ہو، اس کے بعد تم سے کچھ کہنا یا کوئی بات کرنا بے کار ہے۔ تم مجھ سے ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا جھوٹ بولتے رہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ مجھے تو کبھی حقیقت کا پتہ ہی نہیں چلے گا۔ میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ تمہیں امریکہ بھیجنے کے بجائے ہاشم مبین احمد کے حوالے کر دوں تاکہ تمہیں اندازہ ہو اپنی حماقت کا، مگر میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں تمہارا باپ ہوں، مجھے تمہیں بچانا ہی ہے۔ تم میری اس مجبوری کا آج تک فائدہ اٹھاتے رہے ہو مگر آئندہ نہیں اٹھا سکو گے۔ میں تمہارا نکاح نامہ

امامہ کے حوالے کر دوں گا اور اگر مجھے دوبارہ کبھی یہ بتا چلا کہ تم نے اس سے رابطہ کیا ہے یا رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو تو میں اس بار جو کروں گا تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ تم میرے لئے کافی

مہینہ نہیں کھڑی کر چکے ہو، اب ان کا سلسلہ بند ہو جانا چاہئے سمجھتے تم۔“

انہوں نے اکڑے ہوئے لہجہ میں کہا۔ وہ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کے انداز میں عجیب طرح کی لاپرواہی اور اطمینان تھا۔ سکندر عثمان بے اختیار سگے۔ یہ ان کا وہ بیٹا تھا جو ۱۵۰+ کا آئی کیور تھا تھا۔ کیا کوئی کہہ سکتا تھا کہ وہ سرے سے کوئی آئی کیور نکلتا بھی تھا یا نہیں۔

☆.....☆.....☆

اگلے چند ماہ جو اس نے امریکہ میں گزارے تھے وہ اس کی زندگی کے مشکل ترین دن تھے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار سیر و تفریح کے لئے اپنی فیملی کے ساتھ اور ان کے بغیر امریکہ اور یورپ جاتا رہا تھا مگر اس بار جس طریقے سے سکندر نے اسے امریکہ بھیجا تھا اس نے جہاں ایک طرف اسے مشتعل کیا تھا تو دوسری طرف اس کے لئے بہت سے دوسرے پر اہم بھی پیدا کر دیئے تھے۔ اس کے جو دست اسے لیوٹر کے بعد امریکہ آگئے تھے۔ وہ امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے تھے۔ وہ کسی ایک اسٹیٹ میں نہیں تھے۔ کچھ یہی حال اس کے رشتہ داروں اور کزنز کا تھا۔ خود اس کے اپنے بہن بھائی بھی ایک جگہ پر نہیں تھے۔ وہ اپنی فیملی سے اتنا منجھ نہیں تھا کہ ان کی کمی محسوس کرتا یا ہوم سٹے کا فکار ہوتا۔ یہ صرف اس طرح اچانک وہاں بھیجوانے جانے کا نتیجہ تھا کہ وہ اس طرح اضطراب کا فکار ہو رہا تھا۔

کامران سارا دن یونیورسٹی میں ہوتا اور اگر وہ گھر آتا بھی تو اپنی اسٹڈیز میں مصروف ہو جاتا۔ اس کے ایڈمز قریب تھے، جبکہ سالار سارا دن یا تو پارٹنمنٹ میں بیٹھا نہیں دیکھتا ہوتا یا پھر جھوٹو سمھانے میں مصروف رہتا اور جب وہ ان دونوں کاموں سے بیزار ہو جاتا تو آوارہ گردی کے لئے نکل جاتا۔ اس نے وہاں اپنے قیام کے دور ان نیویارک میں اس علاقے کا چھپ چھپا چھان مارا تھا جہاں کامران رہ رہا تھا۔ وہاں کا کوئی نائٹ کلب، ڈسکو ہب، بار، تھیٹر، سینما یا میوزیم اور آرٹ گیلری ایسی نہیں تھی جہاں وہ نہ گیا ہو۔

اس کا ایڈمز بیگ ریکارڈ ایسا تھا کہ جن تین Ivy League کی یونیورسٹیوں میں اس نے اپنا کیا تھا ان تینوں میں رزلٹ آنے سے پہلے ہی اس کی ایڈمیشن کی درخواستیں قبول کی جا چکی تھیں۔ دو تینوں یونیورسٹیوں میں جن میں اس کے دور یا قریب کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا اور یہ اس نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سکندر عثمان اپنی پوری کوشش کریں گے کہ اسے کسی ایسی یونیورسٹی میں ایڈمٹ کروائیں جہاں اس کے بہن بھائیوں میں سے نہیں تو کم از کم اس کے رشتہ داروں میں سے کوئی ضرور موجود ہو تاکہ وہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہیں۔ سالار کی جگہ ان کا کوئی دوسرا بیٹا Ivy League کی کسی یونیورسٹی میں ایڈمیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا تو سکندر عثمان فخر میں جھلا ہوتے اور اس چیز کو اپنے اور اپنی پوری فیملی کے لئے اعزاز سمجھتے مگر یہاں وہ اس خوف میں جھکا ہو گئے تھے کہ وہ سالار پر نظر کیسے رکھ سکیں گے۔ سالار نے ان یونیورسٹیوں میں سے Yale کو چنا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ نہ صرف Yale میں ان کا کوئی شناسا اور واقف کار نہیں تھا، بلکہ New Haven میں بھی سکندر عثمان کا کوئی رشتہ دار

اور دوست نہیں تھا۔

رزلٹ آنے کے بعد اسے یونیورسٹی سے میرٹ اسکالرشپ بھی مل گیا تھا۔ اپنے باقی بھائیوں کے برعکس اس نے خد کر کے ہوٹل میں رہنے کے بجائے ایک پارٹمنٹ کرائے پر لے لیا تھا۔ سکندر عثمان اسے پارٹمنٹ میں رکھنے کے لئے تیار نہیں تھے، مگر اسکالرشپ ملنے کی وجہ سے اس کے پاس اتنی رقم آگئی تھی کہ وہ خود ہی کوئی پارٹمنٹ لے لیتا کیونکہ یونیورسٹی کے اخراجات کے لئے سکندر اس کے اکاؤنٹ میں پہلے ہی ایک لمبی چوڑی رقم جمع کروا چکے تھے حالانکہ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا بھی اسکالرشپ لے رہا تھا مگر سالار سکندر کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ان سے ہر وہ "کام" اور "مطالبہ" کرنے کے لئے بنایا تھا جو اس سے پہلے کسی نے نہ کیا ہو۔ وہ زمین پر خاص طور پر انہیں تنگ کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا جس چیز کو ان کے دوسرے بچے مشرق کہتے وہ اسے مغرب کہتا۔ جسے دوسرے زمین قرار دیتے وہ اس کے آسمان ہونے پر دلائل دینا شروع کر دیتا۔ وہ اس کی باتوں، حرکتوں اور خد پر زیادہ سے زیادہ اپنا بلڈ پریشر اور کولیسٹرول لیول ہائی کر سکتے تھے اور کچھ نہیں۔

New Haven جانے سے پہلے سکندر اور طیبہ اس کے لئے خاص طور پر پاکستان سے امریکہ آنے تھے۔ وہ کئی دن تک اسے سمجھاتے رہے تھے، جنہیں وہ اطمینان سے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتا رہتا تھا۔ وہ کئی سالوں سے نصیحتیں سننے کا عادی تھا اور عملی طور پر وہ نصیحتیں اب اس پر قطعاً کوئی اثر نہیں کرتی تھیں۔ دوسری طرف سکندر اور طیبہ وہاں پاکستان جاتے ہوئے بے حد گھر مند بلکہ کسی حد تک خوفزدہ بھی تھے۔

Yale سے فائنل میں ایڈمیشن اے کرنے آیا تھا اور اس نے وہاں آنے کے چند ہفتوں کے اندر ہی اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔

پاکستان میں جن اداروں میں وہ پڑھتا رہا تھا اگرچہ وہ بھی بہت اچھے تھے، مگر وہاں تعلیم اس کے لئے ایک واک تھی۔ Yale میں مقابلہ بہت مشکل تھا وہاں بے حد قابل لوگ اور ڈیپن اسٹوڈنٹ موجود تھے۔ اس کے باوجود وہ بہت جلد نظروں میں آنے لگا تھا۔

اس میں اگر ایک طرف اس کی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کا دخل تھا تو دوسری طرف اس کے رویے کا بھی۔ ایٹین اسٹوڈنٹس والی روایتی شہساری اور خوش اخلاقی اس میں مفقود تھی۔ اس میں لحاظ اور مردت بھی نہیں تھی اور نہ ہی وہ احساس کمتری اور مرغوبیت تھی جو ایٹین اسٹوڈنٹس امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں فطری طور پر لے کر آتے ہیں۔ اس نے بچپن سے ہی بہترین اداروں میں پڑھا تھا۔ ایسے ادارے جہاں پڑھانے والے زیادہ تر غیر تھے اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بھی کوئی علم کے پیٹے ہوئے سرچشمے نہیں ہوتے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ Yale نے اسے اسکالرشپ دے کر اس پر کوئی احساس نہیں کیا وہ

اگر باقی دونوں یونیورسٹیز میں سے کسی کا انتخاب کرنا تو اسکا لرشپ اسے وہاں سے بھی مل جاتا اور اگر ایسا نہ بھی ہو تا جب بھی اسے یہ معلوم تھا کہ اس کے ماں باپ کے پاس اتنا پیسہ تھا کہ وہ جہاں چاہتا ایڈمیشن لے سکتا تھا۔ اگر اپنے فیملی بیک گراؤنڈ اسٹینڈس اور قابلیت کا زعم نہ ہو تا جب بھی سالار سکندر اس قدر تلخ اور الگ تھلک قسم کی نیچر رکھتا تھا کہ وہ کسی کو اپنی خوش اخلاقی کے جھوٹے مظاہرہ سے متاثر نہیں کر سکتا تھا۔ رہی سہی کسر اس کے آئی کیویول نے پوری کر دی تھی۔

شروع کے چند ہفتوں میں ہی اس نے اپنے پروفیسرز اور کلاس فیلوز کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی اور یہ بھی پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ وہ بچپن سے تعلیمی اداروں میں اسی قسم کی توجہ حاصل کیا کرتا تھا۔ وہ ایسا اسٹوڈنٹس نہیں تھا جو فضول باتوں پر بحث برائے بحث کرتا۔ اس کے سوال ہی اس طرح کے ہوتے تھے کہ اس کے اکثر پروفیسرز کو فوری طور پر ان کا جواب دینے میں دشواری ہوتی۔ جو اب غیر تلی بخش بھی ہوتا، تب بھی وہ یہ جانتا نہیں تھا صرف خاموش ہو جاتا تھا، مگر وہ یہ تاثر بھی نہیں دیتا تھا کہ وہ مطمئن ہو گیا تھا یا اس جواب کو تسلیم کر رہا تھا۔ وہ بحث صرف ان پروفیسرز کے ساتھ کرتا تھا، جن کے بارے میں اسے یہ یقین ہوتا کہ وہ ان سے واقعی کچھ نہ کچھ سیکھے گا یا جن کے پاس صرف روایتی یا کتابی علم نہیں تھا۔ پڑھائی وہاں بھی اس کے لئے بہت مشکل نہیں تھی، نہ ہی اس کا سارا وقت پڑھائی میں گزرتا تھا۔ پہلے کی نسبت اسے کچھ زیادہ وقت دینا پڑتا تھا مگر اس کے باوجود وہ اپنے لئے اور اپنی سرگرمیوں کے لئے وقت نکال لیا کرتا تھا۔

وہ وہاں کسی ہوم سکلینس کا ٹیکار نہیں تھا کہ چوبیس گھنٹے پاکستان کو یاد کرنا پڑتا یا پاکستان کے ساتھ اس طرح کے مشق میں جلا ہوتا کہ ہر وقت اس کے گلچر کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرنا نہ ہی امریکہ اس کے لئے کوئی نئی اور اچھی جگہ تھی اس لئے اس نے وہاں موجود پاکستانیوں کو تلاش کرنے اور ان کے ساتھ روابط بڑھانے کی دانستہ طور پر کوئی کوشش نہیں کی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود بخود وہاں موجود کچھ پاکستانیوں سے اس کی شناسائی ہو گئی۔

یونیورسٹی کی دوسری بہت سی سوسائٹیز، ایسوسی ایشنز اور کلبز میں اس کی دلچسپی تھی اور اس کے پاس ان کی ممبر شپ بھی تھی۔

پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنا زیادہ تر وقت بے کار پھرنے میں ضائع کرتا تھا۔ خاص طور پر ویک اینڈز۔ سینما، کلبز، ڈسکو، تھیٹرز۔ اس کی زندگی انہیں چاروں کے درمیان تقسیم شدہ تھی۔ ہر نئی فلم، ہر نیا سٹیج پلے، ہر نیا کنسرٹ اور کوئی بھی نئی انسٹرومنٹل پرفارمنس وہ نہیں چھوڑتا تھا یا پھر ہر نیا چھوٹا، بڑا ریستورانٹ، میپلے سے مینڈا اور سستے سے سستا۔ اسے ہر ایک کے بارے میں مکمل معلومات تھیں۔

اور اس سب کے درمیان وہ ایڈیوٹچر اس کے ذہن میں اب تک تھا جس کی وجہ سے وہ امریکہ میں موجود تھا۔ سکندر کو اس کے نکاح کا پتہ چلا تھا، کیسے چلا تھا، سالار نے جاننے کی کوشش نہیں کی مگر وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ سکندر عثمان کو اس کے بارے میں کیسے پتا چلا ہو گا۔ یہ حسن یا ناصبرہ نہیں تھے جنہوں نے سکندر عثمان کو سالار اور امامہ کے بارے میں بتایا ہو گا۔ وہ ان کی طرف سے مطمئن تھا یہ خود امامہ ہی ہو گی، جس نے اس سے فون پر بات کرنے کے بعد یہ سوچا ہو گا کہ اس کے بجائے سکندر عثمان سے ساری بات کی جائے اور اس نے یقیناً ایسا ہی کیا ہو گا، اسی لئے اس نے دوبارہ سالار سے رابطہ نہیں کیا۔ سکندر نے اس سے رابطہ کرنے کے بعد ہی اس کے کمرے کی تلاشی لے کر وہ نکاح نامہ برآمد کر لیا تھا۔

مگر یہ سب کب ہوا تھا.....؟ یہ وہ سوال تھا، جس کا جواب وہ نہیں ڈھونڈ پاتا تھا۔ جو بھی تھا امامہ کے لئے اس کی پانچویں کی میں پاکستان سے امریکہ آتے ہوئے کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ یکے بعد دیگرے وہ اس کے ہاتھوں زک اٹھانے پر مجبور ہوا تھا اور اب وہ پچھتا رہا تھا کہ اس نے اس تمام معاملے میں امامہ کی مدد کیسے کی۔ بعض دفعہ اسے حیرانی ہوتی تھی کہ آخر وہ امامہ جیسی لڑکی کی مدد کرنے پر تیار کیسے ہو گیا تھا اور اس حد تک مدد کہ.....

وہ اب ان تمام واقعات کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی کوفت محسوس کرتا تھا۔ آخر میں نے اس کی مدد کیوں کی جبکہ مجھے جو کرنا چاہئے تھا وہ یہ تھا کہ اس کے رابطہ کرنے پر میں وہیم کو، اس کے والدین کو یا خود اپنے والدین کو اس سارے معاملے کے بارے میں بتا دیتا یا پھر مجال کے بارے میں انہیں بتا دیتا یا پھر اس کے کہنے پر اس کے ساتھ سر سے نکاح کرتا ہی نہ یا اسے گھر سے فرار ہونے میں تو کبھی اس طرح مدد نہ کرتا۔

بعض دفعہ اسے لگتا کہ جیسے وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح اس کے ہاتھوں میں استعمال ہوا تھا۔ اتنی فرمانبرداری، اتنی تابع داری آخر کیوں.....؟ جبکہ وہ اس کے ساتھ کوئی تعلق یا واسطہ نہیں رکھتی تھی اور وہ کسی طرح سے بھی اس کی مدد کرنے پر مجبور نہیں تھا۔

اب اسے وہ سب کچھ ایک ایڈیوٹچر سے زیادہ حماقت لگتا۔ وہ کسی سائیکالوجسٹ کی طرح امامہ کے بارے میں اپنے رویے کا تجزیہ کرتا اور مطمئن ہو جاتا۔

”جوں جوں وقت گزرتا جائے گا وہ عمل طور پر میرے ذہن سے نکل جائے گی نہ بھی لگتی تب بھی مجھے کیا فرق پڑے گا۔“ وہ سوچتا۔

☆.....☆.....☆

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں اس کے حلقہ احباب میں اضافہ ہونے لگا اور اسی حلقہ احباب میں ایک نام سعد کا تھا۔ اس کا تعلق کراچی سے تھا۔ سالار کی طرح وہ بھی امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتا

تھا مگر سالار کے برعکس اس کا گھرانہ خاصا مذہبی تھا۔ یہ سالار کا اندازہ تھا۔ سعد کی حس مزاح بہت اچھی تھی اور وہ بہت ہنسنے بھی تھا۔ نیو یون میں ایک امریکی دوست کے توسط سے اس کی ملاقات سعد سے ہوئی تھی اور اس کی طرف دوستی میں پہل کرنے والا سعد ہی تھا۔ سالار نے اس دوستی کو قبول کرنے میں قدرے تامل کیا کیونکہ اسے یوں لگتا تھا جیسے سعد اور اس کے درمیان کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔ سعد وہاں سے ایم فل کر رہا تھا۔ سالار کے برعکس وہ پڑھائی کے ساتھ جاب بھی کرتا تھا۔ اس کا حلیہ اس کی مذہب سے جذباتی و انتہائی تانے کے لئے کافی تھا۔ اس نے ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی اور مذہب کے بارے میں اس کا علم بہت زیادہ تھا۔ سالار نے زندگی میں پہلی بار کسی ایسے شخص سے دوستی کی تھی جو مذہبی تھا۔

سعد پانچ وقت کی نماز پڑھتا تھا اور دوسروں کو بھی اس کے لئے کہتا رہتا۔ وہ مختلف آرگنائزیشنز اور کلبز میں بھی بہت ایکٹو تھا۔ سالار کے برعکس امریکہ میں اس کا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں تھا، صرف ایک دور کے چچا تھے، جو کسی دوسری اسٹیٹ میں رہتے تھے۔ شاید اسی لئے اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لئے وہ بہت زیادہ سوشل تھا۔ سالار کے برعکس وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور شاید یہ لاڈ و پیار ہی تھا جس نے اس کے والدین کو اسے اتنی دور تعلیم کے لئے بھیج دیا تھا اور نہ اس کے ہاتھی دونوں بھائی سعد کے والد کے ساتھ گریجویٹیشن کے بعد بزنس میں شریک ہو گئے تھے۔

وہ بھی ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے کر رہتا تھا مگر اس کے ساتھ اس اپارٹمنٹ میں چار اور لوگ بھی رہتے تھے۔ ان چار میں سے دو عرب اور ایک ہنگر ویشی کے علاوہ ایک اور پاکستانی تھا۔ وہ تمام اسٹوڈنٹس تھے۔

سعد پہلی ہی ملاقات میں سالار سے بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔ سالار کے امریکی دوست جیف نے جب سعد کو سالار کی اکیڈمک کامیابیوں کے بارے میں بتایا تو۔ ایک کی طرح سعد بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

سالار کو سعد کا چہرہ دیکھ کر اور خاص طور پر اس کی ڈاڑھی دیکھ کر ہمیشہ جلال کا خیال آتا۔ ڈاڑھی کی وجہ سے دونوں میں عجیب سی مماثلت اور مشابہت نظر آتی۔ کئی بار دوسرے دوستوں کے علاوہ سعد بھی ویک اینڈ پر اس کے ساتھ ہوتا۔

”تم مسلمان ہو لیکن مذہب کی سرے سے پابندی نہیں کرتے۔“ سعد نے ایک دفعہ سالار سے کہا تھا۔

”اور تم ضرورت سے زیادہ مذہبی ہو۔“ سالار نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ جس طرح تم پانچ وقت کی نمازیں پڑھتے رہتے ہو اور ہر وقت اسلام کی بات کرتے

رہتے ہو یہ کچھ اور اینٹنگ ٹائپ چیز ہو جاتی ہے۔“ سالار نے بڑی صاف گوئی کے ساتھ کہا۔ ”تم تھکتے نہیں ہو ہر وقت نمازیں پڑھ کر۔“

”یہ فرض ہے۔ اللہ کی طرف سے ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں، اسے ہر وقت یاد رکھیں۔“ سعد نے زور دیتے ہوئے کہا۔ سالار نے ایک بھائی لی۔

”تم بھی عبادت کیا کرو، آخر تم بھی مسلمان ہو۔“ سعد نے اس سے کہا۔

”میں جانتا ہوں اور عبادت نہ کرنے سے کیا میں مسلمان نہیں رہوں گا۔“ اس نے کچھ جھکے لہجے میں سعد سے کہا۔

”صرف ہم کا مسلمان بن کر زندگی گزارنا چاہتے ہو تم؟“

”سعد اہلیز اس قسم کے فضول ٹاپک پر بات مت کرو۔ میں جانتا ہوں تمہیں مذہب میں دلچسپی ہے مگر مجھے نہیں ہے۔ بہتر ہے ہم ایک دوسرے کی رائے اور جذبات کا خیال رکھیں اور ایک دوسرے پر کچھ ٹھونسنے کی کوشش نہ کریں۔ جیسے میں تم سے یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ تم نماز چھوڑ دو، اس طرح تم بھی مجھ سے یہ نہ کہو کہ میں نماز پڑھوں۔“ سالار نے انتہائی صاف گوئی سے کہا تو سعد خاموش ہو گیا۔

مگر کچھ دنوں بعد ایک دن وہ اس کے اپارٹمنٹ پر آیا۔ سالار اس کی تواضع کے لئے کچھ لانے کے لئے بکن میں گیا تو سعد بھی اس کے پیچھے ہی آ گیا۔ اس نے باتوں کے دوران فریج کھول لیا اور اس میں موجود کھانے کی چیزوں پر نظر دوڑانے لگا۔ سالار پچھلی رات ایک فاسٹ فوڈ outlet سے اپنا پسندیدہ برگر لے کر آیا تھا۔ وہ فریج میں رکھا تھا۔ سعد نے اسے نکال لیا۔

”اسے رکھ دو، یہ تم نہ کھانا۔“ سالار نے جلدی سے کہا۔

”کیوں؟“ سعد نے مانگیر دوپو کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

”اس میں پورک (سوار کا گوشت) ہے۔“ سالار نے لاپرواہی سے کہا۔

”مذاق مت کرو۔“ سعد ٹھک گیا۔

”اس میں مذاق والی کون سی بات ہے۔“ سالار نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ سعد نے جیسے پھینکنے

والے انداز میں پلیٹ شیٹ پر رکھ دی۔

”تم پورک کھاتے ہو؟“

”میں پورک نہیں کھاتا۔ میں صرف یہ برگر کھاتا ہوں کیونکہ یہ مجھے پسند ہے۔“ سالار نے برز

جالتے ہوئے کہا۔

”تم جانتے ہو، یہ حرام ہے؟“

”اسلام میں؟“

"ہاں"

"اور پھر بھی؟"

"اب تم پھر وہی تبلیغی و منط شروع مت کرنا، میں صرف پورک ہی نہیں کھاتا، ہر قسم کا گوشت کھا لیتا ہوں۔" سالار نے لاپرواہی سے کہا۔ وہ اب فرنگ کی طرف جا رہا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"خیر اس میں ایسی بے یقینی والی کیا بات ہے۔ یہ کھانے کے لئے ہی ہوتا ہے۔" وہ اب فرنگ میں پڑے دودھ کے پیکٹ کو نکال رہا تھا۔

"ہر چیز کھانے کے لئے نہیں ہوتی۔" سعد کچھ تھملا یا۔ "ٹھیک ہے تم زیادہ مذہبی نہ سمجھی مگر مسلمان تو ہو اور اتنا تو تم جانتے ہی ہو گے کہ پورک اسلام میں حرام ہے، کم از کم ایک مسلمان کے لئے۔" سالار خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہا۔

"میرے لئے کچھ مت بنانا، میں نہیں کھاؤں گا۔" سعد یک دم بچن سے نکل گیا۔

"کیوں؟" سالار نے مڑ کر اسے دیکھا۔ سعد واش بیسن کے سامنے کھڑا صابن سے ہاتھ دھو رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" سالار نے اس سے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

سعد نے جواب میں کچھ نہیں کہا وہ اسی طرح کھڑے پڑتے ہوئے ہاتھ دھو رہا تھا۔ سالار چھٹی ہوئی نظروں سے ہونٹ پیچھے اسے دیکھتا رہا۔ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے سالار سے کہا۔

"میں تو اس فرنگ میں رکھی کوئی چیز نہیں کھا سکتا، بلکہ تمہارے برتنوں میں بھی نہیں کھا سکتا۔ اگر تم یہ برگر کھا لیتے ہو تو اور بھی کیا کچھ نہیں کھا لیتے ہو گے۔ چلو باہر چلتے ہیں وہیں جا کر کچھ کھاتے ہیں۔"

"یہ بہت انسٹنگ ہے۔" سالار نے قدرے ناراضی سے کہا۔

"نہیں، انسٹنگ والی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس میں یہ حرام گوشت نہیں کھانا چاہتا اور تم اس معاملے میں پرہیز کے عادی نہیں ہو۔" سعد نے کہا۔

"میں نے تمہیں یہ گوشت کھانے کی کوشش نہیں کی۔ تم نہیں کھاتے، اسی لئے میں نے وہ برگر پکڑتے ہی تمہیں منع کر دیا۔" سالار نے کہا۔ "مگر تم کو تو شاید کوئی فوہیا ہو گیا ہے۔ تم اس طرح ری ایکٹ کر رہے ہو جیسے میں نے اپنے پورے فلیٹ میں اس جانور کو پالا ہوا ہے اور رات دن ان ہی کے ساتھ رہتا ہوں۔"

سالار ناراض سا ہو گیا۔

"چلو باہر چلتے ہیں۔" سعد نے اس کی ناراضی کو ختم کرنے کے لئے کہا۔

"باہر چل کر کچھ کھائیں گے تو میں مل پے نہیں کروں گا، تم کرو گے۔" سالار نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں کروں گا، نو پراہلم۔ تم چلو۔" سعد نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اور اگلی دفعہ تم میرے اپارٹمنٹ پر آتے ہوئے گھر سے کچھ کھانے کے لئے کر آنا۔" سالار نے قدرے طنز سے لہجے میں اس سے کہا۔

"اچھالے آؤں گا۔" سعد نے کہا۔

☆.....☆.....☆

وہ اس ویک اینڈ پر جمیل کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی طرح بہت سے لوگ وہاں پھر رہے تھے۔

وہ کچھ دیر ادھر ادھر پھرنے کے بعد ایک بیچ پر آکر بیٹھ گیا۔ بہت لاپرواہی سے ایک آئس کریم اسٹک کھاتے ہوئے وہ ادھر ادھر نظریں دوڑانے میں مصروف تھا جب اس کی توجہ تین سال کے ایک بچے نے

اپنے طرف مبذول کر لی۔ وہ بچہ ایک فٹ بال کے پیچھے دوڑ رہا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر سیاہ حجاب اوڑھے ایک لڑکی کھڑی تھی جو مسکراتے ہوئے اس بچے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ وہاں موجود بہت سے ایشین

میں سے ایک تھی مگر حجاب میں ملیں و احمد لڑکی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر اسے دیکھے گیا۔ وہ بچہ فٹ بال کو پاؤں سے ٹھوکر لگاتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کی بیچ کی طرف آ گیا تھا۔ ایک اور ٹھوکر نے بال کو سیدھا

سالار کی طرف بھیج دیا۔ کسی غیر ارادی عمل کے تحت سالار نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے اپنے دائیں پاؤں میں پھینے ہوئے جاگری کی مد سے اس بال کو روکا اور پھر پاؤں بنایا نہیں بلکہ اسی طرح فٹ بال پر ہی رکھا مگر اس

بار اس کی نظر اس لڑکی کے بجائے اس بچے پر تھی جو تیز رفتاری سے بال کے پیچھے اس کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے بالکل پاس آنے کے بجائے وہ کچھ دور ٹک گیا۔ شاید وہ توقع کر رہا تھا کہ سالار بال کو اس

کی طرف لڑکھائے گا مگر سالار اسی طرح فٹ بال پر ایک پاؤں رکھے بائیں ہاتھ سے آئس کریم کھاتے ہوئے دور کھڑی اس لڑکی کو دیکھتا رہا۔ شاید اسے توقع تھی کہ اب وہ قریب آئے گی۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ کچھ

دیر تک اسے بال نہ چھوڑتے دیکھ کر وہ لڑکی کچھ حیرانی سے آگے اس کی طرف آئی تھی۔

"یہ فٹ بال چھوڑ دو۔"

اس نے قریب آکر بڑی شائستگی سے کہا۔ سالار چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے فٹ بال سے اپنا پاؤں اٹھایا اور وہیں بیٹھے بیٹھے فٹ بال کو ایک زوردار کلک لگائی۔

فٹ بال اڑتے ہوئے بہت دور جاگری۔ کلک لگانے کے بعد اس نے اطمینان سے اس لڑکی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ اب سرخ ہو رہا تھا جبکہ وہ بچہ ایک بار پھر اس فٹ بال کی طرف بھاگتا جا رہا تھا جو اب

کبھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس لڑکی نے ذرا لب اس سے کچھ کہا اور پھر واپس مڑ گئی۔ سالار اس کے من سے نکلنے والے الفاظ کو سن یا سمجھ نہیں سکا مگر اس کے سرخ چہرے اور تاثرات سے وہ یہ اندازہ بخوبی لگا

سکتا تھا کہ وہ کوئی خوشگوار الفاظ نہیں تھے۔ اسے اپنی حرکت پر شرمندگی بھی ہوئی مگر جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی وہ لڑکی امامہ سے مشابہت رکھتی تھی۔

وہ لمبے سے سیاہ کوٹ میں سیاہ چھاپ اوڑھے ہوئے تھی۔ دراز قد اور بہت ڈبیلی پتلی تھی۔ بالکل امامہ کی طرح۔ اس کی سفید رنگت اور سیاہ آنکھیں بھی اسے امامہ جیسی ہی محسوس ہوتی تھیں۔ امامہ بہت لمبی پوزی چادر میں خود کو چھپائے رکھتی تھی۔ وہ چھاپ نہیں لیتی تھی مگر اس کے باوجود اس وقت اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے اسے اس کا خیال آیا تھا اور لاشعوری طور پر اس نے وہ نہیں کیا جو وہ لڑکی چاہتی تھی۔ شاید اسے کسی حد تک یہ تسکین ہوئی تھی کہ اس نے امامہ کی بات نہیں مانی مگر..... وہ امامہ نہیں تھی۔

”آخر کیا ہو رہا ہے مجھے، اس طرح تو.....“ اس نے حیران ہوتے ہوئے سوچا۔ وہ جیب میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے وہ ایک بار پھر اسی لڑکی کو دیکھنے لگا جو اپنے بچے کو فٹ بال کے ساتھ کھیلنے دیکھ کر مسکراتی تھی۔ سالار اسے دیکھ رہا تھا اور اس کے علاوہ ہر شے سے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس رات وہ کافی دیر تک امامہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے اور حال انصر کے بارے میں اسے یقین تھا اب تک وہ دونوں شادی کر چکے ہوں گے، کیونکہ اپنا نکاح نامہ سدر سے حاصل کرنے کے بعد وہ یہ جان چکی ہوگی کہ طلاق کا حق پہلے ہی اس کے پاس تھا۔ اسے اس سلسلے میں سالار کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ جلال انصر اس کے کہنے پر بھی امامہ سے شادی پر تیار نہیں ہوا تھا سے پھر بھی نہ جانے کیوں یہ یقین تھا کہ جلال انصر ایک بار امامہ کے اپنے پاس پہنچ جانے پر اسے انکار نہیں کر سکا ہوگا۔ اس کی منت سادہت پر وہ مان گیا ہوگا۔

امامہ اس کے مقابلے میں بہت خوب صورت تھی اور امامہ کا خاندان ملک کے طاقت ور ترین خاندانوں میں سے ایک تھا۔ کوئی امتق ہی ہو گا جو جلال انصر جیسی حیثیت رکھتے ہوئے امامہ کو سونے کی چڑیا نہ سمجھتا ہو یا پھر ہو سکتا ہے وہ واقعی امامہ کی محبت میں مبتلا ہو جو بھی تھا اسے یقین تھا کہ وہ دونوں شادی کر چکے ہوں گے اور پتا نہیں کس طرح ہاشم مبین کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چھینے میں کامیاب ہوئے ہوں گے یا یہ بھی ممکن ہے کہ ہاشم مبین نے اب تک انہیں ڈھونڈ نکالا ہو۔

”مجھے پتا تو کرنا چاہئے اس بارے میں۔“ اس نے سوچا اور پھر اگلے ہی لمحے خود کو جھڑکا۔ ”فارگاڈ سیک سالار اُدفع کرو اسے، جانے دو، کیوں خوا خواہ اس کے پیچھے پڑے ہو۔ یہ جان کر آخر کیا مل جائے گا کہ ہاشم مبین اس تک پہنچے ہیں یا نہیں۔“ اس نے بے اختیار خود کو جھڑکا مگر اس کا تجسس ختم نہیں ہوا۔

”واقعی میں نے یہاں آنے کے بعد یہ جاننے کی کوشش کیوں نہیں کی کہ ہاشم مبین اب تک اس تک پہنچے ہیں یا نہیں۔“ اسے حیرانی ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”میرا نام وہیں لپیٹا اور ڈبے۔“

وہ لڑکی اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھائے ہوئے تھی۔ وہ اس وقت لائبریری کی بک شیلٹ سے ایک کتاب نکال رہا تھا، جب وہ اس کے قریب آئی تھی۔

”سالار سنکر را!“ اس نے وہیں سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

”میں جانتی ہوں، تمہیں تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہیں نے بڑی گرم جوشی سے کہا۔ سالار نے اس سے یہ نہیں کہا کہ اسے بھی تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی نگاہ کے پچاس کے پچاس لوگوں کو ان کے نام سے جانتا اور پہچانتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ ان کا بریف بائیو ڈیٹا بھی بغیر انکے کسی غلطی کے بتا سکتا تھا۔ جیسے وہ اس وقت وہیں کو یہ بتا کر حیران کر سکتا تھا کہ وہ نیو جرسی سے آئی تھی۔ وہاں دو سال ایک ہیورجنگ کمپنی میں کام کرتی رہی تھی۔ اس کے پاس مارکیٹنگ میں ایک ڈگری تھی اور وہ اب دوسری ڈگری کے لئے وہاں آئی تھی اور وہ اس سے کم از کم پچیس سات سال بڑی تھی۔ اگرچہ اپنے قد و قامت سے سالار اس سے بہت بڑا لگتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ وہ اس وقت اپنے بچے میں سب سے کم عمر تھا۔ اپنے بچے میں صرف وہی تھا جو کسی قسم کی چھاپ کے بغیر سیدھا سا ایم بی اے کے لئے آیا تھا۔ باقی سب کے پاس گھنٹن کچھ سال کام کرنے کا تجربہ تھا مگر اس وقت وہیں کو یہ سب کچھ بتانا اسے خوش فہمی کا شکار کرنے کے مترادف تھا۔

”اگر میں آپ کو کافی کی دعوت دوں تو؟“ وہیں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد کہا۔

”تو میں اسے قبول کر لوں گا۔“

وہ اس کی بات پر ہنسی۔ ”تو پھر چلئے ہیں، کافی پیتے ہیں۔“ سالار نے کندھے اچکائے اور کتاب کو دوبارہ شیلٹ میں رکھ دیا۔

کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر وہ دونوں تقریباً آدھ گھنٹہ تک ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ یہ وہیں کے ساتھ اس کی شناسائی کا آغاز تھا۔ سالار کے لئے کسی لڑکی کے ساتھ تعلقات بڑھانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ یہ کام بہت آسانی سے کر لیا کرتا تھا۔ اس بار مزید آسانی یہ تھی کہ پہلے وہیں کی طرف سے ہوئی تھی۔

تین چار ملاقاتوں کے بعد اس نے ایک رات وہیں کو اپنے فلیٹ پر رات گزارنے کے لئے انوائٹ کر لیا تھا اور وہیں نے کسی تاہل کے بغیر اس کی دعوت قبول کر لی۔ وہ دونوں یونیورسٹی کے بعد اکٹھے بہت سی جگہوں پر بھرتے رہے۔ سالار کے فلیٹ پر ان کی وائٹسی لیٹ نامت ہوئی تھی۔

وہ جگہ میں اپنے اور اس کے لئے گلاس تیار کرنے لگا جبکہ وہیں بے تکلفی سے ادھر سے ادھر بھرتے ہوئے اس کے لپارٹمنٹ کا جائزہ لے رہی تھی پھر وہ اس کے قریب آ کر کاؤنٹر کے سامنے کھڑی

ہو گئی۔ ”بہت اچھا پارٹمنٹ ہے تمہارا۔ میں سوچ رہی تھی کہ تم کیسے رہتے ہو تو پارٹمنٹ کا علیحدہ خاصا خراب ہو گا مگر تم نے تو ہر چیز بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی ہے۔ تم ایسے ہی رہتے ہو یا یہ اجتام خاص میرے لئے کیا گیا ہے۔“

سالار نے ایک گلاس اس کے آگے رکھ دیا۔ ”میں ایسے ہی رہتا ہوں، قرینے اور طریقے سے۔“ اس نے کھونٹ بھر اور گلاس دوبارہ کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے وہ وینس کے قریب چلا آیا اس نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ وینس مسکرا دی۔ سالار نے اسے اپنے کچھ اور قریب کیا اور پھر ایک دم ساکت ہو گیا۔ اس کی نظریں وینس کی گردن کی زنجیر میں جموتے اسے موتی پر پڑی تھیں، جسے آج اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ سردی کے موسم کی وجہ سے وینس بھاری بھرم سوئیز اور رینکس پہنا کرتی تھی۔ اس نے ایک دوبارہ اس کے کھلے کارل سے نظر آنے والی اس زنجیر کو دیکھا تھا مگر اس زنجیر میں لٹکا ہوا وہ موتی آج پہلی بار اس کی نظروں میں آیا تھا کیونکہ آج پہلی بار وینس ایک گہرے گلے کی شرٹ میں ملبوس تھی۔ وہ اس شرٹ کے اوپر ایک سوئیز پہنے ہوئے تھی، جسے اس نے سالار کے پارٹمنٹ میں آکر اتار دیا تھا۔

اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ ایک جھماکے کے ساتھ وہ موتی اسے کہیں اور۔ کہیں بہت پیچھے۔ کسی اور کے پاس لے گیا تھا۔ مسح کرتے ہاتھ اور انگلیاں۔ ہاتھ اور کلائی۔ کلائی سے کتنی تک کا مسز کرتی انگلیاں۔ آنکھوں سے پوشانی۔ پوشانی سے سفید چادر کے نیچے سیاہ بالوں پر گھسٹے ہوئے ہاتھ۔

امامہ کی گردن کے گرد موجود زنجیر ٹنگ تھی۔ اس میں لٹکے والا موتی اس کی منگلی کی بڑی کے بالکل ساتھ جمنا تھا۔ زنجیر تھوڑی سی بھی لمبی ہوتی تو وہ اسے دیکھ نہ پاتا۔ اس رات وہ بہت ٹنگ گلے کی شرٹ اور سوئیز میں ملبوس تھی۔ اس موتی کو دیکھتے ہوئے وہ کچھ دیر کے لئے مفلوج ہو گیا۔

وہ اسے کس وقت یاد آئی تھی۔ اس نے موتی سے نظریں چرانے کی کوشش کی۔ وہ اپنی رات خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے وینس کو دیکھ کر دوبارہ مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

”مجھے تمہاری آنکھیں بہت خوب صورت لگتی ہیں۔“

”مجھے تمہاری آنکھوں سے گھن آتی ہے۔“

کسی آواز نے اسے ایک چابک مار اور اس کے چہرے کی مسکراہٹ یک دم غائب ہو گئی۔ وینس کے وجود سے اپنے بازو ہٹاتے ہوئے وہ چند قدم پیچھے مڑا اور کاؤنٹر پر پڑا ہوا گلاس اٹھا لیا۔ وینس ہکا ہکا اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ وہ چند قدم آگے بڑھ آئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کچھ تشویش سے پوچھا۔

سالار نے کچھ کہے بغیر ایک ہی سانس میں گلاس خالی کیا۔ وینس اس کے جواب نہ دینے پر اب کچھ اُلجھے ہوئے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

وینس میں اس کی دلچسپی ختم ہونے میں صرف چند منٹ لگے تھے۔ وہ نہیں چاہتا اسے کیوں اس کے وجود سے ابھین ہونے لگی تھی۔ وہ پچھلے دو گھنٹے ایک ناٹ کلب میں اس کے ساتھ ڈانس کرتا رہا تھا اور وہ اس کے ساتھ بے حد خوش تھا اور اب چند منٹوں میں۔

سالار نے اپنے کندھے جھٹکے اور سبک کی طرف چلا گیا۔ وہ اپنا گلاس دھونے لگا۔ وینس دوسرا گلاس لے کر اس کے پاس چلی آئی۔ سالار نے اس سے گلاس لے لیا۔ وہ اپنے سینے پر دو نون بازو پہنے اس کے بالکل پاس کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ سالار کو اس کی نظروں سے جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔

”میں۔۔۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

گلاس کو سینٹ پر رکھتے ہوئے اس نے وینس سے کہا۔ وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ بالواسطہ طور پر اسے وہاں سے جانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ وینس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ سالار کا رویہ بے حد توجہ آیز تھا۔ وہ چند لمبے اسے گھورتی رہی پھر تیزی کے ساتھ اپنا سوئیز اور بیگ اٹھا کر پارٹمنٹ کا دروازہ دھماکے سے بند کر کے باہر نکل گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر بکڑ کر صوف پر بیٹھ گیا۔

وینس اور امامہ میں کہیں کسی قسم کی کوئی مشابہت نہیں تھی۔ دونوں کی گردنوں میں موجود موتی بھی بالکل ایک جیسا نہیں تھا اس کے باوجود اس وقت اس کی گردن اور گردن میں جموتے اس موتی کو دیکھ کر اسے بے اختیار وہ یاد آئی تھی۔ کیوں؟ اب پھر کیوں؟ آخر اس وقت کیوں؟ وہ بے حد مشتعل ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کی رات خراب ہو گئی تھی، اس نے سینئر نمیل پر پڑا ہوا ایک کرسل کا گل دان اٹھا یا اور پوری قوت سے اسے دیوار پر دے مارا۔

دیک اینڈ کے بعد وینس سے اس کی دوبارہ ملاقات ہوئی، لیکن وہ اس سے بڑے روکھے اور اکڑے ہوئے انداز میں ملا۔ یہ اس سے تعلقات شروع کرنے سے پہلے ہی ختم کرنے کا واحد راستہ تھا۔ اسے ہر اس عورت سے جھنجھلاہٹ ہوتی تھی جو اسے کسی بھی طرح سے امامہ کی یاد دلاتی اور وینس ان عورتوں میں شامل ہو گئی تھی۔ وینس جو اس کی طرف سے کسی معذرت اور اگلی دعوت کا انتظار کر رہی تھی وہ اس کے اس رویے سے بری طرح دلبرداشتہ ہوئی تھی۔ Valie میں یہ اس کا پہلا انجیر تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلے چند ماہ وہ پڑھائی میں بے حد مصروف رہا، اتنا مصروف کہ امامہ کو یاد رکھنے اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کو کل پر نالیاں رہا اور شاید یہ سلسلہ ابھی چلتا رہتا اگر اس شام اچانک کی ملاقات جلال انصر سے نہ ہو جاتی۔

وہ ایک اینڈر پریویشن گیا ہوا تھا جہاں اس کے چچا رہتے تھے وہ وہاں اپنے ایک کزن کی شادی اینڈر کرنے آیا تھا۔

اس شام سالار اپنے کزن کے ہمراہ تھا جو ایک ریٹائرمنٹ چار ہا تھا۔ وہ وہاں کھانا کھانے آیا ہوا تھا۔ اس کا کزن آرزو دینے کے بعد کسی کام سے اٹھ کر گیا تھا۔ سالار کھانے کا انتظام کر رہا تھا جب کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔

”ہیلو.....!“ سالار نے بے اختیار مڑ کر اسے دیکھا۔

”آپ سالار ہیں؟“ اس آدمی نے پوچھا۔

وہ جلال انصر تھا۔ اسے پہچاننے میں لٹکے بھر کے لئے دقت اس لئے ہوئی تھی کیونکہ اس کے چہرے سے اب ڈازھی عائب تھی۔

سالار نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملایا۔ ایک سال پہلے کا ایڈوچر ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ رسی ٹیک سلیک کے بعد اس نے جلال کو رسما کھانے کی دعوت دی۔

”نہیں مجھے ڈرا جلدی ہے۔ بس آپ پر اتفاقاً نظر پڑ گئی تو آ گیا۔“ جلال نے اپنا گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”امام کیسی ہے؟“ جلال نے بات کرتے کرتے اچانک کہا۔ سالار کو لگا وہ اس کا سوال ٹھیک سے سن نہیں سکا۔

”سوری.....“ اس نے معذرت خواہانہ انداز میں استفسار کیا۔ جلال نے اپنا سوال دہرایا۔

”میں امام کا پوچھ رہا تھا۔ وہ کیسی ہے؟“

سالار چلبلیں جھپکاتے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ وہ امام کے بارے میں اس سے کیوں پوچھ رہا تھا۔

”مجھے نہیں پتا یہ تو آپ کو پتا ہونا چاہئے۔“ اس نے کچھ اُلجھے ہوئے انداز میں کندھے جھکتے ہوئے کہا۔

اس بار جلال حیران ہوا۔ ”مجھے کس لئے؟“

”کیونکہ وہ آپ کی بیوی ہے۔“

”میری بیوی؟“ جلال کو جیسے کرٹ لگا۔

”آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری بیوی کیسے ہو سکتی ہے وہ۔ میں نے اس سے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ایک سال پہلے آپ ہی تو آئے تھے اس سلسلے میں مجھ سے بات کرنے کے لئے۔“ جلال نے جیسے اسے کچھ یاد دلایا۔ ”میں نے تو آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ آپ خود اس سے

شادی کر لیں۔“

سالار بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔

”میں تو یہ سوچ کر آپ کے پاس آیا تھا کہ شاید آپ نے اس سے شادی کر لی ہو گی۔“ وہ اب وضاحت کر رہا تھا۔

”آپ نے اس سے شادی نہیں کی؟“ سالار نے پوچھا۔

”نہیں..... آپ سے تو ساری بات ہوئی تھی میں نے انکار کر دیا پھر اس سے میری شادی کیسے ہو سکتی تھی؟ پھر میں نے سنا کہ وہ گھر سے کہیں چلی گئی۔ میں نے سوچا آپ کے ساتھ کہیں چلی گئی ہو گی۔ اسی لئے تو آپ کو کچھ کر آپ کی طرف آیا تھا۔“

”میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ میں تو پچھلے سات آٹھ ماہ سے یہیں ہوں۔“ سالار نے کہا۔

”اور مجھے یہاں آئے دو ماہ ہوئے ہیں۔“ جلال نے بتایا۔

”مجھ سے ملاقات کے بعد کیا اس نے دوبارہ آپ سے رابطہ یا ملاقات کرنے کی کوشش کی تھی؟“

سالار نے کچھ اُلجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”نہیں.....“ وہ مجھ سے نہیں ملی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لاہور جا کر اس نے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔“ سالار کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔

”مجھ سے رابطہ کرنے سے کیا ہوتا؟“

”آپ کے لئے وہ گھر سے نکلی تھی۔ اسے آپ کے پاس جانا چاہئے تھا۔“

”نہیں..... وہ میرے لئے گھر سے نہیں نکلی تھی۔ آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ پھر آپ یہ مت کہیں کہ وہ میرے لئے گھر سے نکلی تھی۔“ جلال کے لہجے میں اچانک کچھ جدلی آ گئی۔ ”ساری بات آپ ہی سے تو ہوئی تھی۔“

”کیا آپ واقعتی سچ کہہ رہے ہیں کہ وہ دوبارہ آپ کے پاس نہیں گئی؟“

”میں آپ سے جھوٹ کیوں یوں گا اور اگر وہ میرے ساتھ ہوتی تو میں آپ کے پاس اس کے بارے میں پوچھنے کیوں آتا۔ مجھے دہرہ ہو رہی ہے۔“ جلال کے لہجے میں اب بے نیازی تھی۔

”آپ مجھے اپنا کانٹیکٹ نمبر دے سکتے ہیں؟“ سالار نے کہا۔

”نہیں..... میں نہیں سمجھتا کہ آپ کو مجھ سے اور مجھے آپ سے دوبارہ رابطے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“ جلال نے بڑی صاف گوئی سے کہا اور واپس مڑ گیا۔

سالار کچھ اُلجھے ہوئے انداز میں اس کی پشت پر نظر میں بنائے رہا یہ ناقابل یقین بات تھی کہ وہ جلال سے نہیں ملی۔ کیوں..... کیا اس نے میری اس بات پر واقعی یقین کر لیا تھا کہ جلال نے شادی کر لی

پر غور کے بغیر کہا۔

”کیا وہ تمہیں فون کیا کرتی تھی؟“

وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ ”گھر سے پہلے جانے کے بعد اس نے صرف ایک بار فون کیا تھا پھر میں یہاں آگیا۔ ہو سکتا ہے اس نے دوبارہ بھی فون کیا ہو جس کے بارے میں آپ مجھے نہیں بتا رہے۔“

”اس نے تمہیں فون نہیں کیا۔ اگر کرتی تو میں تمہاری اور اس کی شادی کے بارے میں بہت سے معاملات کو ختم کر دیتا۔ میں تمہاری طرف سے اسے طلاق دے دیتا۔“

”یہ سب آپ کیسے کر سکتے ہیں۔“

سالار نے بہت پرسکون انداز میں کہا۔

”یہاں تمہیں بھگانے سے پہلے میں نے ایک بیچر پر تمہارے signatures لئے تھے، میں طلاق نامہ تیار کروا چکا ہوں۔“ سکندر نے جانتے ہوئے کہا۔

”fake document (جعلی ڈاکومنٹ)۔“ سالار نے اسی انداز میں تہرہ کیا۔ ”میں تو نہیں جانتا تھا کہ آپ طلاق نامہ تیار کروانے کے لئے مجھ سے سائن کروا رہے ہیں۔“

”تم پھر اس مصیبت کو میرے سر پر لانا چاہتے ہو؟“ سکندر کو ایک دم غصہ آگیا۔

”میں نے یہ نہیں کہا کہ میں اس کے ساتھ رشتہ کو قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو صرف یہ بتا رہا ہوں کہ آپ، میری طرف سے یہ رشتہ ختم نہیں کر سکتے۔ یہ میرا معاملہ ہے میں خود ہی اسے ختم کروں گا۔“

”تم صرف یہ شکر کرو کہ تم اس وقت یہاں اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہو، ورنہ تم نے جس خاندان کو اپنے پیچھے لگا لیا تھا وہ خاندان قبر تک بھی تمہارا پیچھا نہ چھوڑتا اور یہ بھی ممکن ہے وہ یہاں بھی تمہاری نگرانی کروا رہے ہوں۔ یہ انتظار کر رہے ہوں کہ تم مطمئن ہو کر دوبارہ امامہ کے ساتھ رابطہ کرو اور وہ تم دونوں کے لئے ایک کواں تیار کر لیں۔“

”آپ مجھے خواہنا وہ خواہنا خورہ کر رہے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں یہ ماننے پر تیار نہیں ہوں کہ یہاں امریکہ میں کوئی میری نگرانی کر رہا ہو گا اور وہ بھی اتنا عرصہ گزار جانے کے بعد اور دوسری بات یہ کہ میں امامہ کے ساتھ تو کوئی رابطہ نہیں کر رہا کیونکہ میں واقعی نہیں جانتا وہ کہاں ہے، پھر رابطے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تو پھر تمہیں اس کے بارے میں اس قدر کانٹنٹس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ جہاں ہے جیسی ہے رہنے دواتے۔“ سکندر کو کچھ اطمینان ہوا۔

”آپ میرے موبائل کے بل چیک کریں۔ وہ موبائل اس کے پاس ہے۔ ہو سکتا ہے پہلے نہیں تو اب وہ اس سے کالز کرتی ہو۔“

”وہ اس سے کالز نہیں کرتی۔ موبائل مستقل طور پر بند ہے۔ جو چند کالز اس نے کی تھیں وہ سب میڈیکل کالج میں ساتھ پڑھنے والی لڑکیوں کو ہی کی تھیں اور پولیس پہلے ہی انہیں انویسٹی گیٹ کر چکی ہے۔ لاہور میں وہ ایک لڑکی کے گھر گئی تھی مگر وہ لڑکی پشاور میں تھی اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی وہ اس کے گھر سے چلی گئی، کہاں گئی، یہ پولیس کو پتا نہیں چل سکا۔“

سالار جھپتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”آپ کو حسن نے میرے اور اس کے بارے میں بتایا تھا؟“

سکندر کچھ بول نہیں سکے۔ موبائل کے امامہ کے پاس ہونے کے بارے میں صرف حسن ہی جانتا تھا۔ کم از کم یہ ایسی بات تھی جو سکندر عثمان صرف اس کے کمرے کی ملاشی لے کر نہیں جان سکتے تھے۔ اسے ان سے بات کرتے تو بے پہلی بار اچانک حسن پر شبہ ہوا تھا کیونکہ سکندر عثمان کو اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا پتا تھا جو صرف اسے پتا تھا یا پھر حسن کو۔۔۔ کوئی تیسرا ان سے واقف نہیں تھا۔ اس نے سکندر عثمان کو کچھ نہیں بتایا تھا تو یقینی طور پر یہ حسن ہی ہو سکتا تھا جس نے انہیں ساری تفصیلات سے آگاہ کیا تھا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مجھے حسن نے بتایا ہے یا کسی اور نے۔۔۔ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ اس بات کے بارے میں مجھے پتا نہ چلا۔ یہ صرف میری حماقت تھی کہ میں نے ہاشم مبین کے الزامات کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور تمہارے جھوٹ پر یقین کر لیا۔“

سالار نے کچھ نہیں کہا، وہ صرف ماتھے پر تیوریاں لے انہیں دیکھتا اور ان کی بات سنتا رہا۔ ”اب جب میں نے تمہیں اس سارے معاملے سے بچا لیا ہے تو تمہیں دوبارہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی چاہئے جس سے۔“

سکندر عثمان نے قدرے نرم لہجے میں کہنا شروع کیا مگر اس سے پہلے کہ ان کی بات مکمل ہوتی سالار ایک جھپٹے سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

سکندر عثمان کے ساتھ ہونے والی اس گفتگو کے بعد وہ ساری رات اس تمام معاملے کے بارے میں سوچتا رہا۔ پہلی بار اسے پلاکسا فوس اور بچھتاوا ہوا تھا۔ اسے امامہ ہاشم کو اس کے کہنے پر فوراً طلاق دے دینی چاہئے تھی پھر شاید وہ جلال کے پاس چلی جاتی اور وہ دونوں شادی کر لیتے۔ امامہ کے لئے بے حد ناپسندیدگی رکھنے کے باوجود اس نے پہلی بار اپنی غلطی تسلیم کی۔

”اس نے دوبارہ مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ وہ طلاق لینے کے لئے کورٹ نہیں گئی۔ اس کے خاندان والے بھی ابھی تک اسے ڈھونڈ نہیں سکے۔ وہ جلال انصر کے پاس بھی نہیں گئی تو پھر آخر وہ گئی کہاں، کیا اس کے ساتھ کوئی حادثہ۔۔۔؟“

ہے؟ سالار کو اپنا جھوٹ یاد آیا مگر یہ کیسے ممکن ہے وہ مزید الجھا۔ میری بات پر اسے یقین کیسے آسکتا ہے جبکہ وہ کہہ بھی رہی تھی کہ اسے میری بات پر یقین نہیں ہے۔
وہ کرسی کھینچ کر دوبارہ بیٹھ گیا۔

اور اگر جلال کے پاس نہیں گئی تو پھر وہ کہاں گئی۔ کیا کسی اور شخص کے پاس؟ جس سے اس نے مجھے بے خبر رکھا، مگر یہ ممکن نہیں ہے اگر کوئی اور ہوتا تو وہ مجھے اس سے بھی رابطہ کرنے کے لئے کہتی۔ اگر وہ فوری طور پر جلال کے پاس نہیں بھی گئی تھی تو سکندر سے نکاح نامہ لینے اور طلاق کے حق کے بارے میں جاننے کے بعد اسے اسی کے پاس جانا چاہئے تھا، وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے جلال کی اس فرضی شادی کے بارے میں اسے کیوں بتایا۔ شاید وہ اسے پریشان کرنا چاہتا تھا یا پھر یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اب کیا کرے گی یا پھر شاید وہ بار بار اس کے اس مطالبے سے نکل آ گیا تھا کہ وہ پھر جلال کے پاس جائے، پھر جلال سے رابطہ کرے، وہ ایسا کرنے کی وجہ نہیں جانتا تھا، جو بھی تھا بہر حال اسے یقین تھا امامہ جلال کے پاس جائے گی۔

مگر سالار کو اب یہ پتا تھا کہ اس کی توقع یا اندازے کے برعکس وہ وہاں گئی ہی نہیں۔

ویز اب کھانا سرو کر رہا تھا، اس کا کزن آچکا تھا، وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے کھانا کھاتے رہے مگر سالار کھانا کھاتے اور باتیں کرتے ہوئے بھی مسلسل امامہ اور جلال کے بارے میں سوچتا رہا۔ کئی ماہ بعد یکدم وہ اس کے ذہن میں پھر تازہ ہو گئی تھی۔

”کیوں ایسا تو نہیں کہ وہ وہاں اپنے گھر واپس چلی گئی ہو؟“ کھانا کھاتے کھاتے اسے اچانک خیال آیا۔
”ہاں یہ ممکن ہے۔“ اس کا ذہن متواتر ایک ہی جگہ لگا ہوا تھا۔ ”مجھے پاپا سے بات کرنی چاہئے۔ انہیں یقیناً اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ پتا ہو گا۔“ سکندر عثمان بھی ان دنوں شادی میں شرکت کی غرض سے وچیں تھے۔

واپس گھر آنے کے بعد رات کے قریب جب اس نے سکندر کو حجاز دیکھا تو اس نے ان سے امامہ کے بارے میں پوچھا۔

”پاپا! کیا امامہ واپس اپنے گھر آگئی ہے؟“ اس نے کسی تہیہ کے بغیر سوال کیا۔

اور اس کے سوال نے کچھ دیر کے لئے سکندر کو خاموش رکھا۔

”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ چند لمحوں کے بعد انہوں نے درشتی سے کہا۔

”بس ایسے ہی۔“

”اس کے بارے میں اتنا غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی اسٹڈیز پر اپنا دھیان رکھو تو بہتر ہے۔“

”پاپا پلیز! آپ میرے سوال کا جواب دیں۔“

”کیوں جواب دوں۔ تمہارا اس کے ساتھ تعلق کیا ہے؟“ سکندر کی ناراضی میں اضافہ ہو گیا۔

”پاپا اس کا ایک بوائے فرینڈ مجھے آج ملا ہے یہاں، وہی جس کے ساتھ وہ شادی کرنا چاہتی تھی۔“

”تو پھر.....؟“

”تو پھر یہ کہ ان دونوں نے شادی نہیں کی۔ وہ تیار ہوا تھا کہ امامہ اس کے پاس گئی ہی نہیں۔ جب کہ

میں سمجھ رہا تھا کہ لاہور جانے کے بعد وہ اسی کے پاس گئی ہوگی۔“

سکندر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”وہ اس کے پاس گئی یا نہیں۔ اس نے اس سے شادی کی یا نہیں۔

یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ نہ ہی تمہیں اس میں انوکھو ہونے کی ضرورت ہے۔“

”ہاں یہ میرا مسئلہ نہیں ہے مگر میں جانا چاہتا ہوں کیا امامہ آپ کے پاس آئی تھی؟ آپ نے

اسے شادی کے بیچ رکھیں بھجوائے تھے۔ میرا مطلب کس کے ذریعے۔“ سالار نے کہا۔

”تم سے کس نے کہا کہ اس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا؟“

وہ ان کے سوال پر حیران ہوا۔ ”میں نے خود اندازہ لگایا۔“

”اس نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا اور رابطہ کرتی تو میں ہاشم مبین کو اس کے بارے میں بتا دیتا۔“

سالار ان کا چہرہ دیکھتا رہا۔ ”میں نے تمہارے کمرے کی تلاش کی تھی اور میرے ہاتھ وہ نکاح نامہ

لگ گیا۔“

”مجھے یہاں بھجواتے ہوئے آپ نے کہا تھا کہ آپ وہ بیچہ زامامہ تک بھجوا دیں گے۔“

”ہاں۔۔۔ یہ اس صورت میں ہوتا اگر وہ مجھ سے رابطہ کرتی مگر اس نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔

تمہیں یہ یقین کیوں ہے کہ اس نے مجھ سے ضرور رابطہ کیا ہو گا۔“ اس بار سکندر نے سوال کر ڈالا۔

سالار کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے پوچھا۔

”پولیس کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا؟“

”نہیں، پولیس کو پتا چلنا تو اب تک وہ ہاشم مبین کے گھر واپس آچکی ہوتی مگر پولیس ابھی بھی اس

کی تلاش میں ہے۔“ سکندر نے کہا۔

”ایک بات تو طے ہے سالار کہ اب تم دوبارہ امامہ کے بارے میں کوئی تلاش نہیں کرو گے۔ وہ

جہاں ہے جس حال میں ہے تمہیں اپنا دماغ تھکانے کی ضرورت نہیں، تمہارا اس کے ساتھ کوئی تعلق

نہیں ہے۔ پولیس جیسے ہی اسے ڈھونڈے گی میں وہ بیچہ زامامہ مبین تک پہنچا دوں گا، تاکہ تمہاری جان

بہیش کے لئے اس سے چھوٹ جائے۔“

”پاپا! کیا اس نے واقعی کبھی گھر فون نہیں کیا مجھ سے بات کرنے کے لئے۔“ سالار نے ان کی بات

وہ پہلی بار بہت سنجیدگی سے، کسی ناراضی یا غصے کے بغیر اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔
 ”یہ تو ممکن نہیں ہے کہ وہ مجھ سے اتنی شدید نفرت اور ناپسندیدگی رکھے کہ بعد میں میری بیوی کے طور پر کہیں خاموشی کی زندگی گزار رہی ہو، پھر آخر کیا وجہ ہے کہ امامہ کسی کے ساتھ بھی دوبارہ رابطہ نہیں کر رہی۔ اب تک جب ایک سال سے زیادہ گزر گیا ہے کیا وہ واقعی حادثے کا شکار ہو گئی ہے؟ کیا حادثہ پیش آسکتا ہے؟“

اس کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کی ذہنی روایک بار پھر نکلنے لگی۔

”اگر کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے تو میں کیا کروں۔ وہ اپنے رسک پر گھر سے نکلی تھی اور حادثہ تو کسی کو کسی بھی وقت پیش آسکتا ہے پھر مجھے اس کے بارے میں اتنا فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ پایا ٹھیک کہتے ہیں جب میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر مجھے اس کے بارے میں اتنا تجسس بھی نہیں رکھنا چاہئے۔ خاص طور پر ایک ایسی لڑکی کے بارے میں جو اس حد تک احسان فراموش ہو جو اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھتی ہو اور جو مجھے اتنا گھٹیا سمجھتی ہو اس کے ساتھ جو بھی ہو ابو کا ٹھیک ہی ہوا ہو گا وہ اسی قابل تھی۔“

اس نے اس کے بارے میں ہر خیال کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔

کچھ دیر پہلے کی سانسف آمیز سنجیدگی وہ اب محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اسے اب کسی قسم کے بچھتاوے کا احساس تھا۔ وہ ویسے بھی چھوٹی موٹی باتوں پر بچھتاوے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے سکون کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں اس کے ذہن میں اب دور دور تک کہیں امامہ ہاشم کا تصور موجود نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

”کیسی Vandame لگے ہو؟“ اس دن یونیورسٹی سے نکلنے ہوئے مائیک نے سالار سے پوچھا۔

”ایک دفعہ۔“

”کیسی جگہ ہے؟“ مائیک نے سوال کیا۔

”بری نہیں ہے۔“ سالار نے تبصرہ کیا۔

”اس ویک اینڈ پر وہاں چلتے ہیں۔“

”کیوں.....؟“ میری گرل فرینڈ کو بہت دلچسپی ہے اس جگہ میں۔ وہ اکثر جاتی ہے۔“ مائیک نے کہا۔

”تو تمہیں تو پھر اس کے ساتھ ہی جانا چاہئے۔“ سالار نے کہا۔

”نہیں سب لوگ چلتے ہیں، زیادہ مزہ آنے گا۔“ مائیک نے کہا۔

”سب لوگوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ اس بارہ دانش نے گفتگو میں حصہ لیا۔

”چھتے دوست بھی ہیں۔ سب۔“

”میں، سالار، تم، سٹیجی اور سعد۔“

”سعد کو رہنے دو۔ وہ ہنٹ کلب کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگانے لگے گا پھر ایک لمبا چوڑا وعظ دے گا۔“ سالار نے مداخلت کی۔

”تو پھر ٹھیک ہے ہم لوگ ہی چلتے ہیں۔“ دانش نے کہا۔

”سینڈرا کو بھی انوائٹ کر لیتے ہیں۔“ سالار نے اپنی گرل فرینڈ کا نام لیا۔

اس ویک اینڈ پر سب وہاں گئے اور تین چار گھنٹوں تک انہوں نے وہاں خوب انجوائے کیا۔ اگلے روز سالار صبح دیر سے اٹھا۔ وہ ابھی کچھ کی تیاری کر رہا تھا جب سعد نے اسے فون کیا۔

”ابھی اٹھے ہو؟“ سعد نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

”ہاں دس منٹ پہلے۔“

”رات کو دیر تک باہر رہے ہو گے۔ اس لئے.....“ سعد نے اندازہ لگایا۔

”ہاں..... ہم لوگ باہر گئے ہوئے تھے۔“ سالار نے دانستہ طور پر ہنٹ کلب کا نام نہیں لیا۔

”ہم لوگ کون.....؟ تم اور سینڈرا؟“

”نہیں پورا گروپ ہی۔“ سالار نے کہا۔

”پورا گروپ.....؟ مجھے لے کر نہیں گئے۔ میں مر گیا تھا؟“ سعد نے چڑ کر کہا۔

”تمہارا خیال ہی نہیں آیا ہمیں۔“ سالار نے اطمینان سے کہا۔

”بہت گھٹیا آدمی ہو تم سالار، بہت ہی گھٹیا..... یہ دانش بھی کیا تھا؟“

”ہم سب مائی ڈیر ہم سب.....“ سالار نے اسی اطمینان کے ساتھ کہا۔

”مجھے کیوں نہیں لے کر گئے تم لوگ؟“ سعد کی غلطی میں کچھ اور اضافہ ہوا۔

”تم ابھی بیٹے ہو۔ ہر جگہ بچوں کو لے کر نہیں جاسکتے۔“ سالار نے شرارت سے کہا۔

”میں ابھی آکر تمہاری ٹانگیں توڑتا ہوں، پھر تمہیں اندازہ ہو گا کہ یہ بچہ بڑا ہو گیا ہے۔“

”مذاق نہیں کر رہا ہوں..... ہم نے تمہیں ساتھ جانے کو اس لئے نہیں کہا کیونکہ تم جانتے ہی نہیں۔“

اس بار سالار واقعی سنجیدہ ہوا۔

”کیوں تم لوگ دوزخ میں جا رہے تھے کہ میں وہاں نہ جاتا۔“ سعد کے غصے میں کوئی کمی نہیں آئی۔

”کم از کم تم اسے دوزخ ہی کہتے۔ ہم لوگ نائٹ کلب گئے ہوئے تھے اور تم کو وہاں نہیں جانا تھا۔“

”کیوں مجھے وہاں کیوں نہیں جانا تھا۔“ سعد کے جواب نے سالار کو کچھ حیران کیا۔

”تم ساتھ چلتے؟“

”آف کورس.....“

”مگر تمہیں وہاں جا کر کیا کرنا تھا..... نہ تم ڈر تک کرتے ہو نہ تم ڈانس کرتے ہو..... پھر وہاں جا کر تم کیا کرتے..... ہمیں نصیحتیں کرتے۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہے ڈر تک اور ڈانس نہیں کرتا، مگر آؤنگک تو ہو جاتی۔ میں انجوائے کرتا۔“ سعد نے کہا۔

”مگر ایسی جگہوں پر جانا اسلام میں جائز نہیں ہے؟“ سالار نے پچھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ سعد چند لمبے کچھ نہیں کہہ سکا۔

”میں وہاں کوئی فلاح کام کرنے تو نہیں جا رہا تھا، تم سے کہہ رہا ہوں صرف آؤنگک کی غرض سے جاتا۔“ چند لمحوں بعد اس نے قدر سنہٹتے ہوئے کہا۔

”او کے اگلی بار ہمارا پروگرام بنے گا تو تمہیں بھی ساتھ لے لیں گے بلکہ مجھے پہلے چاہتا تو کل رات بھی تمہیں ساتھ لے لیتا ہم سب نے واقعی بہت انجوائے کیا۔“ سالار نے کہا۔

”چلو اب میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ خیر آج کیا کر رہے ہو؟“ سعد اب اس سے معمول کی باتیں کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ تک ان دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی رہی پھر سالار نے فون بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

”تم اس ویک اینڈ پر کیا کر رہے ہو؟“ اس دن سعد نے سالار سے پوچھا۔ وہ یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں موجود تھے۔

”میں اس ویک اینڈ پر نیویارک جا رہا ہوں، سینڈرا کے ساتھ۔“ سالار نے اپنا پروگرام بتایا۔

”کیوں.....؟“ سعد نے پوچھا۔

”اس کے بھائی کی شادی ہے۔ مجھے انوائٹ کیا ہے اس نے۔“

”واپس کب آؤ گے؟“

”اتوار کی رات کو۔“

”تم ایسا کر دو کہ اپنے پارٹنر کی چالی مجھے دے جاؤ۔ میں دو دن تمہارے پارٹنر پر گزاروں گا، کچھ اسٹیمپس ہیں جو مجھے تیار کرنے ہیں اور اس ویک اینڈ پر وہ چاروں ہی گھر ہوں گے۔ وہاں بڑا ارش ہو گا میں تمہارے پارٹنر میں اطمینان سے پڑھ لوں گا۔“ سعد نے کہا۔

”او کے تم میرے پارٹنر میں رہ لیتا۔“ سالار نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

اسے سینڈرا کے ساتھ جمعہ کی رات کو ٹھکانا تھا۔ سالار کا بیگ اس کی گاڑی کی ڈکی میں تھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ سینڈرا کو مین آخری وقت میں چند کام بنانے پڑ گئے اور وہ جو سر شام نکلنے کا ارادہ کے بیٹھے تھے ان کا پروگرام نکلنے کی صبح تک ملتوی ہو گیا۔ سینڈرا اپنے انگ گیسٹ کے طور پر کہیں رہتی تھی اور وہ اس

کے پاس رات نہیں گزار سکتا تھا۔ اسے اپنے پارٹنر واپس آنا پڑا۔

رات کو تقریباً یکادو بجے سینڈرا کو اس کی رہائش گاہ پر ڈراپ کرنے کے بعد وہ اپنے پارٹنر چلا آیا۔ اس نے سعد کو ایک چابی دی تھی۔ دوسری چابی اس کے پاس ہی تھی وہ جانتا تھا کہ سعد اس وقت بیٹھا پڑھ رہا ہو گا مگر اس نے اسے ڈسٹرب کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ پارٹنر کا بیرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا، لوگ روم کی لائٹ آن تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا وہ اپنے بیڈ روم میں جانا چاہتا تھا مگر بیڈ روم کے دروازے پر ہی رُک گیا۔

بیڈ روم کا دروازہ بند تھا مگر اس کے باوجود اندر سے آنے والے قبضے اور ہاتھوں کی آوازیں سن سکتا تھا۔ سعد کے ساتھ اندر کوئی عورت تھی۔ وہ جاہد ہو گیا۔ اس کے گروپ میں صرف سعد تھا جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ کسی لڑکی کے ساتھ اس کے تعلقات نہیں تھے۔ وہ جتنا مذہبی آدمی تھا اس سے یہ توقع کی ہی نہیں جاسکتی تھی وہ اندر داخل نہیں ہوا۔ قدرے بے چینی سے واپس مڑ گیا اور تب اس کی نظر لوگ روم کی ٹیبل پر رکھی بوتل اور گلاس پر پڑی، وہاں سے کچن کا ڈسٹر جہاں کھانے کے برتن ابھی تک پڑے ہوئے تھے۔ وہ مزید وہاں رُک کے بغیر اسی طرح خاموشی سے وہاں سے نکل آیا۔

اس کے لئے یہ بات ناقابل یقین تھی کہ سعد وہاں کسی لڑکی کے ساتھ رہنے کے لئے آیا تھا۔ بالکل ناقابل یقین..... جو شخص حرام گوشت نہ کھاتا ہو۔ شراب نہ پیتا ہو، پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہو، ہر وقت اسلام کی بات کرتا رہتا ہو، دوسروں کو اسلام کی تبلیغ کرتا ہو، وہ کسی لڑکی کے ساتھ..... پارٹنر کے دروازے کو باہر سے بند کرتے ہوئے وہ اسی طرح شاک کے عالم میں تھا..... بوتل اور گلاس تو یہی ظاہر کر رہے تھے کہ اس نے پی بھی ہو گی اور شاید کھانا وغیرہ بھی کھایا ہو گا۔ اسی فریج اور کچن میں جہاں کا وہ پانی تنگ پینے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ اسے قہمی آ رہی تھی، جو اپنے آپ کو جتنا اچھا اور سچا مسلمان ظاہر کرنے یا اپنے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے وہ اتنا بڑا فراڈ ہوتا ہے۔ ایک یہ شخص تھا جو یوں ظاہر کرتا تھا جیسے پورے امریکہ میں ایک ہی مسلمان ہے اور ایک وہ لڑکی تھی امام..... جو ٹینٹ جتنی بڑی چادر اوڑھتی تھی اور کردار اس کا یہ تھا کہ ایک لڑکے کے لئے گھر سے بھاگ گئی..... اور بننے پھرتے ہیں سچے مسلمان۔“ نیچے اپنی گاڑی میں آکر بیٹھے ہوئے اس نے کچھ حنجر سے سوچا۔ ”مناقت اور جھوٹ کی حد ان پر ختم ہو جاتی ہے۔“

وہ گاڑی پارکنگ سے نکالتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا، اس وقت وہ سینڈرا کے پاس نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے دانش کے پاس جانے کا فیصلہ کیا وہ اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ سالار نے یہاں بتا دیا کہ وہ یور ہو رہا تھا اس لئے اس نے دانش کے پاس آنے اور رات وہاں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ دانش مطمئن ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اتوار کی رات کو جب وہ واپس ہوئی تو اپنے پارٹنرٹنٹ آیا تو سعد وہاں نہیں تھا، اس کے قلیب میں کہیں بھی ایسے آثار نہیں تھے جس سے یہ پتا چلتا کہ وہاں کوئی عورت آئی تھی، واٹن کی وہ بوتل بھی اسے کہیں نہیں ملی۔ وہ ڈیرلب مسکراتا ہوا پورے پارٹنرٹنٹ کا تفصیلی جائزہ لیتا رہا۔ وہاں موجود ہر چیز ویسے ہی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ سالار نے اپنا سامان رکھنے کے بعد سعد کو فون کیا۔ کچھ دیر رہی باتیں کرتے رہنے کے بعد وہ موضوع پر آگیا۔

”پھر اچھی رہی تمہاری اسٹڈیز۔۔۔ اسائنمنٹ بن گئے؟“

”ہاں یار! میں تو دو دن اچھا خاصا پڑھتا رہا۔ اسائنمنٹس تقریباً مکمل کر لی ہیں۔ تم بتاؤ تمہارا ٹرپ کیسا رہا؟“ سعد نے جواباً پوچھا۔

”بہت اچھا۔۔۔“

”کتنی دیر میں پہنچ گئے تھے وہاں، رات کو سڑک کرتے ہوئے کوئی پرائلم تو نہیں ہوئی؟“

سعد نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

”نہیں رات کو سڑک نہیں کیا؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ فریڈ سے کی رات کو نہیں سٹریڈے کی صبح گئے تھے ہم لوگ وہاں۔“ سالار نے بتایا۔

”تم پھر سیڈر راکی طرف رہے تھے؟“

”نہیں واٹن کے پاس۔“

”کیوں یہاں آجاتے اپنے پارٹنرٹنٹ پر۔“

”آیا تھا۔“ سالار نے بڑے اطمینان سے کہا۔

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ سالار دل ہی دل میں ہنسا۔ سعد کے جیروں کے نیچے سے بیٹینا اس وقت زمین نکل گئی تھی۔

”آئے تھے.....؟ کب.....؟“ اس بار وہ بے اختیار ہلکایا۔

”کیا وہ بیچے کے قریب۔۔۔ تم اس وقت کسی لڑکی کے ساتھ مصروف تھے۔ میں نے تم لوگوں کو

ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے وہاں سے واپس آگیا۔“

وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ سعد پر اس وقت سخت طاری ہو چکا ہو گا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ

سکتا تھا کہ سالار اس طرح اس کا بھانڈا پھوڑوے گا۔

”ویسے تم نے کبھی اپنی گرل فرینڈ سے ملوایا نہیں۔“ اس نے مزید کہا۔ سعد کو سانس لینے میں جتنی

وقت ہو رہی ہو گی وہ اندازہ کر سکتا تھا۔

”بس ویسے ہی۔ ملوادوں گا۔“ اس نے دوسری طرف سے بے حد مدہم اور معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

”مگر تم کسی اور سے اس کا ذکر مت کرنا۔“ اس نے ایک ہی سانس میں کہا۔

”میں کیوں ذکر کروں گا، جنہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

سالار اس کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔ اسے اس وقت سعد پر کچھ ترس بھی آ رہا تھا۔

اس رات سعد نے چند منٹوں بعد ہی فون رکھ دیا۔ سالار کو اس کی شرمندگی کا اچھی طرح اندازہ تھا۔

اس واقعے کے بعد سالار کا خیال تھا کہ سعد دوبارہ کبھی اس کے سامنے اپنی مذہبی عقیدت اور

واپسگئی کا ذکر نہیں کرے گا مگر اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ سعد میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ اب

بھی اسی شد و حد سے مذہب پر بات کرتا۔ دوسروں کو ٹوک دیتا۔ نصیحتیں کرتا۔ نماز پڑھنے کی ہدایت دیتا۔

صدقہ، خیرات دینے کے لئے کہتا۔ اللہ سے محبت کے بارے میں گفتگوں بولنے کے لئے تیار رہتا اور

مذہب کے بارے میں بات کر رہا ہوتا تو کسی آیت یا حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو

بھی آجاتے۔

اس کے گروپ کے لوگوں کے ساتھ اور بہت سے لوگ سعد سے بہت متاثر تھے اور اس کے

کردار سے بہت مرعوب۔۔۔ اور اللہ سے اس کی محبت پر رشک کا شکار، ایک مثالی مسلم۔ جوانی کی

مصروف زندگی میں بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ سعد بات کرنا جانتا تھا اس کا انداز بیان بے حد

متاثر کن تھا۔ اور اس کے سنا سنا لوگوں میں صرف سالار تھا، جس پر اس کی فصاحت کوئی اثر نہیں کرتی تھی

جو اس سے ذرا برابر بھی متاثر نہیں تھا اور نہ ہی کسی رشک کا شکار۔۔۔ جسے سعد کی ڈاڑھی اس کی دین کے

لئے استقامت کا یقین دلانے میں کامیاب ہوئی تھی نہ ہی دوسروں کے لئے اس کا ادب و احترام، اس کا

زہم انداز گفتگو۔

امام سے مذہبی لوگوں کے لئے اس کی ناپسندیدگی کا آغاز ہوا تھا۔ جلال نے اسے آگے بڑھایا تھا

اور سعد نے اسے انتہا پر پہنچا دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مذہبی لوگوں سے بڑھ کر منافق کوئی دوسرا نہیں

ہوتا۔ ڈاڑھی رکھنے والا مرد اور پردہ کرنے والی عورت کسی بھی قسم کی بلکہ ہر قسم کی برائی کا شکار ہوتے

ہیں اور ان لوگوں سے زیادہ جو خود کو مذہبی نہیں کہتے۔

اتفاق سے ملنے والے تینوں لوگوں نے اس یقین کو مستحکم کیا۔ امام ہاشم، پردہ کرنے والی لڑکی اور

ایک لڑکے کے لئے اپنے منگیترا، اپنے خاندان، اپنے گھر کو چھوڑ کر رات میں فرار ہو جانے والی لڑکی۔

جمال انصر۔۔۔ ڈاڑھی والا مرد، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں سرشار ہو کر نعیتیں پڑھنے

والا اور ایک لڑکی سے انہیں چلانے والا اور پھر اسے سچ راستے میں چھوڑ کر ایک طرف ہو جانے والا، پھر

دین الگ، دنیا الگ رکھ کر بات کرنے والا۔ سعد ظفر کے بارے میں اس کی رائے ایک اور واقعہ سے اور خراب ہوئی۔

وہ ایک دن اس کے پارٹمنٹ پر آیا ہوا تھا۔ سالار اس وقت کمپیوٹر آن کئے اپنا کام کرتے ہوئے اس سے باتیں کرنے لگا، پھر اسے کچھ چیزیں لانے کے لئے اپنے پارٹمنٹ سے قریبی مارکیٹ جانا پڑا اور اسے پیدل وہاں آنے جانے اور شاپنگ کرنے میں تیس منٹ لگے تھے۔ سعد اس کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ جب سالار واپس آیا تو سعد کمپیوٹر پر چٹانگ میں مصروف تھا۔ وہ کچھ دیر مزید اس کے پاس بیٹھا، گپ شپ کرتا رہا پھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سالار نے لٹچ کیا اور ایک بار پھر کمپیوٹر پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ بھی کچھ دیر چٹانگ کرنا چاہتا تھا اور یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اس نے لاشعوری طور پر کمپیوٹر چلاتے ہوئے اس کی ہسٹری دیکھی۔ وہاں ان ویب سائٹس اور میگزین کی تفصیلات تھیں جو کچھ دیر پہلے اس نے یا سعد نے دیکھی تھیں۔

سعد نے جن چند ویب سائٹس کو دیکھا تھا وہ پور لوگ رانی سے متعلق تھیں۔ اسے اپنے کسی دوسرے دوست کے ان میگزین دیکھنے پر یا ان ویب سائٹس کو وزٹ کرنے پر حیرت ہوتی نہ اعتراض..... وہ خود ایسی ویب سائٹس کا وزٹ کرتا رہتا تھا مگر سعد کے ان ویب سائٹس کو وزٹ کرنے پر اسے حیرت ہوتی تھی۔ اس کی نظروں میں وہ کچھ اور نیچے آ گیا تھا۔

☆.....☆

”پھر تمہاری کیا پلاننگ ہے؟ پاکستان آنے کا ارادہ ہے؟“

وہ اس دن فون پر سکندر سے بات کر رہا تھا۔ سکندر نے اسے بتایا تھا کہ وہ طیبہ کے ساتھ کچھ ہفتوں کے لئے آسٹریلیا جا رہے ہیں۔ انہیں وہاں اپنے رشتہ داروں کے ہاں ہونے والی شادی کی کچھ تقریبات میں شرکت کرنی تھی۔

”آپ دونوں وہاں نہیں ہوں گے تو میں پاکستان آکر کیا کروں گا۔“ اسے مایوسی ہوئی۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ تم بہن بھائیوں سے ملنا، امتیاز تمہیں بہت مس کر رہی ہے۔“ سکندر نے کہا۔

”پاپا! میں ادھر ہی چھٹیاں گزاروں گا۔ پاکستان آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہمارے ساتھ آسٹریلیا چلو، معیار بھی جا رہا ہے۔“ انہوں نے اس کے بڑے بھائی کا نام لیتے ہوئے کہا۔

”میرا دل خراب نہیں ہے کہ میں اس طرح منہ اٹھا کر آپ کے ساتھ آسٹریلیا چلوں۔ معیار کے ساتھ میری کون سی اذرا سٹیڈنگ ہے، جو آپ مجھے اس کے جانے کا بتا رہے ہیں۔“ اس نے خاصی جہاز کے ساتھ کہا۔

”میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا اگر تم وہیں رہنا چاہتے ہو تو ایسا ہی کسی بس اپنا خیال رکھنا اور دیکھو سالار کوئی غلط کام مت کرنا۔“

انہوں نے اسے حسیبی کی۔ وہ اس غلط کام کی نوعیت کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا اور وہ یہ جملہ سننے کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اب اگر سکندر ہر بار فون بند کرنے سے پہلے اس سے یہ جملہ نہ کہتے تو اسے حیرت ہوتی۔

سکندر سے بات کرنے کے بعد اس نے فون کر کے اپنی سیٹ کینسل کر وادی۔ فون کارڈ ریسیور رکھنے کے بعد صوفے پر چٹ لینا چھت کو گھورتے ہوئے وہ یونیورسٹی بند ہونے کے بعد اگلے کچھ ہفتوں کی مصروفیات کے بارے میں سوچتا رہا۔

”مجھے چند دن سکینگ (skiing) کے لئے کہیں جانا چاہئے یا پھر کسی دوسری اسٹیٹ کو وزٹ کرنا چاہئے۔“ وہ منصوبہ بنانے لگا۔ ”ٹھیک ہے میں کل یونیورسٹی سے واپسی کسی ٹور آپریٹر سے ملوں گا۔ باقی کا پروگرام وہیں طے کروں گا۔“ اس نے فیصلہ کیا۔

اگلے دن اس نے ایک دوست کے ساتھ مل کر سکینگ کے لئے جانے کا پروگرام طے کر لیا۔ اس نے سکندر اور اپنے بڑے بھائی کو اپنے پروگرام کے بارے میں بتا دیا۔

چھٹیاں شروع ہونے سے ایک دن پہلے اس نے ایک انڈین ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا، وہ کھانا کھانے کے بعد بھی کافی دیر تک وہاں بیٹھا رہا پھر وہ ایک قریبی باب میں چلا گیا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھنے کے دوران اس نے وہاں چند پیگ پیچے۔

رات دس بجے کے قریب ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسے اچانک محسوس ہونے لگی۔ گاڑی روک کر وہ کچھ دیر کے لئے سڑک کے گرد پھیلے ہوئے بڑے پر چلے لگا۔ سرد ہوا اور خشکی نے کچھ دیر کے لئے اسے نارمل کر دیا مگر چند منٹوں کے بعد ایک بار پھر اسے محسوس ہونے لگی۔ اسے اب اپنے سینے اور پیٹ میں ہلکا ہلکا درد بھی محسوس ہو رہا تھا۔

یہ کمانے کا اثر تھا یا پیگ کا۔ فوری طور پر اسے اندازہ نہیں ہوا۔ اب اس کا سر بری طرح پکڑا رہا تھا۔ یک دم جھکتے ہوئے اس نے بے اختیار تھکے کی اور پھر چند منٹ اسی طرح جھکا رہا۔ معدہ خالی ہو جانے کے بعد بھی اس کو اپنی حالت بہتر محسوس نہیں ہوئی۔ سیدھا کھڑے رہنے کی کوشش میں اس کے سر لڑکھائے۔ اس نے سڑک اپنی گاڑی کی طرف جانے کی کوشش کی مگر اس کا سر اب پہلے سے زیادہ پکڑا رہا تھا۔ چند گز دور کھڑی گاڑی کو دیکھنے میں بھی اسے دقت ہو رہی تھی۔ اس نے بمشکل چند قدم اٹھائے مگر گاڑی کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ پکڑا کر زمین پر گر پڑا اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

کھل طور پر ہوش کھونے سے پہلے اس نے کسی کو اپنے آپ کو جھجھوڑتے محسوس کیا۔ کوئی بلند آواز میں اس کے قریب کچھ کہہ رہا تھا، آوازیں ایک سے زیادہ تھیں۔ سالار نے اپنے سر کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے سر کو حرکت نہیں دے سکا۔ اس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش بھی ناکام رہی۔ وہ اب کھل طور پر تاریکی میں جا چکا تھا۔

☆.....☆

اس نے دو دن ہاسپٹل میں گزارے تھے۔ وہاں سے گاڑی میں گزرنے والے کسی جوڑے نے اسے گرتے دیکھا تھا اور وہی اسے اٹھا کر ہاسپٹل لے آئے تھے۔ ڈاکٹرز کے مطابق وہ فوڈ پوزاٹنگ کا شکار ہوا تھا۔ وہ ہاسپٹل آنے کے چند گھنٹوں کے بعد ہوش میں آ گیا تھا اور وہاں سے چلے جانے کی خواہش رکھنے کے باوجود وہ جسمانی طور پر اپنے آپ کو اتنی بری حالت میں محسوس کر رہا تھا کہ وہاں سے جا نہیں سکا۔ اگلے دن شام تک اس کی حالت کچھ بہتر ہونے لگی مگر ڈاکٹر کی ہدایت پر سالار نے دو رات بھی وہیں گزار دی۔ اتوار کو سہ پہر کے قریب وہ گھر آ گیا تھا اور گھر آتے ہی اس نے فوراً آپ بٹر کے ساتھ ملے پا جانے والا پروگرام چند دقوں کے لئے ملتوی کر دیا۔ اسے بھر کو صبح لگنا تھا اور اس نے ملے کیا تھا کہ جانے سے پہلے وہ ایک بار پھر سینڈ راکو کال کرے گا لیکن اب پروگرام کنسل کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اس کو بلا لگا۔ اپنے کسی بھی دوست کو کال کرنے کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔

ایک جگہ پھینکے سینڈ ویج کے ساتھ کافی کا ایک کپ پینے کے بعد اس نے سکون آور دہانی اور سونے کے لئے چلا گیا۔ اگلے دن جب اس کی آنکھ کھلی اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ سالار کو نیند سے بیدار ہوتے ہی سر میں شدید درد کا احساس ہوا۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر اس نے اپنا ہاتھ اور جسم چھوا، اس کا ہاتھ بہت زیادہ گرم تھا۔ "کم آن!" وہ بیزار سی سے بڑبڑایا۔ جھپٹے دو دن کی بیماری کے بعد وہ اگلے دو دن بستر پر پڑے ہوئے نہیں گزارنا چاہتا تھا اور اس وقت اسے اس کے آثار نظر آرہے تھے۔

جوں توں بیڈ سے نکل کر وہ منہ ہاتھ دھوئے بغیر ایک بار پھر بکن میں آ گیا کافی بننے کے لئے رکھ کر وہ آکر answerphone پر ریکارڈ کاٹنے لگا، چند کاٹرسد کی تھیں جس نے وہاں پاکستان جانے سے پہلے اس سے ملنے کے لئے بار بار اسے رنگ کیا تھا اور پھر آخری کال میں اس کے اس طرح غائب ہونے پر اسے اچھی خاصی صلوہ تھی سنائی تھیں۔

جوانی کال کرے اگر اس نے جھپٹے دو دن اپارٹمنٹ پر گزارے ہوتے تو وہ یقیناً یہ کام کرتا مگر اب وہ جانتا تھا کہ اب وہ سب واپس جا چکے ہوں گے البتہ وہ سکندر، کامران اور سعد کو پاکستان میں کال کر سکتا تھا مگر اس وقت وہ یہ کام کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

کافی کے ایک کپ کے ساتھ دو سلاٹس کھانے کے بعد اس نے گھر پر موجود چند میڈیسنز لیں اور پھر دوبارہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ بخار کے لئے اتنا ہی کافی تھا اور شام تک وہ اگر کھل طور پر نہیں تو کافی حد تک ٹھیک ہو چکا ہوگا۔

اس کا اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا۔ شام کے وقت وہ میڈیسن کے زیر اثر آنے والی نیند سے بیدار ہوا تو اس کا جسم بری طرح بخار میں چنگ رہا تھا۔ اس کی زبان اور ہونٹ خشک تھے اور اسے اپنا مطلق کاٹوں سے بھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پورے جسم کے ساتھ ساتھ اس کا سر بھی شدید درد کی گرفت میں تھا اور شاید اس کے اس طرح بیدار ہونے کی وجہ یہ شدید بخار اور تکلیف ہی تھی۔

اس بار اندھے منہ، بیڈ پر لیٹتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ نیچے پر ماتھے کے نیچے رکھتے ہوئے ہاتھوں کے انگوٹھوں سے کشیوں کو مسلتے ہوئے سر میں اٹھنے والی درد کی شیسوں کو کم کرنے کی کوشش کی مگر وہ بری طرح ناکام رہا۔ چہرہ نیچے میں چھپائے ہوئے حس و حرکت پڑا رہا۔

تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش میں وہ کب دوبارہ نیند کی آغوش میں گیا اسے اندازہ نہیں ہوا۔ پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو اس وقت کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ رات ہو چکی تھی اور صرف کمرہ ہی نہیں پورا گھر تاریک تھا وہ پہلے سے زیادہ تکلیف میں تھا۔ چند منٹوں تک بیڈ سے اٹھنے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر لیٹ گیا۔ ایک بار پھر اس نے اپنے ذہن کو تاریکی میں ڈوبتے محسوس کیا مگر اس بار یہ نیند نہیں تھی۔ وہ خود کی کسی درمیانی کیفیت میں سے گزر رہا تھا۔ وہ اب خود کو کراہتے ہوئے سن رہا تھا مگر وہ اپنا آواز کا گلا نہیں گھونٹ پارہا تھا۔ سینٹرل ہیڈنگ ہونے کے باوجود اسے بے تماشاً سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور کمبل اس کی کپکپاہٹ کو ختم کرنے میں ناکام تھا وہ جسمانی طور پر خود اٹھ کر کچھ بھی پینے یا اوڑھنے کے قابل نہیں تھا۔ اسے اپنے سینے اور پیٹ میں ایک بار پھر درد محسوس ہونے لگا تھا۔

اس کی کراہوں میں اب شدت آتی جا رہی تھی۔ ایک بار پھر حلی محسوس کرنے پر اس نے اٹھنے اور تیزی سے واٹس روم تک جانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ چند لمحوں کے لئے وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ بیڈ سے اترنے کی کوشش کرتا اسے ایک زور کی ہلکائی آئی۔ جھپٹے چوبیس گھنٹوں میں اندر رو جانے والی تھوڑی بہت خوراک بھی باہر آگئی تھی۔ وہ غشی کے عالم میں بھی اپنے کیزوں اور کمبل سے بے نیاز نہیں تھا مگر وہ کھل طور پر گندگی سے تھڑے ہوئے

کھل طور پر ہوش کھونے سے پہلے اس نے کسی کو اپنے آپ کو جھجھوڑتے محسوس کیا۔ کوئی بلند آواز میں اس کے قریب کچھ کہہ رہا تھا، آوازیں ایک سے زیادہ تھیں۔
سالار نے اپنے سر کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے سر کو حرکت نہیں دے سکا۔ اس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش بھی ناکام رہی۔ وہ اب کھل طور پر تاریکی میں جا چکا تھا۔

☆.....☆

اس نے دو دن ہاسپٹل میں گزارے تھے۔ وہاں سے گاڑی میں گزرنے والے کسی جوڑے نے اسے گرتے دیکھا تھا اور وہی اسے اٹھا کر ہاسپٹل لے آئے تھے۔ ڈاکٹرز کے مطابق وہ فوڈ پوزاٹنگ کا شکار ہوا تھا۔ وہ ہاسپٹل آنے کے چند گھنٹوں کے بعد ہوش میں آ گیا تھا اور وہاں سے چلے جانے کی خواہش رکھنے کے باوجود وہ جسمانی طور پر اپنے آپ کو اتنی بری حالت میں محسوس کر رہا تھا کہ وہاں سے جا نہیں سکا۔
اگلے دن شام تک اس کی حالت کچھ بہتر ہونے لگی مگر ڈاکٹر کی ہدایت پر سالار نے دو رات بھی وہیں گزار دی۔ اتوار کو سہ پہر کے قریب وہ گھر آ گیا تھا اور گھر آتے ہی اس نے فوراً آپ بٹر کے ساتھ ملے پا جانے والا پروگرام چند دقوں کے لئے ملتوی کر دیا۔ اسے بھر کو صبح لگنا تھا اور اس نے ملے کیا تھا کہ جانے سے پہلے وہ ایک بار پھر سینڈ راکو کال کرے گا لیکن اب پروگرام کنسل کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اس کو بلا لگا۔ اپنے کسی بھی دوست کو کال کرنے کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔
ایک جگہ پھینکے سینڈ ویج کے ساتھ کافی کا ایک کپ پینے کے بعد اس نے سکون آور دوائی اور سونے کے لئے چلا گیا۔

اگلے دن جب اس کی آنکھ کھلی اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ سالار کو نیند سے بیدار ہوتے ہی سر میں شدید درد کا احساس ہوا۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر اس نے اپنا ہاتھ اور جسم چھوا، اس کا ہاتھ بہت زیادہ گرم تھا۔
"کم آن!" وہ بیزار سی سے بڑبڑایا۔ جھپٹے دو دن کی بیماری کے بعد وہ اگلے دو دن بستر پر پڑے ہوئے نہیں گزارنا چاہتا تھا اور اس وقت اسے اس کے آثار نظر آرہے تھے۔
جوں توں بیڈ سے نکل کر وہ منہ ہاتھ دھوئے بغیر ایک بار پھر بکن میں آ گیا کافی بننے کے لئے رکھ کر وہ answerphone پر ریکارڈ ڈکٹیشن لگا، چند کالز سہی تھیں جس نے وہاں پاکستان جانے سے پہلے اس سے ملنے کے لئے بار بار اسے رنگ کیا تھا اور پھر آخری کال میں اس کے اس طرح غائب ہونے پر اسے اچھی خاصی صلوہ تھی سنائی تھیں۔

سینڈ راکو اندازہ تھا کہ وہ اس سے ملے بغیر سکینگ کے لئے چلا گیا تھا۔ یہی خیال سنکر رادر کامران کا تھا۔ انہوں نے بھی اسے چند کالز کی تھیں۔ چند کالز اس کے کچھ کا اس فیلو کی تھیں۔ وہ بھی چشیاں گزارنے کے لئے اپنے گھروں کو جانے سے پہلے کی گئی تھیں۔ ہر ایک نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ انہیں

جو ابھی کال کرے اگر اس نے جھپٹے دو دن اپارٹمنٹ پر گزارے ہوتے تو وہ یقیناً یہ کام کرتا مگر اب وہ جانتا تھا کہ اب وہ سب واپس جا چکے ہوں گے البتہ وہ سنکر، کامران اور سعد کو پاکستان میں کال کر سکتا تھا مگر اس وقت وہ یہ کام کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

کافی کے ایک کپ کے ساتھ دو سلاٹس کھانے کے بعد اس نے گھر پر موجود چند میڈیسنز لیں اور پھر دوبارہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ بخار کے لئے اتنا ہی کافی تھا اور شام تک وہ اگر کھل طور پر نہیں تو کافی حد تک ٹھیک ہو چکا ہوگا۔

اس کا اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا۔ شام کے وقت وہ میڈیسن کے زیر اثر آنے والی نیند سے بیدار ہوا تو اس کا جسم بری طرح بخار میں چنگ رہا تھا۔ اس کی زبان اور ہونٹ خشک تھے اور اسے اپنا مطلق کائناتوں سے بھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پورے جسم کے ساتھ ساتھ اس کا سر بھی شدید درد کی گرفت میں تھا اور شاید اس کے اس طرح بیدار ہونے کی وجہ یہ شدید بخار اور تکلیف ہی تھی۔

اس بار اندھے منہ، بیڈ پر لیٹتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ نیچے پر ماتھے کے نیچے رکھتے ہوئے ہاتھوں کے انگوٹھوں سے کشیوں کو مسلتے ہوئے سر میں اٹھنے والی درد کی شیسوں کو کم کرنے کی کوشش کی مگر وہ بری طرح ناکام رہا۔ چہرہ نیچے میں چھپائے وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔

تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش میں وہ کب دوبارہ نیند کی آغوش میں گیا اسے اندازہ نہیں ہوا۔ پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو اس وقت کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ رات ہو چکی تھی اور صرف کمرہ ہی نہیں پورا گھر تاریک تھا وہ پہلے سے زیادہ تکلیف میں تھا۔ چند منٹوں تک بیڈ سے اٹھنے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر لیٹ گیا۔ ایک بار پھر اس نے اپنے ذہن کو تاریکی میں ڈوبتے محسوس کیا مگر اس بار یہ نیند نہیں تھی۔ وہ خود کی کسی درمیانی کیفیت میں سے گزر رہا تھا۔ وہ اب خود کو کراہتے ہوئے سن رہا تھا مگر وہ اپنا آواز کا گلا نہیں گھونٹ پارہا تھا۔ سینٹرل ہیڈنگ ہونے کے باوجود اسے بے تماشاً سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور کھیل اس کی کپکپاہٹ کو ختم کرنے میں ناکام تھا وہ جسمانی طور پر خود اٹھ کر کچھ بھی پینے یا اوڑھنے کے قابل نہیں تھا۔ اسے اپنے سینے اور پیٹ میں ایک بار پھر درد محسوس ہونے لگا تھا۔

اس کی کراہوں میں اب شدت آتی جا رہی تھی۔ ایک بار پھر حلی محسوس کرنے پر اس نے اٹھنے اور تیزی سے واٹس روم تک جانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ چند لمحوں کے لئے وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ بیڈ سے اترنے کی کوشش کرتا اسے ایک زور کی ہلکائی آئی۔ جھپٹے چوبیس گھنٹوں میں اندر رو جانے والی تھوڑی بہت خوراک بھی باہر آگئی تھی۔ وہ غشی کے عالم میں بھی اپنے کیزوں اور کھیل سے بے نیاز نہیں تھا مگر وہ کھل طور پر گندگی سے تھڑے ہوئے

بے بس تھا اسے اپنا پورا وجود مطلق محسوس ہو رہا تھا۔ بے جان سی حالت میں وہ اسی طرح وہ بارہ بستر پر لیٹ گیا۔ اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ارد گرد کے ماحول سے مکمل طور پر بے نیاز ہو چکا تھا۔ غشی کی کیفیت میں کراہوں کے ساتھ اس کے منہ میں جو کچھ آ رہا تھا وہ بولنا جا رہا تھا۔

غشی کا یہ سلسلہ کتنے کتنے گھنٹے جاری رہا تھا اسے یاد نہیں۔ ہاں! البتہ اسے یہ ضرور یاد تھا اس کیفیت کے دوران اسے ایک ہاریوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ مرد رہا ہے اور اسی وقت زندگی میں پہلی بار موت سے عجیب سا خوف محسوس ہوا تھا وہ کسی نہ کسی طرح فون تک پہنچنا چاہتا تھا وہ کسی کو بلانا چاہتا تھا مگر وہ بستر سے نیچے تک نہیں اتر سکا۔ شدید بخار نے اسے مکمل طور پر مطلق کر کے رکھ دیا تھا۔

اور پھر بالآخر وہ خود ہی اس کیفیت سے باہر آ گیا تھا اس وقت رات کا چھٹا پہر تھا جب وہ اس فنودگی سے باہر نکلا تھا۔ آنکھیں کھولنے پر اس نے کمرے میں وہی تاریکی دیکھی تھی مگر اس کا جسم اب پہلے کی طرح گرم نہیں تھا۔ کچھ مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی اس کے سر اور جسم میں ہونے والا درد بھی بہت ہلکا تھا۔

کمرے کی صحت کو کچھ دیر گھورنے کے بعد اس نے لیٹے لیٹے اندھیرے میں سائیدیل کو ڈھونڈ کر آن کر دیا۔ روشنی نے کچھ دیر کے لئے اس کی آنکھوں کو چند صیا کر بند ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر آنکھوں کے بند بچوں کو چھوا۔ وہ سوچے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں جین ہو رہی تھی۔ سوچے ہوئے بچوں کو بمشکل کھلے رکھتے ہوئے وہ اب ارد گرد کی چیزوں پر غور کر رہا تھا اور اپنے ساتھ ہونے والے تمام واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جگہ جگہ جھماکوں کے ساتھ اسے سب کچھ یاد آتا جا رہا تھا۔

اسے بے اختیار اپنے آپ سے گھن آئی، بیڈ پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی شرٹ کے بٹن کھول کر اسے اتار کر دور پھینک دیا۔ پھر لڑکھڑاتے ہوئے وہ بیڈ سے اتر گیا اور کھل اور بیڈ شیٹ بھی کھینچ کر اس نے بیڈ سے اتار کر فرش پر ڈال دیئے۔

ان ہی لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ وہ سوچے سمجھے بغیر ہاتھ روم میں گھس گیا۔ ہاتھ روم میں موجود بڑے آئینے کے سامنے اپنے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے جیسے شاک لگا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں ان کے گرد پڑنے والے حلقے بہت نمایاں تھے اور چہرہ بالکل زرد تھا۔ اس کے ہونٹوں پر چڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اسے اس وقت دیکھنے والا یہی سوچتا کہ وہ کسی ایسی بیماری سے اٹھا ہے۔

”چھٹیں گھنٹے میں اتنی شبو بڑھ گئی ہے؟“ اس نے حیرانی کے عالم میں اپنے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”اتنی بری شکل تو میری فوڈ پوائزنگ کے بعد ہاسپٹل میں رہ کر بھی نہیں ہوتی تھی جتنی ایک دن کے

اس بخار نے کر دی ہے۔“

وہ بے یقینی کے عالم میں اپنے آنکھوں کے حلقوں کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ تب میں پانی بھر کر وہ اس میں لیٹ گیا۔ اسے حیرانی ہو رہی تھی کہ بخار کی حالت میں بھی اس نے فوری طور پر اسی وقت اپنے کپڑے کیوں نہیں بدل لئے وہ کیوں وہیں پڑا رہا۔

ہاتھ روم سے باہر نکلنے کے بعد بیڈ روم میں رہنے کے بجائے وہ بکن میں چلا گیا۔ اسے بے تماشاً بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے نوڈلز بنانے اور انہیں کمانے لگا۔ ”مجھے صبح ڈاکٹر کے پاس جا کر اپنا تفصیلی چیک اپ کروانا چاہئے۔“ اس نے نوڈلز کھاتے ہوئے سوچا، صحن ایک بار پھر اس کے اعصاب پر سوار ہو رہی تھی۔ نہانے کے بعد اسے اگرچہ اپنا وجود بہت ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا مگر اس کی تھکت ختم نہیں ہوئی تھی۔

نوڈلز کمانے کے دوران اس نے ٹی وی آن کر دیا اور چینل سرچ کرنے لگا۔ ایک چینل پر آنے والا ناک شو دیکھتے ہوئے اس نے ریوٹ رکھ دیا اور ایک بار پھر نوڈلز کے پیالے پر جھک گیا۔ اس نے ابھی نوڈلز کا دو سرا چھ منہ میں رکھا ہی تھا کہ وہ بے اختیار رک گیا۔ ابھی ہوئی نظروں سے ناک شو کو دیکھتے ہوئے اس نے ریوٹ کو ایک بار پھر اٹھا لیا۔ ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے وہ ایک بار پھر چینل سرچ کرنے لگا مگر اس بار وہ ہر چینل کو پہلے سے زیادہ ظہیر کر دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے کی آنکھیں بڑھتی جا رہی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ بڑبڑایا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا وہ جمعہ کی رات کو سڑک پر بے ہوش ہونے کے بعد ہاسپٹل گیا تھا۔ ہفتہ کا سارا دن اس نے وہیں گزارا تھا اور اتوار کی سہ پہر کو وہ وہیں آیا تھا۔ اتوار کی سہ پہر کو سونے کے بعد وہ اگلے دن گیارہ بجے کے قریب اٹھا تھا۔ پھر اسی رات اسے بخار ہو گیا تھا۔ شاید اس نے منگل کا سارا دن بخار کی حالت میں گزارا تھا اور اب یقیناً منگل کی رات تھی، مگر ٹی وی مختصر اسے کچھ اور بتا رہے تھے۔ وہ ہفتہ کی رات تھی اور انکا طلوع ہونے والا دن اتوار کا تھا۔

اس نے اپنی رست واپس پر ایک نظر دوڑائی جو لوگ روم کی میز پر پڑی تھی۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے نوڈلز کا پیالہ میز پر رکھ دیا یک لخت ہی جیسے اس کی بھوک اڑ گئی تھی۔ وہاں موجود سارخ نے اسے جیسے ایک اور جھٹکا دیا تھا۔

”کیا مطلب ہے، کیا میں پانچ دن بخار میں مبتلا رہا ہوں۔ پانچ دن ہوش و حواس سے بے خبر رہا ہوں؟ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟“ وہ بڑبڑا رہا تھا۔

”پانچ دن، پانچ دن تو بہت ہوتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھے، مجھے پانچ دن گزرنے کا پتہ ہی نہ

چلے..... میں پانچ دن تک اس طرح بے ہوش کیسے رہ سکتا ہوں۔"

وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ تیزی سے answerphone کی طرف بڑھ گیا، فون پر اس کے لئے کوئی ریکارڈ پیغام نہیں تھا۔

"پاپا نے مجھے کوئی کال نہیں کی اور..... سعد سب کو کیا ہو گیا..... کیا میں انہیں یاد نہیں رہا۔"

اسے جیسے کوئی پیغام نہ پا کر شک لگا تھا۔ وہ بہت دیر تک بالکل ساکت فون کے پاس بیٹھا رہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پاپا کو میرا خیال ہی نہ رہا ہو، یا کسی اور فرینڈ کو..... یا پھر کسی اور کو..... اس طرح مجھے کیسے چھوڑ دیا انہوں نے اور اس وقت اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ ایک بار پھر کپکپا رہے تھے۔ وہ غماہت یا کمزوری نہیں تھی پھر وہ کیا تھا جو اسے کاپٹنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ اٹھ کر واپس صونے کی طرف چلا آیا۔

نوڈلز کے پیالے کو ہاتھ میں لے کر وہ ایک بار پھر انہیں کھانے لگا اس بار نوڈلز میں چند منٹ پہلے کا ڈائننگ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اسے لگا وہ بے ذائقہ رہنے کے چند نرم ٹکڑوں کو چبا رہا ہے۔ چند مچھے لینے کے بعد اس نے پیالہ دوبارہ ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ اسے کھا نہیں پارہا تھا۔ وہ اب بھی عجیب سی بے چینی کی گرفت میں تھا۔ کیا واقعی وہ پانچ دن یہاں اکیلا اس طرح گزار رہا تھا کہ اسے خود اپنے بارے میں پتا تھا اور نہ ہی کسی اور کو۔

وہ ایک بار پھر دواش روم میں چلا گیا۔ اس کا چہرہ کچھ دیر پہلے جیسا نہیں لگ رہا تھا نہ اسے وہ کچھ بہتر ہو گیا تھا مگر اس کی شیو اور آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے صفتے اب بھی اسی طرح موجود تھے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ کچھ دیر تک اپنی آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے صفتوں کو چھونتا رہا یوں جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو کہ وہ واقعی وہاں موجود تھے یا پھر اس کا وہم ہے۔ اسے یک دم اپنے چہرے پر موجود بالوں سے وحشت ہونے لگی تھی۔

وہیں کھڑے کھڑے اس نے شیو تک کٹ نکالی اور شیو کرنے لگا۔ شیو کرتے ہوئے اسے ایک بار پھر احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ یکے بعد دیگرے اسے تین کٹ لگے۔ اس نے شیو کے بعد اپنا چہرہ دھویا اور اس کے بعد تولیے سے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے اسے شگ کرنے لگا جب اسے ان زخموں سے رستے ہوئے خون کا احساس ہوا اس نے چہرے کو تولیے سے تھپتھپانا بند کر دیا۔ خالی الذہنی کے عالم میں وہ آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھنے لگا۔

اس کے گالوں پر آہستہ آہستہ ایک بار پھر خون کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ مگر اس رخ رنگ، وہ ٹکلیں چھپکائے بغیر ان قطرہوں کو دیکھتا رہا۔ تین ٹھنٹے ٹھنٹے سرخ قطرے۔

"-What is next to ecstasy"

"-Pain"

سرد اور عدم آواز آئی۔ وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت ہو گیا۔

"-What is next to pain"

"-Nothingness"

اسے ایک ایک لفظ یاد تھا۔

"-Nothingness"

"وہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ اس کے گالوں کی حرکت سے خون کے قطرے اس کے گالوں پر پھیلنے لگے۔

"-And what comes next to nothingness"

"-Hell"

سالار کو یک دم ایٹائی آئی۔ وہ واٹش ٹیشن پر بے اختیار دوہرا ہو گیا۔ چند منٹ پہلے کھائی تھی خوراک ایک بار پھر باہر آگئی تھی۔ اس نے گل کھول دیا۔ اس نے اس کے بعد کیا پوچھا تھا۔ اس نے اس کے جواب میں کیا کہا تھا اسے یاد تھا۔

"ابھی تمہیں کوئی چیز سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ابھی آئے گی بھی نہیں۔ ایک وقت آئے گا جب تم سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ ہر شخص پر ایک وقت آتا ہے جب وہ سب کچھ سمجھنے لگتا ہے جب کوئی معصوم نہیں رہتا۔ میں اس دور سے گزر رہی ہوں۔ تم پر وہ دور آئندہ بھی آئے گا۔ اس کے بعد تم دیکھنا۔ کیا تمہیں ہنسی آتی ہے۔"

سالار کو ایک اور ایٹائی آئی، اسے اپنی آنکھوں سے پانی بہتا ہوا محسوس ہوا۔

"زندگی میں ہم کبھی نہ کبھی اس مقام پر آجاتے ہیں جہاں سارے رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔ وہاں صرف ہم ہوتے ہیں اور اللہ ہوتا ہے۔ کوئی ماں باپ کوئی بہن بھائی، کوئی دوست نہیں ہوتا۔ پھر ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہمارے پیروں کے نیچے زمین ہے نہ ہمارے سر کے اوپر کوئی آسمان، بس صرف ایک اللہ ہے جو ہمیں اس خلا میں بھی قمار سے ہوتے ہے۔ پھر پتا چلتا ہے ہم زمین پر پڑی مٹی کے ڈمیر میں ایک ڈرے یا درخت پر لگے ہوئے ایک پتے سے زیادہ کی وقعت نہیں رکھتے۔ پھر پتا چلتا ہے کہ ہمارے ہونے یا نہ ہونے سے صرف ہمیں فرق پڑتا ہے۔ صرف ہمارا کردار ختم ہو جاتا ہے۔ کائنات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی کسی چیز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

سالار کو اپنے سینے میں عجیب سا درد محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے پتے ہونے پانی کو منہ میں ڈالا اسے ایک بار پھر ایٹائی آئی۔

”اس کے بعد ہماری عقل لٹکانے آجاتی ہے۔“

وہ اس آواز کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے حیرانی ہو رہی تھی وہ اسے اس وقت کیوں یاد آئی تھی۔

اس نے پانی کے چھینٹے اپنے چہرے پر مارنے شروع کر دیئے۔ چہرے کو ایک بار پھر پونچھنے لگا۔ آفٹرشیر کی بوتل کھول کر اس نے گالوں پر موجود ان زخموں پر لگانا شروع کر دیا جہاں اب اسے پہلی بار تکلیف ہو رہی تھی۔

واش روم سے باہر نکلنے ہوئے اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے ہاتھ اب بھی کانپ رہے ہیں۔

”مجھے ڈاکٹر کے پاس چلے جانا چاہئے۔“ وہ اپنی ہتھیلیاں بھینچنے لگا۔ ”مجھے مدد کی ضرورت ہے اپنا چیک اپ کروانا ہے۔“

وہ نہیں جانتا تھا اسے ایک دم وہاں وحشت کیوں ہونے لگی تھی۔ اسے اپنا سانس وہاں بند ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں جیسے کوئی اس کی گردن پر پاؤں رکھے آہستہ آہستہ داؤ ڈال رہا تھا۔

”کیا یہ ممکن ہے کہ سب لوگ مجھے اس طرح بھول جائیں۔ اس طرح.....“

اس نے اپنی وارڈ روم سے نئے کپڑے نکال کر ایک بار پھر کچھ دیر پہلے کا پہنا ہوا لباس بدلنا شروع کر دیا۔ وہ جلد از جلد ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتا تھا اسے اپنے پارٹنٹ سے ایک دم خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

اس رات گھر آکر وہ تقریباً ساری رات جاگتا رہا تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت نے اسے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ اس کا ذہن یہ تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ اسے اس طرح بھلا دیا گیا ہے۔ وہ ماں باپ کی ضرورت سے زیادہ توجہ ہمیشہ حاصل کرتا رہا تھا۔ کچھ اس کی حرکتوں کی وجہ سے بھی سکندر رحمان اور طیبہ کو اس کے معاملے میں بہت زیادہ محتاط ہونا پڑا۔ وہ ہمیشہ ہی اس کے بارے میں فکر مند رہے تھے، مگر اب ایک دم چند دنوں کے لئے وہ جیسے سب کی زندگی سے نکل گیا تھا۔ دوستوں کی، بہن بھائیوں کی، ماں باپ کی۔ وہ اگر اس بیماری کے دوران وہاں اس پارٹنٹ میں مریجاتا تو کسی کو پتا تک نہیں چلتا شاید جب تک اس کی لاش نکلنے سڑنے نہ لگتی اور اس موسم میں ایسا ہونے میں کتنے دن لگتے۔

وہ اس رات ایک ایک گھنٹے کے بعد اپنے answerphone کو چیک کرتا رہا۔ اگلا پھر رابطہ اس نے اسی بے چینی کے عالم میں اپنے پارٹنٹ میں گزارا، پورے ہفتے کے دوران اسے کبھی سے کوئی کال نہیں ملی۔

”کیا سب لوگ مجھے بھول گئے ہیں؟“

وہ وحشت زدہ ہو گیا۔ ایک ہفتہ تک بے وقوفوں کی طرح کسی کی کال کا انتظار کرتے رہنے کے بعد اس نے خود سب سے رابطہ کی کوشش کی۔

وہ انہیں فون پر بتانا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ کس کیفیت سے گزارا تھا۔ وہ ان کے ساتھ شکوہ کرنا چاہتا تھا، مگر ہر ایک سے رابطہ کرنے پر اسے پہلی بار یوں محسوس ہوا جیسے کسی کو اس میں کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ ہر ایک کے پاس اپنی مصروفیات کی تعصبات تھیں۔

سکندر اور طیبہ اسے آسٹریلیا میں اپنی سرگرمیوں سے آگاہ کرتے رہے۔ وہ وہاں کیا کر رہے تھے، کتنا انجوائے کر رہے تھے۔ وہ کچھ غائب دماغی کے عالم میں ان کی باتیں سنتا رہا۔

”تم انجوائے کر رہے ہو اپنی چھٹیاں؟“

بہت لمبی چوڑی بات کے بعد طیبہ نے بالآخر اس سے پوچھا۔

”ہیں؟ ہاں، بہت.....“ وہ صرف تین لفظ بول سکا۔

وہ واقعی نہیں جانتا تھا کہ اسے طیبہ سے کیا کہنا، اسے کیا بتانا چاہئے؟

باری باری سب سے بات کرتے ہوئے وہ پہلی بار اس قسم کی صورت حال اور کیفیت سے دوچار ہوا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو بنیادی طور پر صرف اپنی زندگی سے دلچسپی تھی۔ شاید وہ انہیں اپنے ساتھ ہونے والے واقعات بتانا چاہتا تو وہ اس کے لئے تشویش کا اظہار کرتے۔ پریشان ہو جاتے مگر وہ سب بعد میں ہوتا۔ اس کے بتانے کے بعد، اس سے پہلے ان کی زندگی کے دائرے میں اس کی زندگی کہاں آتی تھی۔ کس کو دلچسپی تھی یہ سننے میں کہ اس کے چند دن کس طرح غائب ہو گئے۔

اور شاید تب ہی اس نے پہلی بار سوچا اگر میری زندگی ختم بھی ہو گئی تو کسی دوسرے کو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ دنیا میں کیا تبدیلی آئے گی؟ میرا خاندان کیا محسوس کرے گا؟ کچھ بھی نہیں۔ چند دنوں کے دکھ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں اور دنیا میں تو شاید چند لمحوں کے لئے بھی کوئی تبدیلی نہ آئے۔

سالار سکندر اگر غائب ہو جائے تو واقعی کسی دوسرے کو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ چاہے اس کا آئی کیو لیول ۱۵۰+ ہو۔ وہ اپنی سوچوں کو جھٹکنے کی کوشش کرتا مگر ایسی مایوسی اور اس طرح کی ذہنی حالت..... آخر مجھے ہو کیا گیا ہے اگر سب لوگ کچھ دنوں کے لئے مجھے بھول بھی گئے تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے میں بھی تو بہت بار بہت سے لوگوں کے ساتھ رابطہ نہیں رکھ پاتا۔ پھر اگر میرے ساتھ ایسا ہو گیا تو۔

مگر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ اور اگر واقعی میں، میں اس بے ہوشی سے واپس ہوش میں نہ آتا تو..... اگر میرا بخار کم نہ ہوتا اگر سینے یا پیٹ کا دور دورہ ختم نہ ہوتا..... اپنے ذہن سے وہ یہ سب کچھ جھٹکنے کی کوشش کرتا لیکن ناکام رہتا یہ تکلیف سے زیادہ خوف تھا جس کا افکار وہ اس اچانک بیماری کے دوران ہوا تھا۔ ”شاید میں کچھ زیادہ حساس ہوتا جا رہا ہوں۔“ وہ سوچتا رہتا ایک معمولی سی بے ہوشی کو خواہ مخواہ ہونا کمر پر کیوں سوار کر رہا ہوں۔

وہ جھنجھلا تا۔

”تم از کم اب تو ٹھیک ہو چکا ہوں پھر آخر اب مجھے کیا تکلیف ہے کہ میں اس طرح موت کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ آخر پہلے بھی تو کئی بار بیمار ہو چکا ہوں۔ خود کشی کی کوشش کر چکا ہوں، جب مجھے کسی خوف نے نکل نہیں کیا تو آخر اب کیوں مجھے اس طرح کے خوف نکل گئے ہیں۔“

اس کی آنکھوں اور اضطراب میں اضافہ ہو جا جا رہا تھا۔

”اور پھر مجھے تو بتا کر کی وہ تکلیف ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔ میرے لئے تو یہ صرف خواب یا کو ماکہ طرح ہے۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔“ وہ مسکرانے کی کوشش کرتا۔

”کیا چیز ہے جو مجھے پریشان کر رہی ہے۔ کیا بیماری؟ یا پھر یہ بات کہ کسی کو میری ضرورت نہیں پڑی۔ کسی کو میری یاد نہیں آئی۔ خیال تک نہیں، میرے اپنے لوگوں کو بھی، میرے فیملی ممبرز کو۔ دوستوں کو.....“

”مائی گاڈ..... تمہیں کیا ہوا ہے سالار؟“ یونیورسٹی کھلتے ہی پہلے ہی دن سینڈرا نے اسے دیکھتے

ہی کہا۔

”مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔“ سالار نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”تم بیمار رہے ہو؟“ اسے تشویش ہوئی۔

”ہاں تھوڑا بہت۔“

”مگر مجھے تو نہیں لگتے کہ تم تھوڑے بہت بیمار رہے ہو۔ تمہارا وزن کم ہو گیا ہے اور آنکھوں کے گرد دیکھتے پڑے ہوئے ہیں۔ کیا بیماری تھی تمہیں؟“

”کچھ نہیں، تھوڑا سا بخار اور فوڈ پوائزنگ۔“ وہ پھر مسکرایا۔

”تم پاکستان گئے ہوئے تھے؟“

”نہیں، یہیں تھا۔“

”مگر میں نے تو تمہیں نیویارک جانے سے پہلے کئی بار رنگ کیا۔ ہمیشہ answerphone ہی ملا۔ تم

یہ ریکارڈ کروا دیتے کہ تم پاکستان جا رہے ہو۔“

”جسٹ اسٹاپ اٹ؟“ وہ بے اختیار جھنجھلایا۔ ”سوال پر سوال کرتی جا رہی ہو تم۔“

سینڈرا حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ”تم میری بیوی تو نہیں ہو کہ اس طرح بات کر رہی ہو مجھ سے؟“

”سالار کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں ہوا تم بس ختم کرو یہ ساری بات، کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کہاں رہے؟ کیوں رہے، رہیں۔“

سینڈرا چند لمحوں بول نہیں سکی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح ری ایکٹ کرے گی۔

سینڈرا اس دن اس سے یہ سارے سوال پوچھنے والی اکیلی نہیں تھی۔ اس کے تمام دوستوں اور

جاننے والوں نے اسے دیکھتے ہی کچھ اسی طرح کے سوال، تبصرے یا تاثرات دیئے تھے۔

وہ دن ختم ہونے تک بری طرح جھنجھلاہٹ کا شکار ہو چکا تھا اور کسی حد تک مشتعل بھی۔ وہ کم از کم

ان سوالوں کو سننے کے لئے یونیورسٹی نہیں آیا تھا۔ اس طرح کے تبصرے اسے بار بار یاد دہانی کروا رہے

تھے کہ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ غلط ضرور ہو چکا ہے اور وہ ان احساسات سے بھٹکارا پانا چاہتا تھا۔

باب ۵

”مووی دیکھنے کا پروگرام ہے اس ویک اینڈ پر، چلو گے؟“ دانش اس دن اس کے پاس آیا

ہوا تھا۔

”ہاں، چلوں گا۔“ سالار تیار ہو گیا۔

”پھر تم تیار رہنا، میں تمہیں پک کر لوں گا۔“ دانش نے پروگرام ملے کیا۔

دانش پروگرام کے مطابق اسے لینے کے لئے آیا تھا۔ وہ کئی ہفتوں کے بعد کسی سینما میں مووی دیکھنے کے لئے آیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ کم از کم اس رات وہ ایک اچھی تفریح میں کچھ وقت گزار سکے گا مگر مووی شروع ہونے کے دس منٹ بعد اسے وہاں بیٹھے بیٹھے اچانک شدید قسم کی گھبراہٹ ہونے لگی۔ سامنے اسکرین پر نظر آنے والے کردار اسے کٹھ پتلیاں نظر آنے لگے جن کی حرکات اور آوازوں کو وہ گھنے سے قاصر تھا۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر بہت آہستگی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ وہ پارکنگ میں بہت دیر تک

دانش کی گاڑی کے بونٹ پر بیٹھا رہا، پھر ایک گیس لے کر اپنے پارٹمنٹ پر واپس آ گیا۔

☆.....☆.....☆

پروفیسر روٹسن اپنا لیچر شروع کر چکے تھے۔ سالار نے اپنے سامنے بڑے پیپر پر تاریخ اور ٹاپک لکھا۔ وہ آکٹانک Recession کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ سالار ہمیشہ کی طرح ان پر نظریں جمائے ہوئے تھا مگر اس کا ذہن غیر حاضر تھا اور یہ اس کے ساتھ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ وہ انہیں دیکھتے ہوئے کہیں اور پہنچ گیا تھا۔ کہاں، وہ یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ ایک ایچ سے دوسرے ایچ، دوسرے سے تیسرے۔ ایک سین سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے..... ایک آواز سے دوسری، دوسری سے تیسری..... اس کا ستر کہاں سے شروع ہوا، کہاں نہیں۔

”سالار! چلنا نہیں ہے۔“ سینڈرانے اس کا کندھا ہلایا۔

وہ چونک گیا، کلاس خالی تھی، صرف سینڈرا اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بے چینی سے خالی کلاس کو اور پھر وال کلاس کو دیکھا پھر اپنی رست واضح کی۔

”پروفیسر روٹسن کہاں گئے؟“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”کلاس ختم ہو گئی، وہ چلے گئے۔“ سینڈرانے کچھ حیران ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔

”کلاس ختم ہو گئی؟“ اسے جیسے یقین نہیں آیا۔

”ہاں!“ سالار نے بے اختیار اپنی آنکھوں کو مسلا اور پھر اپنی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔ واحد چیز جو اسے پروفیسر روٹسن کے لیچر کے بارے میں یاد تھی، وہ صرف ٹاپک تھا۔ اس کے بعد وہ نہیں جانتا تھا کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔

”تم کچھ اپ سیٹ ہو؟“ سینڈرانے پوچھا۔

”نہیں، کچھ نہیں۔ میں کچھ دیر کے لئے یہاں اکیلا بیٹھنا چاہتا ہوں۔“

”اوکے۔“ سینڈرانے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور اپنی چیزیں اٹھا کر باہر چلی گئی۔

وہ اپنے سینے پر بازو باندھے سامنے نظر آنے والے رائٹنگ بورڈ کو دیکھنے لگا۔ آج یہ تیسری کلاس تھی جس میں اس کے ساتھ یہ ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا یونیورسٹی دو بارہ جو ان کرنے کے بعد سب کچھ معمول پر آ جائے گا، وہ ڈپریشن کے اس فیڑ سے باہر آ جائے گا جس کا وہ تب شکار تھا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں بھی مکمل طور پر اسی ذہنی انتشار کا شکار تھا جس میں وہ اٹنے دنوں سے تھا پہلی بار اس کا دل پڑھائی سے بھی اجاٹ ہو رہا تھا۔ وہاں ہر چیز اسے مصنوعی لگ رہی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار صحیح معنوں میں ڈپریشن کا شکار ہوا تھا۔ اسٹڈیز، یونیورسٹی، فریڈز، کلب، پارٹیز، ریٹورٹس، سیر و تفریح، ہر چیز اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے دوستوں سے ملنا ایک دم چھوڑ دیا۔ answerphone پر اکثر اس کا

پیغام ہوتا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ وہ فریڈز کے اصرار پر ان کے ساتھ کہیں جانے کا پروگرام بنا لیتا اور پھر ایک دم جانے سے انکار کر دیتا۔ چلا بھی جاتا تو کسی وقت بھی بغیر بتائے اٹھ کر واپس چلا آتا۔ وہ پوئینڈرٹی میں بھی یہی کر رہا تھا۔ ایک دن جاتا، دو دن غائب رہتا۔ ایک عریضہ لیتا، اگلے دو عریضے چھوڑ دیتا۔

اپنے لپارٹمنٹ میں کبھی کبھار وہ سارا دن بیڈ پر لیٹے ہوئے گزار دیتا، بعض دفعہ وہ قلم دیکھنا شروع کرتا اور ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد بھی اس کی بجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے۔ ٹی وی جو ٹلو گھماتے ہوئے وہ اسی کیفیت کا شکار رہتا۔ اس کی بھوک بالکل ختم ہو گئی تھی۔ وہ کوئی چیز کھانا شروع کرتا اور پھر ایک دم اس کا دل ڈوب جاتا۔ وہ اسی طرح اسے چھوڑ دیتا، بعض دفعہ وہ پوراپور دن کچھ بھی نہیں کھاتا تھا۔ صرف یکے بعد دیگرے کافی کے کپ اپنے اندر اٹھاتا رہتا۔

وہ جین اسکو کر نہیں تھا مگر ان دنوں بن گیا تھا۔ وہ اپنی چیزیں بہت قریب سے رکھنے کا عادی تھا مگر ان دنوں اس کا پارٹنر گندگی کی مثال تھا اور اسے ان نکھری ہوئی چیزوں کو دیکھ کر کوئی الجھن نہیں ہوتی تھی۔ اس نے اپنے بہن بھائیوں اور والدین سے بھی گفتگو بہت مختصر کر دی تھی۔ وہ فون پر بولنے لگے، وہ دوسری طرف کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے سنتا رہتا یا ہوں ہاں میں جواب دے دیتا۔ اس کے پاس انہیں بتانے کے لئے، ان کے ساتھ شیئر کرنے کے لئے ایک دم سب کچھ ختم ہو گیا تھا اور اسے ان میں سے ایک بات کی بھی وجہ معلوم نہیں تھی۔

اور اسے یہ بات بھی معلوم تھی کہ اس کی ان تمام کیفیات اور حالت کا تعلق امامہ ہاشم سے ہے نہ وہ اس کی زندگی میں آتی نہ اس کے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا۔ پہلے وہ اسے ناپسند کرتا تھا اب اسے امامہ سے نفرت ہونے لگی تھی۔ بچپن سے اسے کاجو پکاسا احساس کچھ عرصہ اس کے ساتھ رہا تھا وہ غائب ہو گیا تھا۔

”اس کے ساتھ جو ہوا، ٹھیک ہوا، میں نے اس کے ساتھ جو کیا، ٹھیک کیا۔ اس کے ساتھ اس سے زیادہ برا ہونا چاہئے تھا۔“

وہ خود بخود ہی اپنے آپ سے کہتا رہتا۔ اسے امامہ ہاشم کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ، ہر حرف، ہر جملے سے نفرت تھی۔ اسے اس کی باتیں یاد آتیں اور اس کی نیند غائب ہو جاتی۔ ایک عجیب سی وحشت اسے گھیر لیتی۔ اس نے اس رات جن باتوں کا مذاق اڑایا تھا، وہ اب ہر وقت اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھیں۔

”کیا میں پاگل ہو رہا ہوں، کیا میں اپنے ہوش و حواس آہستہ آہستہ کھوتا جا رہا ہوں، کیا میں شیڈ فریڈیا کا شکار ہوں۔“ بعض دفعہ اسے پیشے بھانے خوف محسوس ہونے لگتا۔

ہر چیز کی بے معنویت بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر چیز کی بے مقصدیت اور عیاں ہو رہی تھی۔ وہ کون تھا، کیا تھا، کیوں تھا، کہاں کھڑا تھا، کیوں کھڑا تھا؟ اسے ہر وقت یہ سوالات تک کرنے لگے۔ کیا ہو گا اگر میں

Yale سے ایک ایم بی اے کی ڈگری لے لوں گا۔ بہت اچھی جاب مل جائے گی، کوئی ٹیکسٹی شروع کروں گا پھر..... کیا یہ وہ کام تھا جس کے لئے مجھے زمین پر اتارا گیا..... ۱۵۰+ آئی کیو لیول کے ساتھ..... کہ میں چند اور ڈگریاں لوں، شائد اس سائز بس کروں، شادی کروں، بچے پیدا کروں، میٹس کروں پھر مر جاؤں، بس.....

اس نے زندگی میں چار دفعہ صرف اپنے جنسیس کے لئے موت کے تجربے سے گزرنے کی کوشش کی تھی مگر اب شدید ڈپریشن کے عالم میں بھی وہ خودکشی کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ چوبیس گھنٹے موت کے بارے میں سوچنے کے باوجود بھی وہ اسے چھوٹا نہیں چاہتا تھا۔

لیکن اگر اس سے کوئی یہ پوچھ لیتا کہ کیا وہ زندہ رہنا چاہتا ہے تو وہ ہاں میں جواب دینے میں بھی تامل کرتا۔ وہ زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ زندگی کے مفہوم کو نہیں جانتا تھا۔

وہ مرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ موت کے مفہوم سے بھی واقف نہیں تھا۔

وہ کسی خلا میں مطلق تھا، کسی درمیان والی جگہ میں، کسی سچ والی کیفیت میں۔ زندہ رہتے ہوئے مردہ، مردہ ہوتے ہوئے زندہ..... وہ سرشاری کی انتہا پر پہنچ رہا تھا، لہو پہ لہو۔ ۱۵۰+ آئی کیو رکھنے والا وہ شخص جو اپنے سامنے کبھی اور سنی جانے والی کوئی بھی چیز نہیں بھلا سکتا تھا۔ سگریٹ کا دھواں اڑاتے، بیڑے کے گھونٹ لیتے، ٹائٹ کلب میں رقص کرتے، مینجے ریسٹورنٹ میں ڈنر کرتے، اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ رات گزارتے، وہ صرف ایک بات سوچتا رہتا تھا۔

کیا زندگی کا مقصد یہی ہے؟

”میتس اور آساکش.....؟ شائد اس لباس، بہترین خوراک، اعلیٰ ترین سہولتیں۔ ساتھ ستر سال کی ایک زندگی اور پھر؟“

اس کے بعد اس پھر کا کوئی جواب نہیں ہوتا تھا مگر اس ”پھر“ کی وجہ سے اس کی زندگی کے معمولات بگڑ گئے تھے۔ وہ رفتہ رفتہ بے خوابی کا شکار ہو رہا تھا اور یہ ان ہی دنوں تھا کہ اس نے اچانک مذہب میں دلچسپی لینا شروع کی۔ ڈپریشن سے نجات کے لئے وہ بہت سے لوگوں کو یہی کام کرتے دیکھتا تھا۔ اس نے بھی یہی کام شروع کر دیا۔ اس نے اسلام کے بارے میں کچھ کتابیں پڑھنے کی کوشش کی۔ تمام کتابیں اس کے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ کوئی لفظ، کوئی بات اسے اپنی طرف نہیں کھینچ رہی تھی۔ وہ خود پر جبر کر کے چند صفحات پڑھتا اور ان کتابوں کو رکھ دیتا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد پھر اٹھاتا پھر رکھ دیتا۔

”نہیں، شاید مجھے عملی طور پر عبادت شروع کرنی چاہئے۔ اس سے ہو سکتا ہے کہ مجھے کچھ فائدہ ہو۔“

وہ اپنے آپ کو خود ہی سمجھاتا اور ایک دن جب وہ مسجد کے پاس تھا تو اس نے یہی کہا۔

”میں بھی چلا ہوں تمہارے ساتھ۔“ اس نے مسجد کو باہر نکلتے دیکھ کر کہا۔

”مگر میں تو عشاء کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔“ سعد نے اسے یاد دہانی کروائی۔

”میں جانتا ہوں۔“ اس نے اپنے جاگ رز کے تھے کہتے ہوئے کہا۔

”میرے ساتھ مسجد چلو گے؟“ وہ حیران ہوا۔

”ہاں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”نماز پڑھنے کے لئے؟“

”ہاں! سالار نے کہا۔“ اس طرح دیکھنے کی کیا ضرورت ہے، میں کافر تو نہیں ہوں۔“

”کافر تو نہیں ہو مگر..... چلو خیر، پڑھ لینا آج۔“ سعد نے کچھ کہتے کہتے بات بدل دی۔

”میں تو تمہیں پہلے ہی کتنی بار ساتھ چلنے کے لئے کہہ چکا ہوں۔“

سالار نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ خاموشی سے چلتے ہوئے اس کے ساتھ باہر آ گیا۔

”اب اگر آج مسجد جانی رہے ہو تو پھر جاتے رہنا۔ یہ نہ ہو کہ بس آج پہلا اور آخری وژت ہی

ہو۔“ سعد نے عمارت سے باہر نکلنے ہوئے اس سے کہا۔ باہر اس وقت برف باری ہو رہی تھی۔ مسجد،

رہائش کی عمارت سے کچھ فاصلے پر تھی۔ وہ ایک مصری خاندان کا گھر تھا جس کا پچھلا حصہ مسجد کے طور پر ان

لوگوں نے استعمال کے لئے دیا ہوا تھا جبکہ اوپر والے حصے میں وہ لوگ خود رہتے تھے۔ بعض دفعہ وہاں

نمازیوں کی تعداد میں بچپوں ہو جاتی مگر زیادہ تر یہ تعداد دس پندرہ کے درمیان ہی رہتی تھی۔

سعد مسجد تک پہنچنے تک سالار کو ان تفصیلات سے آگاہ کرتا رہا۔ سالار خاموشی اور کچھ لاشعری کے

عالم میں سڑک پر احتیاط سے پھسلتی گاڑیوں اور ہر طرف موجود برف کے ڈھیر پر نظریں دوڑاتا اس کے

ساتھ چلتا رہا۔

پانچ سات منٹ چلتے رہنے کے بعد ایک موڑ مڑ کر سعد ایک گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو

گیا۔ دروازہ بند تھا مگر لاک نہیں تھا اور سعد نے دروازے پر دستک دی تھی، نہ ہی کسی سے اجازت مانگی

تھی۔ بڑے مانوس سے انداز میں اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ سالار نے

اس کی بیرونی کی۔

”تم وضو کر لو۔“ سعد نے اچانک اسے مخاطب کیا اور پھر اسے ساتھ لے کر ایک دروازہ کھول کر

ایک ہاتھ روم میں داخل ہو گیا۔

سعد کی زیر نگرانی جب تک وہ وضو کے آخری حصے تک پہنچتا، ٹھنڈا پانی گرم میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اپنے ہاتھوں کا مسح کرتے کرتے وہ ایک بار پھر ٹھنڈا۔ سعد سمجھا اسے صحیح طریقہ پتا نہیں، اس نے ایک بار پھر

اسے ہدایت دی۔ وہ خالی الذہنی کے عالم میں اپنے ہاتھوں کو ایک بار پھر حرکت دینے لگا۔

گدی تک ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کا ہاتھ گردن میں موجود زنجیر سے گھرایا تھا۔ اس کی نظر بے اختیار

سامنے آئینے میں گئی۔ وہ ایک بار پھر کہیں اور پہنچ چکا تھا۔ سعد نے اس سے کچھ کہا تھا۔ اس بار اس نے نہیں سنا۔

کمرے میں موجود دس افراد دو صفوں میں کھڑے ہو رہے تھے۔ وہ سعد کے ساتھ پچھلی صف میں کھڑا ہو گیا۔ امام صاحب نے لامنت شروع کر دی، سب کے ساتھ اس نے بھی نیت کی۔

”نماز سے واقعی سکون ملتا ہے؟“ اس نے کوئی دو منٹ پہلے ایک لڑکے کو نماز کے مسئلے پر سعد کے ساتھ بحث میں الجھایا تھا۔

”مجھے تو ملتا ہے۔“ سعد نے کہا تھا۔

”میں تمہاری بات نہیں کر رہا۔ میں سب کی بات کر رہا ہوں، سب کو ملتا ہے؟“ اس لڑکے نے کہا تھا۔ ”یہ منحصر ہے کہ سب کتنا اٹوٹا ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔“

سالار بڑے آگے ہوئے انداز میں ان کی بحث کسی حد اعلیٰ یا تبصرے کے بغیر سنتا رہا تھا۔ اس وقت وہ شعوری طور پر نماز میں اشہاک پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”سکون؟ میں واقعی دیکھنا چاہتا ہوں کہ نماز سے سکون کیسے ملتا ہے۔“ اس نے رکوع میں جاتے ہوئے اپنے دل میں سوچا پھر اس نے پہلا سجدہ کیا۔ اس کے اضطراب اور بے چینی میں ایک بہ ایک اضافہ

ہو گیا۔ جن الفاظ کو وہ امام صاحب کی زبان سے سن رہا تھا، وہ بہت نامانوس لگ رہے تھے جو لوگ اس کے ارد گرد کھڑے تھے وہ اسے نا آشنا لگ رہے تھے، جس ماحول میں وہ موجود تھا وہ اسے غیر فطری لگ رہا تھا اور جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ اسے منافقت محسوس ہو رہی تھی۔

ہر سجدے کے ساتھ اس کے دل و دماغ کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے پہلی چار رکعتیں بمشکل ختم کیں۔ سلام پھیرنے کے دوران اس نے اپنے دائیں جانب والے لوجیز عمر محض کے گالوں پر آنسو

دیکھے، اس کا دل وہاں سے بھاگ جانے کو چاہا۔ وہ جی کڑا کر کے ایک بار پھر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر نماز میں پوری طرح منہمک ہونے کی کوشش کی۔

”اس بار میں پڑھی جانے والی آیات کے ہر لفظ پر غور کروں گا۔ شاید اس طرح۔“ اس کی سوچ کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ نیت کی جارہی تھی۔ اس کا دل مزید اچاٹ ہو گیا۔ سر کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے

آیات کے مفہوم پر غور کرنے کی کوشش کی۔

”الحمد لله رب العالمین۔“ سورۃ فاتحہ کی عبادت شروع ہوئی۔

”الرحمن الرحیم۔“ اس نے توجہ مرکوز رکھنے کی پوری کوشش کی۔

”مالک یوم الدین۔“ توجہ بھنگی۔

”ایک نعت وایک تسبیح۔“ اسے سورۃ فاتحہ کا ترجمہ آتا تھا۔ اس نے چند دن پہلے ہی پڑھا تھا۔

"احمد ناالصراط المستقیم۔" (سیدھا راستہ) اس نے ذہن میں دہرایا۔

"صراط المستقیم..... سیدھا راستہ؟" اس کا دل چاہا وہاں سے بھاگ جائے۔ اس نے وہاں نماز جاری رکھنے کی ایک آخری کوشش کی۔

"صراط الذین انعمت۔" اس کا ذہن ایک بار پھر پیچھے گیا۔

"علیہم غیر المغضوب علیہم والضالین۔" اس نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ کھولے، وہ آخری صف میں کھڑا تھا، بہت آہستگی سے چند قدم پیچھے گیا اور صف سے نکل گیا۔

"یہ کام میں نہیں کر سکتا، میں نماز نہیں پڑھ سکتا۔" اس نے جیسے اعتراف کیا۔ بہت خاموشی کے ساتھ وہ اور پیچھے ہوتا گیا۔ باقی لوگ اب رکوع میں جا رہے تھے، وہ مز کر دے قدموں مگر تیز رفتاری سے باہر نکل آیا۔

مسجد سے نکلنے ہوئے اس کے جاگزر اس کے ہاتھ میں تھے۔ عاصب دماغی کے عالم میں وہ باہر میز صوف پر کھڑے ہو کر چند لمبے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ میز صوف پر گیا۔ پاؤں میں چراغیں اور ہاتھوں میں جاگزر پکڑے وہ خالی الذہنی کے عالم میں عمارت کی عقیقہ دیوار کی طرف آگیا۔ وہاں بھی ایک دروازہ اور کچھ میز صوف نظر آ رہی تھیں مگر وہ میز صوف برف سے اٹی ہوئی تھیں۔ دروازے پر موجود لائٹ بھی روشن نہیں تھی۔ اس نے جبک کر سب سے اوپر والی میز صوف کو اپنے جاگزر کے ساتھ صاف کیا اور برف صاف کرنے کے بعد وہاں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر پہلے ہونے والی برف باری اب ختم ہو چکی تھی۔ اس نے میز صوف پر بیٹھ کر اپنے جاگزر زمین لیے۔ تیس گھنٹے کے بعد وہ ایک بار پھر سیدھا ہو کر دروازے سے نکل گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ جبک کی بیویوں میں تھے۔ جبک کے ساتھ لگے ہوئے hood کو وہ سر پر چڑھا چکا تھا۔ سامنے سڑک پر اکاڈ کا گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

وہ میز صوف پر اپنی ٹانگیں پھیلائے اپنی پشت دروازے سے لٹکانے ان اکاڈ گاڑیوں اور رفت پاتھ پر پہلے والے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ وہاں اس سرد اور کبر آلود رات میں کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہوئے وہ کچھ دیر پہلے مسجد کے گرم کمرے سے زیادہ سکون محسوس کر رہا تھا۔ کم از کم بہتر ضرور محسوس کر رہا تھا۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر لائٹ نکال لیا اور اسے جلا کر اپنے بیروں کے قریب میز صوف پر پڑی برف کو کھلانے لگا، کچھ دیر تک وہ اس سرگرمی میں مشغول رہا پھر جیسے اس نے آٹا کر لائٹ دو بارہ جیب میں ڈال لیا۔ جس وقت وہ سیدھا ہوا اس نے اپنے بالکل سامنے ایک عورت کو کھڑا لیا۔ وہ یقیناً اس وقت وہاں آ کر کھڑی ہوئی تھی جس وقت وہ میز صوف پر جھکا اپنے دونوں پاؤں کے درمیان موجود برف کو لائٹ سے پگھلا رہا تھا۔ وہ نیم تاریکی میں بھی اس کے چہرے کی مسکراہٹ کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ منی اسکرٹ اور ایک مختصر بلانڈ میں ملیں تھی۔ اس نے فرکوت پہنا ہوا تھا مگر وہ فرکوت آگے سے دانستہ طور پر کھلا

چھوڑا گیا تھا۔

وہ فرکوت کی دونوں بیویوں میں ہاتھ ڈالے سالار کے بالکل سامنے بڑے اٹناک سے کھڑی تھی۔ سالار نے سر سے لے کر پاؤں تک اسے دیکھا۔ اس کی لمبی ٹانگیں اس سردی میں بھی برہنہ تھیں۔ اس کے عقب میں موجود کالوں کی روشنیوں کے بیک گراؤڈ میں اس کی ٹانگیں یک دم بہت نمایاں ہو رہی تھیں اور اس کی ٹانگیں بہت خوب صورت تھیں۔ کچھ دیر تک وہ ان سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ اس عورت کے بیروں میں بوٹ نمایاں تھیں۔ سالار حیران تھا وہ برف کے اس ڈھیر پر ان جو توں کے ساتھ کس طرح چلتی ہوگی۔ "I charge 50 for an hour۔"

اس عورت نے بڑے دوستانہ انداز میں کہا۔ سالار نے اس کی ناگھوں سے نظریں ہٹا کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس کی نظریں ایک بار پھر اس کی ناگھوں پر گئیں۔ کئی سالوں میں پہلی بار اسے کسی پر ترس آیا۔ کیا مجبوری تھی کہ وہ اس برف باری میں بھی اس طرح برہنہ بھرنے پر مجبور تھی، جبکہ وہ اس موٹی جیڑ میں بھی سردی کو اپنا بڈیوں میں گھستے محسوس کر رہا تھا۔ "OK 40 dollars۔"

اسے خاموش دیکھ کر اس عورت کو اندیشہ ہوا کہ شاید وہ قیمت اس کے لئے قابل قبول نہیں تھی، اس لئے اس نے فوراً اس میں کمی کر دی۔ سالار جانتا تھا چالیس ڈالر بھی زیادہ تھے۔ وہ اس سڑک پر بیس ڈالر میں بھی ایک گھنٹہ کے لئے کسی لڑکی کو حاصل کر سکتا تھا وہ بیستیس چالیس سال کی تھی اور بات کرتے ہوئے عموماً نظروں سے سڑک پر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ سالار جانتا تھا یہ احتیاط کسی پولیس کار یا پولیس والے کے لئے تھی۔

"Ok 30..... No more bargaining"

"take it or leave it"

سالار کی خاموشی نے اس کی قیمت کو کچھ اور کم کیا۔ سالار نے اس بار کچھ بھی کہے بغیر اپنی جبک کے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہاں موجود چند کرنسی نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ اس کے پاس اس وقت والٹ نہیں تھا۔ اس عورت نے حیرانی سے اسے دیکھا اور پھر ان نوٹوں کو اس کے ہاتھ سے سمجھ لیا۔ وہ پہلا گاہک تھا، جو اسے ایڈوائس پے منت کر رہا تھا اور وہ بھی پچاس ڈالر، جبکہ وہ اپنی قیمت کم کر چکی تھی۔

"تم میرے ساتھ چلو گے یا میں تمہارے ساتھ۔" وہ اب بڑی بے تکلفی سے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"نہ میں تمہارے ساتھ چلوں گا نہ تم میرے ساتھ۔ بس تم یہاں سے جاؤ۔" سالار نے ایک بار پھر سڑک کے دوسری طرف موجود کالوں پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

وہ عورت بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔

”واقعی؟“

”ہاں۔“ سالار نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

”تو پھر تم نے یہ کیوں دیکھے ہیں؟“ اس عورت نے اپنے ہاتھ میں پکڑے نوٹوں کی طرف

اشارہ کیا۔

”تاکہ تم میرے سامنے سے ہٹ جاؤ، میں سڑک کے اس پار دکائیں دیکھنا چاہتا ہوں اور تم اس میں رکاوٹ بن گئی ہو۔“ اس نے سرد مہری سے کہا۔

عورت بے اختیار قبضہ لگا کر ہنسی۔ ”تم اچھا مذاق کر لیتے ہو، کیا میں واقعی چلی جاؤں؟“

”ہاں۔“

وہ عورت کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ ”اوکے، ٹھیک یونہی۔“ سالار نے اسے سڑک پار کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ لاشعوری طور پر اسے ہاتھ دیکھا رہا۔ وہ سڑک پار کر کے ایک دوسرے کو نئے کی طرف جا رہی تھی، وہاں ایک اور آدمی کھڑا تھا۔

سالار نے دوبارہ نظریں ان دکانوں پر جمائیں، برف باری ایک بار پھر شروع ہو چکی تھی۔ وہ پھر بھی اطمینان سے وہیں بیٹھا رہا۔ برف اب اس کے اوپر بھی گر رہی تھی۔

وہ رات کے ڈھائی بجے تک وہیں بیٹھا رہا جب سڑک کے پار دکانوں کی اندر کی لائٹس اس نے دیکھے بعد دیگرے بند ہوتے دیکھیں تو وہ اپنی جیکٹ اور جینز سے برف جھانڈتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اگر وقتے وقتے سے وہ اپنی ٹانگیں ہلانے رہا ہوتا تو اس وقت تک وہ اپنے بیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے باوجود کھڑا ہوا کر قدم اٹھانے میں اسے کچھ وقت ہوئی۔ چند منٹ وہیں کھڑا ہوا اپنے بیروں کو جھٹکتا رہا اور پھر اسی طرح جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر واپس پارٹمنٹ کی طرف جانے لگا۔ وہ جانتا تھا سعد نے اسے مسجد سے نکل کر بہت زیادہ ڈھونڈا ہو گا اور اس کے بعد وہ وہاں چلا گیا ہو گا۔

☆.....☆.....☆

”کہاں چلے گئے تھے تم؟“ سعد اسے دیکھتے ہی چلایا۔ وہ کچھ کے بغیر اندر چلا آیا۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔“ سعد دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے آگیا۔ سالار اپنی جیکٹ اتار رہا تھا۔

”کہیں نہیں گیا تھا۔“ اس نے جیکٹ لٹکاتے ہوئے کہا۔

”تمہیں پتا ہے کہ میں نے تمہیں کتنا تلاش کیا ہے، کہاں کہاں فون کئے ہیں اور اب تو میں اتنا پریشان ہو چکا تھا کہ پولیس کو فون کرنے والا تھا..... تم آخر اس طرح نماز چھوڑ کر گئے کہاں تھے؟“

سالار کچھ کے بغیر اپنے جاگڑا اتارنے لگا۔

”میں نے تمہیں بتایا ہے، کہیں نہیں۔“

”تو پھر اب تک کہاں تھے؟“ سعد اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

”وہیں تھا، مسجد کے پچھلے حصے میں فٹ پاتھ پر۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

”واٹ! اتنے کھٹے تم وہاں فٹ پاتھ پر برف میں بیٹھے رہے ہو۔“ سعد دم بخود رہ گیا۔

”ہاں!“

”کوئی تک ہنسی ہے اس حرکت کی۔“ وہ کچھ جھلایا۔

”نہیں، کوئی تک نہیں ہنسی۔“ سالار نے اسی طرح سیدھا بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

”کچھ کھایا ہے؟“

”نہیں۔“

”تو کھانا کھاؤ۔“

”نہیں، بھوک نہیں ہے۔“ وہ اب چھت پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ سعد اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”تمہارے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے؟ بتا سکتے ہو مجھے۔“ سالار نے گردن کو ہلکی سی حرکت دے کر اسے دیکھا۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ بے تاثر لہجے میں کہا گیا۔ ”میں سمجھا، تم اپنے پارٹمنٹ چلے گئے ہو، مگر وہاں بار بار رنگ کرنے پر بھی تم نہ ملے۔“ سعد بڑبڑا رہا تھا۔ سالار کی نظریں چھت پر ہی تھیں۔

”اس سے بہتر تھا کہ میں تمہیں اپنے ساتھ نماز پڑھنے لے کر ہی نہ جاتا۔“ آئندہ میرے ساتھ مت جانا تم۔“ سعد نے ناراضی سے کہا۔ وہ اب اس کے بیڈ سے اٹھ گیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اپنے کام بیٹھا رہا پھر وہ نائٹ بلب آن کر کے اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس نے ابھی آنکھیں بند کی تھیں، جب اس نے

سالار کی آواز سنی۔

”سعد!“

”ہاں!“ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”یہ“ صراط مستقیم“ کیا ہوتا ہے؟“

سادہ لہجے میں پوچھے گئے سوال نے سعد کو حیران کر دیا۔ اس نے گردن موڑ کر بائیں جانب بیڈ پر

سیدھا لیٹے ہوئے سالار کو دیکھا۔

”صراط مستقیم..... سیدھے راستے کو کہتے ہیں۔“

”جانتا ہوں مگر سیدھا راستہ کیا ہوتا ہے؟“ اگلا سوال آیا۔

سعد نے اس کی طرف کر دئی۔ ”سیدھا سہ..... مطلب نیکی کا سہ.....“

”نیکی کیا ہوتی ہے؟“ بھرا بھی بے تاثر تھا۔

”جیسے کام کو نیکی کہتے ہیں۔“

”اچھا کام کیا ہوتا ہے؟“

”اچھا کام..... کوئی ایسا کام جو کسی دوسرے کے لئے کیا گیا ہو۔ کسی کی مدد کی گئی ہو، کسی پر مہربانی کی گئی ہو، وہ اچھا کام ہوتا ہے اور برا اچھا کام نیکی ہوتی ہے۔“

”ابھی کچھ گھنٹے پہلے میں نے وہاں فٹ باٹھ پر ایک hooker کو بچاس ڈال دئے، جبکہ وہ صرف تمہیں ڈالنا تک رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے یہ نیکی ہوتی؟“

سعد کا دل چاہا وہ ایک گھونسا اس کے منہ پر کھینچا مارے، وہ عجیب آدمی تھا۔

”نکو اس بند کرو اور سو جاؤ، مجھے بھی سونے دو۔“ اس نے کھل پھینٹ لیا۔

سالار کو حیرت ہوئی وہ کس بات پر ناراض ہوا تھا۔ ”تو یہ نیکی نہیں ہوتی؟“

”میں نے تم سے کہا ہے، اپنا منہ بند کرو اور سو جاؤ۔“ سعد ایک بار پھر دھاڑا۔

”اتنا ناراض ہونے کی ضرورت تو نہیں ہے، میں نے تم سے ایک بہت معمولی سا سوال کیا ہے۔“ سالار نے بڑے قہر سے کہا۔

سعد یک دم کچھ مشتعل ہوتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے لیسپ آن کر دیا۔

”تمہارے جیسے آدمی کو میں کیا صراطِ مستقیم سمجھاؤں۔ کیا تم پاگل ہو یا جاہل ہو..... یا غیر مسلم ہو..... کیا ہو..... کچھ بھی نہیں ہو..... تمہیں خود پتا ہونا چاہئے کہ صراطِ مستقیم کیا ہوتا ہے مگر تم جیسا آدمی

جو مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے نماز درمیان میں چھوڑ کر چلا آتا ہے، وہ کیسے جان سکتا ہے یہ۔“

”میں نماز اس لئے چھوڑ کر چلا آیا کیونکہ تم کہتے ہو اس میں سکون ملے گا۔ مجھے سکون نہیں ملا، میں چھوڑ آیا۔“ اس کے پرسکون انداز میں کہے ہوئے جملے نے سعد کو مزید مشتعل کیا۔

”تمہیں نماز میں اس لئے سکون نہیں ملا، کیونکہ مسجد تمہاری جگہ نہیں ہے، تمہارے لئے سکون کی جگہیں سینما، تھیٹر، بار اور کلب ہیں۔ مسجد تمہارے لئے نہیں ہے۔ تمہیں نماز میں سکون کہاں سے مل جاتا..... اور تم چاہتے ہو، میں تمہیں بتاؤں صراطِ مستقیم کیا ہوتا ہے۔“

وہ بیٹھ پر سیدھا لپٹا لپٹا جھپکائے بغیر سعد کو دیکھا رہا۔

”تمہارے جیسا شخص جو نماز سے بھاگ جاتا ہے، شراب پیتا اور زنا کرتا ہے۔ وہ صراطِ مستقیم کے مطلب کو سمجھ سکتا ہے نہ اس پر آسکتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے جو شراب پیتے اور زنا کرتے ہیں مگر نماز سے بھاگتے نہیں، نماز بھی پڑھ لینے

ہیں، وہ صراطِ مستقیم کا مطلب سمجھتے ہیں اور صراطِ مستقیم پر ہیں۔“

سعد کچھ بول نہیں سکا۔ مدغم آواز اور بے تاثر لہجے میں کہے گئے ایک ہی سوال نے اسے خاموش کر دیا تھا۔ سالار اب بھی اسی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتے سالار!“ اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ سالار کے کانوں میں ایک جھماکے کے ساتھ ایک دوسری آواز گونج اٹھی تھی۔

”ہاں، میں واقعی نہیں سمجھ سکتا۔ لائٹ آف کر دو، مجھے نیند آرہی ہے۔“ اس نے مزید کچھ کہے بغیر آنکھیں بند کر لیں۔

☆.....☆.....☆

”مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ تم اپنے اپارٹمنٹ پر ہی ہو گے، صرف تم نے جان بوجھ کر answerphone لگا دیا ہو گا۔“

سعد اگلے دن دس بجے سالار کے اپارٹمنٹ پر موجود تھا۔ سالار نے نیند میں اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔

”تم اس طرح بتائے بغیر بھاگ کیوں آئے میرے اپارٹمنٹ سے۔“ سعد نے اندر آتے ہوئے جھڑپا۔

”بھاگا تو نہیں، تم سو رہے تھے، میں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔“ سالار نے آنکھیں ملکتے ہوئے کہا۔

”کس وقت آئے تھے تم؟“

”شاید چار پانچ بجے۔“

”یہ جانے کا کون سا وقت تھا؟“ سعد نے تنک کر کہا۔

”اور تم اس طرح آئے کیوں؟“ سالار کچھ کہنے کے بجائے لوگ روم کے صوفہ پر جا کر اوندھے منہ لیٹ گیا۔

”شاید میری باتوں سے تم ناراض ہو گئے تھے۔ میں اسی لئے ایکسکیوز کرنے آیا ہوں۔“ سعد نے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کون سی باتوں سے؟“ سالار نے گردن کو ہلکا سا تڑچھا کرتے ہوئے اسی طرح لینے سعد سے پوچھا۔

”وہی سب کچھ جو میں نے کچھ شبے میں آکر رات کو تم سے کہہ دیا۔“ سعد نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

”نہیں، میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر تو ناراض نہیں ہو سکتا۔ تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس پر تمہیں ایکسکیوز کرنے کے لئے یہاں آنا پڑتا۔“ سالار نے اسی کے انداز میں کہا۔

”پھر تم اس طرح اچانک میرے اپارٹمنٹ سے کیوں آگئے؟“ سعد بھند ہوا۔

”بس میرا دل گھبرایا اور میں یہاں آ گیا اور چونکہ سونا چاہتا تھا اس لئے answerphone لگا دیا۔“
سالار نے پر سکون انداز میں کہا۔ ”پھر بھی میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ مجھے تم سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ میں صبح سے بہت بیچتا رہا ہوں۔“

”جانے دو اسے۔“ اس نے اسی طرح چہرہ صوفے پر چھپائے کہا۔

”سالار! تمہارے ساتھ آج کل پرائیوٹ کیا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“

”نہیں، کچھ نہ کچھ تو ہے۔ کچھ عجب سے ہوتے جا رہے ہو تم۔“

اس بار سالار ایک دم کروت بدلتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔ چت لینے سعد کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”مثلاً کون سی بات عجیب سی ہوتی جا رہی ہے مجھ میں۔“

”بہت ساری ہیں، تم بہت چپ چپ رہنے لگے ہو، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اٹھنے لگے ہو۔ عباد مجھے بتا رہا تھا کہ یونیورسٹی جانا بھی چھوڑا ہوا ہے تم نے اور سب سے بڑی بات کہ مذہب میں دلچسپی لے رہے ہو۔“ اس کے آخری جملے میں سالار کے ماتھے پر تیریاں آ گئیں۔

”مذہب میں دلچسپی؟ یہ تمہیں غلط فہمی ہے۔ میں مذہب میں دلچسپی لینے کی کوشش نہیں کر رہا، میں صرف سکون حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کیونکہ میں بہت ڈپریشن ہوں۔ مجھے زندگی میں کبھی اس طرح کا..... اور اس حد تک ڈپریشن نہیں ہوا جس کا شکار میں آج کل ہوں اور میں صرف اس ڈپریشن سے نجات حاصل کرنے کے لئے رات نماز پڑھنے کے لئے چلا گیا تھا۔ اس نے بہت ترشی سے کہا۔

”ڈپریشن کیوں ہے تمہیں؟“ سعد نے پوچھا۔

”اگر یہ مجھے پتا ہوتا تو مجھے یقیناً ڈپریشن نہ ہوتا۔ میں اب تک اس کا کچھ نہ کچھ کر چکا ہوتا۔“

”پھر کبھی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی، یوں بیٹھے بٹھائے ڈپریشن تو نہیں ہو جاتا۔“ سعد نے تمبرہ کیا۔

سالار جانتا تھا، وہ ٹھیک کہہ رہا ہے، مگر وہ اسے وجہ بتا کر خود پر ہنسنے کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”کسی دوسرے کے بارے میں تو مجھے پتا نہیں، مگر مجھے تو بیٹھے بٹھائے ہی ہو جاتا ہے۔“ سالار

نے کہا۔

”تم کوئی ایفنی ڈیپریسٹ لے لیتے۔“ سعد نے کہا۔

”میں ان کا ڈیپریسٹ نہیں پڑا۔“

”تم کسی سائیکالرسٹ سے مل لیتے۔“

”میں یہ کام تو کبھی نہیں کروں گا، میں تک آپکا ہوں ان لوگوں سے ملنے ملتے۔ کم از کم اب تو میں نہیں ملوں گا۔“ سالار نے بے اختیار کہا۔

”پہلے کس سلسلے میں ملتے رہے ہو تم؟“ سعد نے کچھ چونک کر تجسس کے عالم میں پوچھا۔ ”بہت سی باتیں تھیں، تم انہیں رہنے دو۔“ وہ اب چت لینا چھت کو گھور رہا تھا۔

”تو پھر تم ایسا کرو کہ عبادت کیا کرو، نماز پڑھا کرو۔“

”میں نے کوشش کی تھی مگر میں نماز نہیں پڑھ سکتا تو مجھے وہاں کوئی سکون ملا نہ ہی میں یہ جانتا تھا کہ میں جو پڑھ رہا ہوں وہ کیا ہے، کیوں پڑھ رہا ہوں۔“

”تم یہ جاننے کی کوشش کرو کہ.....“

سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اب پھر رات والی بحث شروع ہو جائے گی، صراطِ مستقیم والی اور پھر تمہیں غصہ آئے گا۔“

”نہیں، مجھے غصہ نہیں آئے گا۔“ سعد نے کہا۔

”جب مجھے یہ ہی نہیں پتا کہ صراطِ مستقیم کیا ہے تو پھر میں نماز کیسے پڑھ سکتا ہوں۔“

”تم نماز پڑھنا شروع کرو گے تو تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا کہ صراطِ مستقیم کیا ہے۔“

”کیسے؟“

”تم خود ہی غلط کاموں سے بچنے لگو گے، اچھے کام کرنے لگو گے۔“ سعد نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

”مگر میں کوئی غلط کام نہیں کرتا اور نہ ہی مجھے اچھے کام کرنے کی خواہش ہے۔ میری زندگی نارمل ہے۔“

”تمہیں یہ احساس ہو بھی نہیں سکتا کہ تمہارا کون سا کام صحیح ہے اور کون سا غلط۔ جب تک کہ.....“

سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔

”صحیح اور غلط کام میرا مسئلہ نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے بس بے سکونی رہتی ہے اور اس کا تعلق میرے کاموں سے نہیں ہے۔“

”تم وہ تمام کام کرتے ہو جو انسان کی زندگی کو بے سکون کر دیتے ہیں۔“

”مثلاً؟“ سالار نے چیختے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم پورک کھاتے ہو۔“

”کم آن۔“ وہ بے اختیار ہلایا۔ ”پورک یہاں کہاں آ گیا، تم مجھے ایک بات بتاؤ۔“ سالار اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”تم تو بڑی باقاعدگی سے نماز پڑھتے ہو، بڑی عبادت کرتے ہو، نماز نے تمہاری زندگی میں

کوئی ہی تبدیلیاں کر دیں؟“

”مجھے بے سکونی نہیں ہے۔“

”حالانکہ تمہارے فارمولے کے مطابق تمہیں بھی بے سکونی ہونی چاہئے، کیونکہ تم بھی بہت سے غلط کام کرتے ہو۔“ سالار نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”مثلاً..... میں کیا غلط کام کرتا ہوں؟“

”تم جانتے ہو، میرے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں..... میں نہیں جانتا، تم ویراؤ۔“ سعد نے جیسے اسے پہنچایا۔

سالار اسے کچھ دیر دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”میں نہیں سمجھتا سعد کہ صرف عبادت کرنے سے زندگی میں کوئی بہت نمایاں تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ اچھے کاموں یا کردار کا تعلق عبادت کرنے یا نہ کرنے سے نہیں ہوتا۔“

سعد نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں اسی لئے تم سے کہتا ہوں کہ اپنے مذہب میں کچھ دلچسپی لو، اسلام کے بارے میں کچھ علم حاصل کرو تاکہ اپنی اس غلط قسم کی غلاستی اور سوچ کو بدل سکو۔“

”میری سوچ غلط نہیں ہے، میں نے مذہبی لوگوں سے زیادہ جھوٹے مناظر اور دعوے کا ذہنی کو نہیں پایا۔ میں اُمید کرتا ہوں تم برا نہیں مانو گے، مگر میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ابھی تک مجھے تین ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا جو بہت بڑے مسلمان بنتے ہیں اور اسلام کی بات کرتے ہیں اور نتیجوں (مناظر) ہیں۔“ وہ بڑی تکی سے کہہ رہا تھا۔

”سب سے پہلے میں ایک لڑکی سے ملا، وہ بھی بڑی مذہبی بنتی تھی، پر وہ کرتی تھی، بڑی پارسا اور پاک باز ہونے کا ڈرامہ کرتی تھی اور ساتھ میں ایک لڑکے کے ساتھ الٹرا چلا رہی تھی، اپنے منگیتر کے ہوتے ہوئے اس کے لئے گھر سے بھاگ بھی گئی۔ اسے ضرورت پڑی تو اس نے ایک ایسے شخص کی بھی مدد لی جسے وہ بہت برا سمجھتی تھی یعنی اسے اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھا، ان محترمہ پارسا خاتون نے۔“ اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔

”اس کے بعد میں ایک اور آدمی سے ملا جس نے ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ بڑا بچا اور پچاس قسم کا مسلمان تھا وہ بھی لیکن اس نے اس لڑکی کی مدد نہیں کی، جس نے اس سے بھیک مانگنے کی حد تک مدد مانگی تھی۔ اس نے اس لڑکی سے شادی نہیں کی جسے وہ محبت کے نام پر بے وقوف بنا تا رہا اور ابھی کچھ عرصہ پہلے میں یہاں امریکہ میں اس سے ملا تو اس کی ڈاڑھی بھی خاک ہو چکی تھی، شاید اس کے اسلام کے ساتھ۔“

وہ ہنسا۔ ”اور تیسرے تم ہو..... تم پورک نہیں کھاتے، صرف یہ ایک حرام کام ہے، جو تم نہیں کرتے، باقی تمہارے لئے سب کچھ جائز ہے۔ جھوٹ بولنا، شراب پینا، زنا کرنا، کلب میں جانا..... قیمت

کرنا، دوسروں کا مذاق اڑانا، حالانکہ ویسے تم بڑے نیک ہو، تم نے ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے، تم ہمارا دماغ کھا جاتے ہو اسلام کی باتیں کر کر کے۔ زبردستی نماز پڑھانے پر تلے رہتے ہو، ہر بات میں مذہب کا حوالہ لے آتے ہو، یہ آیت اور وہ حدیث..... وہ آیت اور یہ حدیث..... اس کے علاوہ تمہاری زبان پر اور کچھ ہو تا ہی نہیں اور جب میں تمہارا عمل دیکھتا ہوں تو میں ڈرہ بھر بھی تم سے متاثر نہیں ہوتا۔ کتنا مشکل ہوتا ہے اسلام کے بارے میں تمہارا انگریز مشن، میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ مجھ میں اور تم میں زیادہ فرق تو نہیں ہے۔ تم ڈاڑھی رکھ کر اور اسلام اسلام کر کے وہ سارے کام کرتے ہو جو میں ڈاڑھی کے اور اسلام کی بات کئے بغیر کرتا ہوں۔ عبادت نے کیا انقلاب برپا کیا ہے تمہاری زندگی میں، سوائے اس کے کہ تمہیں ایک خوش فہمی ہو گئی ہے کہ تم تو سیدھے جنت میں جاؤ گے اور ہم سارے دوزخ میں۔ تمہارے قول و فعل میں اگر یہ تضاد نہ ہو تو میں کبھی تم سے یہ سب نہ کہتا مگر تم سے ریکوریسٹ کرتا ہوں کہ تم دوسروں کو مذہب کی طرف راغب کرنے کی کوشش نہ کیا کرو، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ تم خود بھی مذہب کے صحیح مفہوم سے واقف نہیں ہو۔ اب میری ان ساری باتوں کو ماننا مت کرنا۔“

سالار اب ٹھیک پر پڑا ایک سگریٹ سلگا رہا تھا۔ سعد تقریباً گونگا ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے، مجھ سے کچھ غلطیاں ہو جاتی ہیں، مگر اللہ انسان کو معاف کر دیتا ہے اور میں نے کبھی یہ تو نہیں کہا کہ میں بہت ہی اچھا مسلمان ہوں اور میں ضرور جنت میں جاؤں گا لیکن میں اگر ایک اچھا کام کرتا ہوں اور دوسروں کو اس کی حمایت کرتا ہوں تو یہ اللہ کی طرف سے مجھ پر فرض ہے۔“

سعد نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس سے کہا۔

”سعد! تم خواہتا ہو دوسروں کی ذمہ داری اپنے سر پر مت لو، پہلے اپنے آپ کو ٹھیک کرو، پھر دوسروں کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرو تاکہ کوئی تمہیں منافق نہ کہے اور جہاں تک اللہ کے معاف کرنے کا تعلق ہے تو اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ وہ تمہاری غلطیوں کو معاف کر سکتا ہے تو پھر وہ ہمیں بھی معاف کر سکتا ہے۔ ہمارے گناہوں کے لئے تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے سے تمہاری نیکیوں میں اضافہ ہو گا اور تم اپنے گناہوں سمیت اللہ کے قریب ہو جاؤ گے تو ایسا نہیں ہو گا۔ بہتر ہے تم اپنا ٹھیک ریکارڈ ٹھیک کرو، صرف اپنے آپ کو دیکھو، دوسروں کو نیک بنانے کی کوشش نہ کرو، ہمیں برا ہی رہنے دو۔“

اس نے ترشی سے کہا۔ اس لمحے اس کے دل میں جو آیا اس نے سعد سے کہہ دیا تھا۔ جب وہ خاموش ہوا تو سعد اٹھ کر چلا گیا۔

اس دن کے بعد اس نے دوبارہ کبھی سالار کے سامنے اسلام کی بات نہیں کی۔

وہ اس ویک اینڈ پر بہت دنوں کے بعد کسی ریسٹورنٹ گیا تھا۔ اپنا آرڈر دینے کو نوٹ کروانے کے بعد وہ ریسٹورنٹ کے شیشوں سے باہر سڑک کو دیکھنے لگا۔ وہ جس میز پر بیٹھا تھا وہ کھڑکی کے قریب تھی اور قد آدم کھڑکیوں کے شیشوں کے پاس بیٹھ کر اسے یونہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ باہر فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا تھا۔

کسی لڑکی کی سسکیوں نے اس کی محویت کو توڑا تھا، اس نے بے اختیار سڑک دیکھا، اس سے چھٹی میز پر ایک لڑکا اور لڑکی بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکی کسی بات پر روتے ہوئے سسکیاں لے رہی تھی اور لڑکے کے ساتھ اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ لڑکا اس کے ہاتھ کو تھپتھپاتے ہوئے شاید اسے تسلی دے رہا تھا۔ ریسٹورنٹ اتنا چھوٹا اور ٹھنڈا اتنی قریب قریب تھیں کہ وہ بڑی آسانی سے ان کی گفتگو سن سکتا تھا مگر وہ وہاں اس کام کے لئے نہیں آیا تھا، وہ سیدھا ہو گیا۔ ناگواری کی ایک لہریں اس کے اندر سے اٹھی تھی۔ اسے اس طرح کے تماشے ایسے نہیں لگتے تھے۔ اس کا موڈ خراب ہو رہا تھا، وہ وہاں سکون سے کچھ وقت گزارنے آیا تھا اور یہ سب کچھ۔ اس کا دل اچلتا ہونے لگا۔ وہ دونوں دیکھ رہے تھے اور اسی زبان میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے کا حکم غیر محسوس طور پر اس کی ساتھیوں ابھی ان ہی سسکیوں کی طرف مرکوز تھیں۔ اس نے کچھ دیر بعد سڑک پر ایک بار پھر اس لڑکی کو دیکھا۔ اس بار اس کے مزے پر لڑکی نے بھی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ چند لمحوں کے لئے ان دونوں کی نظریں ملی تھیں اور وہ چند لمبے اس پر بہت بھاری گزرتے تھے۔ اس کی آنکھیں متورم اور سرخ ہو رہی تھیں۔ اسے ایک دم ایک اور چہرہ یاد آیا۔ امامہ ہاشم کا چہرہ، اس کی متورم آنکھیں۔

ویٹر اس کا آرڈر لے کر آچکا تھا اور وہ اسے سرو کرنے لگا۔ اس نے پانی کے چند گھونٹ پیئے ہوئے اپنے ذہن سے اس چہرے کو جھینکنے کی کوشش کی۔ اس نے چند گہرے سانس لے لئے۔ ویٹر نے اپنا کام کرتے کرتے اسے غور سے دیکھا مگر سالار کھڑکی سے باہر دیکھنے میں مصروف تھا۔

”آج موسم بہت اچھا ہے اور میں یہاں ایسے لمبے گزارنے آیا ہوں، ایک اچھا کھانا کھانے آیا ہوں، اس کے بعد میں یہاں سے ایک فلم دیکھنے جاؤں گا، مجھے اس لڑکی کے بارے میں نہیں ہونا چاہیے۔ کسی بھی طرح نہیں۔ وہ پاگل تھی، وہ بکواس کرتی تھی اور مجھے اس کے حوالے سے کسی قسم کا کوئی بچھتاہوا نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے کیا پتا وہ کہاں گئی، کہاں مری، یہ سب اس نے خود کیا تھا۔ میں نے صرف مذاق کیا تھا اس کے ساتھ۔ وہ مجھ سے رابطہ کرتی تو میں اسے طلاق دے دیتا۔“

لاشعوری طور پر خود کو سمجھاتے سمجھاتے ایک بار پھر اس کا بچھتاہوا اس کے سامنے آنے لگا تھا۔ پیچھے پیٹھی ہوئی لڑکی کی سسکیاں اب اس کے دماغ میں نیزے کی آبی کی طرح چہر رہی تھیں۔

”میں اپنی ٹھیل تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے بہت کھردرے انداز میں ویٹر کو مخاطب کیا۔ ویٹر

تھراں ہو گیا۔

”کس لئے سر؟“

”یا تو ان دونوں کی ٹھیل تبدیل کر دو یا میری۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ویٹر نے ایک نظر اس جوڑے کو دیکھا پھر وہ سالار کا مسند سجھایا نہیں مگر اس نے کونے میں گئی ہوئی ایک ٹھیل پر سالار کو بٹھا دیا۔ سالار کو چند لمحوں کے لئے وہاں آکر واقعی سکون ملا تھا۔ سسکیوں کی آواز اب وہاں نہیں آ رہی تھی مگر اب اس لڑکی کا چہرہ اس کے بالکل سامنے تھا۔ چاولوں کا پہلا بیج منہ میں ڈالنے ہی اس کی نظر اس لڑکی پر دوبارہ پڑی۔

وہ ایک بار پھر بد مزہ ہو گیا اسے ہر چیز ایک دم بے ذائقہ لگنے لگی تھی۔ یہ یقیناً اس کی ذہنی کیفیت تھی، ورنہ وہاں کا کھانا بہت اچھا ہوتا تھا۔

”انسان نعمتوں کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا۔ یہ میری زبان پر ذائقہ چکھنے کی حس ہے، یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ میں اگر کوئی چیز کھاتی ہوں تو میں اس کا ذائقہ محسوس کر سکتی ہوں۔ اچھا کھانا کھا کر خوشی محسوس کر سکتی ہوں۔ بہت سے لوگ اس نعمت سے بھی محروم ہوتے ہیں۔“

اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی تھی اور یہ شاید انتہائیت ہوئی۔ وہ کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ اس نے پوری قوت سے بیچ اپنی پلیٹ میں پٹا اور پٹہ آواز میں دھاڑا۔

”شٹ اپ، جسٹ شٹ اپ۔“ ریسٹورنٹ میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔

”یو شیٹ..... یو ہاسٹرو، جسٹ شٹ اپ۔“ وہ اب اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”تم میرے ذہن سے نکل کیوں نہیں جاتیں؟“

دونوں کنیٹیوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ چلا یا۔

”میں تمہیں مار ڈالوں گا، اگر تم مجھے دوبارہ نظر آئیں۔“

وہ ایک بار پھر چلا یا اور پھر اس نے پانی کا گلاس اٹھا کر پانی پیا اور اس وقت پہلی بار اسے ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگوں، ان کی نظروں کا احساس ہوا، وہ سب اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک ویٹر اس کی طرف آ رہا تھا، اس کے چہرے پر تشویش تھی۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے سر؟“

سالار نے کچھ بھی کہے بغیر اپنا دانت لگا لگا اور چند کرنسی نوٹ ٹھیل پر رکھ دیئے۔ ایک لفظ بھی مزید کہے بغیر وہ ریسٹورنٹ سے نکل گیا۔

وہ امامہ نہیں تھی، ایک بھوت تھا جو اسے چٹ گیا تھا۔ وہ جہاں جاتا وہ وہاں ہوتی۔ کتنی اس کا چہرہ،

کہیں اس کی آواز اور جہاں یہ دونوں چیزیں نہ ہوتیں وہاں سالار کا بچہ تارا ہوتا۔ وہ ایک چیز بھولنے کی کوشش کرتا تو دوسری چیز اس کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی، بعض دفعہ وہ اتنا مشتعل ہو جاتا کہ اس کا دل چاہتا وہ اسے دو بار دہلے تو وہ اس کا گلا دھاوے یا اسے شوٹ کر دے۔ اسے اس کی ہر بات سے نفرت تھی۔ اس رات اس کے ساتھ سفر میں گزارے ہوئے چند گھنٹے اس کی پوری زندگی کو چاہ کر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

”مگر آپ کیوں آرہے ہیں؟“ سالار نے جھنجھلا کر اپنے سب سے بڑے بھائی سے پوچھا۔ وہ دونوں فون پر بات کر رہے تھے اور اس نے سالار کو چند دنوں بعد نیویون آنے کی اطلاع دی تھی۔ سالار اس وقت روٹین کی زندگی گزار رہا ہوتا تو وہ اس اطلاع پر یقیناً خوش ہوتا مگر وہ اس وقت ذہنی ابتری کے جس دور سے گزر رہا تھا اس میں کامران کا آنا اسے بے حد ناگوار گزار رہا تھا اور وہ یہ ناگوار ہی چھپا بھی نہیں سکا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا، کیوں آرہے ہیں تم سے ملنے کے لئے آرہا ہوں۔“ کامران اس کے لہجے پر کچھ حیران ہوا۔ ”اور پاپا نے بھی کہا ہے کہ میں تم سے ملنے کے لئے جاؤں۔“ وہ ہونٹ جھینپنے اس کی بات سناتا رہا۔

”تم مجھے ائیر پورٹ سے پک کر لینا، میں تمہیں ایک دن پہلے اپنی فلائٹ کی تاریخ کے بارے میں بتا دوں گا۔“

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے رہنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔

چار دن کے بعد اس نے کامران کو ائیر پورٹ سے ریسیو کیا۔ وہ سالار کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”تم تیار ہو؟“ اس نے چھوٹے ہی سالار سے پوچھا۔

”نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ سالار نے مسکراتے ہی کوشش کی۔

”لگ تو نہیں رہے ہو۔“ کامران کی تشویش میں کچھ اور اضافہ ہونے لگا۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کیا کرتا تھا، آج خلاف معمول وہ آنکھیں چرا رہا تھا۔

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بھی وہ بہت غور سے سالار کو دیکھتا رہا۔ وہ بے حد احتیاط سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ کامران کو جراتی ہوئی تھی وہ اس قدر درمیش ڈرائیو کرتا تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے بڑے سے بڑا بی دوار آدمی ڈرتا تھا۔ سعد کو یہ ایک مثبت تبدیلی لگی تھی مگر یہ واحد مثبت تبدیلی تھی جو اس نے محسوس کی تھی۔ باقی تبدیلیاں اس کو پریشان کر رہی تھیں۔

”اسٹاپ بڑکیسی جارہی ہیں تمہاری؟“

”ٹھیک ہیں۔“

اسے سفر کے دوران بھی اسی طرح کے جواب ملتے رہے تھے۔ یہ اس کے پارٹنٹ کی حالت تھی جس نے کامران کے اضطراب کو اتنا بڑھایا تھا کہ وہ کچھ مشتعل ہو گیا تھا۔

”یہ تمہارا پارٹنٹ ہے سالار..... مائی گاڈ۔“ سالار کے پیچھے اس کے پارٹنٹ میں داخل ہوتے ہی وہ چلا اٹھا تھا۔ سالار اپنی چیزوں کو جس طرح منظم رکھنے کا عادی تھا وہ نظم و ضبط وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہاں ہر چیز اجتر حالت میں نظر آرہی تھی۔ جگہ جگہ اس کے کپڑے، جرابیں اور جوتے بکھرے پڑے تھے۔ کتابوں، اخباروں اور میگزینز کا بھی یہی حال تھا۔ لیکن کی حالت سب سے بری تھی اور ہاتھ روم کی اس سے بھی زیادہ۔ کامران نے کچھ شاک کی حالت میں پورے پارٹنٹ کا جائزہ لیا۔

”کتنے ماہ، تم نے صفائی نہیں کی ہے؟“

”میں ابھی کر دیتا ہوں۔“ سالار نے سرد مہری کے عالم میں چیزیں اٹھاتے ہوئے کہا۔

”تم اس طرح رہنے کے عادی تو نہیں تھے اب کیا ہوا ہے؟“ کامران بہت پریشان تھا۔ کامران نے اچانک ایک میز پر سکرین کے ٹکڑوں سے بھری ایٹش ٹرے کے پاس جا کر سکرین کے ٹکڑوں کو سونگھنا شروع کر دیا۔ سالار نے چپتی ہوئی تیز نظروں سے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ کامران نے چند لمحوں کے بعد وہ ایٹش ٹرے نیچے پٹخ دیا۔

Salar! what are you upto this time?

”مجھے صاف صاف بتاؤ، مسئلہ کیا ہے۔ ڈرگز استعمال کر رہے ہو تم؟“

”نہیں، میں کچھ استعمال نہیں کر رہا۔“ اس کے جواب نے کامران کو خاصا مشتعل کر دیا۔ وہ اسے کندھے سے پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے ہاتھ روم کے آئینے کے سامنے لے آیا۔

”شکل دیکھو اجی، ڈرگ ایڈکٹ والی شکل ہے یا نہیں اور حرکتیں تو بالکل ویسی ہی ہیں۔ دیکھو، نظریں اٹھاؤ اپنا، چہرہ دیکھو اپنا۔“

وہ اسے اب کالر سے کھینچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سالار آئینے میں اپنے آپ کو دیکھے بغیر بھی جانتا تھا کہ وہ اس وقت کیسا نظر آ رہا ہوگا۔ گہرے حلقوں اور بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ وہ کیسا نظر آ سکتا تھا۔ وہی سہمی سران مہاسوں اور ہونٹوں پر جمی ہوئی چیزوں نے پوری کر دی تھی جو بے تماشائکانہ اور سکرین پینے کا نتیجہ تھی۔ مہاسوں کی وجہ سے اس نے روز شیو کرنی بند کر دی تھی۔ کچھ ناراضی کے عالم میں اس نے کامران سے اپنا کالر چھڑایا اور آئینے پر نظریں دوڑائے بغیر ہاتھ روم سے نکلنے کی کوشش کی۔

”لعنت برس رہی ہے تمہاری شکل پر۔“

لعنت وہ لفظ تھا جو کامران اکثر استعمال کیا کرتا تھا سالار نے پہلے بھی اس لفظ کو محسوس نہیں کیا تھا مگر اس وقت کامران کے منہ سے ہی جملہ سن کر وہ جیسے بھڑک اٹھا تھا۔

”ہاں، لعنت برس رہی ہے میری شکل پر تو؟“ وہ قدرے ہنسنے لگا اور اس نے کہا: ”میرے ہونے انداز میں کامران کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔“

”جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں ڈرگزنہیں لے رہا تو میں نہیں لے رہا۔ آپ کو میرا یقین کرنا چاہئے۔“

”تم پر یقین.....“

کامران نے طنز بھری نگاہوں میں اس کے پیچھے ہاتھ روم سے باہر آتے ہوئے کہا۔ اس نے ہونٹ ہنچنے لگے اور کمرے کی چیزیں سینٹھنے کا کام جاری رکھا۔

”یو نیورسٹی جا رہے ہو تم؟“ سعد کو اچانک ایک اور اندیشہ ہوا۔

”جا رہا ہوں۔“ وہ چیزیں اٹھا ہاتھ کامران کو تسلی نہیں ہوئی۔

”میرے ساتھ ہاسٹل چلو، میں تمہارا چیک اپ کروانا چاہتا ہوں۔“

”اگر آپ یہ سب کرنے آئے ہیں تو بہتر ہے واپس چلے جائیں میں کوئی کنڈرگارٹن کا بچہ نہیں ہوں۔ میں اپنا خیال رکھ سکتا ہوں۔“ کامران نے اس ہار کچھ کہنے کے بجائے اس کے ساتھ مل کر چیزیں اٹھانی شروع کر دیں۔ سالار نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ اس معاملے پر دوبارہ بحث نہیں کرے گا مگر اس کا یہ اندازہ غلط تھا۔ کامران نے اس کے پاس اپنے قیام کو لہا کر دیا۔ دو تین دن کے بجائے دو پورے ایک ہفتہ وہاں رہا۔ سالار اس کے قیام کے دوران باقاعدگی سے یونیورسٹی جاتا رہا مگر کامران اس دوران اس کے دوستوں اور یونیورسٹی کے پروفیسرز سے ملتا رہا۔ سمسٹر میں ٹیبل ہونے کی خبر بھی اسے سالار کے دوستوں سے ہی ملی تھی اور کامران کے لئے یہ ایک شاک تھا۔ سالار سے کچھ بھی توقع کی جا سکتی تھی، مگر سمسٹر میں ٹیبل ہونا اور وہ بھی اس بری طرح سے جبکہ وہ کچھ عرصہ پہلے تک یونیورسٹی کے چھپلے ریکارڈ بریک کرتے ہوئے ٹاپ کر رہا تھا۔

اس بار اس نے سالار سے اس معاملے کو ڈسکس نہیں کیا بلکہ پاکستان سکندر عثمان کو فون کر کے اس سارے معاملے سے آگاہ کر دیا۔ سکندر عثمان کے بیروں تلے سے ایک ہار پھر زمین نکل گئی تھی۔ سالار نے اپنا سابقہ ریکارڈ برقرار رکھا تھا۔ وہ ایک ڈیڑھ سال کے بعد ان کے لئے کوئی نہ کوئی نیا مسئلہ کھڑا کر رہا تھا اور ہاشم تبین والے معاملے کو بھی اتنا ہی عرصہ ہونے والا تھا۔

”آپ ابھی اس سے اس معاملے پر بات نہ کریں۔ یونیورسٹی میں کچھ پھنسیا ہونے والی ہیں، آپ اسے پاکستان بلا لیں، کچھ عرصے کے لئے وہاں رکھیں پھر می سے کہیں کہ وہ اس کے ساتھ واپسی پر یہاں آ جائیں اور جب تک اس کی تعلیم ختم نہیں ہوتی اس کے ساتھ رہیں۔“ کامران نے سکندر عثمان کو سمجھایا۔

سکندر نے اس بار ایسا ہی کیا تھا۔ وہ بتائے بغیر چھنسیا شروع ہونے سے پہلے یونیورسٹی چلنے گئے۔

اس کا علیہ دیکھ کر سکندر عثمان کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگی تھیں مگر انہوں نے کامران کی طرح

اس سے بحث نہیں کی۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ پاکستان چلنے کے لئے کہا۔ اس کے احتجاج اور تعلیمی مصروفیات کے بہانے کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے زبردستی اس کی سیٹ بک کروادی اور اسے پاکستان لے آئے۔

☆.....☆.....☆

دو رات ایک بچے پاکستان پہنچے۔ سکندر اور طیبہ سونے کے لئے چلے گئے۔ وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد اپنے کمرے کو دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ لائٹ آف کر کے اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ غلامت کے دوران سوتا رہا تھا، اس لئے اس وقت اسے نیند محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ جنٹرا فیکٹی تبدیلی تھی جس کی وجہ سے وہ سو نہیں پا رہا تھا۔

”میں واقعی آہستہ آہستہ بے خوابی کا شکار ہو جاؤں گا۔“

اس نے تاریکی میں کمرے کی چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر اسی طرح بیڈ پر کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ کمرے کی کھڑکیوں کی طرف جاتے ہوئے اس نے پردوں کو ہٹا دیا۔ اس کی کھڑکیوں کے پار وسیع سائینڈ لان کے دوسرے طرف ہاشم تبین کا گھر نظر آ رہا تھا۔ اس نے اتنے سالوں میں اس کھڑکی کے پردے آگے پیچھے کرتے کبھی ہاشم تبین کے گھر پر غور نہیں کیا تھا، مگر اس وقت وہ بہت دیر تک تاریکی میں اس گھر کے اوپر والے فلور کی لائٹس میں نظر آنے والی اس عمارت کو دیکھتا رہا۔ بہت ساری باتیں اسے یاد آنے لگی تھیں۔ اس نے پردے ایک ہار پھر برابہ کر دیئے۔

”وسیم کے گھر والوں کو امامہ کا پتا چلا؟“

اس نے اگلے دن ناصرہ کو بلا کر پوچھا۔ ناصرہ نے اسے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

”نہیں جی، کہاں پتا چلا۔ انہوں نے تو ایک ایک جگہ چھان ماری ہے، مگر کہیں سے کچھ پتا نہیں چلا۔“

انہیں شک ابھی بھی آپ پر ہی ہے۔ سلمیٰ بی بی تو بہت گالیاں دیتی ہیں آپ کو۔“ سالار اسے دیکھتا رہا۔

”گھر کے نوکروں سے بھی پولیس نے بڑی پوچھ گچھ کی تھی مگر میں نے تو مجال ہے ذرا ابھی کچھ بتایا

ہو۔ انہوں نے مجھے کام سے بھی نکال دیا تھا۔ مجھے بھی، میری بیٹی کو بھی پھر بعد میں دوبارہ رکھ لیا۔ آپ

کے بارے میں مجھ سے پوچھتے رہتے ہی۔ شاید رکھا بھی ان لوگوں نے دوبارہ اسی لئے ہے کہ یہاں کی

خبریں میں وہاں دیتی رہوں۔ میں بھی آئیں بائیں شائیں کر کے نال دیتی ہوں۔“ وہ بات کو کہاں سے کہاں لے کر جا رہی تھی۔

سالار نے فوراً امداد کی۔ ”پولیس ابھی بھی ڈھونڈ رہی ہے؟“

”ہاں جی ابھی بھی تلاش کر رہے ہیں۔ مجھے زیادہ تو پتا نہیں، وہ لوگ ہر چیز چھپاتے ہیں نوکروں

سے۔ امام بی بی کی بات بھی نہیں کرتے ہمارے سامنے مگر پھر بھی کبھی کبھار کوئی اڑتی اڑتی خبر مل جاتی ہے ہمیں۔ سالار صاحب! کیا آپ کو بھی امام بی بی کا پتا نہیں ہے۔“

ناصر نے بات کرتے کرتے اچانک اس سے پوچھا۔

”مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے؟“ سالار نے ناصر کو گھورا۔

”ایسے ہی پوچھ رہی ہوں جی آپ کے ساتھ ان کی دوستی تھی، اس لئے میں نے سوچا شاید آپ کو پتا ہو۔ وہ جو ایک بار آپ نے میرے ہاتھ کچھ کاغذ بھجوائے تھے، وہ کس لئے تھے؟“ اس کا تجسس اب تشویشناک حد تک بڑھ چکا تھا۔

”اس گھر کے کاغذات تھے، میں نے یہ گھر اس کے نام کر دیا تھا۔“ ناصر وہ کامنہ کھلے کا کھلا رہ گیا پھر وہ کچھ سنبھلی۔

”پر جی ایہ گھر تو سکندر صاحب کے نام پر ہے۔“

”ہاں! مگر یہ مجھے پتا نہیں تھا۔ یہ بات تم نے ان لوگوں کو بتائی ہے کہ تم یہاں سے کوئی کاغذ لے کر اس کے پاس گئی تھیں۔“ ناصر نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”توہ کریں جی امیں نے کیوں بتانا تھا۔ میں نے تو سکندر صاحب کو نہیں بتایا۔“

”اور یہ ہی بہتر ہے کہ تم اپنا منہ اسی طرح ہمیشہ کے لئے بند رکھو، اگر یہ بات ان کو پتا چلی تو پاپا تمہیں سامان سمیت اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیں گے۔ تم ان کے غصے کو جانتی ہو۔ جاؤ اب یہاں سے۔“ سالار نے ترشی سے کہا۔ ناصر وہ خاموشی سے اس کے کمرے سے نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک اینڈر پر کبھی کبھار ہانکنگ کے لئے مارگڈ کی پہاڑیوں پر جایا کرتا تھا۔ وہ ایک اینڈ نہیں تھا مگر اچانک ہی اس کا موڈ وہاں جانے کا بن گیا۔

ہمیشہ کی طرح گاڑی نیچے پارک کر کے وہ ایک بیک اپنی پشت پر ڈالے ہانکنگ کر جا رہا۔ واہسی کا سفر اس نے تب شروع کیا جب سامنے لہجے ہونے لگے۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اسے اپنی گاڑی تک پہنچنے میں دو گھنٹے لگیں گے۔ واہسی کے سڑک کو کچھ تیزی سے طے کرنے کے لئے وہ سڑک پر آگیا جہاں سے عام طور پر لوگ گزرتے تھے۔ اس نے ابھی کچھ فاصلہ ہی طے کیا تھا جب اسے اپنے پیچھے تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ سالار نے ایک نظر مڑ کر دیکھا۔ وہ وہ لڑکے تھے جو اس سے کافی پیچھے تھے، مگر بہت تیزی سے آگے آرہے تھے۔

سالار نے گردن واپس موڑ لی اور اسی طرح اپنا نیچے کا سڑک جاری رکھا۔ اسے اپنے طے سے وہ لڑکے مٹھوک نہیں لگتے تھے۔ جینز اور شرٹس میں ملبوس ان کا علیحدہ عام لڑکوں جیسا تھا مگر پھر پلٹے پلٹے

اسے یک دم کوئی اپنے ہانگل عقب میں محسوس ہوا۔ وہ برقی رفتار سے بے پناہ اور ساکت ہو گیا۔ ان دونوں لڑکوں کے ہاتھ میں ریو ہلو تھے اور وہ اس کے ہانگل سامنے تھے۔

”اپنے ہاتھ اوپر کرو، ورنہ ہم تمہیں شوٹ کر دیں گے۔“

ان میں سے ایک نے بلند آواز میں کہا۔ سالار نے بے اختیار اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ ان میں سے ایک اس کے پیچھے گیا اور بہت تیزی سے اس نے اسے کھینچتے ہوئے دھکا دیا۔ سالار لڑکھڑایا مگر سنبھل گیا۔

”ادھر چلو۔“ سالار نے کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر اس طرف جانا شروع کر دیا جہاں وہ اسے سڑک سے ہٹانا چاہتے تھے، تاکہ کوئی یک دم وہاں نہ آجائے۔ ان میں سے ایک اسے تقریباً چھلکتے ہوئے اس راستے سے ہٹا کر جھاڑیوں اور درختوں کے بہت اندر تک لے گیا۔

”گھنٹوں کے بل بیٹھو۔“ ایک نے درشتی سے اس سے کہا۔

سالار نے خاموشی سے اس کے حکم پر عمل کیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اس کی چیزیں چھینیں گے اور پھر اسے چھوڑ دیں گے اور وہ ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جس پر وہ دونوں مشتعل ہو کر اسے نقصان پہنچاتے۔ ان میں سے ایک اس کے پیچھے گیا اور اس نے اس کی پشت پر لٹکا ہوا چھونا سا بیگ اتار لیا۔ اس بیگ میں ایک کیرو، چند قلم رول، بیٹری، ٹیلی اسکوپ، فرسٹ ایڈ کٹ، والٹ پائی کی بوتل اور چند کھانے کی چیزیں تھیں جس لڑکے نے بیگ اتارا تھا وہ بیگ کھول کر اندر موجود چیزوں کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے والٹ کھول کر اس کے اندر موجود کرنسی اور کریڈٹ کارڈز کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد اس نے بیگ میں سے انٹو کائیٹ نکال لیا اور پھر فرسٹ ایڈ کٹ بھی نکال لی۔

”اب تم کھڑے ہو جاؤ۔“ اس لڑکے نے حکمانہ انداز میں کہا۔ سالار اس طرح ہاتھ سر سے اوپر اٹھائے کھڑا ہو گیا۔ اس لڑکے نے اس کی پشت پر جا کر اس کی شارٹس کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر انہیں نٹو اور اس میں موجود گاڑی کی چابی نکال لی۔

”گڈ! کار ہے؟“ سالار کو پہلی بار کچھ تشویش ہوئی۔

”تم لوگ میرا بیگ لے جاؤ مگر کار کو رہنے دو۔“ سالار نے پہلی بار انہیں مخاطب کیا۔

”ہیوں! کار کو کیوں رہنے دیں۔ تم ہماری خالہ کے بیٹے ہو کہ کار کو رہنے دیں۔“ اس لڑکے نے درشت لہجے میں کہا۔

”تم لوگ اگر کار لے جانے کی کوشش کرو گے تو تمہیں بہت سے پر اٹھو ہوں گے۔ صرف کار کی چابی مل جانے سے تم کار نہیں لے جا سکو گے۔ اس میں اور بھی بہت سے لاکس ہیں۔“ سالار نے ان سے کہا۔

”وہ اتنا مسئلہ ہے، تمہارا نہیں۔“ اس لڑکے نے اس سے کہا اور پھر آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں سے گلہز کھینچ لیا۔

”اپنے جاگرتا ہارو۔“ سالار نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”جاگرتا لے؟“ اس بار اس لڑکے نے جواب دینے کے بجائے پوری قوت سے ایک تھپڑ سالار کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا گیا، چند لمحوں کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ہانچ گئے۔

”دوبارہ کوئی سوال مت کرنا، جاگرتا ہارو۔“

سالار غشگشیں نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ دوسرے لڑکے نے اس پر تانے ہوئے ریو الوور کے جھیر کو ایک بار جتانے والے انداز میں حرکت دی۔ پہلے لڑکے نے ایک اور تھپڑ اس بار سالار کے دوسرے گال پر دے مارا۔

”اب دیکھو اس طرح۔۔۔ جاگرتا ہارو۔“ اس نے سختی سے کہا۔ سالار نے اس بار اس کی طرف دیکھے بغیر نیچے جھک کر آہستہ آہستہ اپنے دونوں جاگرتا ہارو دیئے۔ اب اس کے بیروں میں صرف جراثیم رو گئی تھیں۔

”اپنی شرٹ اتارو۔“ سالار ایک بار پھر اعتراض کرنا چاہتا تھا مگر وہ دوبارہ تھپڑ کھانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر ان دونوں کے پاس ریو الوور نہ ہوتے تو وہ جسمانی طور پر ان سے بہتر تھا اور یقیناً اس وقت ان کی ٹھکانی کر رہا ہوتا، مگر ان کے پاس ریو الوور کی موجودگی نے یک دم ہی اسے ان کے سامنے بے بس کر دیا تھا۔ اس نے اپنی شرٹ اتار کر اس لڑکے کی طرف بڑھائی۔

”نیچے بھینگو۔“ اس لڑکے نے حکیمانہ انداز میں کہا۔ سالار نے شرٹ نیچے پھینک دی۔ اس لڑکے نے اپنے ہاتھ کو جیب میں ڈال کر کوئی چیز نکالی۔ وہ پلاسٹک کی باریک ڈوری کا ایک گچھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی سالار کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بے اختیار پریشان ہوا، شام ہو رہی تھی، کچھ ہی دیر میں وہاں اندھیرا چھا جاتا اور وہ وہاں سے رہائی کس طرح حاصل کرتا۔

”دیکھو، مجھے ہاندھو مت، میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم میرا ایک اور میری کار لے جاؤ۔“ اس نے اس بار ہاتھ اٹھانے انداز میں کہا۔

اس لڑکے نے کچھ بھی کہے بغیر پوری قوت سے اس کے پیٹ میں ایک گھونسا مارا۔ سالار درد سے دہرا ہوا گیا۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی تھی۔

”کوئی مشورہ نہیں۔“

اس لڑکے نے جیسے اسے باور کروایا اور زور سے ایک طرف دھکیلا۔ درد سے ہلبلا جتے ہوئے سالار نے اندھوں کی طرح اس کی بیرونی کی۔ ایک درخت کے سنے کے ساتھ بٹھا کر اس لڑکے نے

بڑی مہارت کے ساتھ اس کے دونوں بازوؤں کو پتکے سے تنے کے پیچھے لے جا کر اس کی ٹھانیوں پر وہ ڈوری پھینکا شروع کر دی۔ دوسرا لڑکا سالار سے ذرا فاصلے پر اطمینان سے ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے سالار پر ریو الوور تانے رہا۔

اس کے ہاتھوں کو ابھی طرح باندھنے کے بعد اس لڑکے نے سامنے آ کر اس کے بیروں کی جراثیم اٹھائیں اور پھر فرسٹ ایڈ کٹ میں موجود قہنگی سے اس نے سالار کی شرٹ کی پٹیاں کاٹنی شروع کر دیں۔ ان میں سے کچھ پٹیوں کو اس نے ایک بار پھر بڑی مہارت کے ساتھ اس کے ٹخنوں کے گرد پھینک کر گرد گردی پھر اس نے ٹشو کا پیکٹ کھولا اور اس میں موجود سارے ٹشو باہر نکال لئے۔

”منہ کھولو۔“ سالار جانتا تھا، وہ اب کیا کرنے والا ہے۔ وہ جتنی گالیاں اسے دل میں دے سکتا تھا اس وقت دے رہا تھا۔ اس لڑکے نے یکے بعد دیگرے وہ سارے ٹشو اس کے منہ میں ٹھونس دیئے اور پھر شرٹ کی واحد بچ جانے والی پٹی کو گھوڑے کی لگام کی طرح اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے درخت کے تنے کے پیچھے اسے باندھ دیا۔

دوسرا لڑکا اب اطمینان سے بیگ بند کر رہا تھا، پھر چند منٹوں کے بعد وہ دونوں وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ ان کے وہاں سے جاتے ہی سالار نے اپنے آپ کو آزاد کرنے کی کوشش شروع کر دی، مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اس لڑکے نے بڑی مہارت کے ساتھ اسے باندھا تھا، وہ صرف ہلنے چلنے کی کوشش سے خود کو آزاد نہیں کر سکتا تھا، نہ ہی ڈوری ڈھیلی کر سکتا تھا۔ وہ ڈوری اس کے حرکت کرنے پر اس کے گوشت کے اندر گھسیتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی حالت اس وقت بے حد خراب ہو رہی تھی۔ وہ نہ کسی کو آواز دے سکتا تھا نہ کسی دوسرے طریقے سے خود اپنی طرف کسی کو متوجہ کر سکتا تھا۔

اس کے ارد گرد قد آدم جھاڑیاں تھیں اور شام کے ڈھلنے ساہیوں میں ان جھاڑیوں میں اس کی طرف کسی کا متوجہ ہو جانا کوئی معجزہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے جسم پر اس وقت لباس کے نام پر صرف گھٹنوں سے کچھ نیچے تک لٹکنے والی برمودا شامس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا اور شام ہونے کے ساتھ ساتھ خشکی بڑھ رہی تھی۔ گھر میں کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ہانگنگ کے لئے یہاں آیا ہوا ہے اور جب گھرنے پہنچنے پر اس کی تلاش شروع ہو گی تب بھی یہاں اس تاریکی میں درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان بندھے ہوئے اس کے وجود تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

آدھ گھنٹے کی جدوجہد کے بعد جب اپنے بیروں کے گرد موجود پٹیوں کو ڈھیلنا کرنے اور پھر انہیں کھولنے میں کامیاب ہوا، اس وقت سورج کھل خروپ ہو چکا تھا اگر چاند نہ لگا ہوتا تو شاید وہ اپنے ہاتھ پاؤں اور ارد گرد کے ماحول کو بھی نہ دیکھ پاتا۔ اکاڑکا گزرنے والی گاڑیوں اور لوگوں کا شور اب نہ

ہونے کے برابر تھا۔ اس کے ارد گرد جھینگروں کی آوازیں گونج رہی تھیں اور وہ گردن سے کمر تک اپنی پشت پر درخت کے تنے کی وجہ سے آنے والی رگڑ اور خراشوں کو بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔ درخت کے دوسری طرف اس کے ہاتھوں کی کالیوں میں موجود ڈوری اب اس کے گوشت میں اترتی ہوئی تھی۔ وہ ہاتھوں کو مزید حرکت دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ کالیوں سے اٹھتی ٹیسیں برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے منہ کے اندر موجود نشووناب گل چکے تھے اور ان کے گلے کی وجہ سے وہ منہ میں لگام کی طرح کسی ہوئی پٹی کو حرکت دینے لگا تھا مگر وہ گلے سے آواز نکالنے میں اب بھی برج طرح ناکام تھا کیونکہ وہ ان گلے ہوئے نشوونابوں کو نکل سکتا تھا، نہ اگل سکتا تھا۔ وہ اسے زیادہ تھکے کہ وہ انہیں بیوقوفم کی طرح چبانے میں بھی ناکام تھا۔

اس کے جسم پر کچلی طاری ہو رہی تھی۔ وہ صبح تک اس حالت میں وہاں یقیناً ٹھہر کر مر جاتا اگر خوف یا کسی زہریلے کیڑے کے کانٹے سے نہ مرنا تو۔ اس کے جسم پر اب چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگ رہے تھے اور بار بار وہ اسے کاٹ رہے تھے۔ وہ اپنی رہنما گلوں پر چلنے اور کانٹے والے کیڑوں کو جھٹک رہا تھا مگر باقی جسم پر رینگنے والے کیڑوں کو جھٹکنے میں ناکام تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ ان چھوٹے کیڑوں کے بعد اسے اور کن کیڑوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اگر وہاں چھو اور سانپ ہوتے تو۔۔۔۔۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حالت مزید خراب ہو رہی تھی۔ ”آخر یہ سب میرے ساتھ کیوں ہوا ہے؟ آخر میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ بے چارگی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ ”اور میں یہاں مر گیا تو۔۔۔؟ تو میری تو لاش تک وہ بارہ کسی کو نہیں ملے گی۔ کیڑے کوڑے اور جانور مجھے کھا جائیں گے۔“

اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ ایک عجیب طرح کے خوف نے اسے اپنی گرفت میں لیا۔ تو کیا میں اس طرح مروں گا، یہاں۔۔۔ اس حالت میں۔۔۔ بے لباس۔۔۔ بے نشان۔۔۔ مگر والوں کو پتا تک نہیں ہو گا میرے بارے میں۔ کیا میرا انجام یہ ہونا ہے۔۔۔ اس کے دل کی دھڑکن رکنے لگی۔ اسے اپنی موت سے یک دم خوف آیا تا خوف کہ اسے سانس لینا مشکل لگنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے موت اس کے سامنے اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہو۔ اس کے انتظار میں۔ یہ دیکھنے کہ وہ کس طرح سسک سسک کر مرتا ہے۔

دور در کی پروا کے بغیر ایک بار پھر اپنی کالیوں کی ڈوری کو توڑنے یا ذمیلی کرنے کی کوشش کرنے لگا، اس کے ہاتھوں نے گلے۔

پندرہ منٹ بعد اس نے ایک بار پھر اپنی جدوجہد چھوڑ دی اور اس وقت اسے احساس ہوا کہ اس کے منہ کی پٹی ذمیلی ہو گئی تھی، وہ گردن کو ہلاتے ہوئے اسے منہ سے نکال سکتا تھا۔ اس کے بعد اس نے

نشووناب نکال دیئے تھے۔ اگلے کئی منٹ وہ گہرے سانس لیتا رہا پھر وہ بلند آواز میں اپنی مدد کے لئے آوازیں دینے لگا۔ اتنی بلند آواز میں جتنی وہ کوشش کر سکتا تھا۔

اس کا انداز بالکل بڈبڈانی تھا۔ آدھے گھنٹے تک مسلسل آوازیں دیتے رہنے کے بعد اس کی صحت اور گلا دونوں جو اب دے گئے۔ اس کا سانس پھول رہا تھا، یوں جیسے وہ کئی میل دوڑنا رہا ہو مگر اب بھی کوئی اس کی مدد کے لئے نہیں آیا تھا۔ کالی کے زخم اب اس کے لئے ناقابل برداشت ہو رہے تھے اور کیڑے اب اس کے چہرے اور گردن پر بھی کاٹ رہے تھے۔ وہ نہیں جانتا ایک دم اسے کیا ہوا، بس وہ بلند آواز میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ زندگی میں پہلی بار بری طرح رورہا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار اسے اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا اور اس وقت درخت کے اس تنے کے ساتھ بندھے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ مرنا نہیں چاہتا ہے۔ وہ موت سے اسی طرح خوفزدہ ہو رہا تھا، جس طرح نیو یون میں ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا وہ کتنی دیر اسی طرح بے بسی کے عالم میں بلند آواز میں روتا رہا پھر اس کے آنسو خشک ہونے لگے۔ شاید وہ اتنا تھک چکا تھا کہ اب روتا بھی اس کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ نڈھال سا ہو کر اس نے درخت کے تنے سے سر نکاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے کندھوں اور بازوؤں میں اتار دے ہو رہا تھا کہ اسے لگ رہا تھا وہ کچھ دیر میں مفلوج ہو جائیں گے پھر وہ کبھی انہیں حرکت نہیں دے سکے گا۔

”میں نے کبھی کسی کے ساتھ اس طرح نہیں کیا پھر میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔“ اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنے لگے۔

”سالار امیر نے لئے پہلے ہی بہت پر اہلڑ ہیں، تم اس میں اضافہ نہ کرو، میری زندگی بہت مشکل ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اور مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ کم از کم تم تو میری کچھ بیشن کو سمجھو، میری مشکلات کو مت بڑھاؤ۔“ درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے سالار نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ نیچے بہت نیچے، بہت دور۔ اسلام آباد کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔

”میں تمہارے مسائل میں اضافہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں؟ میں۔۔۔؟“ نالی ڈیرا ماہر! میں تو تمہاری ہمدردی میں تھل رہا ہوں۔ تمہارے مسائل ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم خود سوچو، میرے ساتھ رہ کر تم کتنی اچھی اور مخلوط زندگی گزار سکتی ہو۔“ سالار نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔

”سالار اچھے خلاق دے دو۔“ بھرائی ہوئی لجاجت آمیز آواز۔

”سویت پارٹ اتم کورٹ میں جا کر لے لو۔ جیسا کہ تم کہہ چکی ہو۔“

وہ اب چپ چاپ خود سے بہت دور نظر آنے والی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی اس کے سامنے جیسے آئینہ لے کر کھڑا ہو گیا تھا جس میں وہ اپنا عکس دیکھ سکتا تھا اور اپنے ساتھ ساتھ کسی اور کا بھی۔

”میں نے امامہ کے ساتھ صرف مذاق کیا تھا۔“ وہ بڑبڑایا۔

”میں..... میں اسے کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔“ اسے اپنے الفاظ کھوکھلے لگے۔

وہ پتا نہیں کس کو وضاحت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ اسی طرح اسلام آباد کی روشتیوں کو دیکھتا رہا پھر اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔

”میں مانتا ہوں، مجھ سے کچھ غلطیاں ہو گئیں۔“

اس بار اس کی آواز بھڑائی ہوئی سرکوشی تھی۔ ”میں نے جانتے بوجھے اس کے لئے مسائل کھڑے کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے دھوکا دیا مگر مجھ سے غلطی ہو گئی اور مجھے بچھتا ہوا بھی ہے۔ میں جانتا ہوں میرے طلاق نہ دینے سے اور جلال کے بارے میں جھوٹ بول دینے سے اسے بہت زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔ مجھے واقعی بچھتا ہوا ہے اس سب کے لئے مگر اس کے علاوہ تو میں نے کسی اور کو کبھی دھوکا نہیں دیا، کسی کے لئے پریشانی کھڑی نہیں کی۔“

وہ ایک بار پھر رونے لگا۔

”میرے خدا..... اگر ایک بار میں یہاں سے بچ گیا، میں یہاں سے نکل گیا تو میں امامہ کو ڈھونڈوں گا، میں اسے طلاق دے دوں گا، میں وہ بارہ کبھی اسے تنگ نہیں کروں گا۔ میں جلال کے بارے میں بھی اسے بچ بتا دوں گا۔ بس ایک بار آپ مجھے یہاں سے جانے دیں۔“

وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ امامہ نے اس کے طلاق نہ دینے سے انکار پر کیا محسوس کیا ہو گا۔ شاید اسی طرح اس نے بھی اپنے ہاتھ بندھے ہوئے محسوس کئے ہوں گے جس طرح وہ کر رہا تھا۔

وہاں بیٹھے ہوئے پہلی بار وہ امامہ کی بے بسی، خوف اور تکلیف کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے جلال انصر کی شادی کے بارے میں اس سے جھوٹ بولا تھا اور اس کے جھوٹ پر امامہ کے چہرے کا تاثر اسے اب بھی یاد تھا۔ اس وقت وہ اس تاثر سے بے حد محظوظ ہوا تھا۔ وہ اسلام آباد سے لاہور تک تقریباً پوری رات روتی رہی تھی اور وہ بے حد سرد رہا تھا۔

وہ اس وقت اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ اس اندھیری رات میں اس گاڑی میں سڑ کرتے ہوئے اسے اپنے آگے اور پیچھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہو گا۔ واحد پناہ گاؤں، جس کا وہ سوچ کر نکلی تھی وہ جلال انصر کا گھر تھا اور سالار سکندر نے اسے وہاں جانے نہیں دیا تھا۔ وہ رات کے اس پہر وہاں اعصاب میں اترنے والی تاریکی میں بیٹھ کر ان اندیشوں اور خوف کا اندازہ کر سکتا تھا جو اس رات امامہ کو زلزلہ ہے تھے۔

”مجھے انسوس ہے، مجھے واقعی انسوس ہے لیکن..... لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر..... اگر وہ مجھے

دو بارہ ملی تو میں اس سے ایکسکیج کر لوں گا، میں جس حد تک ممکن ہو اس کی مدد کروں گا مگر اس وقت..... اس وقت تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر..... اگر میں نے کبھی..... کبھی کوئی نیکی کی ہے تو مجھے اس کے بدلے یہاں سے رہائی دلا دے۔ اوہ گاڈ پلیز..... پلیز..... پلیز۔“ اس نے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اپنی نیکیاں گننے کی کوشش کی جنہیں وہ گنوا سکے۔ اس وقت پہلی بار اس پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ اس نے زندگی میں اب تک کوئی نیکی نہیں کی تھی۔ کوئی نیکی جسے وہ اس وقت اللہ کے سامنے پیش کر کے اس کے بدلے میں رہائی مانگتا۔ ایک اور خوف نے پھر اس کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی خیرات نہیں کی تھی، وہ اس پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ ہوٹل اور ریسٹورنٹس میں ٹپ خوش دلی سے دیا کرتا تھا، مگر کبھی کسی فقیر کے ہاتھ پھیلائے پر اس نے اسے کچھ نہیں دیا تھا۔

اسکول کالج میں مختلف کاموں کے لئے جب فنڈ جمع ہوتے تب بھی وہ ٹکٹس خریدنے یا بیچنے سے صاف انکار کر دیتا۔

”میں چیرینی پر یقین نہیں کرتا۔“ اس کی زبان پر روکھے انداز میں صرف ایک ہی جملہ ہو تا تھا۔ ”میرے پاس اتنی فالو رقم نہیں ہے کہ میں ہر جگہ لانا پھروں۔“ اس کا یہ رویہ نیو ہیون میں بھی جاری رہا تھا۔ یہ سب صرف چیرینی تک ہی محدود نہیں تھا۔ وہ چیرینی کے علاوہ بھی کسی کی مدد کرنے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اسے کوئی ایسا لمحہ یاد نہیں آیا، جب اس نے کسی کی مدد کی کی ہو، صرف امامہ کی مدد کی تھی اور اس مدد کے بعد اس نے جو کچھ کیا تھا اس کے بعد وہ اسے نیکی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ عبادت کرنے کا بھی عادی نہیں تھا۔ شاید بچپن میں اس نے چند بار سکندر کے ساتھ عید کی نماز پڑھی ہو مگر وہ بھی عبادت سے زیادہ ایک رسم تھی۔ اسے نیو ہیون میں ویرات یاد آئی جب وہ عشاء کی نماز اور صوری چھوڑ کر بھاگ آیا تھا اور اس کے ساتھ اسے اس hooker کو دیئے ہوئے ۱۵۰ ڈالر بھی یاد آئے۔ شاید وہ واحد موقع تھا جب اسے کسی پر ترس آیا تھا۔ وہ مستقل اپنے ذہن کو اپنی کسی نیکی کی تلاش میں کھنگالتا رہا مگر ناکام رہا۔

اور پھر اسے اپنے گناہ یاد آنے لگے۔ کیا تھا جو وہ نہیں کر چکا تھا۔ اس کے آنسو، گڑگڑانا، رونا سب کچھ یک دم ختم ہو گیا۔ حساب کتاب بالکل صاف تھا۔ وہ اگر آج اس حالت میں مر جاتا تو اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہوتی۔ پائیس سال کی عمر میں وہاں بیٹھے کئی گھنٹے صرف کرنے پر بھی جس شخص کو اپنی کوئی نیکی یاد نہ آئے جبکہ اس شخص کا آئی کیو لیول ۱۵۰+ ہو اور اس کی میموری فونو گرافک..... وہ شخص اللہ سے یہ چاہتا ہو کہ اسے اس کی کسی نیکی کے بدلے اس آزمائش سے رہا کر دیا جائے جس میں وہ پھنس گیا ہے۔

”What is next to ecstasy?”

اس نے ٹین اتاج میں کوکین پیتے ہوئے ایک بار اپنے دوست سے پوچھا تھا، وہ بھی کوکین لے رہا تھا۔

”more ecstasy۔“ اس نے کہا تھا۔ اس نے کوکین لیتے ہوئے اسے دیکھا۔

There is no end to ecstasy. It is preceded by pleasure and followed by more ecstasy.

وہ نشتے کی حالت میں اس سے کہہ رہا تھا۔ سالار مطمئن نہیں ہوا۔

No, it does end. What happens when it ends? When it really ends?

اس کے دوست نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

You know it yourself, don't you? You have been through it off and on.

سالار جواب دینے کے بجائے دوبارہ کو کہنے لگے لگا تھا۔

اس کی کلائیوں کے گوشت میں اتنی ڈوری سے اب جواب دے رہی تھی۔ "pain" (درو)۔

"What is next to pain?"

اس نے مضطرب نیر لہجے میں اس رات امامہ ہاشم سے پوچھا تھا۔

"Nothingness"

رستی نما کوئی چیز لہراتے ہوئے اس کے جسم پر گری تھی۔ اس کے سر، چہرے، گردن، سینے، پیٹ۔۔۔ اور وہاں سے تیز رفتاری سے رہتی ہوئی اتر گئی۔ سالار نے کانپتے جسم کے ساتھ اپنی چیخ رو کی تھی۔ وہ کوئی سانپ تھا جو اسے کانے بغیر چلا گیا تھا۔ اس کا جسم سینے میں نہا گیا تھا۔ اس کا جسم اب چارے کے مریض کی طرح تھر تھرا کاہل رہا تھا۔

"Nothingness" آواز بالکل صاف تھی۔

"And what is next to nothingness?"

تھخیر آ میر آواز اور مسکراہٹ اس کی تھی۔

"Hell"

اس نے یہی کہا تھا۔ وہ پچھلے آٹھ گھنٹے سے وہاں بندھا ہوا تھا۔ اس ویرانے، اس تاریکی، اس وحشت ناک تنہائی میں۔ وہ پورا ایک گھنٹہ حلق کے بل پوری قوت سے مدد کے لئے پکارتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا حلق آواز نکالنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

Nothingness سے Hell وہ ان دونوں کے بیچ کہیں معلق تھا یا شاید Nothingness میں داخل

ہونے والا تھا اور Hell تک پہنچنے والا تھا۔

"جہنم خوف نہیں آتا یہ پوچھتے ہوئے کہ Hell کے بعد آگے کیا آئے گا؟ دوزخ کے بعد آگے

کیا آسکتا ہے؟ انسان کے معتوب اور مغضوب ہو جانے کے بعد باقی بچتا ہی کیا ہے جسے جانے کا نہیں

استیقامت ہے؟"

سالار نے وحشت بھری نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ وہ کیا تھا، قبر یاد دوزخ بازندگی میں اس کا ایک منہر..... بھوک، پیاس، بے بسی، بے پاری و مددگاری، جسم پر چلتے کیڑے جنہیں وہ خود کو کاٹنے سے روک تک نہیں پارہا تھا۔ مفلوج ہوتے ہوئے ہاتھ پاؤں، پشت اور ہاتھوں کی کلائیوں پر لٹھ بہ لٹھ بڑھتے ہوئے زخم۔ خوف تھا یاد بشت، پتا نہیں کیا تھا مگر وہ بلند آواز میں پانگوں کی طرح چیخیں مارنے لگا تھا۔ اس کی چیخیں دور دور تک فضا میں گونج رہی تھیں۔ ہڈیانی اور جنونی انداز میں بلند کی جانے والی بے مقصد اور خوفناک چیخیں۔ اس نے زندگی میں اس طرح کا خوف کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ کبھی بھی نہیں۔ اسے اپنے ارد گرد عجیب سے بھوت چلتے پھرتے نظر آنے لگے تھے۔

اسے لگ رہا تھا اس کے دماغ کی رگ پھٹنے والی ہے یا پھر نروس بریک ڈاؤن، پھر اس کی چیخیں آہستہ آہستہ دم توڑتی گئیں۔ اس کا گلا پھر بند ہو گیا تھا۔ اب صرف سرسراہٹیں تھیں جو اسے سنائی دے رہی تھیں۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ اب مر رہا ہے۔ اس کا ہارٹ ٹیل ہو رہا ہے یا پھر وہ اپنا ذہنی توازن کھودینے والا ہے اور اسی وقت اچانک تنے کے پیچھے بندھی ہوئی کلائیوں کی ڈوری ڈھیلی ہو گئی۔ ہوش و حواس کھوتے ہوئے اس کے اعصاب نے ایک بار پھر جھٹکا لیا۔

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دباہتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ ڈوری اور ڈھیلی ہوتی گئی۔ شاید مسلسل تنے کی رگڑ لگتے لگتے درمیان سے ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے ہاتھوں کو کچھ اور حرکت دی اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ درخت کے تنے سے آزاد ہو چکا تھا۔

اس نے بے یقینی کے عالم میں اپنے بازوؤں کو سیدھا کیا۔ درد کی تیز لہریں اس کے بازوؤں سے گزریں۔

"کیا میں، میں سچ گیا ہوں؟"

اس نے بے یقینی سے اندھیرے میں اپنے بازوؤں اور ہاتھوں کے بیولے دیکھے ہوئے سوچا۔

"کیوں؟ کس لئے؟" ماڈف ہوتے ہوئے ذہن کے ساتھ اس نے اپنی گردن کے گرد موم جو اس پنی کو آجرا جو پہلے اس کے منہ کے گرد باندھی گئی تھی، بازوؤں کو دی گئی معمولی حرکت سے اس کے منہ سے کراہ لگی تھی۔ اس کے بازوؤں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ اتنی تکلیف کہ اسے لگ رہا تھا وہ دوبارہ کبھی اپنے بازو استعمال نہیں کر سکے گا۔ اس کی ٹانگیں بھی سن ہو رہی تھیں۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ وہ لڑکھڑا کر بازوؤں کے بل زمین پر گرا۔ ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ اس نے دوسری کوشش ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل کی۔ اس بار وہ کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ دونوں لڑکے اس کے جاگڑ اور گھڑی بھی لے جا چکے تھے۔ اس کی جرابیں وہیں کھین پڑی

تھیں۔ وہ اندھیرے میں انہیں ٹول کر بہن سکتا تھا مگر بازوؤں اور ہاتھوں کو استعمال میں لانا پڑتا تو وہ

اس وقت یہ کام کرنے کے قابل نہیں تھا۔ جسمانی طور پر وہ ذہنی طور پر۔

وہ اس وقت صرف وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ہر قیمت پر، اندھیرے میں شوگر کی کھانچا جھاڑیوں سے اُلجھتا خراشیں لیتا وہ کسی نہ کسی طرح اس راستے پر آ گیا تھا جس راستے سے وہ دونوں بنا کر اسے وہاں لے آئے تھے اور پھر ننگے پاؤں اس نے نیچے کا سڑیلے کیا۔ اس کے پیروں میں جگر اور سنگریاں چب رہی تھیں مگر وہ جس ذہنی اور جسمانی اذیت کا شکار تھا اس کے سامنے یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کیا وقت ہوا تھا مگر اسے یہ اندازہ تھا کہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ اسے نیچے آنے میں کتنا وقت لگا اور اس نے یہ سفر کس طرح طے کیا۔ وہ نہیں جانتا..... اسے صرف یہ یاد تھا کہ وہ پورے راستہ بلند آواز سے روتار ہا تھا۔

اسلام آباد کی سڑکوں پر آ کر اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں بھی اس نے اپنے طیلے کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی کہیں رکنے کی خواہش کی نہ ہی کسی کی مدد لینے کی۔ وہ اسی طرح روتا ہوا اڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اس سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر چلا رہا۔

وہ پولیس کی ایک پٹرولنگ کار تھی جس نے سب سے پہلے اسے دیکھا اور اس کے پاس آ کر زک مٹی اندر موجود کانسٹیبل اس کے سامنے نیچے اترے اور اسے روک لیا۔ وہ پہلی بار ہوش و جاں میں آیا تھا مگر اس وقت بھی وہ اپنی آنکھوں سے ہتے ہوئے آنسوؤں پر قابو پانے میں ناکام ہو رہا تھا وہ لوگ اب اس سے کچھ پوچھ رہے تھے، مگر وہ کیا جواب دیتا۔

اگلے پندرہ منٹ میں وہ ایک ہاسٹل میں تھا جہاں اسے فرسٹ ایڈ دی گئی۔ وہ اس سے اس کے گھر کا پتہ پوچھ رہے تھے مگر اس کا گلاب بند تھا۔ وہ انہیں کچھ بھی بتانے کے قابل نہیں تھا۔ سوچے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اس نے ایک کاغذ پر اپنے گھر کا فون نمبر اور ایڈریس لکھ لکھ دیا۔

”ابھی اور کتنی دیر اسے یہاں رکھنا پڑے گا؟“

”زیادہ دیر نہیں جیسے ہی ہوش آتا ہے ہم وہ بارہ چیک اپ کریں گے، پھر ڈسپانچ کر دیں گے زیادہ شدت جسم کی انجریز نہیں ہیں۔ بس گھر میں کچھ دن تک مکمل طور پر ریست کرنا پڑے گا۔“

اس کا ذہن لاشعور سے شعور کا سڑیلے کر رہا تھا۔ پہلے جو صرف بے معنی آوازیں تھیں۔ اب وہ انہیں مفہوم پہناتا رہا تھا۔ آوازوں کو پہچان رہا تھا ان میں سے ایک آواز سکندر عثمان کی تھی۔ وہ سری یقیناً کسی ڈاکٹر کی۔ سالار نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں یک دم چند حیا گئی تھیں۔ کمرے میں بہت تیز روشنی تھی یا کم از کم اسے ایسا ہی لگا تھا وہ ان کے فیملی ڈاکٹر کا پرائیویٹ کلینک تھا۔ وہ ایک بار پہلے بھی یہاں ایسے ہی ایک کمرے میں روکا تھا اور یہ پہچاننے کے لئے ایک نظری کافی تھی اس کا ذہن بالکل صحیح کام کر رہا تھا۔

جسم کے مختلف حصوں میں ہونے والے درد کا احساس اسے بھر ہونے لگا تھا۔ اس کے باوجود کہ اب وہ ایک بہت نرم اور آرام دہ بستری میں تھا۔

اس کے جسم پر وہ لباس نہیں تھا جو اس نے اس سرکاری ہاسٹل میں پہنا تھا، جہاں اسے لے جایا گیا تھا۔ وہ ایک اور لباس میں لمبوس تھا اور یقیناً اس کے جسم کو پانی کی مدد سے صاف بھی کیا گیا تھا کیونکہ اسے آدھے بازوؤں والی شرٹ سے جھانکتے اپنے بازوؤں پر کہیں بھی مٹی یا گرد نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کی کلاچیوں کے گرد پٹیوں بندھی ہوئی تھیں اور اس کے بازوؤں پر چھوٹے چھوٹے بہت سے نشانات تھے۔ بازو اور ہاتھ سوہے ہوئے تھے۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ ایسے ہی بہت سے نشانات اس کے چہرے اور جسم کے دوسرے حصوں پر بھی ہوں گے۔ اسے اپنی ایک آنکھ بھی سوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور اس کے جڑے بھی دکھ رہے تھے مگر اس سے بھی زیادہ برا حال گلے کا تھا۔ اس کے بازو میں ایک ڈرپ لگی ہوئی تھی جو اب تقریباً ختم ہونے والی تھی۔

پہلی بار اس کو ہوش میں ڈاکٹر نے ہی دیکھا تھا۔ وہ ان کا فیملی ڈاکٹر نہیں تھا۔ شاید اس کے ساتھ کام کرنے والا کوئی اور فزیشن تھا۔ اس نے سکندر کو اس کی طرف متوجہ کیا۔

”ہوش آ گیا ہے؟“ سالار نے ایک صوفے پر بیٹھی طیبہ کو اپنی طرف بٹھرتے دیکھا مگر سکندر آگے نہیں آئے تھے۔ ڈاکٹر اب اس کے پاس آ کر اس کی نبض چیک کر رہا تھا۔

”اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

سالار جو اب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکل سکی۔ وہ صرف منہ کھول کر رو گیا۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر اپنا سوال ڈہرایا، سالار نے عجب پر رکھا ہوا اپنی سرنگی میں بلا پایا۔ ”بولنے کی کوشش کرو۔“ ڈاکٹر شاید پہلے ہی اس کے گلے کے پرائیویٹ کے بارے میں جانتا تھا۔ سالار نے ایک بار پھر لگی میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر نے نرس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹرسے سے ایک ٹارچ لٹا کر اٹھایا۔

”منہ کھولیں۔“ سالار نے دیکھتے جڑوں کے ساتھ اپنا منہ کھول دیا۔ ڈاکٹر کچھ دیر اس کے حلق کا معائنہ کرتا رہا پھر اس نے ٹارچ بند کر دی۔

”گلے کا تفصیلی چیک اپ کرنا پڑے گا۔“ اس نے سڑکر سکندر عثمان کو بتایا پھر اس نے ایک رائٹنگ پیڈ اور چین سالار کی طرف بڑھایا۔ نرس جب تک اس کے بازو میں لگی ڈرپ اتار چکی تھی۔

”اٹھ کر بیٹھو اور بتاؤ کیا ہوا ہے۔ گلے کو؟“ اسے اٹھ کر بیٹھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ نرس نے حکیمانہ اس کے پیچھے رکھ دیا تھا وہ رائٹنگ پیڈ ہاتھ میں لئے سوچتا رہا۔

”کیا ہوا تھا؟ گلے کو، جسم کو، دماغ کو۔“ وہ کچھ بھی لکھنے کے قابل نہیں تھا۔ سوتی ہوئی آنکھوں میں پکڑے بین کو وہ دیکھتا رہا۔ اسے یاد تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اسے اپنی وہ نظریں یاد آ رہی تھیں

جنہوں نے اسے اب بولنے کے قابل نہیں سمجھوڑا تھا۔ کیا لکھا جائے یہ کہ مجھے ایک پہاڑ پر ساری چیزیں چھین کر باندھ دیا گیا تھا یا پھر یہ کہ مجھے چند گھنٹوں کے لئے زندہ قبر میں اتار دیا گیا تھا تاکہ مجھے میرے سوالوں کا جواب مل جائے۔

"What is next to ecstasy?"

وہ سفید صاف کاغذ کو دیکھتا رہا پھر اس نے مختصر سی تحریر میں اپنے ساتھ ہونے والا واقعہ تحریر کر دیا۔ ڈاکٹر نے رائٹنگ پیڈ پکڑ کر ایک نظر ان سات آٹھ جملوں پر ڈالی اور پھر اسے سکندر عثمان کی طرف بڑھا دیا۔

"آپ کو چاہئے کہ فوری طور پر پولیس سے رابطہ کریں، تاکہ کار پر آمد کی جاسکے، پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔ پتا نہیں وہ گاڑی کہاں سے کہاں لے جائے ہوں گے۔" ڈاکٹر نے ہمدردانہ انداز میں سکندر کو مشورہ دیا۔ سکندر نے رائٹنگ پیڈ پر ایک نظر ڈالی۔

"ہاں، میں پولیس سے کاٹیکٹ کرتا ہوں۔" پھر کچھ دیر ان دونوں کے درمیان اس کے گلے کے چیک اپ کے سلسلے میں بات ہوتی رہی پھر ڈاکٹر نرس کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلنے ہی سکندر عثمان نے ہاتھ میں پکڑا ہوا رائٹنگ پیڈ سالار کے سینے پر دے مارا۔

"یہ جھوٹ کا پلندہ اپنے پاس رکھو۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ اب میں تمہاری کسی بات پر اعتبار کروں گا۔ نہیں کبھی نہیں۔"

سکندر بے حد مشتعل تھے۔

"یہ بھی تمہارا کوئی نیلایا ویچر ہو گا۔ خود کشی کی کوئی نئی کوشش۔"

وہ کہنا چاہتا تھا۔ "فار گاڈ سیک۔ ایسا نہیں ہے۔" مگر وہ گونگوں کی طرح ان کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"میں کیا کہوں ڈاکٹر سے کہ اس کو عادت ہے ایسے تماشوں اور ایسی حرکتوں کی، یہ بیداری ان کاموں کے لئے ہوا ہے۔"

سالار نے سکندر عثمان کو کبھی اس حد تک مشتعل نہیں دیکھا تھا، شاید وہ واقعی اب اس سے نکل آ چکے تھے۔ طیبہ خاموشی سے پاس کھڑی تھیں۔

"ہر سال ایک نیا تماشہ، ایک نئی مصیبت، آخر تمہیں بیدار کر کے کیا کتاہ کر بیٹھے ہیں ہم۔"

سکندر عثمان کو یقین تھا یہ بھی اس کے کسی سننے ایڈ ویچر کا حصہ تھا جو لڑکا چار بار خود کو مارنے کی کوشش کر سکتا تھا اس کے ہاتھ پاؤں پر موجود ان زخموں کو کوئی ڈیکیتی قرار نہیں دے سکتا تھا وہ بھی اس صورت میں جب اس واقعے کا کوئی گواہ نہیں تھا۔

سالار کو "شیر آیا شیر آیا" والی کہانی یاد آئی۔ بعض کہانیاں واقعی بچی ہوتی ہیں۔ وہ ہار ہار جھوٹ

بول کر اب اپنا اعتبار گنوا چکا تھا۔ شاید وہ سب کچھ ہی گنوا چکا تھا۔ اپنی عزت، خود اعتمادی، غرور، فخر، ہر چیز وہ کسی پاتال میں بھیج گیا تھا۔

"کوئی نیا ڈرامہ کئے بڑے دن گزر گئے تھے تمہیں تو تم نے سوچا ماں باپ کو محروم کیوں رکھوں، انہیں خوار اور ڈھیل کئے بڑا عرصہ ہو گیا ہے۔ اب نئی تکلیف دینی چاہئے۔"

"ہو سکتا ہے سکندر، اب یہ ٹھیک کہہ رہا ہو۔ آپ پولیس کو گاڑی کے بارے میں اطلاع تو دیں۔"

اب طیبہ رائٹنگ پیڈ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے کے بعد سکندر سے کہہ رہی تھیں۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟ کبھی آج تک ٹھیک کہا ہے اس نے، مجھے اس کیواس کے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں ہے۔"

تمہارا یہ بیٹا کسی دن مجھے اپنی کسی حرکت کی وجہ سے پھانسی پر چڑھا دے گا اور تم کہہ رہی ہو کہ پولیس کو اطلاع دوں، اپنا مذاق بناؤں۔ کار کے ساتھ بھی کچھ نہ کچھ کیا ہو گا اس نے، سچ دی ہو گی کسی کو، یا نہیں پھینک آیا ہو گا۔"

وہ اب اسے واقعی گالیاں دے رہے تھے۔ اس نے کبھی انہیں گالیاں دیتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ وہ صرف ڈانٹا کرتے تھے اور وہ ان کی ڈانٹ پر بھی مشتعل ہو جاتا تھا۔ چاروں بھائیوں میں وہ واحد تھا جو ماں باپ کی ڈانٹ سننے کا بھی روادار نہیں تھا اور اس سے بات کرتے ہوئے سکندر بہت محتاط ہوا کرتے تھے کیونکہ وہ کسی بھی بات پر مشتعل ہو جایا کرتا تھا، مگر آج پہلی دفعہ سالار کو ان کی گالیوں پر بھی ہنسنے نہیں آیا تھا۔

وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس نے انہیں کس حد تک زچ کر دیا ہے۔ وہ پہلی بار اس بیڈ پر بیٹھے اپنے ماں باپ کی حالت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا چیز تھی جو انہوں نے اسے نہیں دی تھی۔ اس کے منہ سے نکلنے سے پہلے وہ اس کی فرمائش پوری کر دینے کے عادی تھے اور وہ اس کے بدلے میں انہیں کیا دیتا رہا تھا۔ کیا دے رہا تھا، ذہنی اذیت، پریشانی، تکلیف، اس کے علاوہ اس کے بہن بھائیوں میں سے کسی نے ان کے لئے کوئی پریشانی نہیں کھڑی کی تھی۔ صرف ایک وہ تھا جو.....

"کسی دن تمہاری وجہ سے ہم دونوں کو خود کشی کرنی پڑے گی۔ تمہیں تب ہی سکون ملے گا، صرف تب ہی یقین آئے گا تمہیں۔"

بچپنی رات اس پہاڑ پر اس طرح بندھے ہوئے اسے پہلی بار ان کی یاد آئی تھی۔ پہلی بار اسے پتا چلا تھا کہ اسے ان کی کتنی ضرورت تھی، وہ ان کے بغیر کیا کرے گا، اس کے لئے ان کے علاوہ کون پریشان ہو گا۔

اسے سکندر کے لفظوں سے زندگی میں پہلی بار کوئی بے عزتی محسوس نہیں ہو رہی تھی وہ ہمیشہ سے سکندر کے زیادہ قریب رہا تھا اور اس کے سب سے زیادہ جھگڑے بھی ان ہی کے ساتھ ہوتے رہے تھے۔

”میرادل چادر ہے کہ میں دو بارہ بھی تمہاری شکل تک نہ دیکھوں۔ تمہیں دو بارہ وہیں چنگو
روں جس جگہ کے بارے میں تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

”اب بس کرو سکندر۔“ طیبہ نے ان کو ٹوکا۔

”میں بس کروں۔۔۔۔۔ یہ کیوں بس نہیں کرتا، کبھی تو ترس کھالے یہ ہم لوگوں پر اور اپنی حرکتیں
چھوڑ دے۔ کیا اس پر یہ فرض کر کے اسے زمین پر اُچارا کیا تھا کہ یہ تمہاری زندگی خدا ب بنا دے۔“
سکندر طیبہ کی بات پر مزید مشتعل ہو گئے۔

”ابھی وہ پولیس والے بیان لینے آجائیں گے۔ جنہوں نے اسے سڑک پر پکڑا تھا۔ یہ کہو اس پیش
کریں گے ان کے سامنے کہ اس بے چارے کو کسی نے لوٹ لیا ہے۔ اچھا تو یہ ہوتا کہ اس بار واقعی کوئی
اسے لوٹتا اور اسے پہاڑ پر سے نیچے پھینکتا تاکہ میری جان چھوٹ جاتی۔

سالار بے اختیار سستے لگا۔ سکندر اور طیبہ جو پکڑا گئے، وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑے رو رہا تھا۔ وہ
زندگی میں پہلی بار اسے رو تادیکھ رہے تھے اور وہ بھی ہاتھ جوڑے، وہ کیا کر رہا تھا؟ کیا چادر ہاتھ؟ کیا تار ہا
تھا؟ سکندر عثمان بالکل سکت تھے، طیبہ اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئیں، انہوں نے سالار کو اپنے ساتھ
لگاتے ہوئے تھپکنے کی کوشش کی۔ وہ بچوں کی طرح ان کے ساتھ لپٹ گیا۔

اس کی پائنتی کی طرف کھڑے سکندر عثمان کو اچانک احساس ہوا کہ شاید اس بار وہ جھوٹ نہیں بول
رہا تھا۔ شاید اس کے ساتھ واقعی کوئی حادثہ ہوا تھا۔ وہ طیبہ کے ساتھ لینا نٹھے بچوں کی طرح ہچکیوں
سے رو رہا تھا۔ طیبہ اسے چپ کر داتے خود بھی رونے لگیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر تو کیا بڑی
بڑی باتوں پر بھی رونے کا عادی نہیں تھا، پھر آج کیا ہوا تھا کہ اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔

اس سے دور کھڑے سکندر عثمان کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

”اگر یہ ساری رات واقعی وہاں بندھا رہا تھا تو۔۔۔۔۔؟“

وہ ساری رات اس کے انتظار میں جاگتے رہے تھے اور بگڑتے رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ
گاڑی لے کر پھر کہیں لاہور یا کہیں اور آوارہ گردی کے لئے چلا گیا ہو گا۔ انہیں تشویش ہو رہی تھی مگر وہ
سالار سکندر کی حرکتوں سے واقف تھے۔ اس لئے تشویش سے زیادہ غصہ تھا اور ڈھائی تین بجے کے قریب
وہ سونے کے لئے چلے گئے تھے جب انہیں فون پر پولیس کی طرف سے یہ اطلاع ملی۔

وہ باہر نکلے پھرتے اور انہوں نے اسے وہاں بہت اہتر حالت میں دیکھا تھا مگر وہ یہ یقین کرنے پر تیار
نہیں تھے کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہوا تھا۔ وہ جانتے تھے وہ خود کو اڑا بیت بیچتا تار ہا تھا جو شخص اپنی کھائی
کاٹ لے۔ دن دسے کو توڑتے ہوئے ٹریک کی بھیڑ میں اپنی بائیک دے مارے۔ سلیپنگ پلو لے لے۔
اپنے آپ کو ہاندھ کر پانی میں اُن کو ڈال دیا۔ اس کے لئے ایک بار پھر اپنی یہ حالت کرنا مشکل تھا۔

اس کا جسم کیڑوں کے کاٹنے کے نشانات سے جگہ جگہ بھرا ہوا تھا۔ بعض جگہوں پر نیلا بٹ تھی۔
اس کے سر بھی بری طرح سے زخمی تھے۔ ہاتھوں کی کھالیں، گردن اور پشت کا بھی یہی حال تھا اور اس
کے جیزوں پر بھی خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود سکندر عثمان کو یقین تھا کہ یہ سب کچھ اس کی
اپنی کارستانی ہی ہوگی۔

شاید اس وقت وہ بولنے کے قابل ہوتا اور وضاحتیں پیش کرتا تو وہ کبھی بھی اس پر یقین نہ کرتے
مگر اسے اس طرح ہچکیوں کے ساتھ روتے دیکھ کر انہیں یقین آنے لگا تھا کہ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔

وہ کمرے سے باہر نکل گئے اور انہوں نے موبائل پر پولیس سے رابطہ کیا۔ ایک گھنٹے کے بعد انہیں
پتا چل گیا کہ سڑک کی ایک اسپورٹس کار پہلے ہی پکڑی جا چکی ہے اور اس کے ساتھ دو لڑکے بھی۔
پولیس نے انہیں ایک معمول کی چیکنگ کے دوران لائنس اور گاڑی کے کاغذات نہ ہونے پر گھبرا
جانے پر پکڑا تھا۔ انہوں نے ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ انہوں نے گاڑی کیسے سے چھینی تھی، وہ صرف یہی
کہتے رہے کہ وہ گاڑی انہیں گھنٹی تھی اور وہ صرف شوق اور تجسس سے مجبور ہو کر چلانے لگے چونکہ
پولیس کے پاس ابھی تک کسی گاڑی کی ایف آئی آر بھی درج نہیں کروائی گئی تھی اس لئے ان کے بیان کی
تصدیق مشکل ہو گئی تھی۔

مگر سکندر عثمان کی ایف آئی آر کے کچھ دیر بعد ہی انہیں کار کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ اب وہ
صحیح معنوں میں سالار کے بارے میں تشویش کا شکار ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

سکندر اور طیبہ سالار کو اس رات واپس نہیں لے کر آئے، وہ اس رات ہاسٹل میں ہی رہا گئے
دن اس کے جسم کا درد اور سوجن میں کافی کمی واقع ہو چکی تھی۔ وہ دونوں گیارہ بجے کے قریب اسے گھر
لے آئے۔ اس سے پہلے پولیس کے دو اہلکاروں نے اس سے ایک لمبا چوڑا تحریری بیان لیا تھا۔

سکندر اور طیبہ کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پہلی بار اس نے اپنی کھڑکیوں پر
لگی ہوئی مختلف ملازمتی ان نوڈ تصویروں کو دیکھا اسے بے اختیار شرم آئی۔ طیبہ اور سکندر بہت بار اس
کے کمرے میں آتے رہے تھے اور وہ تصویروں میں ان کے لئے کوئی نئی یا قابل اعتراض چیز نہیں تھیں۔

”تم اب آرام کرو۔ میں تمہارے فریج میں پھل اور جوس رکھوا دیا ہے۔ بھوک لگے تو کھال کر
کھا لینا یا پھر ملازم کو بلا لینا۔ وہ نکال دے گا۔“

طیبہ نے اس سے کہا۔ وہ اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر اس کے پاس رہے پھر کھڑکی کے
پر دے برابر کر کے اسے سونے کی تاکید کرتے ہوئے چلے گئے، وہ ان کے باہر نکلتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
اس نے کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کیا۔ کھڑکیوں کے پردے پٹا کر اس نے بہت تیزی سے

ان پر لگی ہوئی تمام تصویروں کو اتارنا شروع کر دیا۔ پوسٹر، تصویروں، کٹ آؤٹ۔ اس نے چند منٹ میں پورا کمرہ صاف کر دیا تھا، وائش روم میں جا کر اس نے ہاتھ منہ میں انہیں پھینک دیا۔

وائش روم کی لائٹ جلانے پر اس کی نظر اپنے چہرے پر پڑی تھی۔ وہ بری طرح سو جا ہوا اور نیا ہوا رہا تھا وہ ایسے ہی چہرے کی توقع کر رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر وائش روم سے نکل آیا۔ اس کے کمرے میں پورے نوگرائی کے بہت سے میگزین بھی پڑے تھے۔ وہ انہیں اٹھا لایا۔ اس نے انہیں بھی ہاتھ منہ میں پھینک دیا، پھر وہ باری باری اپنے ریک میں پڑی ہوئی گندی ویڈیوز اٹھا کر اس میں سے ٹیپ نکالنے لگا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اس کا کارپٹ ٹیپ کے ڈبیر سے بھرا ہوا تھا۔

اس نے وہاں موجود تمام ویڈیوز کو ضائع کر دیا اور ٹیپ کے اس ڈبیر کو اٹھا کر ہاتھ منہ میں پھینک دیا اور لائٹس کے ساتھ اس نے انہیں آگ لگا دی۔ ایک چنگاری بھڑکی تھی اور تصویروں اور ٹیپ کا وہ ڈبیر جلنے لگا تھا اس نے ایگزاسٹ آن کر دیا۔ ہاتھ روم کی کھڑکیاں کھول دیں وہ اس ڈبیر کو اس لئے جا رہا تھا کیونکہ وہ اس آگ سے بچنا چاہتا تھا جو دوزخ میں اسے اپنی لپٹوں میں لے لیتی۔

”آگ کی لپٹیں تصویروں اور ٹیپ کے اس ڈبیر کو کھا رہی تھیں۔ یوں جیسے وہ صرف آگ کے لئے ہی بنائی گئی تھیں۔“

وہ چلکیں جھپکے بغیر ہاتھ منہ میں آگ کے اس ڈبیر کو دیکھ رہا تھا یوں جیسے وہ اس وقت کسی دوزخ کے کنارے کھڑا تھا۔ ایک رات پہلے اس پہاڑی پر اس حالت میں اسلام آباد کی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ وہ اس کی زندگی کی آخری رات تھی اور وہ اس کے بعد دوبارہ کبھی ان روشنیوں کو نہیں دیکھ سکے گا۔

اس نے مذہبی حالت میں گلا پھاڑ کر چیختے ہوئے بار بار کہا تھا ”ایک بار، صرف ایک بار، مجھے ایک موقع دیں۔ صرف ایک موقع، میں دوبارہ گناہ کے پاس تک نہیں جاؤں گا۔ میں کبھی گناہ کے پاس نہیں جاؤں گا۔“ اسے یہ موقع دے دیا گیا تھا اب اس وعدے کو پورا کرنے کا وقت تھا۔ آگ نے ان سب کاغذوں کو راکھ بنا دیا تھا جب آگ بجھ گئی تو اس نے پانی کھول کر پانی کے ساتھ اس راکھ کو بھانا شروع کر دیا۔

سالار پلٹ کر دوبارہ وائش روم کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اس کے گلے میں موجود سونے کی مٹین کو وہ لوگ اتار کر لے گئے تھے مگر اس کے کان کی لو میں موجود ڈائمنڈ ٹائپس وہیں تھا۔ وہ چائینم میں جڑا ہوا تھا اور ان لوگوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ شاید ان کا خیال ہو گا کہ وہ کوئی معمولی پتھر یا پتھر زر قون ہو گا یا پھر شاید اس کے لیے کھلے ہاتھوں کی وجہ سے اس کے کان کی لو چھپی رہی ہوگی۔

وہ کچھ دیر آہینے میں خود کو دیکھتا رہا پھر اس نے کان کی لو میں موجود وہ ٹائپس اٹھا کر وائش روم کے

پاس رکھ دیا۔ شیوگ کٹ میں موجود کلپر اس نے نکالا اور اپنے بال کاٹنے لگا۔ بڑی بے رحمی اور بے دردی کے ساتھ۔ وائش روم میں بیٹا ہوا پانی ان بالوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جا رہا تھا۔

ریڈر نکال کر اس نے شیو کرنا شروع کر دی۔ وہ جیسے اپنی تمام نشانیوں سے بچھا چھڑا رہا تھا۔ شیو کرنے کے بعد اس نے اپنے کپڑے کھانے اپنے ہاتھوں پر بندھی پٹیاں کھولیں اور شاور کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پورا ایک گھنٹہ اپنے پورے جسم کے ایک ایک حصے کو کھد پڑھ پڑھ کر صاف کر رہا۔ یوں جیسے وہ آج پہلی بار اسلام سے متعارف ہوا ہو۔ پہلی بار مسلمان ہوا ہو۔

وائش روم سے باہر آ کر اس نے فرنیچ میں رکھے سیب کے چند ٹکڑے کھائے اور پھر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ الارم سے کھلی جسے اس نے سونے سے پہلے لگا یا تھا وہ بچ رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

”مائی گاڈ سالار! یہ اپنے بالوں کو کیا کیا ہے تم نے؟“ طیبہ اسے دیکھتے ہی کچھ دیر کے لئے بھول گئیں کہ وہ بولنے کے قابل نہیں تھا۔ سالار نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر ان کے سامنے کر دیا۔

”میں مارکیٹ جانا چاہتا ہوں۔“ اس پر لکھا ہوا تھا۔

”کس لئے؟“ طیبہ نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

”تم ابھی ٹھیک نہیں ہوئے ہو۔ کچھ گھنٹے ہوئے ہیں تمہیں ہاسٹل سے آئے اور تم ایک بار پھر آوارہ گردی کے لئے نکلتا جا رہے ہو۔“ طیبہ نے اسے قدرے نرم آواز میں تھڑکا۔

”مئی امیں کچھ کتابیں خریدنا چاہتا ہوں۔“ سالار نے ایک بار پھر کاغذ پر لکھا ”میں آوارہ گردی کرنے کے لئے نہیں جا رہا۔“

طیبہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ ”تم ڈرائیور کے ساتھ چلے جاؤ۔“ سالار نے سر ہلادیا۔

☆.....☆.....☆

وہ جس وقت مارکیٹ کی پارکنگ میں گاڑی سے اتر اٹھا ہوا پتلی تھی۔ مارکیٹ کی روشنیاں وہاں جیسے رنگ و نور کا ایک سیلاب لے آئی تھیں۔ وہ جگہ جگہ پھرتے لڑکے لڑکیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ مغربی ملبوسات میں ملبوس بے فکری اور لاچار وائی سے قہقہے لگاتے ہوئے اسے زندگی میں پہلی بار اس جگہ سے وحشت ہوئی تھی، وہی وحشت جو وہ اڑتالیس گھنٹے پہلے مارگلہ کی ان پہاڑیوں پر محسوس کرنا رہا تھا۔ وہ ان ہی لڑکوں میں سے ایک تھا لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے والا۔ بلند دہانگ قہقہے لگانے والا، فضول اور بے ہودہ باتیں کرنے والا، اپنا سر نیچے کئے وہ کسی بھی چیز پر دھیان دینے بغیر سامنے نظر آنے والی بک شاپ میں چلا آیا۔

اپنی جیب سے کاغذ نکال کر اس نے دکاندار کو اپنی مطلوبہ کتابوں کے بارے میں بتایا۔ وہ قرآن

پاک کا ایک ترجمہ اور نماز کے بارے میں کچھ دوسری کتابیں خریدنا چاہتا تھا۔ دکاندار نے اسے حیرانی سے دیکھا، وہ سالار کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ وہاں سے پورنوگرافی کے غیر ملکی میگزینز اور سڈنی شیلڈن اور بیرلڈر وینر سمیت چند دوسرے انگلش ٹائڈ ٹرکٹس والوں کے ہر سٹے ٹائڈ کو خریدنے کا عادی تھا۔ سالار اس کی نظروں کے استہجاب کو سمجھتا تھا۔ وہ اس سے نظریں ملانے کے بجائے صرف کاؤنٹر کو دیکھتا رہا۔ وہ آدمی کسی سبزیوں کو بدایات دینا یا پھر اس نے سالار سے کہا۔

”آپ بڑے دن بعد آئے۔ کیسے گئے ہوئے تھے؟“

”اسٹڈیز کے لئے باہر۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے سامنے بڑے ہونے کا نڈ پر لکھا۔

”اور یہ گلے کو کیا ہوا؟“

”بس ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے لکھا۔

سبزیوں میں قرآن پاک کا ترجمہ اور دوسری مطلوبہ کتابیں لے آیا۔

”ہاں ایہ اسلامی کتابوں کا آج کل بڑا ٹریڈ چلا ہوا ہے۔ لوگ بہت پڑھنے لگے ہیں، بڑی اچھی بات ہے۔ خاص طور پر باہر جا کر تو ضرور پڑھنا چاہئے۔“ دکاندار نے بڑے کاروباری انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ سالار نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنے سامنے پڑی کتابوں پر ایک نظر دوڑانے لگا۔

چند لمحوں کے بعد اس کے دائیں ہاتھ قرآن پاک کے ترجمے کے ساتھ کاؤنٹر پر خالی جگہ پر شاپ کیپر نے اس کے سامنے پورنوگرافی کے کچھ نئے میگزینز رکھ دیئے۔ کتابوں کو دیکھتے دیکھتے اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

”یہ سنے آئے ہیں میں نے سوچا آپ کو دکھا دوں۔ ہو سکتا ہے آپ خریدنا پسند کریں۔“

سالار نے ایک نظر قرآن پاک کے ترجمے کو دیکھا دوسری نظر چند اچھے دور پڑے ان میگزینز کو دیکھا، ہنسنے کی ایک لہری اس کے اندر اٹھی تھی۔ کیوں؟ وہ نہیں جانتا تھا۔ اپنے بائیں ہاتھ سے ان میگزینز کو اٹھا کر وہ چٹنی دور اس شاپ کے اندر پیچیک سکتا تھا اس نے پیچیک دیئے۔ چند لمحوں کے لئے پوری شاپ میں خاموشی چھا گئی۔

سبزیوں کا کھڑا تھا۔ ”ہل“ سالار نے کاؤنٹر پر گھسٹا اور سرخ چہرے کے ساتھ اس سبزیوں کی آنکھوں کے سامنے اس کاؤنٹر کو کیا۔ سبزیوں نے کچھ بھی کہے بغیر اپنے سامنے پڑے کیپوٹر پر ان کتابوں کا ہل بنانا شروع کر دیا جو اس کے سامنے رکھی تھیں۔

چند منٹوں میں سالار نے ہل ادا کیا اور کتابیں اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

”ایڈیٹ۔۔۔ دکان سے باہر نکلتے ہوئے اس نے کاؤنٹر کے پاس کھڑی ایک لڑکی کا تہرہ سنا، مخاطب کون تھا اس نے مز کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا وہ تہرہ ہی پر کیا گیا تھا۔

☆—☆—☆

دو ہفتے بعد اس کی آواز بحال ہو گئی تھی۔ اگرچہ ابھی اس کی آواز بالکل ٹھیک نہیں ہوئی تھی مگر وہ بولنے کے قابل ہو گیا تھا اور ان دو ہفتوں میں وہ روح کی دریافت میں مصروف رہا۔ وہ زندگی میں پہلا بار یہ کام کر رہا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار اسے یہ احساس ہوا تھا کہ روح بھی کوئی وجود رکھتی تھی اور اگر روح کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو جائے تو وہ زندگی میں پہلی بار خاموشی کے ایک لمبے فیز میں داخل ہوا تھا۔ یوں لگتا نہیں، سنا۔۔۔ صرف سنا بھی بعض دفعہ بہت اہم ہوتا ہے اس کا اور آگ اسے پہلی بار ہو رہا تھا۔

اسے زندگی میں رات سے کبھی خوف نہیں آیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد اسے رات سے بے تحاشا خوف آنے لگا تھا۔ وہ کمرے کی لائٹ آن کر کے سوتا تھا۔ اس نے پولیس کسٹڈی میں ان دونوں لڑکوں کو پہچان لیا تھا، مگر وہ پولیس کے ساتھ اس جگہ پر جانے کے لئے تیار نہیں ہوا تھا جہاں اس شام وہ اسے ہاندہ کر چھوڑ گئے تھے۔ وہ وہ بارہ کسی ذہنی پرائمر کی کاشکار ہونا نہیں چاہتا تھا، اس نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی اتنی بے خواب راتیں نہیں گزاریں تھیں مگر اب یہ ہو رہا تھا کہ وہ سلپنگ پلاؤں کے بغیر سونے میں کامیاب نہیں ہوتا تھا اور بعض دفعہ جب وہ سلپنگ پلاؤں لیتا تو دوسری رات جاگتے ہوئے گزار دیتا، اس نے نوبیوں میں بھی ایسے ہی چند ہفتے گزارے تھے۔ اسے ہی تکلیف دہ اور لذت ناک مگر جب صرف اُلجھن اور اضطراب تھا شاید کسی حد تک بچھتا ہوا۔

مگر اب وہ ایک تیسری کیفیت سے گزار رہا تھا خوف سے وہ اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس رات اسے کس چیز سے زیادہ خوف آیا تھا۔ موت سے، قبر سے، ایبا پھر دوزخ سے۔

امامہ نے کہا تھا ecstasy کے بعد pain ہوتی ہے۔ موت pain تھی۔

اس نے کہا تھا pain کے بعد nothingness ہوتی۔

قبر nothingness تھی۔

امامہ نے کہا تھا nothingness کے بعد hell آجائے گا۔

وہ وہاں تک پہنچتا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس ecstasy سے بچنا چاہتا تھا، جو اسے pain سے hell کا سفر کرنے پر مجبور کر دیتی۔

”اگر مجھے ان سب چیزوں کا پتا نہیں تھا تو امامہ کو کیسے پتا تھا۔ وہ میری ہی عمر کی ہے۔ وہ میرے جیسے خاندان سے تعلق رکھتی ہے، پھر اس کے پاس ان سوالوں کے جواب کیسے آگئے؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے سوچنے لگتا۔ آسانئیں تو اس کے پاس بھی وہی ہی تھیں جیسی میرے پاس تھیں پھر اس میں اور مجھ میں کیا فرق تھا وہ جس بکثرت لکھتے تھے وہ کون ہوتے ہیں اور وہ کیوں اس بکثرت لکھنے سے منسلک رہتا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے پہلی بار اس کے بارے میں تفصیلی طور پر پڑھا۔ اس کی اُلجھنوں میں اضافہ ہوا، ختم نبوت پر

اختلاف کیا اتنا ہم ایشیہ ہے کہ ایک لڑکی اس طرح اپنا گھر چھوڑ کر چلی جائے۔

”میں نے احمد سے اس لئے شادی نہیں کی کیونکہ وہ ختم نبوت ﷺ پر یقین نہیں رکھتا۔ تم سمجھتے ہو میں تمہارے جیسے انسان کے ساتھ زندگی گزارنے پر تیار ہو جاؤں گی۔ ایک ایسے شخص کے ساتھ جو ختم نبوت ﷺ پر یقین رکھتا ہے اور پھر بھی گناہ کرتا ہے جو ہر وہ کام کرتا ہے جس سے میرے پیغمبر ﷺ نے منع فرمایا۔ میں اگر حضرت محمد ﷺ پر یقین نہ رکھنے والے سے شادی نہیں کروں گی تو میں آپ ﷺ کی نافرمانی کرنے والے کے ساتھ بھی زندگی نہیں گزاروں گی۔“

اسے امام ہاشم کا ہر لفظ یاد تھا۔ وہ مہلک پر پہلی بار غور کر رہا تھا۔

”تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔“

اس نے بہت بار سالار سے یہ جملہ کہا تھا۔ اتنی بار کہ وہ اس تپیلے سے چڑنے لگا تھا۔ آخر وہ یہ بات کہہ کر اس پر کیا جتنا چاہتی تھی یہ کہ وہ کوئی بہت بڑی اسکا ریلیاں ساتھی اور وہ اس سے بہت کمتر..... اب وہ سوچ رہا تھا وہ بالکل ٹھیک کہتی تھی۔ وہ واقعی تب کچھ بھی سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ کچھ میں رہنے والا لڑکیاں کیسے جان سکتا تھا کہ وہ کس گندگی میں رہتا ہے، اسے اپنے بھانے دوسرے گندگی میں لٹنے اور گندگی میں رہتے نظر آتے ہیں۔ وہ بھی تب گندگی میں ہی تھا۔

”مجھے تمہاری آنکھوں سے، تمہارے کھلے گریبان سے گھن آتی ہے۔“ اسے پہلی بار اب ان دونوں چیزوں سے گھن آئی۔ آئینے کے سامنے رکھے ہونے پر یہ جملہ کسی بزدل (buzz word) کی طرح کئی ماہ تک اس کے کانوں میں گونجنے لگا۔ وہ ہر بار اسے ذہن سے جھٹکتا کچھ مشتعل ہوتا، اپنے کام میں مصروف ہو جاتا مگر اب پہلی بار اس نے محسوس کیا تھا کہ اسے خود بھی اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی۔ وہ اپنا گریبان بند رکھنے لگا تھا۔ اپنی آنکھوں کو جھکانے لگا۔ وہ آئینے میں بھی خود اپنی آنکھوں میں دیکھنے سے کترانے لگا تھا۔

اس نے کبھی کسی سے یہ نہیں سنا تھا کہ کسی کو اس کی آنکھوں اس کی نظروں سے گھن آتی تھی۔ خاص طور پر کسی لڑکی کو۔

یہ اس کی آنکھیں نہیں ان آنکھوں میں جھلکتے والا تاثر تھا، جس سے امام ہاشم کو گھن آتی تھی۔ امام ہاشم سے پہلے کسی لڑکی نے اس تاثر کو شناخت نہیں کیا تھا۔

وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والی لڑکیوں کی کہانی میں رہتا تھا اور وہ ایسی ہی لڑکیوں کو پسند کرتا تھا۔ امام ہاشم نے کبھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کی تھی وہ اس کے چہرے کو دیکھتی اور اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر نظر پٹائی پٹائی پھر کسی اور چیز کو دیکھنے لگتی۔ سالار کو خوش فہمی تھی کہ وہ اس سے نظریں اس لئے چراتی تھی کیونکہ اس کی آنکھیں بہت پرکشش تھیں۔

اسے پہلی بار اس کے منہ سے فون پر یہ سن کر شاک لگا تھا کہ اسے اس کی آنکھوں سے گھن آتی تھی۔ ”آنکھیں روح کی کڑیاں ہوتی ہیں؟“ اس نے کہیں پڑھا تھا تو کیا میری آنکھیں میرے اندر کبھی گندگی کو دکھاتا شروع ہو گئی تھیں۔ اسے قہقہے نہیں ہوا۔ ایسا ہی تھا مگر اس گندگی کو دیکھنے کے لئے سامنے والے کا پاک ہونا ضروری تھا اور امام ہاشم پاک تھی۔

☆.....☆.....☆

”آپ اب مجھے کچھ بھی نہ سمجھائیں۔ آپ کو اب مجھ سے کوئی حکایت نہیں ہوگی۔“

سالار نے سکندر سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔

۷۷۷۷ بار ۷۷۷۷ بار با تھا اور جانے سے پہلے سکندر نے بیٹھ کی طرح اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہی پرانی نصیحتیں کسی مہموم سی اس اور اُمید میں ایک بار پھر اس کے کانوں میں ٹھونسنے کی کوشش کی تھی مگر اس بار ان کے بات شروع کرتے ہی سالار نے انہیں شاید زندگی میں پہلی دفعہ یقین دہانی کرائی تھی اور زندگی میں پہلی بار سکندر عثمان کو اس کے الفاظ پر یقین آیا تھا۔

وہ اس حادثے کے بعد اس میں آنے والی تبدیلیوں کو واضح طور دیکھ رہے تھے۔ وہ پہلے والا سالار نہیں رہا تھا، اس کی زندگی ہی تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کا طبع، اس کا انداز سب کچھ..... اس کے اندر کے شعلے کو جیسے کسی نے پھونک مار کر بجھا دیا تھا۔ صحیح ہوا تھا یا غلط، یہ تبدیلیاں اچھی تھیں یا بری۔ خود سکندر عثمان ابھی اس پر کوئی رائے دینے کے قابل نہیں ہوئے تھے مگر انہیں یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ اس میں کوئی بہت بڑی تبدیلی آئی تھی۔ انہیں یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس نے زندگی میں پہلی بار چوتھی کھائی تھی اور زندگی میں پہلی بار پڑنے والی چوٹ، بڑے بڑوں کو لادتی ہے وہ تو پھر اکیس پانچس سال کا لڑکا تھا۔

زندگی میں بعض دفعہ ہمیں پتا نہیں چلتا کہ ہم تاریکی سے باہر آئے ہیں یا تاریکی میں داخل ہوئے ہیں۔ اندھیرے میں سمت کا پتا نہیں چلتا مگر آسمان اور زمین کا پتا ضرور چل جاتا ہے بلکہ ہر حال میں چلنا ہے۔ سر اٹھانے پر آسمان ہی ہوتا ہے۔ نظر آئے نہ آئے۔ سر جھکانے پر زمین ہی ہوتی ہے، دکھائی دے نہ دے مگر زندگی میں سفر کرنے کے لئے صرف چار سمتوں ہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ دائیں، بائیں، آگے، پیچھے پانچویں سمت بیروں کے نیچے ہوتی ہے۔ وہاں زمین نہ ہو تو پاتال آجاتا ہے۔ پاتال میں کتنے کتنے کے بعد کسی سمت کی ضرورت نہیں رہتی۔

پانچویں سمت سر سے اوپر ہوتی ہے۔ وہاں جایا ہی نہیں جاسکتا۔ وہاں اللہ ہوتا ہے۔ آنکھوں سے نظر نہ آنے والا مردوں کی ہر دھڑکن، خون کی ہر گردش، ہر آنے جانے والے سانس، صلیق سے اترنے والے ہر نوالہ کے ساتھ محسوس ہونے والا وہ فوٹو گرافک میموری، ۱۵۰۰۰ + آئی کی لیول اسے اب عذاب لگ

رہا تھا۔ وہ سب کچھ بھولنا چاہتا تھا۔ وہ سب جو وہ کرتا رہا، وہ کچھ بھی بھلانے کے قابل نہیں تھا۔ کوئی اس سے اس کی تکلیف پوچھتا۔

☆.....☆.....☆

نیویون واپس آنے کے بعد اس نے زندگی کے ایک نئے سڑ کو شروع کیا تھا۔ اس رات اس جنگل کے ہولناک اندھیرے اور تھائی میں اس درخت کے ساتھ بندھے بیٹھے ہوئے کئے گئے تمام وعدے اسے یاد تھے۔ وہ سب سے بالکل الگ تھلگ رہنے لگا تھا۔ معمولی سے رابطے اور تعلق کے بھی بغیر۔

وہ صاف گو تو بیٹھ سے ہی تھا مگر اس حد تک ہو جائے گا اس کے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی اس کی توقع نہیں تھی۔ چند ہفتے اس کے بارے میں اس کا گروپ چہ میگوئیاں کرتا رہا پھر یہ چہ میگوئیاں اعتراضات اور تبصروں میں تبدیل ہو گئیں اور اس کے بعد طنزیہ جملوں اور ناپسندیدگی میں پھر سب اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہو گئے۔ سالار سکندر کسی کی زندگی کا مرکز اور محور نہیں تھا۔ وہ سب کو کوئی اس کی زندگی کا۔ اس نے نیویون میں پہنچنے کے بعد جو چند کام کئے تھے اس میں جلال انصر سے ملاقات کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ پاکستان سے واپس آتے ہوئے اس کے گھر سے امریکہ میں اس کا ایڈریس لے آیا تھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اس کا ایک کزن بھی اسی ہاسٹل میں کام کر رہا تھا جہاں جلال کام کر رہا تھا۔ باقی کا کام بہت آسان ثابت ہوا۔ ضرورت سے زیادہ آسان۔

وہ اس سے ایک بار مل کر اس سے معذرت کرنا چاہتا تھا۔ اسے ان تمام جموں کے بارے میں بتا دینا چاہتا تھا جو وہ اس سے امامہ کے بارے میں اور امامہ سے اس کے بارے میں بولتا رہا تھا۔ وہ ان دونوں کے تعلق میں اپنے رول کے لئے شرمندہ تھا۔ وہ اس کی سلائی کرنا چاہتا تھا۔ وہ جلال انصر تک پہنچ چکا تھا اور وہ امامہ ہاشم تک پہنچنا چاہتا تھا۔

وہ جلال انصر کے ساتھ ہاسٹل کے کینے میریا میں بیٹھا ہوا تھا۔ جلال انصر کے چہرے پر بے حد سنجیدگی تھی اور اس کے ماتھے پر بڑے ہوئے بل اس کی ناراضی کو ظاہر کر رہے تھے۔ سالار کچھ دیر پہلے ہی وہاں پہنچا تھا اور جلال انصر سے اپنے سامنے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس نے جلال سے چند منٹ مانتے تھے۔ وہ دیکھنے انتظار کروانے کے بعد بالآخر کینے میریا میں آیا تھا۔

”سب سے پہلے تو میں یہ جانتا چاہوں گا کہ تم نے مجھے ڈھونڈا کیسے؟“ اس نے آپ جنتاب کے تمام تکلفات کو برطرف رکھتے ہوئے ٹیبل پر بیٹھے ہی سالار سے کہا۔

”یہ اہم نہیں ہے۔“

”یہ بہت اہم ہے۔ اگر تم واقعی یہ چاہتے ہو کہ میں کچھ دیر تمہارے ساتھ یہاں گزاروں تو مجھے بتا دینا چاہئے کہ تم نے مجھے کیسے ڈھونڈا؟“

”میں نے اپنے کزن سے مدد لی ہے۔ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور اس شہر میں بہت عرصے سے کام کر رہا ہے۔ میں یہ نہیں جانتا اس نے آپ کو کیسے ڈھونڈا ہے۔ میں نے صرف اس کو آپ کا نام اور کچھ دوسری معلومات دی تھیں۔“ سالار نے کہا۔

”کی.....؟“ جلال نے بڑے رسمی انداز میں کہا، وہ ٹیبل پر آتے ہوئے اپنی لٹچا لٹھے سے ساتھ لے کر آیا تھا۔

”نہیں، میں نہیں کھاؤں گا۔“ سالار نے شکر یہ کے ساتھ معذرت کر لی۔

جلال نے کندھے اچکائے اور کھانا شروع کر دیا۔

”کس معاملے میں بات کرنا چاہتے تھے تم مجھ سے؟“

”میں آپ کو چند حقائق سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔“

جلال نے اپنی ہاتھوں اچکائیں۔ ”حقائق؟“

”میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں امامہ کا دوست نہیں تھا۔ وہ میرے دوست کی بہن تھی۔ صرف میری ٹیکسٹ ڈور neighbour..... جلال نے کھانا جاری رکھا۔

”میری اس سے معمولی جان پہچان تھی۔ وہ بھی صرف اس لئے کیونکہ ایک بار اس نے مجھے فرسٹ ایڈ دے کر میری جان پہچانی تھی۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتی تھی خود میں بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے آپ پر یوں ظاہر کیا جیسے وہ میری بہت گہری دوست تھی۔ میں آپ دونوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنا چاہتا تھا۔“

جلال سنجیدگی سے اس کی بات سنتے ہوئے کھانا کھا چ رہا۔

”اس کے بعد جب امامہ گھر سے نکل کر آپ کے پاس آنا چاہتی تھی تو میں نے اس سے جھوٹ بولا۔ آپ کی شادی کے بارے میں۔“

اس بار جلال کھانا کھاتے کھاتے رک گیا۔ ”میں نے اس سے کہا کہ آپ شادی کر چکے ہیں۔ وہ آپ کے پاس اسی لئے نہیں آئی تھی۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ میں نے بہت نامناسب حرکت کی ہے مگر اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ امامہ سے میرا کوئی رابطہ نہیں تھا مگر یہ ایک اتفاق ہے کہ آپ سے میرا رابطہ ہو گیا۔ میں آپ سے ایک سیکو زکرنا چاہتا ہوں۔“

”میں تمہاری معذرت قبول کرتا ہوں مگر میں نہیں سمجھتا کہ تمہاری وجہ سے میرے اور امامہ کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی، میں پہلے ہی اس سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔“ جلال نے بڑی

صاف گوئی سے کہا۔

”وہ آپ سے بہت محبت کرتی تھی۔“ سالار نے دھیمی آواز میں کہا۔

”ہاں میں جانتا ہوں مگر شادی وغیرہ میں صرف محبت تو نہیں دیکھی جاتی اور بھی بہت کچھ دیکھا جاتا ہے۔“ جلال بہت حقیقت پسندانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”جلال! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ اس سے شادی کر لیں۔“

”پہلی بات یہ کہ میرا اس کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے اور دوسری بات یہ کہ میرا اس کے ساتھ رابطہ ہوتا بھی تب بھی میں اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔“

”اس کو آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔“ سالار نے کہا۔

”میں نہیں سمجھتا کہ اسے میرے سہارے کی ضرورت ہے۔ اب تو بہت عرصہ گزر چکا ہے اب تک وہ کوئی نہ کوئی سہارا تلاش کر چکی ہوگی۔“ جلال نے اطمینان سے کہا۔

”ہو سکتا ہے اس نے ایسا نہ کیا ہو۔ وہ ابھی بھی آپ کا انتظار کر رہی ہو۔“

”میں اس طرح کے امکانات پر غور کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میرے لئے اپنے کیریئر کی اس اسٹیج پر شادی کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ بھی اس سے۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”اس کیوں کا جواب میں تمہیں کیوں دوں۔ تمہارا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اس سے کیوں شادی نہیں کرتا چاہتا۔ میں تب ہی اسے بنا چکا ہوں اور اتنے عرصے کے بعد تم دوبارہ

آکر پھر وہی پیڑ اور اباکس کھولنے کی کوشش کر رہے ہو۔“ جلال نے قدرے ناراضی سے کہا۔

”میں صرف اس نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، جو میری وجہ سے آپ دونوں کا ہوا۔“ سالار نے نرمی سے کہا۔

”میرا کوئی نقصان نہیں ہوا اور اباکس کا بھی نہیں ہوا ہوگا۔ تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو رہے ہو۔“ جلال نے سلاخ کے چند ٹکڑے منہ میں ڈالنے ہوئے اطمینان سے کہا۔ سالار اسے دیکھتا رہا۔ وہ

نہیں سمجھ پارہا تھا کہ وہ اسے اپنی بات کیسے سمجھائے۔

”میں اس کو ڈھونڈنے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔“ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”مگر میں اسے ڈھونڈنا نہیں چاہتا۔ شادی مجھے اس سے نہیں کرنی تو پھر ڈھونڈنے کا فائدہ۔“

سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”آپ جانتے ہیں اس نے کس لئے گھر چھوڑا تھا؟“

”میرے لئے بہر حال نہیں چھوڑا تھا۔“ جلال نے بات کاٹی۔

”آپ کے لئے نہیں چھوڑا تھا، مگر جن وجوہات کی بنا پر چھوڑا تھا کیا ایک مسلمان کے طور پر آپ

کو اس کی مدد نہیں کرنی چاہتے جب کہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ لڑکی آپ سے بہت محبت کرتی ہے۔ آپ سے بہت انہاز ہے۔“

”میں دنیا میں کوئی واحد مسلمان نہیں ہوں اور نہ ہی مجھ پر یہ فرض کر دیا گیا ہے کہ میں اس کی مدد ضرور کروں۔ میری ایک ہی زندگی ہے اور میں اسے کسی دوسرے کی وجہ سے تو خراب نہیں کر سکتا اور پھر

تم بھی مسلمان ہو، تم کیوں نہیں شادی کرتے اس سے؟ میں نے تو جب بھی تم سے کہا تھا کہ تم اس سے شادی کر لو۔ تم ویسے بھی اس کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہو۔“

جلال انصر نے قدرے چیختے ہوئے انداز میں کہا۔ سالار اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ وہ اسے بتا نہیں سکتا تھا کہ وہ اس سے شادی کر چکا ہے۔

”شادی۔۔۔؟ وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔“ اس نے کہا۔

”میں اس سلسلے میں اسے سمجھا سکتا ہوں۔ تم میرا اس سے رابطہ کروادو تو میں اسے تم سے شادی پر تیار کر لوں گا۔ اچھے آدمی ہو تم۔۔۔ اور خاندان وغیرہ بھی ٹھیک ہی ہوگا تمہارا۔ کار تو ڈیڑھ سال پہلے

بھی بڑی شاندار رکھی ہوئی تھی تم نے۔ اس کا مطلب ہے روپیہ وغیرہ ہوگا تمہارے پاس۔ ویسے یہاں کس لئے ہو؟“

”ادب میں اسے کر رہا ہوں۔“

”پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ چاہ تمہیں مل جائے گی۔ روپیہ ویسے بھی تمہارے پاس ہے۔ لڑکیوں کو اور کیا چاہئے۔ اباکس تو ویسے بھی تمہیں جانتی ہے۔“ جلال نے چنگی بھاتے مسئلہ حل کیا تھا۔

”سارا مسئلہ تو اسی ”جانتے“ نے ہی پیدا کیا ہے۔ وہ مجھے ضرورت سے زیادہ جانتی ہے۔“ سالار نے جلال کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

”وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔“ سالار نے مجھے اسے یاد دلایا۔

”اب اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ لڑکیاں کچھ زیادہ جذباتی ہوتی ہیں اس معاملے میں۔“ جلال نے قدرے بیزارگی سے کہا۔

”یہ دن سائینڈ ڈیوائسز تو نہیں ہوگا۔ آپ کسی نہ کسی حد تک اس میں انوالو تو ضرور ہوں گے۔“ سالار نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں تو بڑا بہت انوالو تھا، مگر وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ ترجیحات بھی بدلتی رہتی ہیں انسان کی۔“

”اگر آپ کو وقت اور حالات کے ساتھ اپنی ترجیحات بدلتی تھیں تو آپ کو اس کے بارے میں اباکس کو انوالو ہوتے ہوئے ہی بتا دینا چاہئے تھا۔ کم از کم اس سے یہ ہوتا کہ وہ آپ سے مدد کی توقع رکھتی نہ

ہی آپ پر اس قدر انحصار کرتی۔ میں امید کرتا ہوں آپ یہ تو نہیں کہیں گے کہ آپ نے اس سے شادی کے حوالے سے کبھی کوئی بات یا وعدہ کیا ہی نہیں تھا۔

جلال کچھ کہنے کے بجائے خشکیں انھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

”تم مجھے کیا بتانے اور بتانے کی کوشش کر رہے ہو؟“ اس نے چند لمحوں کے بعد اگڑے ہوئے

انداز میں اس سے کہا۔

”اس نے جب مجھ سے پہلی بار رابطہ کیا تھا تو آپ کا فون نمبر اور ایڈریس دے کر اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے پوچھوں آپ نے اپنے بیٹس سے شادی کی بات کر لی ہے۔ میں نے اسے اپنا فون دیا تھا کہ وہ آپ سے یہ بات خود پوچھ لے۔ یقیناً اسلام آباد آنے سے پہلے آپ نے اس سے یہ کہا ہو گا کہ آپ اس سے شادی کے لئے اپنے بیٹس سے بات کریں گے۔ آپ نے یقیناً پہلے محبت وغیرہ کے اٹکھار کے بعد اسے پرپوز کیا ہو گا۔“

جلال نے کچھ برہمی سے اس کی بات کاٹی۔ ”میں نے اسے پرپوز نہیں کیا تھا۔ اس نے مجھے پرپوز کیا تھا۔“

”مان لیتا ہوں اس نے پرپوز کیا۔ آپ نے کیا کیا؟ انکار کر دیا؟“ وہ تھینچ کرنے والے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”انکار نہیں کیا ہو گا۔“ سالار عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

”اس نے مجھے بتایا تھا کہ آپ نعمت بہت اچھی پڑھتے ہیں اور آپ کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی بہت محبت ہے۔ آپ کو بھی بتایا ہو گا اس نے کہ وہ آپ سے محبت کیوں کرتی تھی مگر آپ سے مل کر اور آپ کو جان کر مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ آپ نعمت بہت اچھی پڑھتے ہوں گے مگر جہاں تک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا تعلق ہے میں نہیں سمجھتا کہ وہ آپ کو ہے۔ میں خود کوئی بہت اچھا آدمی نہیں ہوں اور محبت کے بارے میں زیادہ بات نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر اللہ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کے بارے میں مگر اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ جو شخص اللہ یا اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے یا لوگوں کو یہ امپریشن دیتا پھر تاہم وہ مدد کے لئے پہلے ہوئے ہاتھ کو نہیں جھک سکتا، ہی وہ کسی کو مدد کا اور فریب دے گا۔“ سالار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اور میں تو آپ سے ریکوریٹ کر رہا ہوں اس کی مدد کے لئے۔ ہو سکتا ہے اس نے بھی ڈیڑھ سال پہلے ہی ہو پھر بھی اگر آپ انکار پر مصر ہیں تو..... میں یا کوئی آپ کو مجبور تو نہیں کر سکتا مگر آپ سے مل کر اور آپ سے بات کر کے مجھے بہت مایوسی ہوئی۔“

اس نے الوداعی مصافحہ کے لئے جلال کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جلال نے اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا، وہ

تھمڑ بھرے انداز میں ماتھے پر ہل لے اسے دیکھتا رہا۔

”خدا حافظ۔“ سالار نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ جلال اسی انداز میں اسے جاتا دیکھتا رہا اور پھر اس نے خود دکھائی کی۔ ”It's really an idiot's world out there.“

وہ وہ بارہ بج گئے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کا موڈ بے حد آف ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

جلال انصر سے ملاقات کے بعد وہ اپنے احساسات کو کوئی نام دینے میں ناکام ہو رہا تھا۔ کیا اسے اپنے بچپن سے آزاد ہو جانا چاہئے؟ کیونکہ جلال نے یہ کہا تھا کہ سالار سچ میں نہ آتا تو بھی، وہ امامہ سے شادی نہیں کرتا اور جلال انصر سے بات کرنے کے بعد اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ امامہ کے لئے اس کے احساسات میں کوئی گہرائی نہیں تھی مگر یہ شاید اس کے لئے بہت سے نئے سوال پیدا کر رہا تھا۔ وہ جلال سے آج ملا تھا، ڈیڑھ سال پہلے اس نے جلال کے ساتھ اس طرح بات کی ہوتی تو شاید اس پر ہونے والا اثر مختلف ہوتا۔ جب امامہ کے لئے اس کے احساسات کا پیمانہ مختلف ہو تا اور شاید ڈیڑھ سال پہلے وہ امامہ کے بارے میں اس بے حسی کا مظاہرہ نہ کرتا جس کا مظاہرہ اس نے آج کیا تھا وہ ایک ذہنی رو میں اپنے کندھوں سے یوجہ بنا ہوا محسوس کرتا اور اگلی ذہنی روا سے پھر اُلجھن کا شکار کر دیتی۔

☆.....☆.....☆

ایم جی اے کا دوسرا سال بہت پرسکون گزرا تھا۔ پڑھائی کے علاوہ اس کی زندگی میں اور کوئی سرگرمی نہیں رہی تھی۔ وہ گیمز پر صرف ڈسکشن میں ہی اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ گفتگو کرتا یا پھر گروپ پریزنٹیشن کے سلسلے میں ان کے ساتھ وقت گزارتا۔ باقی کا سارا وقت وہ لائبریری میں گزار دیتا۔ ایک اینڈ پر اس کی واحد سرگرمی اسلامک سینٹر جانا تھا جہاں وہ ایک عرب سے قرآن پاک تلاوت کرنا سیکھا کرتا تھا پھر وہ قرآن پاک کے ان اسباق کو دہرایا کرتا پھر اسی عرب سے اس نے عربی زبان سیکھنا شروع کر دی۔

خالد عبدالرحمن نامی وہ عرب بنیادی طور پر ایک میڈیکل ٹیکنیشن تھا اور ایک ہسپتال سے وابستہ تھا۔ وہ ایک اینڈ پر وہاں آ کر عربی زبان اور قرآن پاک کی کلاسز لیا کرتا تھا۔ وہ اس کام کا کوئی معاوضہ نہیں لیا کرتا تھا بلکہ اسلامک سینٹر کی لائبریری میں موجود کتابوں کی ایک بڑی تعداد بھی اسی کے دوستوں اور رشتہ داروں کی طرف سے ہی عطیہ کی گئی تھی۔

قرآن پاک کی ان ہی کلاسز کے دوران ایک دن اس نے سالار سے کہا۔

”تم قرآن پاک حفظ کیوں نہیں کرتے؟“ سالار اس کے اس تجویز ناما سوال پر کچھ دیر حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔

”میں..... میں کیسے کر سکتا ہوں؟“

”کیوں..... تم کیوں نہیں کر سکتے؟“ خالد نے جو اب اس سے پوچھا۔

”یہ بہت مشکل ہے اور پھر میرے جیسا آدمی، نہیں میں نہیں کر سکتا۔“ سالار نے چند لمحوں کے بعد کہا۔

”تمہارا ذہن بہت اچھا ہے بلکہ میں اگر یہ کہوں کہ میں نے اپنی آج تک کی زندگی میں تم سے زیادہ ذہین آدمی نہیں دیکھا جتنی تیز رفتاری سے تم نے اسے مختصر عرصہ میں اتنی چھوٹی بڑی سو میں یاد کی ہیں کوئی اور نہیں کر سکا اور جتنی تیز رفتاری سے تم عربی سیکھ رہے ہو میں اس پر بھی حیران ہوں جب ذہن اس قدر تیز ہو اور دنیا کی ہر چیز سیکھ لینے اور یاد رکھنے کی خواہش ہو تو قرآن پاک کیوں نہیں۔ تمہارے ذہن پر اللہ کا بھی حق ہے۔“ خالد نے کہا۔

”آپ میری بات نہیں سمجھے۔ مجھے سمجھنے پر کوئی اعتراض نہیں مگر یہ بہت مشکل ہے۔ میں اس عمر میں یہ نہیں سیکھ سکتا۔“ سالار نے وضاحت کی۔

”جب کہ میرا خیال ہے کہ جنہیں قرآن پاک حفظ کرنے میں بہت آسانی ہوگی۔ تم ایک بار اسے حفظ کرنا شروع کرو، میں کسی اور کے بارے میں تو یہ دعویٰ نہ کرتا مگر تمہارے بارے میں، میں دعوے سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم نہ صرف بہت آسانی سے اسے حفظ کر لو گے بلکہ بہت کم عرصے میں.....“

سالار نے اس دن اس موضوع کے بارے میں مزید کوئی بات نہیں کی۔ مگر اس رات اپنے پارٹنر پر واپس آنے کے بعد وہ خالد عبدالرحمان کی باتوں کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ اس کا خیال تھا خالد عبدالرحمان دوبارہ اس کے بارے میں اس سے بات نہیں کرے گا۔ مگر اگلے دن خالد عبدالرحمان نے ایک بار پھر اس سے یہی سوال کیا۔

سالار بہت دیر چپ چاپ اسے دیکھتا رہا پھر اس نے مدہم آواز میں خالد سے کہا۔

”مجھے خوف آتا ہے۔“

”کس چیز سے؟“

”قرآن پاک حفظ کرنے سے؟“ خالد نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

سالار نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”کیوں.....؟“ وہ بہت دیر خاموش رہا پھر کارپٹ پر اپنی انگلی سے کلیریں کھینچنے اور انہیں دیکھتے ہوئے اس نے خالد سے کہا۔

”میں بہت گناہ کر چکا ہوں، اچھے گناہ کہ مجھے انہیں گناہ بھی مشکل ہو جائے گا۔ صغیرہ، کبیرہ ہر گناہ جو انسان سوچ سکتا ہے یا کر سکتا ہے۔ میں اس کتاب کو اپنے سینے یا ذہن میں محفوظ کرنے کا سوچ بھی نہیں

سکتا۔ میرا سینہ اور ذہن پاک تو نہیں ہے۔ میرے جیسے لوگ اسے..... اسے حفظ کرنے کے لائق نہیں ہوتے۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

خالد کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ”ابھی بھی گناہ کرتے ہو؟“ سالار نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”تو پھر کس چیز کا خوف ہے تم اگر قرآن پاک کی تلاوت کر سکتے ہو، اپنے ان سارے گناہوں کے باوجود تو پھر اسے حفظ بھی کر سکتے ہو اور پھر تم نے گناہ کئے مگر تم اب گناہ نہیں کرتے۔ یہ کافی ہے۔ اگر اللہ یہ نہیں چاہے گا کہ تم اسے حفظ کرو تو تم اسے حفظ نہیں کر سکو گے چاہے تم لاکھ کوشش کر لو اور اگر تم خوش قسمت ہوئے تو تم اسے حفظ کر لو گے۔“ خالد نے چنگی بجاتے ہوئے جیسے یہ مسئلہ حل کر دیا تھا۔

سالار اس رات جاگتا رہا، آدھی رات کے بعد اس نے پہلا پارہ کھول کر کا پیتے ہاتھوں اور زبان کے ساتھ حفظ کرنا شروع کیا۔ اسے حفظ کرتے ہوئے اسے احساس ہونے لگا کہ خالد عبدالرحمان ٹیکہ کہتا تھا۔ اسے قرآن پاک کا بہت سا حصہ پہلے ہی یاد تھا۔ خوف کی وہ کیفیت جو اس نے قرآن پاک حفظ کرنا شروع کرتے ہوئے محسوس کی تھی وہ زیادہ دیر نہیں رہی تھی۔ اس کے دل کو گھٹن سے استحکام مل رہی تھی۔ کہاں سے؟ کوئی اس کی زبان کی لڑکھا بہت دور کر رہا تھا، کون.....؟ کوئی اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ ختم کر رہا تھا کیوں؟“

غیر کی نماز سے کچھ دیر پہلے وہ اس وقت بے تماشا روایا جب اس نے پچھلے پانچ گھنٹے میں یاد کئے ہوئے سبق کو پہلی بار مکمل طور پر دہرایا۔ وہ کہیں نہیں اٹکا تھا۔ وہ کچھ نہیں بھولا تھا۔ زیر زبیر کی کوئی غلطی نہیں، آخری چند جملوں پر اس کی زبان پہلی بار کپکپانے لگی تھی۔ آخری چند جملے ادا کرتے ہوئے اسے وقت ہوئی تھی کیونکہ وہ اس وقت آنسوؤں سے رو رہا تھا۔

”اگر اللہ یہ چاہے گا اور تم خوش قسمت ہو گے تو تم قرآن پاک حفظ کر لو گے ورنہ کچھ بھی کر لو، نہیں کر پاؤ گے۔“ اسے خالد عبدالرحمان کی بات یاد آ رہی تھی۔

غیر کی نماز ادا کرنے کے بعد اس نے کیسٹ پر اپنی زندگی کے اس پہلے سبق کو یاد کیا تھا۔ ایک بار پھر اسے کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کی آواز میں پہلے سے زیادہ روانی اور لہجے میں پہلے سے زیادہ فصاحت تھی۔

اس کی زندگی میں ایک ہی چیز شامل ہو گئی تھی۔ اس پر ایک اور احسان کر دیا گیا تھا مگر اس کا ڈپریشن ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ رات کو سلیپنگ پلو کے بغیر نیند کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور سلیپنگ پلو لینے کے باوجود وہ کبھی اپنے کمرے کی لائٹس آف نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تاریکی سے خوف کھاتا تھا۔

یہ پھر خالد عبدالرحمان ہی تھا جس نے ایک دن اس سے کہا تھا۔ وہ اسے قرآن پاک کا سبق زبانی بتا رہا تھا اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ خالد عبدالرحمان مسلسل اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا

جب اس نے اپنا سبق ختم کیا اور پانی کا گلاس اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگایا تو اس نے خالد کو کہتے سنا۔

”میں نے کل رات تمہیں خواب میں جج کرتے دیکھا ہے۔“

سالار منہ میں لے جانے والا پانی حلق سے اُتار نہیں سکا۔ گلاس نیچے رکھتے ہوئے خالد کو دیکھنے لگا۔

”اس سال تمہارا ایم بی اے ہو جائے گا۔ اگلے سال تم جج کرو۔“

خالد کا لہجہ بہت نرم تھی تھا۔ سالار نے منہ میں موجود پانی غیر محسوس انداز میں حلق سے نیچے اُتار لیا۔

وہ اس دن اس سے کوئی سوال جواب نہیں کر سکا تھا۔ اس کے پاس کوئی سوال تھا ہی نہیں۔

ایم بی اے کے فائنل سسٹمز سے دو ہفتے پہلے اس نے قرآن پاک کی پہلی بار حفظ کر لیا تھا۔ فائنل سسٹمز

کے چار ہفتے کے بعد ساڑھے تیس سال کی عمر میں اس نے اپنی زندگی کا پہلا جج کیا تھا۔ وہاں جاتے ہوئے

وہاں سے آتے ہوئے اس کے دل و دماغ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی تکبر، کوئی تقدر، کوئی رشک کچھ بھی

نہیں۔ اس کے ساتھ پاکستانی کمپ میں ساتھ جانے والے شاید وہ لوگ ہوں گے جو خوش قسمت ہوں

گے۔ انہیں ان کی ٹیکسوں کے عوض وہاں بلایا گیا تھا۔ وہ اپنے نامہ اعمال سے واقف تھا۔ اسے صرف

صفائی اور وضاحتوں کے لئے بلایا گیا تھا۔ وہ قرآن پاک حفظ نہ کر رہا ہوتا تو جج کرنے کا سوچتا بھی نہیں،

جو شخص حرم شریف سے دور اللہ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ رکھتا ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کعبہ کے

سامنے پہنچ کر اللہ کا سامنا کر لے گا وہ ہر جگہ جانے کو تیار ہو جاتا، مگر خانہ کعبہ جانے کی جرأت نہیں کر

سکتا تھا۔

مگر خالد عبدالرحمان کے ایک بار کہنے پر اس نے جیسے کھینچے جھپٹتے ہوئے جج پر جانے کے لئے ہچے ز

جمع کروا دیے تھے۔

لوگوں کو جج پر جانے کا موقع تب ملتا تھا جب ان کے پاس گناہوں کے علاوہ ابھی کچھ بھی نہیں تھا۔

ہے۔ سالار سکندر کو یہ موقع تب ملا تھا جب اس کے پاس گناہوں کے علاوہ ابھی کچھ بھی نہیں تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے، اگر میں گناہ کرنے سے خوف نہیں کھاتا ہا تو پھر اب مجھے اللہ کے سامنے جانے

اور معذرت کرنے سے بھی خوف نہیں کھانا چاہیے۔ صرف یہی ہے تاکہ میں وہاں سر نہیں اٹھا سکوں گا۔

نظریں اوپر نہیں کر سکوں گا۔ منہ سے معافی کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں نکال سکوں گا تو ٹھیک ہے مجھے یہ

سزا بھی ملنی چاہیے۔ میں تو اس سے زیادہ شرمندگی اور بے عزتی کا مستحق ہوں۔ ہر بار جج پر کوئی نہ کوئی

شخص ایسا آتا ہو گا، جس کے پاس گناہوں کے علاوہ اور کچھ ہو گا ہی نہیں۔ اس بار وہ شخص میں سکی، سالار

سکندر رہی سکی۔“ اس نے سوچا تھا۔

☆.....☆.....☆

گناہ کا بوجھ کیا ہوتا ہے اور آدمی اپنے گناہ کے بوجھ کو کس طرح قیامت کے دن اپنا پشت سے اُتار

پھینکنا چاہے گا کس طرح اس سے دور بھاگنا چاہے گا کس طرح اسے دوسرے کے کندھے پر ڈال دینا

چاہے گا۔ یہ اس کی سمجھ میں حرم شریف میں پہنچ کر ہی آیا تھا۔ وہاں کھڑے ہو کر وہ اپنے پاس موجود اور

آنے والی ساری زندگی کی دولت کے عوض بھی کسی کو وہ گناہ بیچتا چاہتا تو کوئی یہ تجارت نہ کرتا۔ کاش

آدمی کسی مال کے عوض اپنے گناہ بیچ سکتا۔ کسی اجرت کے طور پر دوسروں کی نیکیاں مانگنے کا حق رکھتا۔

لاکھوں لوگوں کے اس جھوم میں دو سفید چادریں اوڑھے کون جانتا تھا سالار سکندر کون تھا؟ اس

کا آئی کیو لیول کیا تھا، کسے پروا تھی۔ اس کے پاس کون سی اور کہاں کی ڈگری تھی، کسے ہوش تھا۔ اس نے

زندگی کے میدان میں کتنے نقلیوں کی پکار ڈٹوڑے اور بنائے تھے، کسے خبر تھی وہ اپنے ذہن سے کون سے

میدان تفسیر کرنے والا تھا، کون رشک کرنے والا تھا۔

وہ وہاں اس جھوم میں ٹھوکر کھا کر گرتا۔ بھگدڑ میں روندنا چاہتا۔ اس کے اوپر سے گزرنے والی

خلقت میں سے کوئی بھی یہ نہیں سوچتا کہ انہوں نے کیسے دماغ کو کھودیا تھا۔ کس آئی کیو لیول کے ناپیاب

آدمی کو کس طرح ختم کر دیا تھا۔

اسے دنیا میں اپنی اوقات، اپنی اہمیت کا پتا چل گیا تھا۔ اگر کچھ مخالف رو بھی گیا تھا تو اب ختم ہو گیا

تھا۔ اگر کچھ شبہ باقی تھا تو اب دور ہو گیا تھا۔

فخر، تکبر، رشک، انا، خود پسندی، خود ستائشی کے ہر بیجے ہوئے ٹکڑے کو نچوڑ کر اس کے اندر سے

پھینک دیا گیا تھا۔ وہ ان ہی آلائشوں کو دور کروانے کے لئے وہاں آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایم بی اے میں اس کی شاندار کامیابی کسی کے لئے بھی حیران کن نہیں تھی۔ اس کے ڈیپارٹمنٹ

میں ہر ایک کو پہلے سے ہی اس کا اندازہ تھا۔ اس کے اور اس کے گلاس فیلوز کے پروفیسر اور اساتذہ

میں اتنا فرق ہوتا تھا کہ اس کے پروفیسرز کو یہ ماننے میں کوئی عار نہیں تھا۔ وہ مٹا بیے کی اس دوڑ میں دس

گزر آگے دوڑ رہا تھا اور ایم بی اے کے دوسرے سال میں اس نے اس کا صلے کو اور بڑھا دیا تھا۔

اس نے انٹرن شپ اقوم متحدہ کی ایک ایجنسی میں کی تھی اور اس کا ایم بی اے مکمل ہونے سے پہلے

ہی اس ایجنسی کے علاوہ اس کے پاس سات مختلف ملٹی میٹیل کمپنیوں کی طرف سے آفرز موجود تھیں۔

”تم اب آگے کیا کرنا چاہتے ہو؟“ اس کے رزلٹ کے متعلق جاننے کے بعد سکندر عثمان نے اپنے

پاس ہا کر پوچھا تھا۔

”میں وہاں امریکہ جا رہا ہوں۔ میں یونائیٹڈ نیشنز کے ساتھ ہی کام کرنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا بزنس شروع کرو یا میرے بزنس میں شامل ہو جاؤ۔“ سکندر عثمان

نے اس سے کہا۔

”پاپا! میں بزنس نہیں کر سکتا۔ بزنس والا سپر امانت نہیں ہے میرا۔ میں جاب کرنا چاہتا ہوں اور میں پاکستان میں رہنا بھی نہیں چاہتا۔“ سکندر عثمان حیران ہوئے۔ ”تم نے پہلے کبھی ذکر نہیں کیا کہ تم پاکستان میں رہنا نہیں چاہتے۔ تم مستقل طور پر امریکہ میں سیٹل ہونا چاہتے ہو؟“

”پہلے میں نے امریکہ میں سیٹل ہونے کے بارے میں نہیں سوچا تھا لیکن اب میں وہیں رہنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟“

وہ ان سے یہ کہنا نہیں چاہتا تھا کہ پاکستان میں اس کا ڈپریشن بڑھ جاتا ہے۔ وہ مسلسل امامہ کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ وہاں ہر چیز اسے امامہ کی یاد دلاتی تھی۔ اس کے بچپن اور احساس جرم میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

”میں یہاں ایڈجسٹ نہیں ہو سکتا۔“ سکندر عثمان کچھ دیر اسے دیکھتے رہے۔

”حالانکہ میرا خیال ہے تم ایڈجسٹ ہو سکتے ہو۔“

سالار جانتا تھا ان کا اشارہ کس طرف تھا مگر وہ خاموش رہا۔

”جاب کرنا چاہتے ہو؟ ٹھیک ہے، چند سال جاب کر لو لیکن اس کے بعد آکر میرے بزنس کو دیکھو۔ یہ سب کچھ میں تم لوگوں کے لئے ہی اسٹیبلش کر رہا ہوں، دوسروں کے لئے نہیں۔“

وہ کچھ دیر اسے سمجھاتے رہے، سالار خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔

☆.....☆.....☆

ایک ہفتہ کے بعد وہ دوبارہ امریکہ آ گیا تھا اور اس کے چند ہفتے کے بعد اس نے یو بی سیٹ میں جاب شروع کر دی۔ وہ نیو یون سے نیویارک چلا گیا تھا۔ یہ ایک نئی زندگی کا آغاز تھا اور وہاں آنے کے چند ہفتے بعد اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ کہیں فرار حاصل نہیں کر سکتا تھا وہ اسے وہاں بھی اسی طرح یاد آ رہی تھی، اس کا احساس جرم وہاں بھی اس کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

وہ سولہ سے اٹھارہ گھنٹے تک کام کرنے لگا۔ وہ ایک دن بھی تین چار گھنٹے سے زیادہ کبھی نہیں سویا اور دن رات کی اس مصروفیت نے اسے بڑی حد تک نارمل کر دیا تھا اگر ایک طرف کام کے اس انجانے اس کے ڈپریشن میں کمی کی تھی تو دوسری طرف وہ اپنے اوارے کے نمایاں ترین ورکرز میں شمار ہونے لگا تھا۔ یو بی سیٹ کے مختلف پروجیکٹس کے سلسلے میں وہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک جانے لگا۔ غربت اور بیماری کو وہ پہلی دفعہ اپنی آنکھوں سے اسے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ رپورٹس اور اخباروں میں چھپنے والے حقائق میں اور ان حقائق کو اپنی تمام ہولناکی کے ساتھ کھلی آنکھ سے دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے اور یہ فرق اسے اس جاب میں ہی سمجھ میں آیا تھا۔ ہر روز بھوکے سونے والے لوگوں کی تعداد کروڑوں

میں تھی۔ ہر رات پیٹ بھر کر ضرورت سے زیادہ کھا لینے والوں کی تعداد بھی کروڑوں میں تھی۔ صرف تین وقت کا کھانا، سر پر چھت اور جسم پر لباس بھی کتنی بڑی نعمتیں تھیں، اسے تب کچھ میں آیا تھا۔ وہ یو بی سیٹ کی ٹیم کے ساتھ چار ٹریڈ لیٹروں میں ستر کرتے ہوئے اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا۔ اس نے زندگی میں ایسے کون سے کارنامے انجام دیے تھے کہ اسے وہ پر آسائش زندگی دی گئی تھی جو وہ گزار رہا تھا اور ان لوگوں سے کیا گناہ ہوئے تھے کہ وہ زندگی کی تمام بنیادی ضروریات سے محروم صرف زندہ رہنے کی خواہش میں خوراک کے ان پیکٹس کے پیچھے بھاگتے پھرتے تھے۔

وہ ساری ساری رات جاگ کر اپنے اوارے کے لئے ممکنہ اسکیمیں اور پلان بنا رہا تھا۔ کہاں خوراک کی ڈسٹری بیوٹن کیسے ہو سکتی ہے، کیا بہتری لائی جاسکتی ہے، کہاں مزید امداد کی ضرورت ہے، کن علاقوں میں کس طرح کے پروجیکٹس درکار تھے، وہ بعض دفعہ از تالیس گھنٹے بغیر سوئے کام کر جاتا تھا۔

اس کے بنائے ہوئے پروجیکٹس اور رپورٹس تکنیکی لحاظ سے اتنے مربوط ہوتے تھے کہ ان میں کوئی خامی ڈھونڈنا کسی کے لئے ممکن نہیں رہتا تھا اور اس کی یہ خصوصیات، اس کی سادگی اور نام کو اور بھی مطمئن کرتی جارہی تھیں اگر مجھے اللہ نے دوسروں سے بہتر ذہن اور صلاحیتیں دی ہیں تو مجھے ان صلاحیتوں کو دوسروں کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ اس طرح استعمال کرنا چاہئے کہ میں دوسروں کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ آسانی لاسکوں، دوسروں کی زندگی کو بہتر کر سکوں۔ وہ کام کرتے ہوئے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچتا تھا۔

یو بی سیٹ کے لئے کام کرنے کے دوران ہی اس نے ایم فل کرنے کا سوچا تھا اور پھر اس نے ایم فل میں ایم بی بیٹن لے لیا تھا۔ ابونک کلاسز کو جوائن کرتے ہوئے اسے قلعہ کسی قسم کا کوئی شہ نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک بار پھر ضرورت سے زیادہ مصروف کر رہا تھا مگر اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ کام اس کا جنون بن چکا تھا شاید اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر ایک مشن۔

☆.....☆.....☆

فرقان سے سالار کی پہلی ملاقات امریکہ سے پاکستان آتے ہوئے فلائٹ کے دوران ہوئی۔ وہ اس کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔ وہ امریکہ میں ڈاکٹری کی کسی کالگری میں شرکت کر کے واپس آ رہا تھا جبکہ سالار سکندر اپنی بہن امینا کی شادی میں شرکت کے لئے پاکستان آ رہا تھا۔ اس لمبی فلائٹ کے دوران دونوں کے درمیان ابتدائی تعارف کے بعد گفتگو کا سلسلہ تھا نہیں۔

فرقان، عمر میں سالار سے کافی بڑا تھا، وہ پچیس سال کا تھا لیکن اسے شادمانہ نظر میں کرنے کے بعد وہ واپس پاکستان آیا تھا اور وہاں ایک ہاسٹل میں کام کر رہا تھا وہ شادی شدہ تھا اور اس کے دو بیٹے بھی تھے۔ چند گھنٹے آپس میں گفتگو کرتے رہنے کے بعد فرقان اور وہ سونے کی تیاری کرنے لگے۔ سالار نے

معمول کے مطابق اپنے بریف کیس سے سلپنگ پلو کی ایک گولی پانی کے ساتھ نگلی۔ فرقان نے اس کی اس تمام کارروائی کو خاموشی سے دیکھا۔ جب اس نے بریف کیس بند کر کے دوبارہ رکھ دیا تو فرقان نے کہا۔

”اکثر لوگ فلائٹ کے دوران سلپنگ پلو کے بغیر نہیں سو سکتے۔“
سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور کہا۔

”میں سلپنگ پلو کے بغیر نہیں سو سکتا۔ فلائٹ میں ہوں یا نہ ہوں، اس سے فرق نہیں پڑتا۔“
”سو نے میں مشکل پیش آتی ہے؟“ فرقان کو ایک دم کچھ تجسس ہوا۔

”مشکل؟“ سالار مسکرایا۔ ”میں سر سے سو ہی نہیں سکتا۔ میں سلپنگ پلو لیتا ہوں اور تین چار گھنٹے سو لیتا ہوں۔“
”انسومیڈیا؟“ فرقان نے پوچھا۔

”شاید۔ میں نے ڈاکٹر سے چیک اپ نہیں کروایا مگر شاید یہ وہی ہے۔“ سالار نے قدرے لاپرواہی سے کہا۔

”تمہیں چیک اپ کرانا چاہئے تھا، اس عمر میں انسومیڈیا..... یہ کوئی بہت صحت مند علامت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تم کام کے پیچھے جنونی ہو چکے ہو اور اسی وجہ سے تم نے اپنی سونے کی نارمل روٹین کو خراب کر لیا ہے۔“

فرقان اب کسی ڈاکٹر کی طرح بول رہا تھا۔ سالار مسکراتے ہوئے سنتا رہا۔ وہ اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ اگر رات دن مسلسل کام نہ کرے تو وہ اس احساس جرم کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا تھا جسے وہ محسوس کرتا ہے۔ وہ اسے یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ سلپنگ پلو کے بغیر سونے کی کوشش کرے تو وہ ایسا کرے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ اس حد تک کہ اسے اپنا سر در سے پھلتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔

”کتنے گھنٹے کام کرتے ہو ایک دن میں؟“ فرقان اب پوچھ رہا تھا۔
”اٹھارہ گھنٹے، بعض دفعہ تیس۔“

”مائی گڈ نیس! اور کب سے؟“
”دو تین سال سے۔“

”اور تب ہی سے نیند کا مسئلہ ہو گا تمہیں، میں نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ تم نے خود اپنی روٹین خراب کر لی ہے۔“ فرقان نے اس سے کہا۔ ”ورنہ اتنے گھنٹے کام کرنے والے آدمی کو تو ذہنی تھکن ہی ایک لمبی اور پرسکون نیند ملا دیتی ہے۔“

”یہ میرے ساتھ نہیں ہوتا۔“ سالار نے دم لہجے میں کہا۔

”یہی تو تمہیں جاننے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اگر یہ تمہارے ساتھ نہیں ہوتا تو کیوں نہیں ہوتا۔“ سالار اس سے یہ نہیں کہہ سکا کہ وہ وجہ جانتا ہے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد فرقان نے اس سے کہا۔

”میں اگر تمہیں کچھ آیتیں بتاؤں رات کو سونے سے پہلے، تو تم پڑھ سکو گے؟“
”کیوں نہیں پڑھ سکوں گا۔“ سالار نے گردن موڑ کر اس سے کہا۔

”نہیں، اصل میں تمہارے اور میرے جیسے لوگ جو زیادہ پڑھ لیتے ہیں اور خاص طور پر تعلیم مغرب میں حاصل کرتے ہیں وہ ایسی چیزوں پر یقین نہیں رکھتے یا انہیں پرکھتے نہیں سمجھتے۔“ فرقان نے وضاحت کی۔

”فرقان! میں حافظ قرآن ہوں۔“ سالار نے اسی طرح لہجے ہوئے پرسکون آواز میں کہا۔
فرقان کو جیسے کرٹ لگا۔

”میں روز رات کو سونے سے پہلے ایک پارہ پڑھ کر سوتا ہوں، میرے ساتھ یقین یا اعتماد کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ سالار نے بات جاری رکھی۔
”میں بھی حافظ قرآن ہوں۔“

فرقان نے تاپا۔ سالار نے گردن موڑ کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ یہ یقیناً ایک خوشگوار اتفاق تھا۔ اگرچہ فرقان نے ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی مگر سالار کو پھر بھی یہ اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ وہ حافظ قرآن ہے۔

”پھر تو تمہیں اس طرح کا کوئی مسئلہ ہو ہی نہیں چاہئے۔ قرآن پاک کی تلاوت کر کے سونے والے انسان کو نیند نہ آنے، یہ مجھے کچھ عجیب لگتا ہے۔“

سالار نے فرقان کو بو بڑاتے سنا۔ وہ اب اپنے حواس کو ہلکا ہلکا مظلوم پارہا تھا۔ نیند اس پر غلب پارہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”تمہیں کوئی پریشانی ہے؟“ اس نے فرقان کی آواز سنی۔ وہ نیند کی گولیوں کے زیر اثر نہ ہوتا تو مسکرا کر انکار کر دیتا مگر وہ جس حالت میں تھا اس میں وہ انکار نہیں کر سکا۔

”ہاں، مجھے بہت زیادہ پریشانیاں ہیں۔ مجھے سکون نہیں ہے، مجھے لگتا ہے میں مسلسل کسی صحرا میں سفر کر رہا ہوں، پچھتوے اور احساس جرم مجھے چھوڑتے ہی نہیں۔ مجھے..... مجھے کسی حیرت کاش کی تلاش ہے، جو مجھے اس تکلیف سے نکال دے، جو مجھے میری زندگی کا راستہ دکھا دے۔“

فرقان دم بخود اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ سالار کی آنکھیں بند تھیں، مگر وہ اس کی آنکھوں کے کونوں سے نکلتی نمی کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کی آواز میں بھی بے رہنمی اور لاکھڑاہٹ تھی۔ وہ اس وقت لاشعوری طور

پر سلپنگ ہلڑ کے زیر اثر بول رہا تھا۔

دو اب خاموش ہو چکا تھا۔ فرقان نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ بہت ہموار انداز میں چلنے والی اس کی سانس بتا رہی تھی کہ وہ نیند میں چاچکا تھا۔

☆.....☆.....☆

جہاز میں ہونے والی وہ ملاقات وہیں ختم نہیں ہوئی۔ وہ دونوں جاگنے کے بعد بھی آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ فرقان نے سالار سے ان چند جملوں کے بارے میں نہیں پوچھا تھا، جو اس نے نیند کی آغوش میں سماتے ہوئے بولے تھے۔ خود سالار کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس نے سونے سے پہلے اس سے کچھ کہا تھا، اگر کہا تھا تو کیا کہا تھا۔

سفر ختم ہونے سے پہلے ان دونوں نے آپس میں کائناتیک نمبر زاور ایئر لائنس کا تبادلہ کیا پھر سالار نے اسے اپنی شادی پر انوائٹ کیا۔ فرقان نے آنے کا وعدہ کیا مگر سالار کو اس کا یقین نہیں تھا۔ ان دونوں کی غلامت کراچی تک تھی پھر سالار کو اسلام آباد کی غلامت یعنی تھی جبکہ فرقان کو لاہور کی۔ اخیر پورٹ پر فرقان نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس سے الوداعی مصافحہ کیا۔

اپنی شادی تین دن بعد تھی اور سالار کے پاس ان تین دنوں کے لئے بھی بہت سے کام تھے۔ کچھ شادی کی مصروفیات اور کچھ اس کے اپنے مسئلے۔

وہ اگلے دن شام کو اس وقت حیران ہوا جب فرقان نے اسے فون کیا۔ دس پندرہ منٹ دونوں کی گفتگو ہوتی رہی۔ فون بند کرنے سے پہلے سالار نے ایک بار پھر اسے اپنی شادی کے بارے میں یاد دلایا۔ "یہ کوئی یاد دلانے والی بات نہیں ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں ویسے بھی اس ویک اینڈ پر اسلام آباد میں ہی ہوں گا۔" فرقان نے جواباً کہا۔ "وہاں مجھے اپنے گاؤں میں اپنا اسکول دیکھنے بھی جانا ہے۔ اس کی بلڈنگ میں کچھ اضافی تعمیر ہو رہی ہے، اسی سلسلے میں۔ تو اسلام آباد میں اس بار میرا قیام کچھ لمبا ہی ہوگا۔" سالار نے اس کی بات کو کچھ دلچسپی سے سنا۔

"گاؤں..... اسکول..... کیا مطلب؟"

"ایک اسکول چلا رہا ہوں میں وہاں، اپنے گاؤں میں۔" فرقان نے اسلام آباد کے نواحی علاقوں میں سے ایک کا نام لیا۔ "بلکہ کئی سالوں سے۔"

"کس لئے؟"

"کس لئے؟" فرقان کو اس کے سوال نے حیران کیا۔ "لوگوں کی مدد کے لئے اور کس لئے۔"

"چھریں ورگ ہے؟"

"نہیں، چھریں ورگ نہیں ہے۔ یہ میرا فرض ہے۔ یہ کسی پر کوئی احسان نہیں ہے۔" فرقان نے

بات کرتے کرتے موضوع بدل دیا۔ اسکول کے بارے میں مزید گفتگو نہیں ہوئی اور فون بند ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

فرقان اپنی شادی پر واقعی آگیا تھا۔ وہ خاصی دیر وہاں رکا مگر سالار کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ حیران تھا۔

"تمہاری فیملی تو خاصی مغرب زدہ ہے۔"

سالار کو یک دم اس کی ابھمن اور حیرانی کی وجہ کچھ میں آگئی۔

"میرا خیال تھا کہ تمہاری فیملی کچھ کٹرو ریٹھی ہوگی کیونکہ تم نے بتایا تھا کہ تم حافظہ قرآن ہو اور تمہارا الٹ اسٹائل مجھے کچھ سادہ سا لگا مگر یہاں آکر مجھے حیرانی ہوئی۔ تم اور تمہاری فیملی میں بہت فرق ہے۔" "I think you are the odd one out۔"

وہ اپنے آخری بیٹلے پر خود ہی مسکرایا۔ وہ دونوں اب فرقان کی گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ "میں نے صرف دو سال پہلے قرآن پاک حفظ کیا اور دو تین سال سے ہی میں odd one out ہوا ہوں۔ پہلے میں اپنی فیملی سے بھی زیادہ مغرب زدہ تھا۔" اس نے فرقان کو بتایا۔

"دو سال پہلے قرآن پاک حفظ کیا۔ امریکہ میں اپنی اسٹڈیز کے دوران، مجھے یقین نہیں آرہا۔" فرقان نے پہلے ہی سے سر ہلایا۔

"کتنے عرصے میں کیا؟"

"تقریباً آٹھ ماہ میں۔"

فرقان بہت دیر تک کچھ نہیں کہہ سکا، وہ صرف اس کا چہرہ دیکھتا رہا، پھر اس نے ایک گہرا سانس لے کر سٹائی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم پر کوئی اللہ کا خاص ہی کرم ہے، ورنہ جو کچھ تم مجھے بتا رہے ہو یہ آسان کام نہیں ہے۔ میں غلامت میں بھی تمہارے کارناموں سے بڑا متاثر ہوا تھا، کیونکہ جس عمر میں یوٹیکو میں جس سیٹ پر تم کام کر رہے ہو ہر کوئی نہیں کر سکتا۔"

اس نے ایک بار پھر بڑی گرم جوشی کے ساتھ سالار سے ہاتھ ملایا۔ چند لمحوں کے لئے سالار کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوا۔

"اللہ کا خاص کرم! اگر میں اسے یہ بتا دوں کہ میں ساری زندگی کیا کر چکا ہوں تو یہ....." سالار نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے سوچا۔

"تم پر سو کسی اسکول کی بات کر رہے تھے۔" سالار نے دانش طور پر موضوع بدلا۔

"تم اسلام آباد میں نہیں رہتے؟"

”نہیں، میں اسلام آباد میں ہی رہتا ہوں مگر میرا ایک گاؤں ہے۔ آبائی گاؤں، وہاں ہماری کچھ زمین ہے، ایک گھر بھی تھا۔“ فرقان اسے تفصیل بتانے لگا۔ ”کئی سال پہلے میرے والدین اسلام آباد شفٹ ہو گئے تھے۔ میرے والد نے فیڈرل سروس سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہاں اپنی زمینوں پر ایک اسکول بنالیا۔ اس گاؤں میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ انہوں نے پرانے اسکول کو اپنا لیا۔ سات آٹھ سال سے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ اب وہ سینڈری اسکول بن چکا ہے۔ چار سال پہلے میں نے وہاں ایک ڈپنٹری بھی بنوائی۔ تم اس ڈپنٹری کو دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔ بہت جدید سامان ہے اس میں۔ میرے ایک دوست نے ایک ایجوکیشن بھی گفٹ کی ہے اور اب صرف میرے گاؤں کے ہی نہیں بلکہ ارد گرد کے بہت سارے گاؤں کے لوگ بھی اسکول اور ڈپنٹری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔“

سالار اس کی باتیں توچہ سے سن رہا تھا۔

”مگر تم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو۔ تم ایک سرجن ہو، تم یہ سب کیسے کر لیتے ہو اور اس کے لئے بہت پیسے کی ضرورت ہے۔“

”کیوں کر رہا ہوں، تو میں نے اپنے آپ سے کبھی نہیں پوچھا۔ میرے گاؤں میں اتنی غربت تھی کہ یہ سوال پوچھنے کی جگہ کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ہم لوگ بچپن میں کبھی کبھار اپنے گاؤں جایا کرتے تھے۔ یہ ہمارے لئے تفریح تھی۔ ہماری حویلی کے علاوہ گاؤں کا کوئی مکان پکا نہیں تھا اور سڑک کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم سب کو یوں لگتا تھا جیسے ہم جنگل میں آگے ہیں، اب اگر ہم جانور ہوتے تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شہر کی طرح ہم جنگل میں دھناتے پھرتے۔ یہی سوچ کر کہ سب، ہم سب سے مرعوب ہیں اور کوئی بھی ہمارے جیسا نہیں، کوئی ہماری طرح رہتا ہے، نہ ہمارے جیسا کھاتا ہے۔ نہ ہمارے جیسا پہنتا ہے مگر انسان ہو کر یہ برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہمارے ارد گرد کے انسان جانوروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ انسانوں کو اس سے خوشی محسوس ہوتی ہو کہ انہیں ہر نعمت میسر ہے اور باقی سب ترس رہے ہیں مگر ہمارا شمار ایسے انسانوں میں نہیں ہوتا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میرے پاس کوئی چلارہ کی چھڑی تو تھی نہیں کہ میں اسے جلاتا اور سب کچھ بدل دیتا، نہ ہی بے شمار وسائل۔ تمہیں میں نے بتایا ہے تاکہ میرے والد سول سرونٹ تھے، ایمان دار قسم کے سول سرونٹ۔ میں اور میرا بھائی دونوں شروع سے ہی اسکالر شپ پر پڑھتے رہے، اس لئے ہم پر ہمارے والدین کو زیادہ خرچ نہیں کرنا پڑا۔ خود وہ بھی کوئی فضول خرچ نہیں تھے، اس لئے تھوڑی بہت بچت ہوتی رہی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میرے والد نے سوچا کہ لاہور یا اسلام آباد کے کسی گھر میں اخبار پڑھ کر، واک کر کے پانی دیکھ کر زندگی گزارنے کے بجائے، انہیں اپنے گاؤں جانا چاہئے۔ وہاں کچھ بہتری لانے کی کوشش کرنی چاہئے۔“

وہ دونوں گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے تھے۔

”مشکلات کا تم اندازہ نہیں کر سکتے گاؤں میں نہ بجلی تھی، نہ صاف پانی، کچھ بھی نہیں تھا۔ بابا نے بتا نہیں کہاں کہاں بھاگ کر یہ ساری چیزیں منظور کروائیں۔ جب وہاں پرانے اسکول بن گیا، ایک سڑک بھی آگئی، بجلی اور پانی جیسی سہولتیں بھی آگئیں تو گورنمنٹ کو اپنا کچھ وہاں ایک اسکول بنانے کا خیال آیا۔ میرے والدین کی خواہش تھی کہ گورنمنٹ ان کے اسکول کو اپنا زیر نگرانی لے لے۔ اس میں اپنے ٹیچرز بھجوائے اور کچھ عرصے کے بعد اس اسکول کو اپ گریڈ کر دے، مگر حلقہ تعلیم کے ساتھ چند رابطوں میں ہی بابا کو اندازہ ہو گیا کہ ایسا ہونے کی صورت میں ان کی ساری محنت پر پانی بھر جائے گا۔ بابا وہاں بچوں کو سب کچھ دیتے تھے۔ کتابیں، کاپیاں، یونیفارم اور ایسی کچھ دوسری چیزیں۔ انہوں نے باقاعدہ اس کے لئے فنڈز رکھے ہوئے تھے، مگر تم اندازہ کر سکتے ہو کہ گورنمنٹ کے پاس چلے جانے کے بعد اس اسکول کا کیا حشر ہوتا۔ سب سے پہلے وہ فنڈز جاتے پھر باقی سب کچھ۔ اس لئے بابا خود ہی اس اسکول کو چلاتے رہے۔“

حلقہ تعلیم نے وہاں اسکول پھر بھی کھولا مگر وہاں ایک بچہ بھی نہیں گیا پھر بارہا انہوں نے وہ اسکول بند کر دیا اور ہمارے اسکول کو اپ گریڈ کر دیا۔ بابا کے کچھ دوستوں نے اس سلسلے میں ان کی مدد کی، اسی طرح اس کی اپ گریڈنگ ہوتی گئی۔ میں ان دنوں لندن میں پڑھتا تھا اور میں روپے بچا بچا کر بھینچا کرتا تھا۔ ابھی بھی ہم اس کو اور ترقی دے رہے ہیں، آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی اپنے بچوں کو ہمارے پاس بھجواتے ہیں۔ میں جب پاکستان واپس آیا تو میں نے وہاں ایک باضابطہ قسم کی ڈپنٹری قائم کی۔ گاؤں کی آبادی بھی اب بہت بڑھ گئی ہے لیکن گاؤں میں غربت ابھی بھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ تعلیم سے اتنا ضرور ہوا ہے کہ گاؤں کے کچھ بچے باہر شہر میں آگے پڑھنے کے لئے جانے لگے ہیں۔ کچھ مختلف ہنر سیکھ رہے ہیں۔ وہ جو غربت کا ایک پتھر تھا وہ ختم ہو رہا ہے۔ ان کی یہ نسلیں نہیں تو اگلی نسلیں شاید تمہارے اور میرے جیسے تعلیمی اداروں سے اعلیٰ ڈگریاں لے کر نکلیں۔ کون کہہ سکتا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں ہر ماہ ایک ویک اینڈ پر گاؤں جاتا ہوں، وہاں دو کپاؤنڈر ہیں مگر کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ ایک ویک اینڈ پر میں وہاں جاتا ہوں، باقی تین ویک اینڈ پر بھی ہم کسی نہ کسی کو وہاں بھجوا دیتے ہیں پھر میں وہاں ہر تین ماہ بعد ایک میڈیکل کیمپ لگواتا ہوں۔“

”اور اس سب کے لئے روپیہ کہاں سے آتا ہے۔“

”شروع میں تو یہ بابا کا روپیہ تھا۔ ان ہی کی زمین پر اسکول بنا، ان کی گرجیوٹی سے اس کی تعمیر ہوئی۔ میری امی نے بھی اپنے پاس موجود رقم سے ان کی مدد کی، پھر بابا کے کچھ دوست بھی مالی امداد

کرنے لگے۔ اس کے بعد میں اور مہراں بھی اس میں شامل ہو گئے پھر میرے کچھ دوست بھی۔ میں اپنی انکم کا ایک خاص حصہ ہر ماہ گاؤں بھجواتا ہوں۔ اس سے ڈیپنٹری بڑے آرام سے چلتی رہتی ہے، جو ڈاکٹر وہاں مینیجمنٹ کے تین ویک اینڈز پر جاتے ہیں وہ کچھ چارج نہیں کرتے۔ ان کے لئے یہ سوشل ورک ہے۔ میڈیکل کیسپس بھی اسی طرح کے لگ جاتے ہیں اور اسکول کے پاس اب اپنے اپنے گلسڈ ڈیپارٹمنٹس ہو چکے ہیں کہ ان سے آنے والی رقم نیچر کی تنخواہ اور دوسرے اخراجات کے لئے کافی ہوتی ہے۔ ہم چند سالوں میں وہاں میڈیکل ایجوکیشن کے لئے بھی کچھ کام کرنا چاہتے ہیں۔

”تم کب جا رہے ہو وہاں؟“

”میں تو صبح نکل رہا ہوں۔“

”اگر میں تمہارے ساتھ جانا چاہوں؟“ سالار نے کہا۔

”موسٹ ویگم..... مگر کل تو ریمو ہو گا، تم یہاں مصروف ہو گے۔“ فرقان نے اسے یاد دلایا۔

”ویگم تو رات کو ہے، سارا دن تو میں فارغ ہی ہوں گا۔ کیا رات تک واپس پہنچنا مشکل ہو گا؟“

”نہیں، بالکل بھی نہیں۔ تم بہت آسانی سے واپس پہنچ سکتے ہو۔ صرف صبح کچھ جلدی لگانا پڑے گا۔ اگر تم واقعی وہاں چند گھنٹے گزارنا چاہتے ہو، ورنہ پھر تم واپس آکر خاصے تھک جاؤ گے۔“ فرقان نے اس سے کہا۔

”میں نہیں تھکوں گا، میں یو سیف کی میز کے ساتھ کیسے کیسے علاقوں میں کتنا لہا سز کر رہا ہوں، تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ میں فجر کے بعد تیار رہوں گا، تم مجھے وقت بتا دو۔“

”ساز سے پانچ۔“

”اوکے، تم گھر سے نکلے ہوئے مجھے ایک بار موپائل پر کال کر لینا اور دو تین بار بارن دینا یہاں آ کر، میں نکل آؤں گا۔“

اس نے فرقان سے کہا اور پھر خدا حافظ کہتا ہوا اندر مڑ گیا۔

اگلی صبح فرقان ٹھیک ساڑھے پانچ بجے اس کے گیٹ پر بارن دے رہا تھا اور سالار پہلے ہی بارن پر باہر تھا۔

”تم واپس پاکستان کیوں آ گئے؟ تم انگلینڈ میں بہت آگے جا سکتے تھے؟“ گاڑی شہر سے باہر والی سڑک پر بھاگ رہی تھی، انہیں سز کرتے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا، جب سالار سے اچانک اس نے پوچھا۔

”انگلینڈ کو میری ضرورت نہیں تھی، پاکستان کو تھی، اس لئے میں پاکستان آ گیا۔“ فرقان نے بڑے نارمل انداز میں کہا۔

”وہاں ایک ڈاکٹر فرقان کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں ایک ڈاکٹر فرقان کے نہ

ہونے سے بہت فرق پڑ جاتا۔ یہاں میری خدمات کی ضرورت ہے۔“ اس نے اپنے آخری جملے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”مگر وہاں اتنے سالوں میں تم بہت آگے جا سکتے تھے پھر پروفیشنل بھی تم بہت کچھ سیکھتے۔ فنانس بھی تم اس پر ویکٹ کے لئے زیادہ روپیہ حاصل کر سکتے تھے، جو تم نے شروع کیا ہوا ہے۔ آفٹر آل، پاکستان میں تم اتنے کامیاب نہیں ہو سکتے۔“ سالار نے کہا۔

”اگر کامیابی سے تمہاری مراد پانڈنٹری کے تعداد اور سہولتوں سے ہے تو ہاں، دونوں جگہوں کا کوئی مقابلہ نہیں ہے لیکن اگر تمہارا اشارہ علاج کی طرف ہے تو میں یہاں زیادہ لوگوں کو زندگی بانت رہا ہوں جو اطمینان ڈاکٹر اپنے صحت یاب ہونے والے مریض کو دیکھ کر حاصل کرتا ہے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ انگلینڈ اوکو لو جوٹ سے بھرا ہوا ہے۔ پاکستان میں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ میں وہاں رو کر روپے کا ڈیپنٹری یہاں بھجواتا رہتا تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ جہاں ایک فرد کی کمی ہوتی ہے وہاں اس فرد سے ہی دو کمی پوری ہوتی ہے۔ روپیہ یاد دوسری کوئی چیز اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ میں بہت قانع ہوں سالار! میری پوری فیلٹی بہت قانع ہے۔ اگر میں نے کوئی چیز بیگی ہے تو وہ سب سے پہلے میرے اپنے لوگوں کے کام آئی چاہئے۔ میں اپنے لوگوں کو مرنا چھوڑ کر دوسرے لوگوں کی زندگی نہیں بچا سکتا۔ پاکستان میں کچھ بھی صحیح نہیں ہے، سب کچھ خراب ہے، کچھ بھی ٹھیک نہیں، سہولتوں سے خالی ہاسٹل اور حد سے زیادہ برادر اور کپٹ ہیلٹھ سسٹم۔ جس برائی اور خانی کا سوچو وہ یہاں ہے مگر میں اس جگہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ان لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر میرے ہاتھ میں شفا ہے تو پھر سب سے پہلے یہ شفا میرے اپنے لوگوں کے حصے میں آتی چاہئے۔“

سالار بہت دیر تک کچھ نہیں بول سکا۔ گاڑی میں ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔

”تم نے مجھ سے تو یہ سوال پوچھ لیا کہ میں پاکستان کیوں آ گیا، کیا اب میں تم سے یہ سوال پوچھوں کہ تم پاکستان کیوں نہیں آ جاتے؟“ فرقان نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سکرانے ہوئے کہا۔

”میں یہاں نہیں رہ سکتا۔“ سالار نے بے اختیار کہا۔

”تم پیسے اور سہولتوں کی وجہ سے یہ کہہ رہے ہو؟“

”نہیں، پیسے یا سہولتیں میرا مسئلہ نہیں ہیں، اب نہ ہی پہلے کبھی۔ تم میرا فیلٹی بیک گراؤنڈ جان چکے ہو۔“

”پھر؟“

”پھر..... کچھ بھی نہیں۔ بس میں یہاں نہیں آ سکتا۔“ اس نے قلمی لہجے میں کہا۔

”یہاں تمہاری ضرورت ہے۔“

”کس کو؟“

”اس ملک کو۔“

سالار بے اختیار مسکرایا۔ ”میں تمہاری طرح کی حب الوطنی نہیں رکھتا۔ میرے بغیر بھی سب کچھ ٹھیک ہے یہاں۔ ایک ڈاکڑی اور بات ہے مگر ایک اکانومٹ تو کسی کو زندگی اور موت نہیں دے سکتا۔“

باب ۶

”تم جو سردسردیوں میں رہے ہو، وہ یہاں کے لوگوں کو دے سکتے ہو جو کچھ اپنے بچپن میں وہاں کی یونیورسٹی میں سکھا رہے ہو، یہاں کی یونیورسٹی میں سکھا سکتے ہو۔“

اس کا دل چاہا، وہ فرقان سے کہے کہ وہ یہاں آکر کچھ بھی سکھانے کے قابل نہیں رہ سکے گا، مگر وہ خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔

”تم نے افریقہ کی غربت، بھوک اور بیماری دیکھی ہے۔ تم یہاں کی غربت، بھوک اور بیماری دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔“

”یہاں صورت حال ان ملکوں کی طرح خراب نہیں ہے فرقان! یہاں اتنی پسماندگی نہیں ہے۔“

”اسلام آباد کے جس سیکٹر میں تم پلے بڑھے ہو، وہاں رہ کر اردگرد کی زندگی کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ تم اسلام آباد کے قریبی گاؤں میں چلے جاؤ تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ ملک کتنا

خوشحال ہے۔"

"فرقان! میں تمہارے اس پروجیکٹ میں کچھ کنٹری بیوشن کرنا چاہتا ہوں۔" سالار نے یک دم بات کا موضوع بدلتا چلا۔

"سالار! میرے اس پروجیکٹ کو فی الحال کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اگر ایسا کوئی کام کرنا چاہتے ہو تو تم خود ایسے ہی کسی گاؤں میں اس طرح کا کام شروع کرو، تمہارے پاس فنڈز کی کمی نہیں ہوگی۔" "میرے پاس وقت نہیں ہے، میں امریکہ میں بیٹھ کر یہ سب کچھ نہیں چلا سکتا۔ تم اگر یہ چاہتے ہو تو کہ کسی دوسرے گاؤں میں بھی کوئی اسکول قائم کیا جائے تو میں اسے سپورٹ کرنے کو تیار ہوں۔ میرے لئے ذاتی طور پر وقت دینا مشکل ہے۔"

فرقان اس بار خاموش رہا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سالار اب اس کے اس اصرار پر کچھ جھنجھار رہا تھا۔ بات کا موضوع ایک بار پھر فرقان کے گاؤں کی طرف مڑ گیا۔

وہ دن سالار کی زندگی کے یادگار ترین دنوں میں سے ایک تھا۔ وہ اس اسکول کو دیکھ کر واقعی بہت متاثر ہوا تھا مگر اس سے بھی زیادہ متاثر وہ اس ڈپنٹری کو دیکھ کر ہوا تھا جہاں وہ گیا تھا۔ اسے ایک چھوٹا ہاسپتال کہنا زیادہ بہتر تھا۔ ڈاکٹر کے نہ ہونے کے باوجود وہ بڑے منظم طریقے سے چلایا جا رہا تھا۔ اس دن فرقان کی آمد متوقع تھی اور اس کے انتظار میں مریضوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی فرقان آتے ہی مصروف ہو گیا۔ ہاسپتال کا احاطہ مریضوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں ہر عمر اور ہر طرح کے مریض تھے۔ نوزائیدہ بچے، عورتیں، بوڑھے، نوجوان۔

سالار احاطے میں لاشعوری طور پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ وہاں موجود چند لوگوں نے اسے بھی ڈاکٹر سمجھا اور اس کے قریب چلے آئے۔ سالار ان سے بات چیت کرنے لگا۔

زندگی میں پہلی بار وہ کینسر کے ایک اسپیشلسٹ کو ایک فزیشن کے طور پر چیک اپ کرتے اور نئے لکھتے دیکھ رہا تھا اور اس نے اعتراف کیا۔ اس نے زندگی میں فرقان سے اچھا ڈاکٹر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بے حد پروفیشنل اور بے حد نرم مزاج تھا۔ اس تمام عمل میں اس کے چہرے کی مسکراہٹ ایک لمحہ کے لئے بھی غائب نہیں ہوئی تھی۔ سالار کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ کو کسی چیز کے ساتھ چپکایا ہوا تھا کچھ وقت گزرنے کے بعد اس نے سالار کو ایک آدمی کے ساتھ اسکول بھجوا دیا تھا وہ وہاں اس کے والدین سے ملا۔

وہ اس کی آمد سے پہلے ہی باخبر تھے، یقیناً فرقان نے ان کو فون پر بتا دیا تھا وہ ان کے ساتھ اسکول میں پھر تارہا۔ اسکول کی عمارت اس کی توقعات کے برعکس بہت وسیع اور بہت اچھی بنی ہوئی تھی۔ اسے وہاں موجود بچوں کی تعداد دیکھ کر بھی حیرت ہو رہی تھی۔

وہاں کچھ سمجھنے رکھنے کے بعد وہ ان دونوں کے ساتھ ان کی حویلی میں آ گیا، حویلی کے بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی بے اختیار اس کا دل خوش ہوا تھا۔ اسے اس گاؤں میں اس قسم کے شاندار لان کی توقع نہیں تھی۔ وہاں پودوں کی بھرمار تھی مگر بے ترتیبی نہیں تھی۔

"بہت شاندار لان ہے، بہت آرٹسٹک۔" وہ تعریف کے بغیر نہیں رہ سکا۔

"یہ نکلیل صاحب کا شوق ہے۔" فرقان کی امی نے کہا۔

"میرا اور نوشین کا۔" فرقان کے والد نے اضافہ کیا۔

"نوشین؟" سالار نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"فرقان کی بیوی۔ یہ آرٹسٹک سچ ایسی کا ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"فرقان نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی نیپلی لاہور میں ہوتی ہے۔" سالار کو یاد تھا۔

"ہاں، وہ لوگ لاہور میں ہی ہوتے ہیں مگر فرقان سینے میں ایک ویک اینڈ یہاں گزارتا ہے پھر وہ

اپنی نیپلی بھی یہاں لاتا ہے۔ یہ سلائیڈز اس کے بچوں کے لئے لگوائی ہیں۔ نوشین بھی ڈاکٹر ہے۔ انہی

بچے چھوٹے ہیں، اس لئے پریکٹس نہیں کرتی مگر جب یہاں آتی ہے تو فرقان کے ساتھ ڈپنٹری جاتی

ہے۔ اس بار وہ اپنے بھائی کی شادی میں مصروف تھی، اس لئے فرقان کے ساتھ نہیں آ سکی۔" وہ ادھر

ادھر نظریں دوڑاتا ان کی باتیں سنتا رہا۔

وہ ان کے ساتھ بچ کرنے کے لئے گھر آیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ کچھ دیر تک فرقان بھی آ

جائے گا مگر جب کھانا لگنا شروع ہو گیا تو اس نے فرقان کے بارے میں پوچھا۔

"وہ وہاں کھانا کھانا نہیں کھاتا۔ صرف ایک سینڈویچ اور چائے کا کپ لیتا ہے۔ اس میں بھی پانچ

منٹ سے زیادہ نہیں گلتے۔ اس کے پاس مریض اتنے ہوتے ہیں کہ وہ شام تک بالکل فارغ نہیں ہوتا۔

کھانا دانا بالکل بھول جاتا ہے۔"

فرقان کی امی نے اس سے کہا۔ وہ ان کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کھانا کھانے لگا۔ فرقان کے

والد فانس ڈویژن میں ہی کام کرتے رہے تھے اور بیٹیوں گریڈ میں ریٹائر ہوئے تھے۔ یہ جان کر کہ

سالار کا تعلق بھی فانس سے ہی تھا۔ ان کے جوش میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ سالار کو ان سے باتیں کرتے

ہوئے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا۔ سالار نے ان سے اس اسکول کے حوالے سے بات کی۔

"اسکول کے لئے ہمیں فی الحال کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس خاصے فنڈز ہیں۔

فرقان کا ایک دوست ایک نیا بلاک بھی بنا رہا ہے بلکہ بن ہی چکا ہے، تم نے تو دیکھا ہی ہے۔ ہاں، تم اگر

کچھ کرنا چاہتے ہو تو ڈپنٹری کے لئے کرو۔ ہمیں ایک مستقل ڈاکٹر کی ضرورت ہے اور ہم اس کے لئے

ہیلتھ منسٹری میں بہت دفعہ درخواستیں دے چکے ہیں۔ فرقان نے اپنے تعلقات بھی استعمال کئے ہیں مگر

کوئی بھی ڈاکٹر یہاں مستقل طور پر آکر رہنے کو تیار نہیں اور ہمیں ایک ڈاکٹر کی اشد ضرورت ہے۔ تم نے مریضوں کی تعداد تو دیکھی ہی ہو گی۔ ایک قریبی گاؤں میں ایک ڈسپنری اور ڈاکٹر ہے، مگر ڈاکٹر مستقل چھٹی پر ہے اور انکا ڈاکٹر بھی آنے سے پہلے ہی چھٹی پر چلا جاتا ہے۔

”میں اس سلسلے میں جو کچھ کر سکا ضرور کروں گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس اسکول کے لئے بھی کچھ کروں۔ میں واپس جانے کے بعد کوشش کروں گا کہ آپ کو پونیسکو کی طرف سے کسی این بی او کے ذریعے ہر سال کچھ گرانٹ بھی ملتی رہے۔“

”لیکن ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب کچھ جو تم نے دیکھا ہے یہ سب ہم لوگوں نے خود کیا ہے۔ ہماری فیملی نے، ریشہ داروں نے، فیملی فرینڈز نے، میرے واقف کاروں نے، میرے بچوں کے دوستوں نے۔ ہمیں کبھی کسی حکومتی یا بین الاقوامی ایجنسی کی گرانٹ کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ کب تک پونیسکو آکر ہمارے لوگوں کی بھوک، جہالت اور بیماری ختم کرتی رہے گی۔ جو کام ہم اپنے وسائل سے کر سکتے ہیں وہ ہمیں اپنے وسائل سے ہی کرنے چاہئیں۔“

”میں صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ اس پروجیکٹ کو اور بڑھائیں۔“ سالار بے اختیار بولنے ہوئے لڑکھڑایا۔

”یہ بہت بڑا جائے گا، تم میں ۲۰ سال بعد یہاں آکر دیکھو گے تو یہ گاؤں تمہیں ایک مختلف گاؤں ملے گا۔ جتنی غربت تم نے آج یہاں دیکھی ہے وہ تب نہیں ہو گی۔ ان کا مکمل آج سے مختلف ہو گا۔“

فرقان کے والد نے بے حد امداد سے کہا۔ سالار چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔
سہ ماہ کے قریب اسے فرقان نے ڈسپنری سے فون کیا۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد اس نے سالار سے کہا۔

”اب تمہیں واپس اسلام آباد کے لئے نکل جانا چاہئے۔ میں چاہتا تھا کہ خود تمہیں واپس چھوڑ کر آؤں مگر یہاں بہت رش ہے جو لوگ دوسرے گاؤں سے آتے ہیں اگر میں انہیں آج چیک نہیں کر سکتا تو انہیں بہت زحمت ہو گی، اس لئے میں اپنے ڈسپنر کو بھجوا رہا ہوں۔ وہ گاڑی میں تمہیں اسلام آباد چھوڑ آئے گا۔“ اس نے پروگرام ملے کیا۔

”اوکے۔“ سالار نے کہا۔

”جانے سے پہلے ڈسپنری آکر مجھ سے مل لینا۔“ اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

سالار نے ایک بار پھر فرقان کے والدین کے ساتھ چائے پی۔ گاڑی تب تک وہاں آچکی تھی، پھر وہ وہاں سے گاڑی میں فرقان کے پاس چلا گیا۔ صبح والی بھیڑ کم ہو چکی تھی۔ وہاں اب صرف بچپن تیس کے قریب لوگ تھے۔ فرقان ایک بوڑھے آدمی کا معائنہ کر رہا تھا۔ سالار کو دیکھ کر مسکرایا۔

”میں دو منٹ میں انہیں چھوڑ کر آتا ہوں۔“

اس نے مریض سے کہا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سالار کے ساتھ چلنا ہوا وہ باہر گاڑی تک آیا۔

”تم کب تک پاکستان میں ہو؟“ اس نے سالار سے پوچھا۔

”ڈیڑھ ہفتہ۔“

”پھر تو دوبارہ ملاقات نہیں ہو سکے گی تم سے کیونکہ میں تو اب اگلے ہی ماہ اسلام آباد اور یہاں

آؤں گا لیکن میں تمہیں فون کروں گا، تمہاری فلائٹ کب ہے؟“

سالار نے اس کے سوال کو نظر انداز کیا۔

”ملاقات کیوں نہیں ہو سکتی، میں لاہور آسکتا ہوں، اگر تم انوائٹ کرو۔“ فرقان کچھ حیران انداز

میں مسکرایا۔

سالار اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

سالار نہیں جانتا تھا اسے کون سی چیز اس طرح اچانک فرقان کے اتنے قریب لے آئی تھی۔ وہ یہ

بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ فرقان کو کیوں اتنا پسند کر رہا تھا۔ وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

فرقان کے ساتھ اس کا گاؤں دیکھنے کے چار دن بعد وہ لاہور گیا۔ وہ وہاں ایک دن کے لئے گیا

تھا اور اس نے فرقان کو فون پر اس کی اطلاع دی۔ فرقان نے اسے ایئر پورٹ پر پک کرنے اور اپنے

ساتھ رہنے کی آفر کی، مگر اس نے انکار کر دیا۔

وہ فرقان سے ملے شدہ پروگرام کے مطابق چار بجے کے قریب اس کے گھر پہنچا۔ وہ ایک اچھے

علاقے میں ایک عمارت کے گراؤنڈ فلور کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ دروازے کے ساتھ موجود تیل دبا

کر وہ خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ اندر سے یک دم کسی بچے کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ایک چار پانچ سال کی

بچی ڈور چھین کی وجہ سے دروازے میں آنے والی جھری سے اس کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ کو کس سے ملنا ہے؟“ سالار اسے دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرایا تھا مگر اس بچی کے چہرے

پر کوئی مسکراہٹ نہیں آئی۔ وہ بڑی سنجیدگی سے سالار سے پوچھ رہی تھی۔

”بیٹا! مجھے آپ کے پیارے ملنا ہے۔“

اس بچی اور فرقان کے چہرے میں اتنی مماثلت تھی کہ اس کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ

وہ فرقان کی بیٹی تھی۔

”پاپا اس وقت کسی سے نہیں ملتے۔“ اسے بڑی سنجیدگی سے اطلاع دی گئی۔

”مجھ سے مل لیں گے۔“ سالار نے قدرے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ سے کیوں مل لیں گے؟“ نور اچھا جواب آیا۔

”یہ تو میں تمہیں راستے میں ہی بتاؤں گا۔“ وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

☆.....☆.....☆

”میں وہاں جا کر کروں گا کیا؟“ سالار نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے فرقان سے پوچھا۔

”وہی جو میں کرتا ہوں۔“ وہ سکتل پر گاڑی روکنے ہوئے بولا۔

”اور تم وہاں کیا کرتے ہو؟“

”یہ تم وہاں پہنچ کر دیکھ لینا۔“

فرقان اسے کسی ڈاکٹر سید سہیل علی کے پاس لے کر جا رہا تھا جس کے پاس وہ خود بھی جایا کرتا تھا۔ وہ کوئی مذہبی عالم تھے اور سالار کو مذہبی علماء سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ پچھلے چند سالوں میں اتنے مذہبی علماء کے اصلی چرے دیکھ چکا تھا کہ وہ اب مزید ان جگہوں پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”فرقانی اسپتالنگ فرقان! میں اس ناپ کا ہوں نہیں جس ناپ کا تم مجھے سمجھ رہے ہو۔“ اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد فرقان کو مخاطب کیا۔

”کس ناپ کے؟“ فرقان نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”نبی پیری مریدی..... پایبیت وغیرہ..... یا جو بھی تم سمجھ لو۔“ اس نے قدرے صاف گوئی سے کہا۔

”اسی لئے تو میں تمہیں وہاں لے جا رہا ہوں، تمہیں مدد کی ضرورت ہے؟“ سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سڑک کو دیکھ رہا تھا۔

”کیسی مدد؟“

”اگر کوئی حافظ قرآن رات کو ایک پارہ پڑھے اور پھر بھی نیند لانے کے لئے اسے نیند کی گولیاں کھانی پڑیں تو پھر کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ غلط ضرور ہے۔ کئی سال پہلے مجھے بھی ایک بار بہت ڈپریشن ہوا تھا۔ میرا ذہن بھی بہت الجھ گیا تھا پھر کوئی مجھے ڈاکٹر صاحب کے پاس لے کر گیا تھا۔ آٹھ دس سال ہو گئے ہیں مجھے اب وہاں جاتے۔ تم سے مل کر مجھے احساس ہوا کہ تمہیں بھی میری طرح کسی کی مدد کی ضرورت ہے، رہنمائی کی ضرورت ہے۔“ فرقان نے نرم لہجے میں کہا۔

”تم کیوں میری مدد کرنا چاہتے ہو؟“

”کیونکہ دین کہتا ہے کہ تم میرے بھائی ہو۔“ اس نے موڑ موڑتے ہوئے کہا۔ سالار نے گردن سیدھی کر لی۔ وہ اس سے مزید کیا پوچھتا۔

اسے مذہبی علماء سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہر عالم اپنے فرقے کی تعریف میں زمین اور آسمان کے تقابے ملانے میں ماہر تھا۔ ہر عالم کو اپنے علم پر غرور تھا۔ ہر عالم کالب لہاب بھی ہوتا تھا۔ میں اچھا ہوں، باقی سب برے ہیں۔ میں کامل ہوں، باقی سب نامکمل ہیں۔ ہر عالم کو کچھ کر لگتا اس نے علم کتابوں سے

نہیں، براہ راست وحی کے ذریعے حاصل کیا ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اس نے آج تک ایسا عالم نہیں دیکھا تھا جو اپنے اوپر تنقید سے اور برداشت بھی کرے۔

سالار خود اہل سنت مسلک سے تعلق رکھتا تھا مگر جو آخری چیز وہ کسی سے ڈسکس کرنا چاہتا تھا وہ مسلک اور فرقہ تھا اور ان مذہبی علماء کے پاس ڈسکس کرنے کے لئے سب سے پہلی چیز مسلک اور فرقہ ہی تھا۔ ان علماء کے پاس جاتے جاتے وہ فرقہ فرقہ ان سے رگڑتے ہو گیا تھا۔ ان کی پوچھی میں صرف علم بھرا ہوا تھا، عمل نہیں۔ وہ ”غیبت ایک گناہ“ پر لمبا چوڑا لکچر دیتے، قرآنی آیات اور احادیث کے حوالے دیتے اور اگلی ہی سانس میں وہ اپنے کسی ہم عصر عالم کا نام لے کر اس کا مذاق اڑاتے، اس کی طمی جہالت کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔

وہ اپنے پاس آنے والے ہر ایک کا پورا بائو ڈینا جانتے اور پھر اگر وہ بائو ڈینا ان کے کام کا ہو تا تو مطالعوں اور سٹارٹوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جاتا اور اس بائو ڈینا کو وہ اپنے پاس آنے والوں کو متاثر کرنے کے لئے بھی استعمال کرتے کہ ان کے پاس کس وقت، کون آیا تھا۔ کس طرح کون ان کے علم سے فیض یاب ہوا تھا۔ کون بڑا آدمی ہر وقت ان کی جوتیاں سیدھی کرتے رہنے کو تیار رہتا ہے۔ کس نے انہیں گھر پایا اور کس طرح خدمت کی۔ وہ اب تک جن عالموں کے پاس ایک بار گیا تھا وہ بارہ نہیں گیا اور اب فرقان اسے پھر ایک عالم کے پاس لے کر جا رہا تھا۔

وہ شہر کے اچھے علاقوں میں سے ایک میں جا پہنچے تھے۔ وہ علاقہ اچھا تھا، مگر بہت پوش نہیں تھا۔ اس سڑک پر پہلے بھی بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ فرقان نے بھی ایک مناسب جگہ پر گاڑی سڑک کے کنارے پارک کر دی، پھر وہ گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ سالار نے اس کی بیرونی کی۔ تین چار منٹ چلنے رہنے کے بعد وہ ان بنگلوں میں سے ایک نسبتاً سادہ مگر پر وقار اور چھوٹے بنگلے کے سامنے پہنچ گئے۔ نیم پلٹ پر ڈاکٹر سید سہیل علی کا نام تحریر تھا۔ فرقان بلا جھجک اندر داخل ہو گیا۔ سالار نے اس کی بیرونی کی۔

بنگلے کے اندر موجود چھوٹے سے لان میں ایک مانی اپنے کام میں مصروف تھا۔ فرقان نے پورچ میں ایک ملازم کے ساتھ دعا سلام کا تبادلہ کیا پھر وہ مزید کچھ آگے چلتا ہوا ایک دروازے کے سامنے پہنچ گیا اور وہاں اس نے اپنا جوتا اتار دیا۔ وہاں پہلے بھی بہت سے جوتے پڑے تھے۔ اندر سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سالار نے بھی دیکھا دیکھی اپنے جوتے اتار دیئے۔ سالار نے ایک قدم اس کے پیچھے اندر رکھتے ہوئے ایک ہی نظر میں پورے کمرے کا جائزہ لے لیا۔ وہ ایک کشادہ کمرے میں تھا جس کے فرش پر کارپٹ بچھا ہوا تھا اور بہت سے طور کشٹرز بھی پڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں فرنیچر کے نام پر صرف چند معمولی سی چیزیں تھیں اور دیواروں پر کچھ قرآنی آیات کیلی گرائی کی صورت میں لگی ہوئی تھیں۔ کمرے میں تین بیچیں کے قریب مردھے جو آپس میں گھٹکوں میں مصروف تھے۔ فرقان نے اندر

”کیونکہ میں ان کا دوست ہوں، آپ انہیں جا کر بتائیں گی کہ سالار اٹکل آئے ہیں تو وہ مجھ سے مل لیں گے۔“ سالار نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی مسکراہٹ سے متاثر نہیں ہوئی۔

”لیکن آپ میرے اٹکل تو نہیں ہیں۔“

سالار کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

”آپ نہ نہیں۔“ وہ بے اختیار بگڑی۔ سالار بچوں کے بل اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

”اچھا میں نہیں ہوتا۔“ اس نے چہرے کی مسکراہٹ کو چھپایا۔

”آپ اس فرماک میں بہت اچھی لگ رہی ہیں۔“ وہ اب کچھ قریب سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ اس کی تعریف نے دروازے کی جھری میں سے جھانکتی ہوئی محترمہ کے تاثرات اور موڈ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

”لیکن آپ مجھے اچھے نہیں لگتے۔“

اس کے جملے سے زیادہ اس کے تاثرات نے سالار کو محفوظ کیا۔ وہ اب کچھ دور سے ٹھیک کے اندر کسی کے قدموں کی آواز سن رہا تھا۔ کوئی دروازے کی طرف ہی آ رہا تھا۔

”ہیو، میں کیوں اچھا نہیں لگا؟“ اس نے مسکراتے ہوئے اطمینان سے پوچھا۔

”بس نہیں اچھے لگتے۔“ اس نے ناگواری سے گردن کو جھٹکا۔

”نام کیا ہے آپ کا؟“ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

”امام؟“ سالار کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے دروازے کی جھری میں سے امام کے مقب میں فرقان کو دیکھا۔ وہ امام کو اٹھاتے ہوئے دروازہ کھول رہا تھا۔

سالار کھڑا ہو گیا۔ فرقان نہا کر اٹھا، اس کے بال گیلے اور بے ترتیب تھے۔ سالار نے مسکرائے کی کوشش کی وہ فوری طور پر کامیاب نہیں ہو سکا۔ فرقان نے اس سے ہاتھ ملایا۔

”میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ وہ اس کے ساتھ اندر جاتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں اب ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہے تھے۔

امام، فرقان کی گود میں چڑھی ہوئی تھی اور اسے مسلسل کان میں کچھ بتانے کی کوشش کر رہی تھی، جسے فرقان مسلسل نظر انداز کر رہا تھا۔

”اٹکل سالار سے ملی ہیں آپ؟“ فرقان نے سالار کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے امام سے پوچھا۔ وہ اب خود بھی صوفے پر بیٹھ رہا تھا۔

”یہ مجھے اچھے نہیں لگتے۔“ اس نے باپ تک اپنی ٹانہ پڑھائی۔

”بہت بری بات ہے امام ایسے نہیں کہتے۔“ فرقان نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔

”آپ اٹکل کے پاس جائیں اور ان سے ہاتھ ملائیں۔“

اس نے امام کو نیچے اُتار دیا۔ وہ سالار کی طرف جانے کے بجائے ایک دم بھاگتے ہوئے باہر چلی گئی۔

”حیرانی کی بات ہے کہ اسے تم اچھے نہیں لگے، ورنہ اس کو میرا ہر دوست اچھا لگتا ہے۔ آج اس کا موڈ بھی کچھ آف ہے۔“ فرقان نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔

”یہ نام کا اثر ہے مجھے حیرانی ہوتی آکر اسے میں اچھا لگتا۔“ سالار نے سوچا۔

چائے پیتے ہوئے وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے اور باتوں کے دوران سالار نے اس سے کہا۔

”ایک دو ہفتے تک تم لوگوں کی ڈپٹری میں ڈاکٹر آجائے گا۔“ اس نے سرسری انداز میں کہا۔

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔“ فرقان ایک دم خوش ہوا۔

”اور اس بار وہ ڈاکٹر وہاں رہے گا۔ اگر نہ رہے تو مجھے تانا۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا میں تمہارا شکر یہ کیسے ادا کروں۔ ڈپٹری میں ایک ڈاکٹر کی دستیابی سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ رکا۔ ”وہاں جانے سے پہلے مجھے توقع نہیں تھی کہ تم اور تمہاری فیملی اس کام کو اس اسکیل پر اور اتنے آرگنائزڈ انداز میں کر رہے ہو میں تم لوگوں کے کام سے درحقیقت بہت متاثر ہوا ہوں اور میری آفر ابھی بھی وہی ہے۔ میں اس پروجیکٹ کے سلسلے میں تمہاری مدد کرنا چاہوں گا۔“

اس نے سنجیدگی سے فرقان سے کہا۔

”سالار! میں نے تم سے پہلے بھی کہا ہے کہ میں چاہوں گا، تم اسی طرح کا کوئی پروجیکٹ وہاں کسی دوسرے گاؤں میں شروع کرو۔ تمہارے پاس مجھ سے زیادہ ذرائع ہیں اور تم مجھ سے زیادہ اچھے طریقے سے یہ پروجیکٹ چلا سکتے ہو۔“

”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا میرا مسئلہ وقت ہے، میں تمہارے جتنا وقت نہیں دے سکتا اور پھر میں پاکستان میں رہ بھی نہیں سکتا۔ تمہاری طرح میرے فیملی ممبرز بھی اس معاملے میں میری مدد نہیں کر سکتے۔“ سالار نے اسے اپنا مسئلہ بتایا۔

”چلو اس پر بعد میں بات کریں گے، ابھی تو تم چائے پیو پھر میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ فرقان نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”کہاں؟“

داخل ہوتے ہی بلند آواز میں سلام کیا اور پھر چند لوگوں کے ساتھ کچھ خیر مقدمی کلمات کا چالوہ کیا پھر وہ ایک خالی کونے میں بیٹھ گیا۔

”ڈاکٹر سید سید علی کہاں ہیں؟“ سالار نے اس کے قریب بیٹھے ہوئے مدہم آواز میں پوچھا۔
 ”آٹھ بیٹھے ہی وہ اندر آ جائیں گے، ابھی تو صرف سات بجیں ہوئے ہیں۔“ فرقان نے اس سے کہا۔

سالار گردن بلا کر کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں ہر عمر کے افراد تھے۔ چند نیشنل ایجنٹ لڑکے، اس کے ہم عمر افراد، فرقان کی عمر کے لوگ، اور جیز عمر۔۔۔ اور کچھ عمر رسیدہ بھی۔ فرقان اپنی دائیں طرف بیٹھے کسی آدمی کے ساتھ مصروف گفتگو تھا۔

ٹھیک آٹھ بجے اس نے ساتھ بیٹھے سال کے ایک آدمی کو ایک اندرونی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کی توقع کے برعکس وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی بھی استقبال کے لئے اٹھنا کھڑا نہیں ہوا۔ آنے والے نے ہی سلام میں کابل کی تھی جس کا جواب وہاں موجود لوگوں نے دیا۔ آنے والے کے احترام میں کھڑا نہ ہونے کے باوجود سالار اب اچانک وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نشست کے انداز میں احترام دیکھ رہا تھا۔ وہ سب یک دم بہت چوکے اور تھملا نظر آنے لگے تھے۔

آنے والے یقیناً ڈاکٹر سید سید علی تھے۔ وہ کمرے کی ایک دیوار کے سامنے اس مخصوص جگہ پر بیٹھ گئے جنہیں شاید ان ہی کے لئے چھوڑا گیا تھا۔ وہ سفید شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔ ان کی رنگت سرخ و سفید تھی اور یقیناً جوانی میں وہ بہت خوبصورت ہوں گے۔ ان کے چہرے پر موجود ڈاڑھی بہت لمبی نہیں تھی مگر بہت گھنی اور نفاست سے تراشی گئی تھی۔ ڈاڑھی نعلی طور پر سفید نہیں ہوئی تھی اور کچھ یہی حال ان کے سر کے بالوں کا بھی تھا۔ سفید اور سیاہ کے امتزاج نے ان کے چہرے اور سر پر موجود بالوں کو بہت باوقار کر دیا تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر دائیں طرف موجود کسی آدمی کا حال دریافت کر رہے تھے۔ شاید وہ کسی بیماری سے اٹھ کر آیا تھا۔ سالار نے چند ہی لمحوں میں ان کے سراپے کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ اور فرقان باقی لوگوں کے عقب میں دیوار کے ساتھ ٹھیک لگائے بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر سید علی نے اپنے نیچر کا آغاز کیا۔ ان کا لب و لہجہ بے حد شائستہ تھا اور انداز و جیما تھا۔ کمرے میں عمل سکوت تھا، وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ سالار کو ان کے ابتدائی چند جملوں سے ہی اندازہ ہو گیا تھا وہ ایک غیر معمولی عالم کے سامنے تھا۔

ڈاکٹر سید سید علی شکر کے بارے میں بات کر رہے تھے۔
 ”انسان اپنی زندگی میں بہت سے ٹھیب و فراز سے گزرتا ہے۔ کبھی کمال کی بلندیوں کو جا چھو تا ہے، کبھی زوال کی گہرائیوں تک جا پہنچتا ہے۔ ساری زندگی وہ ان ہی دونوں انتہاؤں کے درمیان ستر

کر جا رہا ہے اور جس راستے پر وہ ستر کرتا ہے، وہ شکر کا ہوتا ہے یا شکر کی کا۔ کچھ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ زوال کی طرف جائیں یا کمال کی طرف، وہ صرف شکر کے راستے پر ہی ستر کرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو صرف ناشکر کی راستے پر ستر کرتے ہیں، چاہے وہ زوال حاصل کریں یا کمال اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ان دونوں راستوں پر ستر کرتے ہیں۔ کمال کی طرف جاتے ہوئے شکر کے اور زوال کی طرف جاتے ہوئے ناشکر کی۔ انسان اللہ کی ان نعمت مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے۔ اشرف المخلوقات ہے مگر مخلوق ہی ہے۔ وہ اپنے خالق پر کوئی حق نہیں رکھتا، صرف فرض رکھتا ہے۔ وہ زمین پر ایسے کسی ٹریک ریکارڈ کے ساتھ نہیں آتا کہ اللہ سے کسی بھی چیز کو اپنا حق سمجھ کر مطالبہ کر سکے مگر اس کے باوجود اس پر اللہ نے اپنی رحمت کا آغاز جنت سے کیا، اس پر نعمتوں کی بارش کر دی گئی اور اس سب کے بدلے اس سے صرف ایک چیز کا مطالبہ کیا گیا شکر کا۔ کیا محسوس کرتے ہیں آپ لا اگر آپ کبھی زندگی میں کسی پر کوئی احسان کریں اور وہ شخص اس احسان کو یاد رکھتے اور آپ کا احسان مند ہونے کے بجائے آپ کو ان مواقع کی یاد دلائے، جب آپ نے اس پر احسان نہیں کیا تھا یا آپ کو یہ بتائے کہ آپ کا احسان اس کے لئے کافی نہیں تھا۔ اگر آپ اس کے لئے ”یہ کر دیتے یا“ وہ ”کر دیتے تو زیادہ خوش ہوتا۔ کیا کریں گے آپ ایسے شخص کے ساتھ؟ وہ بارہ احسان کرنا تو ایک طرف، آپ تو شاید اس سے تعلق رکھنا تک پسند نہ کریں۔ ہم اللہ کے ساتھ یہی کرتے ہیں۔ اس کی نعمتوں اور رحمتوں پر اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے ہم ان چیزوں کے نہ ملنے پر کڑے رہتے ہیں، جنہیں ہم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اللہ پھر بھی رحیم ہے، وہ ہم پر اپنی نعمتیں نازل کرتا رہتا ہے۔ ان کی تعداد میں ہمارے اعمال کے مطابق کمی بیشی کرتا رہتا ہے مگر ان کا سلسلہ کبھی بھی مکمل طور پر منقطع نہیں کرتا۔“

سالار چلکیں جھپکائے بغیر ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔
 ”شکر ادا کرنا بھی ایک بیماری ہوتی ہے، ایسی بیماری جو ہمارے دلوں کو روز بہ روز کشادگی سے تنگی کی طرف لے جاتی ہے جو ہماری زبان پر شکوہ کے علاوہ اور کچھ آنے ہی نہیں دیتی۔ اگر ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنے کی عادت نہ ہو تو ہمیں انسانوں کا شکر یہ ادا کرنے کی بھی عادت نہیں پڑتی۔ اگر ہمیں خالق کے احسانوں کو یاد رکھنے کی عادت نہ ہو تو ہم کسی مخلوق کے احسان کو بھی یاد رکھنے کی عادت نہیں سیکھ سکتے۔“
 سالار نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ناشکر کی کیا ہوتی ہے، کوئی اس سے زیادہ اچھی طرح نہیں جان سکتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں کھول کر ڈاکٹر سید سید علی کو دیکھا۔
 پورے ایک گھنٹے کے بعد انہوں نے اپنا نیچر ختم کیا، کچھ لوگوں نے ان سے سوال کئے پھر لوگ باری باری آٹھ کر جانے لگے۔

باہر سڑک پر لوگ اپنی گاڑیوں پر بیٹھ رہے تھے، وہ بھی اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ رات اب

گیری ہو رہی تھی۔ سالار کے کانوں میں ابھی بھی ڈاکٹر سید علی کی باتیں گونج رہی تھیں۔ فرقان گاڑی اشارت کر کے واپسی کا سفر شروع کر چکا تھا۔

سات دن پہلے وہ فرقان نامی کسی شخص سے واقف تک نہیں تھا اور سات دن میں اس نے اس کے ساتھ تعلقات کی بہت سی سیز حیاں طے کر لی تھیں۔ اسے حیرت تھی وہ لوگوں کا عادی نہیں تھا۔ کچھ تعلقات اور روابط اوپر کہیں طے کئے جاتے ہیں۔ کس وقت..... کون کے..... کہاں..... کس لئے طے گا اور زندگی میں کیا تبدیلی لے آئے گا یہ سب۔

وہ صرف ایک دن کے لئے لاہور آیا تھا، مگر وہ پاکستان میں اپنے قیام کے باقی دن اسلام آباد کے بجائے لاہور میں قیام رہا اور باقی کے دن وہ ہر روز فرقان کے ساتھ ڈاکٹر سید علی کے پاس جاتا رہا۔ وہ ایک دن بھی ان سے براہ راست نہیں ملا۔ صرف ان کا بچہ سنا اور آٹھ کر آ جاتا۔

ڈاکٹر سید علی کی زندگی کا بڑا حصہ مختلف یورپی ممالک کی یونیورسٹیوں میں اسٹاڈیوں اور اسٹاک ہولم کی تعلیم دینے گزرا تھا۔ پچھلے دس بارہ سال سے وہ پاکستان میں یہاں کی ایک یونیورسٹی سے وابستہ تھے اور فرقان تقریباً اتنے ہی عرصے سے انہیں جانتا تھا۔

جس دن اسے لاہور سے اسلام آباد اور پھر وہاں سے واپس واپس جانا تھا اس رات پہلی بار وہ بچہ کے شرم ہونے کے بعد فرقان کے ساتھ وہاں ٹھہر گیا۔ باری باری تمام لوگ کمرے سے نکل رہے تھے۔ ڈاکٹر سید علی کمرے سے تھے اور کچھ لوگوں سے الوداعی مصافحہ کر رہے تھے۔

فرقان اس کے ساتھ ڈاکٹر سید علی کی طرف بڑھ آیا۔ ڈاکٹر سید علی کے چہرے پر فرقان کو دیکھ کر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں موجود آخری آدمی کو رخصت کر رہے تھے۔

”کیسے ہیں آپ فرقان صاحب!“ انہوں نے فرقان کو مخاطب کیا۔ ”بڑے دنوں کے بعد رخصت آپ یہاں پر۔“

فرقان نے کوئی وضاحت دی پھر سالار کا تعارف کروایا۔

”یہ سالار سکندر ہیں، میرے دوست ہیں۔“

سالار نے اپنا نام سننے پر انہیں یک دم چونکتے دیکھا اور پھر وہ کچھ حیران ہوئے مگر اگلے ہی لمحہ ان کے چہرے پر ایک بار پھر پہلے والی مسکراہٹ تھی۔ فرقان اب اس کا تفصیلی تعارف کر رہا تھا۔

”آئیے بیٹھے۔“ ڈاکٹر سید علی نے فرشی نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ فرقان اور وہ ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔ وہ فرقان کے ساتھ اس کے پردہ جیکٹ کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ سالار خاموشی سے باری باری ان دونوں کے چہرے دیکھتا رہا۔ گفتگو کے دوران ہی ان کا ملازم اندر

آیا اور انہوں نے اسے کھانا لانے کے لئے کہا۔

ملازم نے اس کمرے میں دسترخوان بچھا کر کھانا لگا دیا۔ فرقان یقیناً پہلے بھی وہاں کئی بار کھانا کھاتا رہا تھا۔

وہ جب ہاتھ دھو کر کھانا کھانے کے لئے واپس کمرے میں پہنچا اور دسترخوان پر بیٹھا تو ڈاکٹر سید علی نے اچانک اسے مخاطب کیا۔

”آپ مسکراتے نہیں ہیں سالار؟“ وہ ان کے سوال سے زیادہ سوال کی نوعیت پر گڑبڑایا۔ کچھ ہونے سا وہ انہیں دیکھتا رہا۔

”اس عمر میں اتنی سنجیدگی تو کوئی بہت مناسب بات نہیں۔“ سالار کچھ حیرانی سے مسکرایا، پھر وہ بیس منٹ کی ملاقات میں وہ یہ کیسے جان گئے تھے کہ وہ مسکرائے گا عادی نہیں رہا تھا۔ وہ فرقان کی طرف دیکھ کر کچھ جھینپا، پھر اس نے مسکرائے کی کوشش کی۔ یہ آسان کام ثابت نہیں ہوا۔

”کیا میرا چہرہ میرے ہر احساس کو ظاہر کرنے لگا ہے کہ پہلے فرقان اور اب ڈاکٹر سید علی مجھ سے میری سنجیدگی کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔“ اس نے سوچا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اتنا سنجیدہ نہیں ہوں۔“ اس نے ڈاکٹر سید علی سے زیادہ جیسے خود کو بتایا۔

”ممکن ہے ایسا ہی ہو۔“ ڈاکٹر سید علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کھانے کے بعد دونوں کو رخصت کرنے سے پہلے وہ اندر گئے۔ واپسی پر ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی وہ کتاب انہوں نے سالار کی طرف بڑھادی۔

”آپ کا تعلق معاشیات سے ہے، کچھ عرصے پہلے میں نے اسلامی اقتصادیات کے بارے میں یہ کتاب لکھی ہے۔ مجھے خوشی ہو گی اگر آپ اسے پڑھیں تاکہ آپ کو اسلامی اقتصادی نظام کے بارے میں بھی کچھ واقفیت حاصل ہو۔“

سالار نے کتاب ان کے ہاتھ سے پکڑ لی، کتاب پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس نے مدہم آواز میں ڈاکٹر سید علی سے کہا۔

”میں واپس جا کر بھی آپ سے رابطہ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے صرف اقتصادیات کے بارے میں نہیں سیکھنا چاہتا اور ابھی بہت کچھ جاننا چاہتا ہوں۔“ ڈاکٹر سید علی نے نرمی سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

☆.....☆.....☆

”ڈاکٹر سید علی صاحب کے پاس بیٹھنے لوگ بھی آتے ہیں وہ کسی نہ کسی حوالے سے کمیونٹی ورک سے وابستہ ہیں۔ کچھ پہلے ہی اس کام میں انوالو ہوتے ہیں اور جو پہلے نہیں ہوتے وہ بعد میں ہو جاتے ہیں۔“

ڈاکٹر سیٹھ علی سے پہلی ملاقات کے بعد فرقان نے اسے بتایا۔

”ان کے پاس آنے والے زیادہ تر لوگ بہت کوالیفائینڈ ہیں۔ بڑے بڑے اداروں سے وابستہ ہیں۔ میں بھی اتفاقاً ہی ان کے پاس جانا شروع ہوا۔ لندن میں ایک بار ان کا ایک لیکچر سننے کا اتفاق ہوا پھر پاکستان آنے پر ایک دوست کے توسط سے ان سے ملنے کا موقع ملا اور اس کے بعد سے میں ان کے پاس جا رہا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے بارے میں میرے نظریات پہلے کی نسبت اب بہت صاف اور واضح ہیں۔ ذہنی طور پر بھی میں پہلے کی نسبت اب زیادہ مضبوط ہو گیا ہوں تم اس پر وجیکٹ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اس پر وجیکٹ میں میری بہت زیادہ مدد ڈاکٹر سیٹھ علی کے پاس آنے والے لوگوں نے بھی کی۔ بہت ساری سہولیات انہیں لوگوں نے فراہم کیں اور میں یہاں اس قسم کے پروجیکٹ پر کام کرنے والا واحد نہیں ہوں اور ہم ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں۔ اس مدد کی نوعیت مختلف ہوتی ہے، مگر مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ ہم اس ملک کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔“

سالار نے اس کے آخری جملے پر عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”یہ اتنا آسان تو نہیں ہے۔“

”ہاں ہم جانتے ہیں یہ آسان کام نہیں ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں یہ سب ہماری زندگیوں میں نہیں ہو گا مگر ہم وہ بنیاد ضرور فراہم کر دینا چاہتے ہیں، جن پر ہمارے بچے اور ان کے بعد والی نسل تعمیر کرتی رہے۔ وہ اندھیرے میں ٹانگہ ٹوٹیاں نہ مارتی رہے۔ کم از کم مرتے ہوئے ہم لوگوں کو یہ احساس تو نہیں ہو گا کہ ہم لوگوں نے قماشائیوں جیسی زندگی گزار دی۔ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح ہم بھی صرف تنقید کرتے رہے۔ خرابیوں پر انگلیاں اٹھاتے رہے۔ اسلام کو صرف مسجد کی حدود تک ہی محدود کر کے بیٹھے رہے۔ اپنے اور دوسروں کی زندگیوں میں ہم نے کوئی تبدیلی لانے کی کوشش نہیں کی۔“

وہ حیرانی سے فرقان کا چہرہ دیکھتا رہا تھا۔ امام، پاشم، جلال انصر، سعد کے بعد وہ ایک اور مسلمان کو دیکھ رہا تھا۔ ایک اور پریکٹیکل مسلمان کو، وہ مسلمانوں کی ایک اور قسم سے آگاہ ہو رہا تھا۔ وہ مسلمان جو دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے، جو دونوں انتہاؤں کے بیچ کے راستے کو پیچھتے تھے اور ان پر چلنے کا طریقہ جانتے تھے وہ بری طرح اُلجھا۔

”تم نے میری آفر کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ اس نے فرقان سے کہا۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا میں تم سے کیا چاہتا ہوں۔ تمہاری ضرورت ہے اس ملک کو۔ یہاں کے لوگوں کو، یہاں کے اداروں کو، تمہیں یہاں آکر کام کرنا چاہئے۔“

سالار اس بات پر ہلکے سے ہنسا ”تم کبھی اس ٹاپک کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اچھا میں اس پر سوچوں گا۔ پھر تم میری آفر کے بارے میں کیا کہو گے۔“

”میرے گاؤں کے قریب ہی ایک اور گاؤں ہے۔ اسی حالت میں جس حالت میں دس پندرہ

سال پہلے میرا گاؤں تھا۔ میں آج کل کوشش کر رہا تھا کہ کوئی وہاں پر اسکول بنا دے۔ پرائمری اسکول تو گورنمنٹ کا وہاں ہے مگر آگے کچھ نہیں ہے۔ اگر تم وہاں اسکول شروع کرو تو یہ زیادہ بہتر ہو گا۔ میں اور میری فیملی تمہاری غیر موجودگی میں اسے دیکھیں گے۔ ہم اسے قائم کرنے میں بھی تمہاری مدد کریں گے مگر پھر تمہیں خود ہی اسے چلانا ہو گا۔ صرف روپیہ فراہم کر دینا کافی نہیں ہو گا۔“ فرقان نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

”کل چل سکتے ہو، میرے ساتھ وہاں؟“ سالار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”تمہاری تو فلائٹ ہے کل صبح۔“

”نہیں میں دو دن کے بعد چلا جاؤں گا۔ ایک بار میں چلا گیا تو فوری طور پر میرے لئے واپس آنا ممکن نہیں رہے گا اور میں جانے سے پہلے یہ کام شروع کر دینا چاہتا ہوں۔“

اس نے فرقان سے کہا۔ فرقان نے سر ہلادیا۔

☆.....☆.....☆

وہ اس رات کی فلائٹ سے اسلام آباد گئے اور پھر رات کو ہی فرقان کے گاؤں چلے گئے۔ رات وہاں قیام کرنے کے بعد صبح فجر کے وقت فرقان کے ساتھ وہ اس گاؤں میں گیا۔ دو پہر بارہ بجے تک وہ اس گاؤں کے لوگوں سے ملنے اور وہاں پھرتے رہے۔ وہاں موجود پرائمری اسکول کو دیکھ کر سالار کو یقین نہیں آیا تھا۔ وہ اپنی حالت سے کچھ بھی لگتا تھا مگر اسکول نہیں۔ فرقان کو اس کی طرح کوئی شک نہیں لگا تھا۔ وہ وہاں کے حالات سے پہلے ہی بہت اچھی طرح باخبر تھا۔ وہ سال میں تین چار مرتبہ مختلف دیہات میں میڈیکل کیسپس لگوایا کرتا تھا اور وہ دیہات کی زندگی اور وہاں کی حالت سے سالار کی نسبت بہت اچھی طرح واقف تھا۔ فرقان کو شام کی فلائٹ سے واپس لاہور جانا تھا۔ وہ لوگ دوپہے کے قریب وہاں سے اسلام آباد جانے کے لئے روانہ ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

اسکول کے اس پروجیکٹ کو شروع کرنے سے پہلے سکندر عثمان سے اس کی بات ہوئی تھی۔ اس نے مختصر الفاظ میں انہیں اس پروجیکٹ کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ کسی مدخلت کے بغیر اس کی بات سنتے رہے پھر انہوں نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا۔

”یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو تم؟“

”پاپا! میں اس کام کی ضرورت محسوس کرتا ہوں لوگوں کو۔۔۔ انہوں نے سالار کی بات کاٹ دی۔“

”میں اسکول کی بات نہیں کر رہا۔“

”پھر آپ کس چیز کی بات کر رہے ہیں؟“ وہ حیران ہوا۔

"میں تمہارے لائف اسٹائل کی بات کر رہا ہوں۔"

"میرے لائف اسٹائل کو کیا ہوا؟" وہ چونکا۔ سکندر عثمان اسے دیکھتے رہے۔

"تم نے قرآن پاک حفظ کرنے کے بارے میں ہمیں اس وقت بتایا جب تم حفظ کر چکے تھے، اوکے فائن، میں نے کچھ نہیں کہا۔ تم حج پر جانا چاہتے تھے میرے اس سلسلے میں کچھ تنگدلیاں تھے مگر میں تمہیں نہیں روکا۔ تم نے ہر طرح کی سوشل لائف ختم کر دی۔ میں نے اعتراض نہیں کیا۔ تم مذہب میں ضرورت سے زیادہ لچھی لینے لگے، نماز شروع کر دی وہ بھی مسجد میں۔ میں نے پھر بھی کچھ نہیں کہا۔ تم نے بزنس کرنے کے بجائے جاب کرنا چاہی وہ بھی یہاں نہیں امریکہ میں۔ میں نے تمہیں کرنے دی۔ اب تم ایک اسکول کھولنا چاہ رہے ہو۔ اب ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اس تمام معاملے پر کچھ سنجیدگی سے بات کر لیں۔" سکندر عثمان بے حد سنجیدہ تھے۔

"تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارا یہ لائف اسٹائل تمہیں ہمارے سوشل سرکل کے لئے ناقابل قبول بنا دے گا۔ پہلے تم ایک انتہا پر تھے اب تم دوسری انتہا پر ہو۔ بچیوں، چھبیس سال کی عمر میں جن کاموں میں تم اپنے آپ کو انوکھ کر رہے ہو وہ غیر ضروری ہیں۔ تمہیں اپنے کیریئر پر دھیان دینا چاہئے اور اپنے لائف اسٹائل میں تبدیلی لانی چاہئے۔"

ہم جس کلاس سے تعلق رکھتے ہیں وہاں مذہب سے ایسی وابستگی بہت سے مسائل پیدا کر دیتی ہے۔ "وہ سر جھکانے ان کی باتیں سن رہا تھا۔"

"اور صرف تمہارے لئے ہی نہیں، ہمارے لئے بھی بہت سے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ تم خود سوچو تم لوگوں کو کیا اپریشن دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ کل کو ہم یا تم خود جب اپنی کلاس کی کسی اچھی فیملی کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہو گے تو تمہاری یہ مذہبی وابستگی تمہارے لئے کتنے مسائل پیدا کرے گی تمہیں اندازہ ہے۔ کوئی بھی فیملی سکندر عثمان کا نام دیکھ کر یا تمہاری کوالیفیکیشن دیکھ کر اپنی بیٹی کی شادی تم سے نہیں کر دے گی۔ اوپر سے تم نے اس عمر میں سوشل ورک شروع کرنے کی ٹھان لی ہے جب تمہاری عمر کے لوگ اپنے کیریئر کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں تم یومیٹ میں بہت سوشل ورک کرتے رہے ہو اتنا کافی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ تم یہ سب کچھ اپنی پرسل لائف میں بھی شروع کر دو۔ جو پیسے تم اس اسکول پر اور لوگوں کی زندگیوں کو بہتر بنانے کے لئے ضائع کرو گے اسے تم اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کرو۔ انہیں آسائشیں دینے کے لئے، ایک آرام دہ لائف اسٹائل دینے کے لئے۔ اپنے آپ پر خرچ کرو، تین سو سال کی زندگی نہیں ہے تمہاری، پھر اتنی سی عمر میں بڑھا پو کو کیوں سوار کر لیا ہے تم نے اپنے اعصاب پر۔ ایک حادثہ ہوا، برا ہوا۔ تم نے سنی سیکھا۔ بہت اچھا کیا۔ بس اتنا کافی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اس عمر میں صبح پکڑ لو۔" وہ زکے۔ "کیا میری بات کو

کچھ رہے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"پاپا! میں نے تصحیح نہیں پکڑی ہے۔" سالار نے ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ "آپ نے زندگی میں توازن رکھنے کی بات کی میں وہ توازن ہی رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اپنے کیریئر میں کہاں پر کھڑا ہوں آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ میری کارکردگی سے آپ واقف ہیں۔"

"میں واقف ہوں اور اسی لئے تم سے کہہ رہا ہوں کہ اگر تم اس طرح کی سرگرمیوں میں خود کو انوکھ کر دو تو تم بہت آگے جا سکتے ہو۔" سکندر نے کہا۔

"میں کہیں نہیں جا سکتا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں یہ سب کچھ چھوڑ دوں تو کیریئر کی کسی ماڈرن ایورسٹ تک پہنچ جاؤں گا، تو ایسا نہیں ہے۔" اس نے توقف کیا۔

"تم اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچو۔ اپنی شادی کے بارے میں، ایسی اپروچ رکھنے پر تم کو کہاں قبول کیا جائے گا۔"

"میں نے سوچا ہے پاپا! میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

سکندر رخصتے۔

"بچکانہ سوچ ہے۔ ہر ایک یہی کہتا ہے۔ تمہیں تو اپنا "ایڈوانسڈ" یاد رکھنا چاہئے۔"

ان کا اشارہ کس طرف تھا وہ جاننا تھا وہ بہت دیر کچھ نہیں کہہ سکا۔ یہ بھی نہیں کہ وہ اس ایڈوانسڈ پٹری وچ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"مجھے یاد ہے۔" بہت دیر بعد اس نے مدغم آواز میں کہا۔

"میں آپ کے سوشل سرکل میں بہت پہلے ہی مس فٹ ہو چکا ہوں اور میں یہاں جگہ بنانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے اس سوشل سرکل میں کوئی نیا تعلق یا رشتہ بھی قائم نہیں کرنا۔ مجھے پورا نہیں کہ لوگ، میرے بہن بھائی، میرا مذاق اڑائیں گے یا مجھ پر نہیں گے۔ میں اس سب کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوں۔ جہاں تک سوال اس پر وجیکٹ کا ہے۔ پاپا مجھے اسے شروع کرنے دیں۔ میرے پاس بہت پیسے ہیں۔ اس پر وجیکٹ کو شروع کرنے کے بعد بھی مجھے فٹ پاتھ پر رہنا نہیں پڑے گا۔ کچھ لوگوں کو جسم کی بیماری ہوتی ہے، کچھ کو روح کی۔ جسم کی بیماری کے لئے لوگ ڈاکٹرز کے پاس جاتے ہیں۔ روح کی بیماری کے لئے لوگ وہی کرتے ہیں جو میں کر رہا ہوں۔ جو میں کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس پیسے سے سب کچھ خرید سکتا ہوں صرف سکون نہیں خرید سکتا۔ زندگی میں پہلی بار میں سکون حاصل کرنے کے لئے اس پیسے کو انویسٹ کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے سکون مل جائے۔" سکندر عثمان کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس سے کیا کہیں۔

واپس واقفین پہنچ کر وہ ایک بار پھر پہلے کی طرح مصروف ہو گیا تھا مگر اس بار فرق یہ تھا کہ وہ مسلسل پاکستان میں فرقان اور ڈاکٹر سیٹھ علی کے ساتھ رابطے میں تھا۔ فرقان اسے اسکول کے بارے میں ہونے والی تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

یو سیٹھ میں اس طرح کا کام اس کی جاب کا حصہ تھا۔ اسے اس کام کے لئے بہت اچھا معاوضہ دیا جاتا تھا مگر پاکستان کے اس گاؤں میں اس طرح کے کام کا آغاز اور وہ بھی اپنے وساکس سے۔ چند سال پہلے کے سالار سکندر کو جاننے والے کبھی بھی اس بات پر یقین نہیں کرتے۔ خود اسے بھی یقین نہیں آتا تھا کہ وہ کبھی اس طرح کا کام کرنے کا سوچ سکتا تھا مگر یہ صرف اس پر وجیٹ کے لئے اپنے اکاؤنٹ سے پیسہ نکالنے ہونے سے اندازہ ہوا تھا کہ اس کے لئے یہ پروجیکٹ کم از کم لیا جلا سے مشکل نہیں تھا۔

پچھلے تین سال میں اس کے اخراجات میں بہت کمی آگئی تھی۔ بہت ساری وہ چیزیں اس کی زندگی سے نکل گئی تھیں جن پر وہ اندھا دند پیسہ خرچ کرتا تھا۔ وہ اپنے بینک اکاؤنٹ میں جمع رقم جان کر حیران ہو گیا تھا۔ وہ ایسا شخص نہیں تھا جس سے پیسہ جمع کرنے کی توقع کی جاسکتی۔ ایم فل کے لئے اس کے پاس اس کا رشپ تھا۔ کم از کم اس کے لئے اپنے پاس سے کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس دن اپنے پارٹنرٹ میں بیٹے پھرتے اس نے پہلی بار وہاں موجود تمام چیزوں کو غور سے دیکھا تھا۔ اس کے پارٹنرٹ میں کہیں بھی کوئی بھی مہنگی چیز نہیں تھی بلکہ سامان بھی بہت محدود تھا۔ اس کا بچن بھی کھانے پینے کی چیزوں سے تقریباً خالی تھا۔ کافی، چائے، دودھ اور اسی طرح کی چند دوسری چیزیں۔ اس کا اپنے پارٹنرٹ میں بہت کم وقت گزارنا تھا جو وقت گزارنا تھا وہ سونے میں گزارتا۔

یو سیٹھ میں اپنی جاب پر جاتے ہوئے بھی اس کے پاس پہلے سے موجود کپڑوں اور دوسری اشیاء کا اتنا ہمار موجود تھا کہ وہ اس معاملے میں بھی لاپرواہی برتا رہا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے آخری بار اس طرح کی کوئی چیز کب خریدی تھی۔ اپنے ساتھ کام کرنے والوں اور یونیورسٹی میں اپنے کچھ کلاس فیلوز کے علاوہ نیویارک میں کسی کو نہیں جانتا تھا یا پھر دانشت طور پر اس نے خود کو ایک محدود سرکل میں رکھا تھا اور ان لوگوں کے ساتھ بھی اس کی دوستی بہت رسمی قسم کی تھی۔

واحد چیز جس پر وہ رقم خرچ کرتا تھا وہ کتابیں تھیں۔ اس لائف اسٹائل کے ساتھ اگر اس کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم جمع ہو گئی تھی تو یہ کوئی خلاف توقع بات نہیں تھی۔ آفس، یونیورسٹی، فلیٹ۔ اس کی زندگی کے معمولات میں چوتھی چیز کوئی نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

ایم فل کے دوران سالار نے یو سیٹھ چھوڑ کر یونیورسٹی جوائن کر لیا۔

ایم فل کرنے کے بعد سالار کی پوسٹنگ جی بی میں ہو گئی۔ اس سے پہلے وہ ایک فیلڈ آفس میں کام

کر رہا تھا مگر اب اسے یونیورسٹی کے ہیڈ کوارٹرز میں کام کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ وہ گزشتہ سالوں میں وقتاً فوقتاً چھوٹے موٹے پرائیکٹس کے سلسلے میں جی بیس جاتا رہا تھا مگر اس بار وہ پہلی دفعہ ایک لمبے عرصے کے لئے وہاں جا رہا تھا۔ ایک آشنا دنیاسے آشنا دنیاس میں، اس دنیا میں جہاں وہ زبان تک سے واقف نہیں تھا۔ نیویارک میں اس کے بہت سے دوست تھے، یہاں پر ایسا کوئی بھی نہیں تھا جسے وہ بہت اچھی طرح جانتا ہو۔

یو سیٹھ میں کسے جانے والے ان تھک کام کی طرح وہ یہاں آ کر ایک بار پھر اسی طرح کام کرنے لگا تھا مگر اسلام آباد کے نوادی علاقے میں شروع کیا جانے والا وہ اسکول یہاں بھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ بعض دفعہ اسے حیرت ہوتی کہ اپنی جاب میں تعلیم سے اتنا گہرا تعلق ہونے کے باوجود آخر اسے کبھی فرقان کی طرح وہ اسکول کھولنے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ اگر اس اسکول کے بارے میں وہ کئی سال پہلے سوچ لیتا تو شاید آج یہ اسکول بہت مستحکم بنیادوں پر کھڑا ہو جا۔

”مجھے پاکستان سے زیادہ محبت نہیں ہے، نہ ہی اس کے لئے میں کوئی گہری اہمیت رکھتا ہوں۔“ اس نے شروع کی ملاقات میں ایک بار فرقان سے کہا تھا۔

”کیوں؟“ فرقان نے پوچھا تھا۔

”کیوں کا جواب تو میں نہیں دے سکتا، بس پاکستان کے لئے کوئی خاص احساسات میرے دل میں نہیں ہیں۔“ اس نے کتھے سے اچکا کر کہا تھا۔

”یہ جاننے کے باوجود کہ یہ تمہارا ملک ہے؟“

”ہاں، یہ جاننے کے باوجود۔“

”امریکہ کے لئے خاص احساسات ہیں، امریکہ سے محبت ہے؟“ فرقان نے پوچھا۔

”نہیں، اس کے لئے بھی میرے دل میں کچھ نہیں ہے۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

فرقان نے اس بار حیرانی سے اسے دیکھا۔ ”دراصل میں وطنیت پر یقین نہیں رکھتا۔“ اس نے فرقان کو حیران دیکھ کر وضاحت کی۔

”پانچھ مجھے ان جگہوں کے لئے محبت پیدا کرنے میں وقت محسوس ہوتی ہے، جہاں میں رہتا ہوں۔

میں کل کسی تیسرے ملک میں رہنے لگوں گا تو امریکہ کو بھی یاد نہیں کروں گا۔“

”تم بوے مجب آدمی ہو سالار“ فرقان نے بے اختیار کہا۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی اپنے ملک کے لئے یا اس جگہ کے لئے کوئی خاص احساسات ہی نہ رکھے جہاں وہ رہتا ہے۔“

فرقان کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا مگر اس نے کچھ فائدہ نہیں کہا تھا۔ جی بی آئے کے بعد اسے نیویارک کی کوئی چیز یاد نہیں آئی تھی۔ نہ ہی اسے نیویارک آئے ہوئے بھی اسے وہاں ایڈجسٹمنٹ کا

کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ وہ ہریانی کی پھلی تھا۔

☆.....☆

وہ ان دنوں یونائیٹڈ نیشنز کے زیر اہتمام ہونے والی کسی ریجنل کانفرنس کے سلسلے میں پاکستان آیا ہوا تھا۔ وہ پرل کانٹینیٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے وہاں ایک بزنس مینٹ کے ادارے میں کچھ لیکچرز دینے تھے اور فرقان کے ساتھ اپنے اسکول کے سلسلے میں کچھ امور کو بھی طے کرنا تھا۔

وہ لاہور میں اس کے قیام کا تیسرا دن تھا۔ اس نے رات کا کھانا کچھ جلدی کھا لیا اور اس کے بعد وہ کسی ضروری کام سے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ شام کے ساڑھے سات ہو رہے تھے۔ مال روڈ پر جاتے ہوئے اچانک اس کی گاڑی کا ٹائر ٹچر ہو گیا۔ ڈرائیور گاڑی سے اتر کر ٹائر کو دیکھنے لگا۔ چند منٹوں کے بعد اس نے سالار کی کڑکی کے پاس آکر کہا۔

”سر گاڑی میں دو سرائز موجود نہیں ہے۔ میں آپ کے لئے کوئی ٹیکسی لاتا ہوں۔ آپ اس پر

چلے جائیں۔“ سالار نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

”نہیں، میں خود ٹیکسی روک لیتا ہوں۔“ وہ کہتا ہوا اتر گیا۔ کچھ دور ایک پارک میں کچھ ٹیکسیاں نظر آ رہی تھیں۔ سالار کا رخ اسی طرف تھا جب ایک کار نے پیک دم اس کے پاس آکر بریک لگائی۔ گاڑی سامنے سے آئی تھی اور اس کے رکنے پر سالار نے فٹ پاتھ پر چلنے ہوئے اس میں بیٹھے شخص کو ایک نظر میں ہی پہچان لیا۔

وہ عاکف تھا۔ وہ اب گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سے اتر رہا تھا۔ لاہور میں کچھ سال پہلے اس کی سرگرمیوں کا وہ ایک مرکزی کردار تھا۔ عاکف اور اکل۔ وہ ان ہی دونوں کے ساتھ اپنا زیادہ وقت گزارا کرتا تھا اور اس سے سالار کی وہ بارہ ملاقات کئی سالوں کے بعد ہو رہی تھی۔ وہ ان سب کو چھوڑ چکا تھا۔ پاکستان یا لاہور آنے پر بھی اس نے کبھی ان کے ساتھ رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان لوگوں نے پچھلے کئی سالوں میں بار بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ان کی ان کوششوں کے باوجود سالار ان سے بچنے کی کوششوں میں کامیاب رہا تھا۔

اور اب اتنے سالوں کے بعد وہ پیک دم اس طرح اچانک اس کے سامنے آ گیا تھا۔ سالار کے اعصاب پیک دم تن گئے۔ عاکف بڑے جوش و خروش کے عالم میں اس کی طرف بڑھا۔

”سالار! مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ تم ہو۔۔۔ کہاں غائب تھے اتنے سالوں سے؟ تم تو کدو سے کے سر سے سینک کی طرح غائب ہو گئے تھے۔ کہاں تھے یار! اور اب یہاں کیا کر رہے ہو۔ طبع ہی بدل لیا ہے، کہاں گئے وہ ہال، لاہور میں کب آئے ہو، آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟“

اس نے یکے بعد دیگرے سوالات کی بوجھاڑ کر دی۔ اس نے سالار کے انداز میں جھکتے والی

سر دمہری پر غور نہیں کیا تھا۔ سالار کے جواب دینے سے پہلے ہی عاکف نے دوبارہ پوچھا۔

”یہاں مال پر کیا کر رہے ہو؟“

”گاڑی خراب ہو گئی تھی، میں ٹیکسی کی طرف جا رہا تھا۔“ سالار نے کہا۔

”کہاں جا رہے ہو، میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ عاکف نے پے نکلنی سے کہا۔

”نہیں، میں چلا جاتا ہوں۔ ٹیکسی پاس ہی ہے۔“ سالار نے تیزی سے کہا۔

عاکف نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

”چلو اندر بیٹھو۔“ اس نے بازو پکڑ کر کھینچ لیا۔ سالار شہنشاہین اس کی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

اس کا موڈ اب بہت خراب ہونے لگا تھا۔

”تم تو ٹیکسی پڑھنے چلے گئے تھے اور پھر مجھے پتا چلا کہ تم نے وہاں جا ب کر لی ہے پھر اچانک

پاکستان کیسے؟“ عاکف نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا پھٹیاں گزارنے آئے ہو؟“

”ہاں! سالار نے مختصر آکھا، وہ اس طرح اس سے جان چھڑا سکتا تھا۔

”کیا کر رہے ہو آج کل؟“ عاکف نے گاڑی چلاتے ہوئے پوچھا۔

”یونائیٹڈ نیشنز کی ایک ایجنسی میں کام کر رہا ہوں۔“

”یہاں لاہور میں کہاں ٹھہرے ہو؟“

”پنی سی میں۔“

”اور پنی سی میں کیوں ٹھہرے ہو، میرے پاس آتے یا مجھے فون کرتے۔ کب آئے یہاں؟“

عاکف نے کہا۔

”نکل۔“

”بس تو پھر تم میرے ساتھ، میرے گھر رہو گے۔ ضرورت نہیں ہے ہوٹل میں رہنے کی۔“

”نہیں، میں کل صبح اسلام آباد واپس جا رہا ہوں۔“ سالار نے روانی سے جھوٹ بولا۔ وہ عاکف

سے ہر قیمت پر جان چھڑا لینا چاہتا تھا۔ اسے اس سے الجھن ہو رہی تھی یا پھر شاید یہ اس کے ساتھ گزارا

جاننے والا ماضی تھا جو اسے تکلیف میں مبتلا کر رہا تھا۔

”مگر کل اسلام آباد واپس جا رہے ہو تو پھر آج میرے ساتھ رہو۔ کھانا کھاؤ میرے ساتھ گھر

چل کر۔“ عاکف نے آفر کی۔

”کھانا میں دس منٹ پہلے ہی کھا کر نکلا ہوں۔“

”پھر بھی میرے ساتھ گھر چلو۔ تمہیں اپنی بیوی سے ملاؤں گا۔“

”شادی ہو گئی تمہاری؟“

”ہاں، تین سال ہوئے۔“ عاکف نے کہا۔ پھر پوچھا۔

”اور تم..... تم نے شادی کر لی؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”بس کچھ مصروفیت تھی، اس لئے۔“ سالار نے کہا۔

”گڈ! ابھی آزاد ہی پھر رہے ہو۔“ عاکف نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”خوش قسمت ہو۔“ سالار

نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ عاکف نے اس سے بات کرتے ہوئے گلوکپارٹمنٹ کھول کر اندر سے ایک کیسٹ نکالی چاہی۔ اس کا دھیان ذرا بڑھا اور کیسٹ نکالتے نکالتے گلوکپارٹمنٹ سے بہت سی چیزیں سالار کی گود اور نیچے اس کے پیروں میں گر پڑیں۔

”too bad“ عاکف نے بے اختیار کہا۔ سالار جھک کر چیزیں اٹھانے لگا۔ عاکف نے گاڑی کے

اندر کی لائٹ جلا دی۔ وہ ان چیزوں کو سمیٹ کر گلوکپارٹمنٹ میں رکھنے لگا تھا جب وہ ٹھنک گیا کسی نے

اس کے جسم میں جیسے کرنٹ سا وہ ڈوبایا۔ گلوکپارٹمنٹ کے ایک کونے میں دو ایر رنگز پڑے تھے۔ سالار کے

ہاتھوں میں بے اختیار لرزش آگئی۔ باباں ہاتھ بڑھا کر اس نے ان ایر رنگز کو باہر نکال لیا۔ وہ اب اس کے

ہاتھ کی پتیلی پر گاڑی کے اندر بھتی روشنی میں چمک رہے تھے۔ وہ بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھ رہا تھا۔

بہت سال پہلے اس نے ان ایر رنگز کو کسی کے کانوں میں دیکھا تھا۔ ایک بار..... دو بار..... تین

بار..... چوتھی بار وہ انہیں اب دیکھ رہا تھا۔ اسے کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ امامہ ہاشم کے ایر رنگز تھے۔ وہ

آنکھیں بند کر کے کانڈ پر ان کا ڈیزائن اتار سکتا تھا۔ ہر بیچ وشم کو..... عاکف نے اس کی پتیلی سے وہ

ایر رنگز اٹھائے۔ کسی نے جیسے سالار کا سنتے توڑ دیا تھا۔ عاکف ان ایر رنگز کو ایک بار پھر گلوکپارٹمنٹ میں

رکھ رہا تھا۔

”یہ ایر رنگز.....“ وہ اکتختے ہوئے بولا۔ ”یہ تمہاری بیوی کے ہیں؟“ سالار نے اپنے سوال کو

کھل کیا۔

”بیوی کے؟“ عاکف ہنسا۔ ”نہم آن یار! بیوی کے ہوتے تو میں یہاں رکھتا۔“ سالار پلکیں

بچھکائے بغیر اسے دیکھا رہا۔

”پھر؟“ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”یار ہے ایک گرل فرینڈ میری، گھٹی رات میرے ساتھ تھی۔ یہ ایر رنگز میرے بیڈ روم میں

چھوڑ گئی۔ کچھ ایمر جنسی میں ہی جانا پڑا اسے کیونکہ وہ باواپس آگئی تھی۔ میں نے یہ ایر رنگز لا کر گاڑی میں

رکھ دیئے کیونکہ آج میرا اس کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔“ عاکف بڑی بے تکلفی سے اسے بتا رہا تھا۔

”گرل فرینڈ؟“ سالار کے حلق میں جیسے پھندہ لگا۔

”ہاں، گرل فرینڈ۔ ریڈ لائٹ ایریا کی ایک لڑکی ہے۔ اب اوہر ڈینٹس میں شفٹ ہو گئی ہے۔“

”کیا..... کیا نام ہے اس کا۔“ امامہ ریڈ لائٹ ایریا کی لڑکی تو سمجھی نہیں ہو سکتی۔ یقیناً مجھے غلط فہمی

ہوئی ہے۔ اس نے عاکف کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

”صوبہ۔“ عاکف نے اس کا نام بتایا۔ سالار نے چہرہ موڑ کر ہاتھ میں بچڑی چیزیں گلوکپارٹمنٹ

میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔ اسے واقعی غلط فہمی ہوئی تھی۔ عاکف گاڑی کی لائٹ آف کر چکا تھا۔ سیٹ کی

پشت سے ٹیک لگا کر سالار نے گہرا سانس لیا۔

”گھر یہ اس کا اصلی نام نہیں ہے۔“ عاکف نے بات جاری رکھی۔ ”اصلی نام اس کا امامہ ہے۔“

سالار کے کانوں میں کوئی دھماکہ ہوا تھا یا پھر یہ پگھلا ہوا سپرہ تھا جو کسی نے اس کے کانوں میں داخل

دیا تھا۔

عاکف اب اسٹیئرنگ پر تھوڑا آگے بھٹکے ہونٹوں میں دہا سگریٹ لائٹ سے جلا رہا تھا۔

”تم نے..... تم نے..... کیا کہا؟“ سالار کی آواز میں لرزش تھی۔

”کیا کہا؟“ عاکف نے سگریٹ کا شیش لیتے ہوئے اسے دیکھا۔

”نام بتا رہے تھے تم اس کا؟“

”ہاں، امامہ..... تم جانتے ہو اسے؟“ عاکف نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ سالار کو دیکھا۔

کھڑکی کا شیش اب نے کھول دیا تھا۔ سالار یک تک اسے دیکھا رہا یوں جیسے وہ عاکف کو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

ایر رنگز اب اس کی ٹمٹی کی گرفت میں تھے۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں یا تم جانتے ہو اسے؟“

عاکف نے ہونٹوں سے سگریٹ اٹھایوں میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

”میں..... میں.....“ سالار نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ اپنی آواز اسے کسی کھائی سے آتی محسوس

ہوئی۔ ریڈ لائٹ ایریا وہ آخری جگہ تھی جہاں اس نے کبھی امامہ کے ہونے کا تصور کیا تھا۔

گاڑی کے اندر بٹلے والی روشنی میں عاکف نے بہت غور سے دیکھا۔ اس کے زرد پڑتے ہوئے

چہرے کو، اس کے ہاتھ کی بندھنی کو، اس کے کپکپاتے ہونٹوں کو، اس کے بے ربط، بے معنی لفظوں کو۔

عاکف مسکرایا۔ اس نے اس کے کندھے پر تسلی آمیز انداز میں جھکی دی۔

”ڈونٹ وری یار! کیوں گھبرا رہے ہو، وہ صرف گرل فرینڈ ہے میری۔ اگر تمہارے اور اس کے

درمیان بھی کچھ ہے تو کوئی بات نہیں، ہم تو پہلے بھی بہت کچھ شیئر کیا کرتے تھے، یاد ہے تمہیں۔“ عاکف

نے قہقہہ لگایا پھر اس نے بارود میں تلی پیٹلی۔

”یہ تو پھر لڑکی ہے۔“

مال روڈ پر کتنا رش تھا۔ عاکف کتنی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ان دو سوالوں کے ساتھ ساتھ سالار نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اسٹریٹ پر موجود شخص پر بھیڑنے کی صورت میں خود اس کے ساتھ کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے پلگ چبھنے میں عاکف کو گلے سے پکڑ لیا۔ عاکف کا پاؤں بے اختیار بریک پر آیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ وہ دونوں پوری قوت سے ڈیش بورڈ سے ٹکرائے۔ سالار نے اس کے کار کو نہیں چھوڑا۔ عاکف حواس باختگی کی حالت میں چلایا۔

”کیا کر رہے ہو تم؟“ اس نے سالار کے ہاتھوں سے اپنا گلہ جھڑانے کی کوشش میں اسے دور ہٹانے کی کوشش کی۔ ”پاگل ہو گئے ہو؟“

”How dare you talk like that.“

سالار جوا بخرا گیا۔ اس کے ہاتھ ایک بار پھر عاکف کی گردن پر تھے۔ عاکف کا سانس رکنے لگا۔ اس نے کچھ ٹیسے اور کچھ حواس باختگی کے عالم میں سالار کے منہ پر مکارا۔ سالار بے اختیار جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹا۔ اس کے دونوں ہاتھ اب اپنے منہ پر تھے۔ عاکف کی گاڑی کے پیچھے موجود گاڑیاں ہارن پر ہارن اے رہی تھیں۔ وہ سڑک کے وسط میں کھڑے تھے اور یہ ان دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ اس طرح اپنا کبھی گاڑی رکنے پر پیچھے آنے والی گاڑی ان سے نہیں ٹکرائی۔

سالار دونوں ہاتھوں سے اپنا جہز پکڑے ہوئے اپنی سیٹ پر دہرا ہوا تھا۔ عاکف نے اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے گاڑی کو کچھ آگے ایک سستان ڈبلی سڑک پر موڑتے ہی ایک طرف روک لیا۔ سالار جب تک سیدھا ہو چکا تھا اور اپنی ایک ہاتھ کی ہتھیلی سے ہونٹوں اور جڑے کو دبائے وٹا اسکرین سے باہر دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ پہلے کا اشتعال اب غائب ہو چکا تھا۔

عاکف نے گاڑی روکی۔ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس کی طرف مڑا اور کہا ”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔ میرے گلے کیوں پڑ رہے تھے، میں نے کیا کیا ہے؟“

بلند آواز میں بات کرتے کرتے اس نے ڈیش بورڈ سے ٹشو پکس اٹھا کر سالار کی طرف بڑھایا۔ اس نے سالار کی شرٹ پر خون کے چند قطرے دیکھ لئے تھے۔ سالار نے یکے بعد دیگرے دو ٹشو نکال لئے اور ہونٹ کے اس کوئے کو صاف کرنے لگا جہاں سے خون رس رہا تھا۔

”گاڑی کا ایکسٹرنٹ ہو جاتا ابھی۔“ عاکف نے کہا۔ سالار کو ہاتھ صاف کرتے ہوئے دو بارہ ایر رنگز کا خیال آیا۔ اس نے یک دم جھک کر پائیدان میں ایر رنگز ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

”ٹپ ہاتھ پر گاڑی چڑھ جاتی یا۔“

عاکف بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”کیا ڈھونڈ رہے ہو؟“

”وہ ایر رنگز۔“ سالار نے مختصر کہا۔

عاکف بے اختیار جھلایا۔

”کیا پر اہلم ہے سالار! میری گرل فرینڈ ہے، اس کے ایر رنگز ہیں، میرا پر اہلم ہے یہ ایر رنگز یا اس کا پر اہلم ہے تمہارا نہیں۔“ سالار یک دم ڈک گیا۔ اسے اپنی ناہمقول حرکت کا احساس ہوا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ٹشو کو کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے اسے دم گھٹنا محسوس ہو رہا تھا۔

عاکف ماتھے پر ہل لے کر اسے اس کو دیکھ رہا تھا۔

”تمہارا اور صنوبر کا کوئی.....“ عاکف ہاتھ کرتے کرتے محتاط انداز میں ڈک گیا۔ وہ اندازہ نہیں کر پار ہاتھ کا بچھلی ہار اس کے بیٹھے میں ایسا کون سا لفظ تھا جس نے اسے مشتعل کیا تھا۔ وہ دوبارہ تلخی ڈھرتا نہیں چاہتا تھا۔

”آئی ایم سوری۔“ سالار نے اس کے رکنے پر کہا۔

”او کے فائن۔“ عاکف کچھ مطمئن ہوا۔ ”تم اور صنوبر۔“ وہ پھر ڈک گیا۔

”تم نے کہا تھا، اس کا نام امام ہے۔“ سالار نے گردن موڑ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ عاکف کو بے اختیار اس کی آنکھوں سے خوف آیا۔ وہ کسی پارٹل شخص کی آنکھیں نہیں تھیں۔ وحشت..... بے چارگی..... خوف..... وہ ہر تاثر لے ہوئے تھیں۔

”ہاں، اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا۔ شروع میں، ایک بار اپنے ہارے میں بتا رہی تھی، تب اس نے مجھے بتایا۔“

”اس کا طبع بتا سکتے ہو مجھے؟“ سالار نے موہوم سی امید کے ساتھ کہا۔

”ہاں، کیوں نہیں۔“ عاکف گڑبڑ لیا۔ ”بہت خوب صورت ہے۔ fair..... tall“ عاکف اب دیکھنے لگا۔ ”کالی آنکھیں ہیں، بال بھی پہلے کالے تھے اب ڈائی گئے ہوئے ہیں اس نے اور کیا بتاؤں۔“ وہ زچ ہوا۔

سالار نے آنکھیں بند کر کے وٹا اسکرین کی طرف چہرہ کر لیا۔ عکس کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

”امام ہاشم ہے اس کا نام؟“ وہ وٹا اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

”پتا نہیں، باپ کا نام تو نہیں بتایا اس نے۔ نہ ہی میں نے پوچھا۔“ عاکف نے کہا۔

”امام ہاشم ہی ہے وہ۔“ وہ بڑبڑایا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ ”یہ سب میری وجہ سے ہوا..... سب..... میں ذمہ دار ہوں اس سب کچھ کا۔“

”کس چیز کے ذمہ دار ہو تم؟“ عاکف کو تجسس ہوا۔ سالار خاموشی سے وٹا اسکرین سے باہر دیکھتا

رہا۔ عاکف جواب کا انتظار کرتا رہا۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد سالار نے گردن موڑ کر اس سے کہا۔
"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔"

عاکف کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر وہ ڈیش بورڈ سے موبائل اٹھا کر ایک کال مائلے لگا۔ کچھ دیر تک وہ کوشش کرتا رہا پھر اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"اس کا موبائل آف ہے۔ پتا نہیں وہ گھر پر ملے یا نہ ملے کیونکہ اب رات ہو رہی ہے اور وہ....."
عاکف چپ ہو کر گاڑی اشارت کرنے لگا۔ "لیکن میں تمہیں لے جاتا ہوں اس کے گھر۔"

آدھ گھنٹہ کے بعد وہ دونوں ڈیفنس کے ایک بنگلہ کے باہر کھڑے تھے۔ وہاں پہنچتے تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ عاکف اب اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے سالار کو لٹ دی تھی۔

چند بار بارن دینے پر اندر سے ایک آدمی باہر نکل آیا، وہ چوکیدار تھا۔

"صنوبر گھر ہے؟" عاکف نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"نہیں، بی بی صاحبہ تو نہیں ہیں۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"مجھے پتا نہیں۔" عاکف نے سالار کو دیکھا اور پھر گاڑی کا دروازہ کھولنے ہوئے کہا۔

"تم بیٹھو، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" عاکف اس آدمی کے ساتھ اندر چلا گیا۔

"اس کی واپسی دس منٹ کے بعد ہوئی۔"

"تم کو اس سے بات کرنی ہے؟" اس نے اندر بیٹھتے ہی پوچھا۔

"مجھے اس سے ملنا ہے۔" عاکف دو بارہ گاڑی اشارت کرنے لگا۔

سفر پھر اسی خاموشی سے طے ہونے لگا۔ نو بج رہے تھے جب وہ ریڈ لائٹ ایریا میں پہنچے تھے۔
سالار کے لئے وہ جگہ نئی نہیں تھی۔ صرف اس تکلیف کا احساس نیا تھا جو اسے اس بار ہو رہا تھا۔

"آج یہاں ہی ہے وہ..... کسی آدمی نے یہاں کی کچھ لڑکیوں کو ہپک کر دیا ہے کسی فنکشن کے لئے۔ وہ بھی ان ہی کے ساتھ جا رہی ہے۔"

عاکف نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

"تم بھی تو اترو، بہت اندر جاتا ہے۔ اب صنوبر کو تو میں تم سے ملانے کے لئے یہاں نہیں لا سکتا۔" سالار باہر نکل آیا۔

وہ عاکف کے ساتھ ایک بار پھر ان گلیوں میں جانے لگا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا وہ اس طرح کی جگہ میں آخری بار وہاں کب آیا تھا، وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ انسانی گوشت کی تجارت تب بھی اسی

"ڈھکے چھپے" انداز میں ہو رہی تھی۔

اسے بہت اچھی طرح یاد تھا وہ پہلی بار اٹھارہ سال کی عمر میں وہاں آیا تھا پھر وہ کئی بار وہاں آتا رہا تھا، کئی بار۔ بعض دفعہ رقص دیکھنے، بعض دفعہ کسی مشہور ایکٹریس کی کسی محفل میں شرکت کے لئے۔ بعض

دفعہ ان گلیوں کے دروازوں، کمڑیوں، چوہاروں سے لگتی جھاگنی نیم برہنہ عورتوں کو دیکھنے۔ (اسے عجیب سی خوشی ملتی تھی ان گلیوں سے گزرتے ہوئے۔ وہ وہاں کمڑی کسی بھی عمر کی کسی بھی شکل کی لڑکی کو

چند گھنٹوں کے لئے خرید سکتا تھا۔ والٹ سے نکلنے والے چند نوٹ وہاں کمڑی کسی بھی لڑکی کو سر سے ہیرے تک اس کا کر دیتے۔ دنیا بیروں کے بچے اور کائنات ٹھہری میں ہونا اور کسے کہتے تھے، اسے سرشاری کا

احساس ہوتا۔) اور بعض دفعہ وہاں رات گزارنے کے لئے، ان عورتوں کے ساتھ جن سے وہ نفرت کرتا تھا چند روپوں کی خاطر جسم فروخت کرنے والیوں کے لئے وہ اس کے علاوہ کیا جذبہ رکھ سکتا تھا

اور نفرت کے باوجود وہ انہیں خریدتا تھا کیونکہ وہ خرید سکتا تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں اسے یقین تھا ان عورتوں میں کبھی کوئی ایسی عورت نہیں ہو سکتی تھی جس سے اس کا کوئی تعلق ہو، خونی رشتہ ہو یا

محبت ہوئی۔

اس کی ماں اور لیٹن ایلیٹ کلاس کی فرد تھیں۔ اس کی بیوی کو بھی اسی کلاس کے کسی گھر سے آتا تھا۔ اس کی بیٹی بھی اسی کلاس سے ہوئی۔ ریڈ لائٹ ایریا کی عورتیں..... انہیں اسی کام کے لئے پیدا کیا گیا

ہے۔ اسے یقین تھا آگزی گردن، اٹھی ہوئی ٹھوڑی اور تپتے ہوئے ابروؤں کے ساتھ وہ اس مخلوق سے جتنی نفرت کرتا، کم تھی۔ جتنی تذبذب کرنا، ناکافی تھی۔

اور اب..... اب قسمت نے کیا کیا تھا۔ سات پردوں میں رہنے والی اس عورت کو جس کے جسم پر وہ کسی کی انگلی کے لمس تک کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، اسے اس بازار میں پھینک دیا گیا تھا۔ اس سے چند

قدم آگے وہ شخص چل رہا تھا جو اس کا لاکھ تھا اور سالار سکندر زبان کھولنے کے قابل تک نہیں تھا۔ آواز بلند نہیں کر سکتا تھا۔ شکوہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی سے کیا کہتا۔ کیا وہ اللہ سے کہہ سکتا تھا کہ اس کے ساتھ

ایسا کیوں ہوا۔ آخر اس نے ایسا کیا کیا تھا؟ اس نے اپنے ہونٹ سمجھنے لئے۔ اس کی کپکپاہٹ کو کیسے روکتا۔ ان گلیوں میں آنے والا کوئی شخص کبھی دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے اپنے گھر اپنے

خاندان کی عورت کبھی اس بازار میں نہیں آئے گی۔ کسی دوسرے مرد کی جیب میں پڑے ہوئے نوٹوں کے عوض نہیں ہک سکے گی۔ ماں نہیں؟..... بہن؟..... یا بیوی؟..... بیٹی؟..... پوتی؟..... نواسی؟.....

آنے والی نسلوں میں سے کوئی۔

سالار سکندر کی زبان حلق سے سمجھتی گئی تھی۔ اہامہ ہاشم اس کی بیوی تھی اس کی منکوحہ۔ ایلیٹ کلاس کی وہ عورت جس کا اس بازار سے کبھی واسطہ نہیں پڑتا۔ سالار سکندر نے ایک بار پھر خود کو مار گھدی

پہاڑیوں پر رات کی تاریکی میں درخت کے ساتھ بندھ لیا..... بے بسی کی انتہا تھی۔

”صاحب! میرے ساتھ چلو، ہر عمر کی لڑکی ہے میرے پاس۔ اس علاقے کی سب سے اچھی لڑکیاں، قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔“ اس کے ساتھ ایک آدمی چلنے لگا۔

”میں اس لئے یہاں نہیں آیا ہوں۔“ سالار نے مدغم آواز میں اس پر نظر ڈالے بغیر کہا۔

”کوئی ڈرنک چاہئے، کوئی ڈرگ، میں سب کچھ سپلائی کر سکتا ہوں۔“

عاکف نے یک دم قدم روک کر قدرے اکڑے ہوئے انداز میں اس آدمی سے کہا۔ ”تمہیں ایک بار کہا ہے تاکہ ضرورت نہیں پھر پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔“

اس آدمی کے قدم ختم گئے۔ سالار خاموشی سے چٹا رہا۔ اس کا ذہن کسی آمدنی کی زد میں آیا ہوا تھا۔ امام ہاشم وہاں کب، کیوں، کیسے آگئی تھی۔ ماضی ایک قلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے آیا تھا۔

”پلیز، تم ایک بار۔۔۔ ایک بار اس کو جا کر میرے بارے میں سب کچھ بتاؤ، اس سے کب مجھ سے شادی کر لے۔ اس سے کب، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، صرف ایک ہم ہے۔ اس کو تم حضرت محمد

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ دو گے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ وہ اتنی محبت کرنا ہے ان کے لئے۔“

اس نے بہت سال پہلے اپنے بیڑ پر نیم دراز جیسے کھاتے ہوئے موبائل فون پر بڑے اطمینان کے ساتھ اس کو پکارتے سنا تھا۔

”بائی دادو، تم امام کے کیا لگتے ہو؟“

”میں۔۔۔؟ میں اور امام بہت گہرے اور پرانے فرینڈز ہیں۔“ جلال انصر کے ماتھے پر ہل پڑ گئے تھے۔ سالار نے عجیب سی سرشاری محسوس کی۔ جلال اس وقت امام اور اس کے بارے میں کیا سوچ رہا

ہو گا۔ وہ اچھی طرح اندازہ کر سکتا تھا۔

”اس سے جا کر صاف صاف کہہ دو کہ میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔“

وہ جلال انصر کا یہ پیغام سنتے ہوئے امام ہاشم کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے چوتھم کے بتل بناتے ہوئے امام کو موبائل پر خبر دی تھی۔

”تم نے مجھ پر اتنے احسان کئے ہیں، ایک احسان اور کرو۔ مجھے خلاق دے دو۔“ وہ فون پر مڑ مڑاتی تھی۔

”نہیں، میں تم پر احسان کرتے کرتے تھک گیا ہوں، اب اور احسان نہیں کر سکتا اور یہ والا احسان۔۔۔ یہ تو ناممکن ہے۔“ اس نے جواب کہا تھا۔

”تم طلاق چاہتی ہو، کورٹ میں جا کر لے لو مگر میں تو تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔“

سالار کے حلق میں پستہ دے گئے تھے۔

”ہاں، میں نے یہ سب کچھ کیا تھا لیکن میں نے، میں نے جلال انصر کی غلط فہمی کو دور کر دیا تھا۔ میں

نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا، کچھ بھی نہیں چھپایا۔ میں نے صرف ایک مذاق کیا تھا، ایک پریکٹیکل جوک۔ میں یہ تو نہیں چاہتا تھا کہ امام کے ساتھ یہ سب کچھ ہو۔“ وہ جیسے کسی عدالت میں آن کھڑا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں نے اس کے ساتھ زیادتی کی اسے طلاق نہیں دے کر۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ میں نے پھر بھی یہ خواہش تو نہیں کی تھی کہ وہ یہاں آجیٹے۔ میں نے۔۔۔ میں نے اسے گھر چھوڑنے سے روکا تھا،

میں نے مذاق میں ہی کسی مگر اسے مدد کی آخر بھی کی تھی۔ میں تو اس کو یہاں لے کر نہیں آیا تھا۔ کوئی مجھے تو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتا اس سب کا۔“

وہ بے روبا جملوں میں وضاحتیں دے رہا تھا۔ اس کے سر میں سسٹناہٹ ہونے لگی تھی۔ درد کی ایک تیز مگر مانوس سی میٹرنگین (آدمی سر کا درد کا ایک اور اٹیک۔ وہ پچھلے پچھلے زکا، بوٹ بچھتے ہوئے اس نے بے اختیار اپنی کپٹی کو مسلا، درد کی لہر گزر گئی تھی۔ آنکھیں کھول کر اس نے گلی کے پتھر کو دیکھا۔

وہ اندھی گئی تھی، کم از کم اس کے لئے اور امام ہاشم کے لئے۔ اس نے قدم آگے بڑھائے۔ عاکف ایک چوہارے نما گھر کے سامنے رُک گیا تھا۔ اس نے مڑ کر سالار کو دیکھا۔

”یہی گھر ہے۔“ سالار کا چہرہ کچھ اور زرد پڑ گیا۔ قیامت اب اور کتنی دور رہ گئی تھی۔

”اوپر کی منزل پر جانا ہے، صوبہ راولپنڈی ہوگی۔“ عاکف کہتے ہوئے ایک طرف موجود گنگ اور ٹارپیک سی بیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سالار کو پہلی بیڑھی پر ہی شوکر لگی۔ وہ بے اختیار جھکا، عاکف نے مڑ کر

اسے دیکھا اور رُک گیا۔

”احتیاط سے آؤ، بیڑھیوں کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اوپر سے یہ لوگ بلب لگوانے کے بھی روادار نہیں۔“ سالار سیدھا ہو گیا۔ اس نے دیوار کا سہارا لے کر اوپر والی بیڑھی پر قدم رکھا۔ بیڑھیاں

ہل کھا کر گولائی کی صورت میں اوپر جا رہی تھیں اور اتنی ٹھگ تھیں کہ صرف ایک وقت میں ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا۔ ان کی سینٹ بھی اکٹری ہوئی تھی۔ وہ بوٹ پینے کے ہاوجود ان کی خستہ حالت کو جانچ

سکتا تھا جس دیوار کا سہارا لے کر وہ بیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اس دیوار کی سینٹ بھی اکٹری ہوئی تھی۔ سالار اندھوں کی طرح دیوار ٹٹولتے ہوئے بیڑھیاں چڑھنے لگا۔

پہلی منزل کے ایک دروازے کے کھلے ہوئے پٹ سے آنے والی روشنی نے سالار کی رہنمائی کی تھی۔ عاکف وہاں کہیں نہیں تھا۔ یقیناً وہ دروازہ پار کر کے آگے چلا گیا تھا۔ سالار چند لمحوں کے لئے وہاں

رُکا پھر اس نے دلچیز کے پار قدم رکھا۔ وہ اب ایک چوہارے میں تھا۔ ایک طرف بہت سے کمروں کے دروازے تھے۔ دوسری طرف نیچے گلی نظر آ رہی تھی۔ برآمدے نما سہاچہ بارہ بالکل خالی تھا۔ تمام کمروں

کے دروازے اسے وہاں کھڑے بند ہی لگ رہے تھے۔ عاکف کہاں گیا تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے بہت مختصر انداز میں اپنے قدم آگے بڑھائے۔ یوں جیسے وہ کسی بھوت بچھگے میں آ گیا تھا۔ ابھی کوئی دروازہ

کھلتا اور امام ہاشم اس کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی۔

”میرے خدا..... میں..... میں اس کا سامنا یہاں کیسے کروں گا۔“ اس کا دل ڈوبا۔

وہ ان بندروں و انہوں پر نظر ڈالتے ہوئے چلتا جا رہا تھا۔ جب اس پر آمدے کے آخری سرے پر ایک دروازے میں سے عاکف نکلا۔

”تم کہاں رہ گئے ہو۔“ وہ وہیں سے بلند آواز میں بولا۔ ”یہاں آؤ۔“

سالار کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔ سالار دروازے تک پہنچنے سے پہلے چند لمبے کے لئے زک گیا۔ وہ اپنے دل کی دھڑکن کی آواز باہر تک سن رہا تھا پھر آنکھیں بند کئے سرد ہاتھوں کی مضامین بچھتے وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں عاکف ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ ایک لڑکی اپنے بالوں پر برش کرتے ہوئے عاکف سے باتیں کر رہی تھی۔

”یہ امام نہیں ہے۔“ بے اختیار سالار کے من سے نکلا۔

”ہاں، یہ امام نہیں ہے۔ وہ اندر ہے، آؤ۔“ عاکف نے اٹھتے ہوئے ایک اور کمرے کا دروازہ کھولا۔ سالار غیر ہموار قدموں سے اس کے پیچھے گیا۔ عاکف اگلے کمرے کو بھی پار کر گیا اور ایک اور دروازہ کھول کر ایک دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔

”بیٹو صنوبر! سالار نے دور سے عاکف کو کہتے ہوئے سنا۔ اس کا دل اچھل کر مطلق میں آ گیا۔ ایک لمبے کے لئے اس کا جی چاہا وہ وہاں سے بھاگ جائے۔ ابھی اسی وقت..... سرپٹ..... ادھر ادھر دیکھے بغیر..... اس گھر سے..... اس علاقے سے..... اس شہر سے..... اس ملک سے..... دو بارہ کبھی وہاں کا رخ تک نہ کرے..... اس نے گردن موڑ کر اپنے عقب میں موجود دروازے کو دیکھا۔

”آؤ سالار!“ عاکف نے اسے مخاطب کیا۔ وہ اب گردن موڑے اندر کسی لڑکی سے مصروف گفتگو تھا۔ سالار نے تھوک لگایا، اس کا مطلق کانٹوں کا جنگل بن گیا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ عاکف نے اپنی پشت پر اس کے قدموں کی آواز سنی تو دروازے سے ہٹ گیا۔ سالار دروازے میں تھا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔

”یہ ہے صنوبر۔“ عاکف نے تعارف کروایا۔ سالار اس سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ وہ بھی اس پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

”امام؟“ وہ بے حس و حرکت اسے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

”ہاں امام!“ عاکف نے تصدیق کی۔

سالار گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا۔ عاکف گھبرا گیا۔

”کیا ہوا، کیا ہوا؟“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے سجدے میں تھا۔ وہ ایک طوائف کے

کوٹھے پر سجدے میں گرنے والا پہلا مرد تھا۔

عاکف بچوں کے بل بیٹھا اسے کندھے سے پکڑے ہمار ہا تھا۔ سالار سجدے میں بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

”پانی..... پانی لاؤں؟“ صنوبر گھبراتے ہوئے تیزی سے بیڈ کے سرہانے پڑے جگ اور گلاس کی طرف گئی اور گلاس میں لے کر سالار کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”سالار صاحب! آپ پانی پیئیں۔“

سالار ایک جھینکے سے اٹھ بیٹھا۔ یوں جیسے اسے کرنٹ لگا ہو، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھگا ہوا تھا۔ کچھ کہے بغیر اس نے اپنی جھڑکی جیب سے والٹ نکالا اور پانگھوں کی طرح اس میں سے کرنسی نوٹ نکال کر صنوبر کے سامنے رکھتا گیا اس نے والٹ چند سیکنڈ میں خالی کر دیا تھا۔ اس میں کرنسی کارڈز کے علاوہ کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ پھر وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑا ہوا اور اگلے قدموں دروازے کی دہلیز سے ٹھوکر کھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ عاکف ہکا بکا اس کے پیچھے آیا۔

”سالار..... سالار.....! کیا ہوا ہے؟ کہاں جا رہے ہو؟“

اس نے سالار کو کندھے سے پکڑ کر روکنے کی کوشش کی۔ سالار وحشت زدہ اس سے اپنے آپ کو چھڑانے لگا۔

”چھوڑو مجھے۔ ہاتھ نہ لگاؤ۔ مجھے جانے دو۔“

وہ بلند آواز میں روتے ہوئے بذیاتی انداز میں چلا گیا۔

”امام سے ملنا تھا تمہیں۔“ عاکف نے اسے یاد دلایا۔

”یہ امام نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے امام ہاشم۔“

”تو ٹھیک ہے۔ مگر میرے ساتھ جانا ہے تمہیں۔“

”میں چلا جاؤں گا۔ میں چلا جاؤں گا۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“ وہ اگلے قدموں اپنا کندھا اس سے چھڑا کر بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ عاکف نے لرب کچھ بڑبڑایا۔ اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ سڑ

کر وہ صنوبر کے کمرے میں گھس گیا جو اب بھی حیرانی سے لوٹوں کے ڈھیر کو دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

بیز حیاں اب بھی اسی طرح تاریک تھیں مگر اس بار وہ جس ذہنی حالت میں تھا اسے کسی دیوار، کسی سہارے، کسی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اندھا حد حندان تاریک بیز حیاں سے نیچے بھاگا اور بری طرح گرا۔ اگر بیز حیاں سیدھی ہوتیں تو وہ سیدھا نیچے جا کر گرتا مگر بیز حیاں کی گولائی نے اسے بچالیا

تھا۔ وہ اندھیرے میں ایک بار پھر اٹھا۔ گھٹنوں اور ٹخنوں میں اٹھنے والی ٹیسوں سے بے پروا اس نے

دوبارہ اسی طرح بھاگتے ہوئے سبز حیاں اترنے کی کوشش کی۔ چند سبز حیاں اترنے کے بعد لگائی جانے والی چھلانگ نے اسے پھر زمین بوس کیا تھا۔ اس بار اس کا سر بھی دیوار سے ٹکرایا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ اس کی ہڈی نہیں ٹوٹی۔ شاید سبز حیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تو وہ پھر تیسری بار اٹھ کر اس طرح سبز حیاں اترنے کی کوشش کرتا لیکن دوسری بار سبز حیوں سے گرنے کے بعد وہ نیچے والی سبز حیوں پر آ گیا تھا۔ سامنے گلی کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ سبز حیوں سے نکل آیا مگر آگے نہیں جا سکا۔ چند قدم آگے چل کر اس گھر کے باہر تھڑے پر بیٹھ گیا۔ اسے حسی محسوس ہو رہی تھی۔ سر کو تھامتے ہوئے بے اختیار اسے ابکائی آئی وہ تھڑے پر بیٹھے بیٹھے جھک گیا، وہ ابکائیاں کرتے ہوئے بھی اسی طرح رو رہا تھا۔ گلی میں سے گزرنے والے لوگوں کے لئے یہ سینا نیا نہیں تھا۔ یہاں بہت سے شرابی اور نشئی ضرورت سے زیادہ نشہ استعمال کرنے کے بعد یہی سب کچھ کیا کرتے تھے۔ صرف سالار کا لالہ اس اور طیلہ تھا جو اسے کچھ مہذب دکھا رہا تھا اور اس کے آنسو اور دواویا، کسی طوائف کی بے وفائی کا نتیجہ تھا شاید۔ وہاں کئی پارکئی مرد ایسے ہی مہذب اور معزز نظر آنے والے مرد اسی طرح رو رہے جاتے تھے۔ طوائف کا کوٹھا ہر کسی کو اس نہیں آتا۔ گزرنے والے نظر یہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ کوئی اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ اس بازار میں حال احوال جاننے کا رواج نہیں تھا۔

حاکف نیچے نہیں آیا تھا۔ آتا تو شاید سالار کے پاس زک جاتا۔ امام ہاشم وہاں نہیں تھی۔ صنوبر، امام ہاشم نہیں تھی۔ کتنا بڑا بوجہ اس کے کندھوں سے اٹھایا گیا تھا، کیسی اذیت سے اسے بچایا گیا تھا۔ تکلیف دے کر اسے آگئی نہیں دی گئی۔ صرف تکلیف کا احساس دے کر اسے آگئی سے شام کر دیا گیا تھا۔ اسے وہاں نہ دیکھ کر وہ اس حالت میں جا پہنچا تھا۔ وہ اسے وہاں دیکھ لیتا تو اس پر کیا گزرتی۔ اسے اللہ سے خوف آ رہا تھا بے پناہ خوف۔ وہ کس قدر طاقتور تھا کیا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کس قدر مہربان تھا۔ کیا نہیں کرتا تھا۔ انسان کو انسان رکھنا اسے آتا تھا۔ کبھی غضب سے، کبھی احسان سے۔ وہ اسے اس کے دائرے میں ہی رکھتا تھا۔

اسے کبھی اپنی زندگی کے اس سیاہ باب پر اتنا بچھتا، اتنی غرت نہیں ہوئی جتنی اس وقت ہو رہی تھی۔

”کیوں؟ کیوں؟ کیوں آتا تھا میں یہاں پر.....؟ کیوں خریدتا تھا میں ان عورتوں کو.....؟ کیوں گناہ کا احساس میرے اندر نہیں جاگتا تھا؟“ وہ چوتھے پر بیٹھا دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے جھک رہا تھا۔

”اور اب..... اب جب میں یہ سب کچھ چھوڑ چکا ہوں تو اب..... اب کیوں..... یہ تکلیف..... یہ جین ہو رہی ہے مجھے۔ میں جانتا ہوں۔ جانتا ہوں مجھے اپنے ہر عمل کے لئے جو اب وہ ہوتا

ہے، مگر یہ حساب یہاں..... اس طرح نہ لے۔ جس عورت سے میں محبت کرتا ہوں اسے کبھی اس بازار میں نہ پھینک۔“

دور دتے روئے زکا، کون سا انکشاف کہاں ہو رہا تھا۔

”محبت؟“ وہ گلی سے گزرتے لوگوں کو دیکھتے ہوئے بے یقینی سے بڑبڑایا۔

”یہاں میں..... میں اس سے محبت کرتا ہوں؟“ کوئی لہرا اس کے سر سے چروں تک گزری تھی۔

”کیا یہ تکلیف صرف اس لئے ہو رہی ہے مجھے کہ میں اس سے.....“ اس کے چہرے پر سامنے

لہرائے تھے۔ ”کیا وہ میرا بچھتا اور نہیں ہے۔ کچھ اور ہے.....؟“

اسے لگا وہ وہاں سے کبھی اٹھ نہیں پائے گا۔

”تو یہ بچھتا، انہیں محبت ہے، جس کے پیچھے میں بھاگتا پھر رہا ہوں۔“ اسے اپنا جسم ریت کا بنا

ہوا لگا۔

”امام پھانس نہیں ہے روگ ہے؟“ آنسو اب بھی اس کے گالوں پر بہ رہے تھے۔

”اور اس بازار میں اس عورت کی تلاش میں آئے میرے قدموں میں لرزش اس لئے تھی کیونکہ

میں نے اسے اپنے دل کے بہت اندر نہیں بہت اونچی جگہ پر رکھا تھا۔ وہاں، جہاں خود میں بھی اس کو

محسوس نہیں کر پارہا تھا۔ چیک میٹ۔“

”1۵۰ + آئی کیو لیول کا وہ مرد منہ کے بل زمین پر گر لیا گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر

روئے لگا۔ کون سا زخم تھا جو وہاں بیٹھا رہا ہو رہا تھا۔ کون سی تکلیف تھی جو سانس لینے نہیں دے رہی تھی۔

آئینے نے اسے کہاں پر ہند کیا تھا۔ اسے کیا دیا تھا؟ کیا لیا تھا؟ وہ اٹھ کر وہاں سے چلے لگا۔ اسی طرح جھک

جھک کر روئے ہوئے۔ اسے خود پر قابو نہیں تھا۔ اسے پاس سے گزرنے والوں کی نظروں کی بھی پروا نہیں

تھی۔ اسے اپنے وجود سے کبھی زندگی میں اتنی غرت محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت ہو رہی تھی۔ وہ

ریڈ لائٹ ایریا اس کی زندگی کا سب سے سیاہ باب تھا۔ ایسا سیاہ باب جسے وہ کھریج کر اپنی زندگی سے علیحدہ

نہیں کر پاتا تھا۔ وہ ایک بار پھر اس کی زندگی میں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ کئی سال پہلے وہاں گزار دی گئی راتیں

اب بلاؤں کی طرح اسے کھیرے ہوئے تھیں اور وہ ان سے فرار حاصل نہیں کر پارہا تھا اور اب جس خوف

نے اسے اپنے حصار میں لیا تھا وہ تو.....

”اگر..... اگر..... امام اس بازار میں آگئی ہوتی تو.....؟ صنوبر، امام ہاشم نہیں تھی مگر کوئی

اور.....“ اس کے سر میں درد کی ایک اور لہرا تھی۔ میگزین اب شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس کا ذہن

ماؤف ہو رہا تھا اور اسے کونجی ٹھیک سے دیکھ نہیں پارہا تھا۔ اب اس کا سر درو سے پھٹ رہا تھا پھر وہ کہیں

بیٹھ گیا تھا۔ گاڑیوں کے ہارن اور لائٹس نے اس کے درد کو اور بڑھایا تھا پھر اس کا ذہن کسی تاریکی میں

آزتا گیا تھا۔

کسی نے پکا سا قہقہہ لگایا پھر کچھ کہا۔۔۔ ایک دوسری آواز نے جو باپ کچھ کہا۔ سالار سکندر کے حواس آہستہ آہستہ کام کرنے لگے تھے۔ متضلل تھکن زدہ۔۔۔ مگر آوازوں کو شناخت کرنا ہوا ذہن۔

بہت آہستہ آہستہ اس نے آنکھیں کھولیں۔ اسے حیرانی نہیں ہوئی۔ اسے یہیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ ہاسپٹل یا کسی کلینک کے ایک کمرے میں ایک بیڈ پر تھا۔ بے حد نرم اور آرام دہ بیڈ، اس سے کچھ فاصلے پر فرقان کسی دوسرے ڈاکٹر کے ساتھ کھڑا کھلی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔ فرقان اور دوسرے ڈاکٹر نے گردن موڑ کر باتیں کرتے اسے دیکھا پھر وہ دونوں اس کی طرف چلے آئے۔ سالار نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں کھلا رکھنا اسے مشکل لگ رہا تھا۔ فرقان نے پاس آکر نرمی سے اس کے سینے کو تھپتھپایا۔

”کیسے ہوا اب سالار؟“

سالار نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے مسکرانے کی کوشش نہیں کی۔ صرف چند لمبے خالی اللذہنی کے عالم میں اسے دیکھتا رہا۔

”فائن۔۔۔ اس نے کہا۔

دوسرا ڈاکٹر اس کی نبض دیکھنے میں مصروف تھا۔

سالار نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ فرقان اور دوسرا ڈاکٹر آپس میں ایک بار پھر گفتگو میں مصروف تھے۔ اسے اس گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے کسی بھی چیز میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ باقی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ احساس جرم، بچھتاوا، عاکف، صنوبر۔۔۔ امام۔۔۔ ریڈ لائٹ ایریا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ اس کا دل چاہا کاش وہ ابھی ہوش میں نہ آتا۔

”تو سالار صاحب۔۔۔ اب کچھ تھکنا گفتگو ہو جائے آپ کے ساتھ۔“ اس نے فرقان کی آواز پر آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس کے بیڈ کے بالکل قریب ایک اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرا ڈاکٹر باہر جا چکا تھا۔ سالار نے اپنی ٹانگوں کو سینے کی کوشش کی۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی۔ اس کے نٹنے اور گھٹنوں میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں پر کھل تھا وہ انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا مگر اس کو اندازہ تھا کہ اس کے نٹنے اور گھٹنے پر کچھ لینا ہوا تھا۔ وہ اپنے کپڑوں میں بھی نہیں تھا بلکہ مریضوں کے لئے مخصوص لباس میں تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ سالار نے بے اختیار کراہ کر ٹانگ سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

”sprained ankle دونوں گھٹنوں اور calf پر کچھ خراشیں اور سوجن مگر خوش قسمتی سے کوئی فریکچر نہیں۔ ہاڈوں اور کہنوں پر بھی کچھ Bruises خوشی قسمتی سے پھر کوئی فریکچر نہیں۔ سر کے بائیں پچھلے حصے میں چھوٹا سا کٹ توڑی سی ہلڈنگ، مگر سی ٹی اسکین کے مطابق کوئی سیریس انجری نہیں۔ سینے

پر بھی رگڑ کی وجہ سے معمولی خراشیں مگر جہاں تک تمہارے سوال کا تعلق ہے کہ کیا ہوا ہے؟ تو یہ تم بتاؤ کہ کیا ہوا ہے؟“

فرقان کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح بات کرتے کرتے بولا۔ سالار چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

”میں پہلے سمجھتا رہا کہ میگزین کا ایک اتنا شدید تھا کہ تم بے ہوش ہو گئے مگر بعد میں تمہارا چیک اپ کرنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ ایسا نہیں تھا۔ کیا کسی نے حملہ کیا تھا تم پر؟“ وہ اب سنجیدہ تھا۔ سالار نے ایک گہرا سانس لینے ہوئے سر کو ہنکا۔

”تم مجھ تک کیسے پہنچے بلکہ میں یہاں کیسے پہنچا؟“

”میں تمہارے موہاگل پر تمہیں کال کر رہا تھا اور تمہارے بجائے کسی آدمی نے وہ کال ریسیو کی، وہ اس وقت فٹ پاتھ پر تمہارے قریب تھا۔ تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے مجھے تمہاری حالت کے بارے میں بتایا۔ اچھا آدمی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ تمہیں کسی ٹیکسی میں کسی قریبی ہاسپٹل لے جائے۔ وہ لے گیا پھر میں وہاں پہنچ گیا اور تمہیں یہاں لے آیا۔“

”ابھی کیا وقت ہے؟“

”صبح کے تھے بخار ہے ہیں۔ سمیر نے تمہیں رات کو پین گلرزدیے تھے اسی لئے تم ابھی تک سو رہے تھے۔“

فرقان کو بات کرتے کرتے احساس ہوا کہ وہ دلچسپی نہیں لے رہا۔ اس کی نظروں میں ایک جیب سی سرد مہری فرقان کو محسوس ہوئی تھی۔ یوں جیسے فرقان اسے کسی تیرے شخص کی حالت کے بارے میں بتا رہا تھا۔

”تم مجھے۔۔۔ دو بارہ۔۔۔“ سالار نے اسے خاموش ہوتے ہوئے دیکھ کر کہنا شروع کیا۔ پھر قدرے اُلجھن آ میر انداز میں رکا۔ آنکھیں بند کیں جیسے ذہن پر زور دے رہا ہو۔

”ہاں۔۔۔ کوئی ٹریکو لائزر دے دو۔ میں بہت لمبی ٹینڈ سوچنا چاہتا ہوں۔“

”سوچانا۔۔۔ مگر یہ تو بتاؤ۔۔۔ ہو کیا تھا؟“

”کچھ نہیں۔“ سالار نے بیزار سی سے کہا۔

”میگزین۔۔۔ اور میں فٹ پاتھ پر گر پڑا، گرنے سے چوٹیں لگ گئیں۔“

فرقان نے اسے غور سے دیکھا۔

”کچھ کھالو۔۔۔“

سالار نے اس کی بات کاٹی۔ ”نہیں۔۔۔ بھوک۔۔۔ نہیں ہے۔ تم بس مجھے کچھ دو۔۔۔ ٹیبلٹ، انجکشن، کچھ بھی، میں بہت تھکا ہوا ہوں۔“

”اسلام آیا تو تمہارے گھر والوں.....“
سالار نے اسے بات کھل کرنے نہیں دی۔
”نہیں اطلاع مت کرنا۔ میں جب سو کر اٹھوں گا تو اسلام آباد چلا جاؤں گا۔“
”اس حالت میں؟“

”تم نے کہا ہے میں ٹھیک ہوں۔“
”ٹھیک ہو کر اسے بھی ٹھیک نہیں ہو۔ دو چار دن آرام کرو۔ ہمیں رہو لاہور میں، پھر چلے جانا۔“
”اچھا پھر تم ہی کیا کوئی اطلاع مت دینا۔“
فرقان نے کچھ اچھے ہوئے انداز میں اسے دیکھا۔ اس کے ماتھے پر چند بل آگئے۔ ”اچھا۔۔۔ اور کچھ.....؟“

”ٹریکولازر.....“

فرقان اسے سوچتے ہوئے دیکھنے لگا۔

”میں رہوں تمہارے پاس۔۔۔؟“

”قائدہ.....؟ میں تو ابھی سو جاؤں گا۔ تم جاؤ۔ جب میں اٹھوں گا تو تمہیں کال کروں گا۔“

اس نے بازو کے ساتھ اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں۔ اس کے انداز میں موجود روکے پن اور سرد مہری نے فرقان کو کچھ اور پریشان کیا۔ اس کا رویہ بہت ابھرا مل تھا۔

”میں میرے بات کرتا ہوں، مگر ٹریکولازر چاہئے تو پہلے تمہیں کچھ کھانا ہو گا۔“ فرقان نے اٹھتے ہوئے دونوں انداز میں کہا۔ سالار نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا۔

دو بارہ اس کی آنکھ جس وقت کھلی اس وقت شام ہو رہی تھی۔ کمرہ خالی تھا۔ اس کے پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ جسمانی طور پر صبح سے زیادہ تھکاؤت محسوس کر رہا تھا۔ اپنی ناگوں سے کھیل کو پرے پھینک کر اس نے لینے لینے بائیں ٹخنے اور گھٹنوں میں اٹھتی ہوئی ٹیسوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ناگوں کو سیکڑ لیا۔ اسے اپنے اندر ایک عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ اتنی گھٹن جیسے کسی نے اس کے سینے کو بکڑ لیا ہو۔ وہ اسی طرح لینے لینے چھت کو گھور رہا پھر جیسے اسے کوئی خیال آیا۔

☆.....☆.....☆

وہ ہوش آ کر اپنا سامان پیک کر رہا تھا جب فرقان نے دروازے پر دستک دی۔ سالار نے دروازہ کھول دیا۔ فرقان کو دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی اس کے پیچھے آجائے گا۔

”عجیب انسان ہو تم سالار.....“ فرقان اسے دیکھتے ہی ناراضی سے بولنے لگا۔

”یوں کسی کو بتائے بغیر میرے کلینک سے چلے آئے، مجھے پریشان کر دیا۔ اوپر سے موہاگل کو بھی

آف کر رکھا ہے۔“

سالار نے کچھ نہیں کہا۔ وہ نظر اٹا ہوا ایک بار پھر اپنے بیک کے پاس آ گیا۔ جس میں وہ اپنی چیزیں پیک کر رہا تھا۔

”تم جا رہے ہو؟“ فرقان بیک دیکھ کر چو لگا۔

”ہاں.....! سالار نے بیک لٹھکی جواب دیا۔

”کہاں.....؟“ سالار نے بیک کی زپ بند کر دی اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”اسلام آباد؟“ فرقان اس کے سامنے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔

”نہیں.....؟“ سالار نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر.....؟“

”کراچی جا رہا ہوں۔“

”کس لئے؟“ فرقان نے حیرانی سے پوچھا۔

”فلائٹ ہے میری۔“

”بیرس کی؟“

”ہاں.....!“

”چار دن بعد ہے تمہاری فلائٹ، ابھی جا کر کیا کرو گے؟“ فرقان اسے دیکھنے لگا۔ میر کا اندازہ

ٹھیک تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بے حد عجیب تھے۔

”کام ہے مجھے وہاں۔“

”کیا کام ہے؟“

وہ جواب دینے کے بجائے بیڈ پر بیٹھا ٹیکس جھپکائے بغیر چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ فرقان سائیکالوجسٹ نہیں تھا۔ پھر بھی سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی آنکھوں کو پڑھنے میں اسے کوئی مشکل نہیں آتی۔ سالار کی آنکھوں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف سرد مہری تھی۔ یوں جیسے وہ کسی کو جانتا ہی نہ ہو۔ اسے اور اپنے آپ کو بھی۔ وہ ڈپریشن تھا۔ فرقان کو کوئی شبہ نہیں تھا مگر اس کا ڈپریشن اسے کہاں لے جا رہا تھا۔ فرقان یہ جاننے سے قاصر تھا۔

”تمہیں آخر کیا پریشانی ہے سالار؟“ وہ پوچھتے بغیر نہیں رہ سکا۔

سالار نے توقف کیا۔ پھر کندھے جھٹکے۔

”کوئی پریشانی نہیں ہے۔“

”تو پھر.....“ سالار نے فرقان کی بات کاٹ دی۔

”تم جانتے ہو مجھے میگرین ہے۔ کبھی کبھار اس طرح ہو جاتا ہے مجھے۔“
 ”میں ڈاکٹر ہوں سالار! فرقان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میگرین کو کوئی مجھ سے زیادہ بہتر نہیں جانتا۔ یہ سب کچھ صرف میگرین کی وجہ سے نہیں تھا۔“

”تو تم بتا دو اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“ سالار نے اُناس سے سوال کیا۔
 ”کسی لڑکی کا پر اہم ہے؟“ سالار پلکیں جھپک نہیں سکا۔ فرقان کہاں جا پہنچا تھا۔
 ”ہاں۔“ وہ نہیں جانتا اس نے ”نہیں“ کیوں نہیں کہا تھا۔
 ”کسی میں انوالو ہو تم؟“ فرقان کو اپنے اندازے کے صحیح ہونے پر جیسے یقین نہیں آیا۔
 ”ہاں۔“

فرقان بہت دیر چپ بیٹھا سے دیکھتا رہا۔ یوں جیسے اپنی بے یقینی پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔
 ”کس کے ساتھ انوالو ہو؟“
 ”تم اسے نہیں جانتے۔“

”شادی نہیں ہو سکی تمہاری اس کے ساتھ؟“ سالار اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔
 ”ہو گئی تھی۔“ اس کے لہجے میں آغ تھی۔
 ”شادی ہو گئی تھی؟“ فرقان کو پھر یقین نہیں آیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“
 ”پھر۔۔۔۔۔ طلاق ہو گئی؟“ اس نے پوچھا۔
 ”نہیں۔“

”تو؟“ سالار کے پاس آگے بتانے کے لئے کچھ نہیں تھا۔
 ”تو بس۔۔۔۔۔“

”بس کیا۔۔۔۔۔؟“ سالار اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اپنے ہاتھ کی انگلی دائیں ہاتھ میں موجود دل کی گھیر پر پھیرتا رہا۔

”کیا نام ہے اس کا؟“ فرقان نے مدغم آواز میں اس سے پوچھا۔ وہ ایک بار پھر اسی طرح لکیر کو چھوتے ہوئے بہت دیر خاموش رہا۔ بہت دیر۔۔۔۔۔ پھر اس نے کہا۔

”امام ہاشم۔“ فرقان نے بے اختیار سانس لیا۔ اسے اب کچھ میں آیا کہ وہ اس کی چھوٹی بیٹی کو ڈیڑھوں کے حساب سے تھلے تھانف کیوں دیا کرتا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے میں جب سے سالار سے اس کی شناسائی ہوئی تھی اور سالار کا اس کے گھر آنا شروع ہوا تھا سالار اور امام کی بہت دوستی ہو گئی تھی۔ وہ پاکستان سے جانے کے بعد بھی اسے وہاں سے کچھ نہ کچھ بھجواتا رہتا تھا مگر فرقان کو اکثر صرف ایک بات

پر حیرانی ہوتی تھی۔ وہ کبھی امام کا نام نہیں لیتا تھا اور خود اس سے بات کرتا تو اسے نام کے بغیر مخاطب کرتا رہتا۔ فرقان کو چند ایک بار یہ بات محسوس ہوئی تھی مگر اس نے اسے نظر انداز کر دیا تھا لیکن اب امام ہاشم کا نام سن کر وہ جان گیا تھا کہ وہ کیوں اس کا نام نہیں لیتا تھا۔

وہ اب زک زک کر رہے رہا جملوں میں مدغم آواز میں اسے اپنے اور امام کے بارے میں بتا رہا تھا۔ فرقان دم سادھے سن رہا تھا۔ جب وہ سب کچھ بتانے کے بعد خاموش ہوا تو دیر تک فرقان بھی کچھ نہیں بول سکا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ تسلی دے یا پھر کچھ اور کہے۔ کوئی نصیحت۔
 ”تم اسے بھول جاؤ۔“ اس نے بالآخر کہا۔ ”سوچ لو کہ وہ جہاں بھی ہے خوش اور محفوظ ہے۔ ضروری نہیں اس کے ساتھ کوئی سانحہ ہی ہوا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ بالکل محفوظ ہو۔“ فرقان کہہ رہا تھا۔ ”تم نے اس کی مدد کی تھی، جس حد تک تم کر سکتے تھے۔ پچھتاووں سے اپنے آپ کو نکال لو۔ اللہ مدد کرتا ہے۔ تمہارے بعد ہو سکتا ہے اسے تم سے بہتر کوئی اور مل گیا ہو۔ تم کیوں اس طرح کے وہم لئے بیٹھے ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ جلال سے اس کی شادی نہ ہونے کی وجہ تھی، جو کچھ تم نے مجھے جلال کے بارے میں بتایا ہے میرا اندازہ تو یہی ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں امام سے شادی نہ کرتا، چاہے تم سچ میں آتے نہ آتے۔ کوشش کرتے نہ کرتے۔ جہاں تک امام کو طلاق نہ دینے کا سوال ہے اسے چاہئے تھا وہ تم سے دو بارہ رابطہ کرتی۔ وہ ایسا کرتی تو تم یقیناً اسے طلاق دے دیتے۔ اگر اس معاملے میں تم سے کوئی لفظی ہوئی بھی ہے تو اللہ تمہیں معاف کر دے گا کیونکہ تم بچتا رہے ہو۔ تم اللہ سے معافی بھی مانگتے آ رہے ہو۔ یہ کافی ہے مگر اس طرح ڈپریشن کا شکار ہونے سے کیا ہو گا۔ تم اپنے آپ کو اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کرو۔“ وہ بڑی دلچسپی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ سالار کی خاموشی سے اسے امید بندھی کہ شاید اس کی کوشش رنگ لاری تھی مگر ایک لمبی تقریر کے بعد جب وہ خاموش ہوا تو سالار اٹھ کر اپنا بریف کیس کھولنے لگا۔
 ”کیا کر رہے ہو؟“ فرقان نے پوچھا۔

”میری فائنٹ کا نام ہو رہا ہے۔“ وہ اب اپنے بریف کیس میں سے کچھ چیز نکال رہا تھا۔ فرقان کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس سے کیا کہے۔

☆.....☆.....☆

وہ پچھلے کئی سالوں میں کئی بار پاکستان آتا جاتا رہا تھا اسے کبھی واپس جاتے ہوئے اس قسم کی کیفیات کا شکار نہیں ہونا پڑا تھا جس قسم کی کیفیات کا شکار وہ اس بار ہوا تھا۔ جہاز کے ٹیک آف کے وقت ایک عجیب سا حالتی پن تھا، جو اس نے اپنے اندر اترتے محسوس کیا تھا۔ اس نے جہاز کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ بہت دور تک پھیلے ہوئے اس شعلے میں نہیں امام ہاشم نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ وہاں رہتا تو کبھی کہیں کسی وقت کسی روپ میں وہ اسے نظر آ جاتی۔ اسے مل جاتی۔ یا کوئی ایسا شخص اسے مل جاتا جو اس سے واقف ہوتا لیکن

وہ اب جہاں جا رہا تھا اس زمین پر امام ہاشم کہیں نہیں تھی۔ کوئی اتفاق بھی ان دونوں کو آمنے سامنے نہیں لاسکتا تھا۔ وہ ایک بار پھر ایک لمبے عرصے کے لئے "امکان" کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ وہ زندگی میں کتنی بار "امکان" کو چھوڑ کر جاتا رہے گا۔

دس منٹ کے بعد پانی سے ٹریکو لائزرز کو نکلنے ہوئے اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ زندگی میں کہیں بھی نہیں کھڑا تھا۔ وہ زندگی میں کبھی بھی نہیں کھڑا ہو پائے گا۔ اس کے پیروں کے نیچے زمین کبھی نہیں آسکے گی۔

ساتویں منزل پر اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بھی اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا وہ کہیں اور جانا چاہتا تھا۔ کہاں.....؟

اس نے اپارٹمنٹ کے دروازے کو لاک کیا۔ لاؤج میں پڑے ٹی وی کو آن کیا۔ سی این این پر نیوزیشن آرہا تھا۔ اس نے اپنے جوتے اور جیکٹ اتار کر دور پیٹک دیئے۔ پھر ریوٹ لے کر صوفے پر لیٹ گیا۔ خانی الذہنی کے عالم میں وہ چینل بدلتا رہا۔ ایک چینل سے گونجی آواز آواز نے اسے روک لیا۔ ایک غیر معروف سا گلوکار کوئی غزل گارہا تھا۔

میری زندگی تو فریق ہے، وہ ازل سے دل میں ملیں کسی وہ نگاہ شوق سے دور ہیں، رگ جاں سے لاکھ قرین کسی اس نے ریوٹ اپنے سینے پر رکھ دیا۔ گلوکار کی آواز بہت خوب صورت تھی یا پھر شاید وہ اس کے جذبات کو الفاظ دے رہا تھا۔

ہمیں جان دینی ہے ایک دن، وہ کسی طرح وہ کہیں کسی ہمیں آپ کھینچنے دار پر جو نہیں کوئی، تو ہمیں کسی شاعری، کلاسیکل میوزک، پرانی فلمیں، انٹروینٹیل میوزک اسے ان تمام چیزوں کی worth کا اندازہ کھینچنے کچھ سالوں میں ہی بنا شروع ہوا تھا۔ کھینچنے کچھ سالوں نے اس کی موسیقی کے انتخاب کو بہت اعلیٰ کر دیا تھا اور وہ غزلیں سننے کا تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

سحر طور ہو، سحر حشر ہو، ہمیں انتظار قبول ہے وہ کبھی ملیں، وہ کہیں ملیں، وہ کبھی ملیں، وہ کہیں کسی اسے ایک بار پھر امام یاد آئی۔ اسے ہمیشہ وہی یاد آتی تھی۔ پہلے وہ صرف تہائی میں یاد آتی تھی پھر وہ نجوم میں بھی نظر آنے لگی..... اور وہ۔ وہ محبت کو بچھتاوا بھتا رہا۔

نہ ہو ان پہ جو مرا بس نہیں کہ یہ عاشقی ہے ہوس نہیں میں ان ہی کا تھا، میں ان ہی کا ہوں، وہ میرے نہیں تو نہیں کسی

سالاریک دم صوفے سے اٹھ کر کھڑکیوں کی طرف چلا گیا۔ ساتویں منزل پر کھڑے وہ رات کو روشنیوں کی ادھ میں دیکھ سکتا تھا۔ عجیب وحشت تھی جو باہر تھی۔ عجیب عالم تھا جو اندر تھا۔

جو ہو فیصلہ وہ سناہے اسے حشر پر نہ اٹھائے

جو کریں گے آپ تم وہاں، وہ ابھی کسی، وہ یہیں کسی

وہاں کھڑے کھڑکیوں کے شیشوں کے پار اندھیرے میں ٹھنڈی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے اندر اترنے کی کوشش کی۔

"میں اور کبھی کسی لڑکی سے محبت کروں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

بہت سال پہلے اکثر کہا جانے والا جملہ اسے یاد آیا۔ باہر تاریکی کچھ اور بڑھی۔ اندر آوازوں کی بازگشت..... اس نے گھٹت خوردہ انداز میں سر جھکا یا پھر چند لمحوں کے بعد دوبارہ سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ انسان کا اختیار کہاں سے شروع کہاں پر ختم ہوتا ہے؟ پرسن کا ایک اور دور، وہ باہر نظر آنے والی ٹھنڈی روشنیاں بھی اب بجھنے لگی تھیں۔

اسے دیکھنے کی جو لوگی تو نصیر دیکھ ہی لیں گے ہم

وہ ہزار آنکھ سے دور ہو، وہ ہزار پردہ نہیں کسی

سالار سکندر نے مڑ کر اس کی اسکرین کو دیکھا، گلوکار لہک لہک کر بار بار آخری شعر دہرا رہا تھا۔ کسی معمول کی طرح چلتا ہوا وہ صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ سینٹرل ٹیبل پر رکھے ہوئے بریف کیس کو کھول کر اس نے اندر سے لیپ ٹاپ نکال لیا۔

اسے دیکھنے کی جو لوگی تو نصیر دیکھ ہی لیں گے ہم

وہ ہزار آنکھ سے دور ہو، وہ ہزار پردہ نہیں کسی

گلوکار مطلق دہرا رہا تھا۔ سالار کی انگلیاں لیپ ٹاپ پر برقی رفتار سے حرکت کرتے ہوئے استغنیٰ لکھنے میں مصروف تھیں۔ کمرے میں موسیقی کی آواز اب ڈوبتی جا رہی تھی۔ استغنیٰ کی ہر لائن اس کے وجود پر چھائے جمود کو ختم کرتی جا رہی تھی وہ جیسے کسی جاوے کے حصار سے باہر آ رہا تھا۔ کوئی توڑ ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

"اپنے کیریئر کی اس اسٹیج پر اس طرح کا امتحان فیصلہ صرف تم ہی کر سکتے تھے۔"

وہ فون پر سکندر عثمان کو خاموشی سے سن رہا تھا۔

"آخر اتنی اچھی پوسٹ کو کیوں چھوڑ رہے ہو اور وہ بھی اس طرح اچانک اور چلو اگر چھوڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر اگر اپنا بزنس کرو۔ بینک میں جانے کی کیا تکلفی ہے۔" وہ اس کے فیصلے پر بری طرح تنقید کر رہے تھے۔

”میں اب پاکستان میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ بس اسی لئے چاب چھوڑ دی۔ بزنس میں نہیں کر سکتا اور بینک کی آخر میرے پاس بہت عرصے سے تھی۔ وہ مجھے پاکستان پوسٹ کرنے پر تیار ہیں، اس لئے میں اسے قبول کر رہا ہوں۔“ اس نے تمام سوالوں کا اکتھا جواب دیا۔

”پھر بینک کو بھی جوائن مت کرو، میرے ساتھ آکر کام کرو۔“

”میں نہیں کر سکتا پاپا! مجھے مجبور نہ کریں۔“

”تو پھر وہیں پر رہو۔ پاکستان آنے کی کیا تک ہفتی ہے؟“

”میں یہاں پر رہ نہیں پا رہا۔“

”جب وطنی کا کوئی دورہ پڑا ہے تمہیں؟“

”نہیں۔“

”تو پھر.....؟“

”میں آپ لوگوں کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔“ اس نے بات بدلی۔

”خیر یہ فیصلہ کم از کم ہماری وجہ سے تو نہیں کیا گیا۔“ سکندر عثمان کا لہجہ نرم ہوا۔

سالار خاموش رہا۔ سکندر عثمان بھی کچھ دیر خاموش رہے۔

”فیصلہ تو تم کری چکے ہو۔ میں اب اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کر سکتا۔ ٹھیک ہے آنا چاہتے ہو آ جاؤ۔ کچھ عرصہ بینک میں کام کر کے بھی دیکھ لو لیکن میری خواہش یہی ہے کہ تم میرے ساتھ، میرے بزنس کو دیکھو۔“ سکندر عثمان نے جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

”تمہارا تو پی ایچ ڈی کا بھی ارادہ تھا۔ اس کا کیا ہوا؟“ سکندر عثمان کو بات ختم کرتے کرتے پھر

یاد آیا۔

”فی الحال میں مزید اسٹیڈیز نہیں کرنا چاہ رہا۔ ہو سکتا ہے کچھ سالوں کے بعد پی ایچ ڈی کے لئے دوبارہ باہر چلا جاؤں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پی ایچ ڈی کروں ہی نہ۔“ سالار نے مدغم آواز میں کہا۔

”تم اس اسکول کی وجہ سے آرہے ہو؟“ سکندر عثمان نے اچانک کہا۔ ”شاید.....“ سالار نے تردید نہیں کی۔ وہ اگر اسکول کو اس کی واپسی کی وجہ سمجھ رہے تھے تو بھی کوئی حرج نہیں تھا۔

”ایک بار پھر سوچ لو سالار!.....“ سکندر کے بغیر نہیں رہ سکے۔

”بہت کم لوگوں کو کیریئر میں اس طرح کا اشارہ ملتا ہے جس طرح کا تمہیں ملا ہے۔ تم سن رہے ہو؟“

”جی.....!“ اس نے صرف ایک لفظ کہا۔

”باقی تم پیچور ہو، اپنے فیصلے خود کر سکتے ہو۔“ انہوں نے ایک طویل کال کے اختتام پر فون بند

کرنے سے پہلے کہا۔

سالار نے فون رکھنے کے بعد پارٹمنٹ کی دیواروں پر ایک نظر دوڑائی۔ اٹھارہ دن کے بعد اسے یہ پارٹمنٹ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا تھا۔

☆.....☆.....☆

پیرس سے واپسی پر اس کی زندگی کے ایک نئے فیر کا آغاز ہوا تھا۔ ابتدائی طور پر وہ اسلام آباد میں اس خیرگی بینک میں کام کر رہا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد وہ اسی بینک کی ایک نئی برانچ کے ساتھ لاہور چلا آیا۔ اسے کراچی جانے کا موقع بھی مل رہا تھا مگر اس نے لاہور کا انتخاب کیا تھا۔ اسے یہاں ڈاکٹر سید علی کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔

پاکستان میں اس کی مصروفیات کی نوعیت تبدیل ہو گئی تھی مگر ان میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ یہاں بھی دن رات مصروف رہتا تھا۔ ایک exceptional ماہر معاشیات کے طور پر اس کی شہرت اس کے ساتھ ساتھ سزا کر رہی تھی۔ حکومتی حلقوں کے لئے اس کا نام نیا نہیں تھا مگر پاکستان آ جانے کے بعد فنانس منسٹری مختلف مواقع پر وقتاً فوقتاً اپنے زیر تربیت آفیسرز کو دینے جانے والے ٹیچرز کے لئے اسے بلواتی رہتی۔ ٹیچرز کا سلسلہ بھی اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ yale میں زیر تعلیم رہنے کے بعد وہ وہاں مختلف کلاسز کو ٹیچر دیتا رہا تھا یہ سلسلہ نیویارک منتقل ہو جانے کے بعد بھی جاری رہا۔ جہاں وہ کولمبیا یونیورسٹی میں بیومن ڈیولپمنٹ پر ہونے والے سیمینارز میں حصہ لیتا رہا بعد میں اس کی توجہ ایک ہار پھر اکتانکس کی طرف مبذول ہو گئی۔

پاکستان میں بھی بہت جلد وہ ان سیمینارز کے ساتھ انوالو ہو گیا تھا۔ جو FAST اور LUMS، IBA اور FAST جیسے ادارے کروارہے تھے۔ اکتانکس اور بیومن ڈیولپمنٹ واحد موضوعات تھے جن پر وہ خاموشی اختیار نہیں کیا کرتا تھا۔ وہ اس کے پسندیدہ موضوع گفتگو تھے اور سیمینارز میں اس کے ٹیچرز کا فیڈ بیک ہمیشہ بہت زبردست رہتا تھا۔

وہ مہینے کا ایک ویک اینڈ گاؤں میں اپنے اسکول میں گزارا کرتا تھا اور وہاں رہنے کے دوران وہ زندگی کے ایک نئے رخ سے آشنائی حاصل کر رہا تھا۔

”مہ نے اپنی غربت اپنے دیہات میں چھپا دی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے لوگ مٹی کو کارپٹ کے نیچے چھپا دیتے ہیں۔“

”اس اسکول کی تعمیر کا آغاز کرتے ہوئے فرقان نے ایک بار اس سے کہا تھا اور وہاں گزارے جانے والے دن اسے اس جیلے کی ہولناکی کا احساس دلاتے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں غربت کی موجودگی سے نا آشنا تھا۔ وہ یونیورسٹی اور یونیورسٹی میں کام کے دوران دوسرے ایشیائی ممالک کے ساتھ

ساتھ پاکستان کے بارے میں بھی بہت ساری رپورٹس دیکھتا رہا مگر پاکستان میں غربت کی آخری حدوں کو بھی پار کر جانے والے لوگوں کو وہ پہلی بار ذاتی طور پر دیکھ رہا تھا۔

"پاکستان کے دس پندرہ بڑے شہروں سے نکل جائیں تو احساس ہوتا ہے کہ چھوٹے شہروں میں رہنے والے لوگ تیسری دنیا میں نہیں، دسویں بارہویں دنیا میں رہتے ہیں۔ وہاں تو لوگوں کے پاس نہ روزگار ہے، نہ سہولتیں۔ وہ اپنی آدمی زندگی خواہش میں گزارتے ہیں اور آدمی حسرت میں جلتا ہو کر کون سی اخلاقیات سکھا سکتے ہیں آپ اس شخص کو جس کا دن سوکھی روٹی سے شروع ہوتا ہے اور فالتے پر ختم ہو جاتا ہے اور ہم۔۔۔ ہم لوگوں کی بھوک مٹانے کے بجائے مسجدوں پر مسجدیں تعمیر کرتے ہیں۔ عالی شان مسجدیں، پر شکوہ مسجدیں، ماربل سے آراستہ مسجدیں۔ بعض دفعہ تو ایک ہی سڑک پر دس دس مسجدیں کھڑی ہوتی ہیں۔ نمازیوں سے خالی مسجدیں۔"

فرقان کھٹی سے کہتا تھا۔

"اس ملک میں اتنی مسجدیں ہو چکی ہیں کہ اگر پورا پاکستان ایک وقت کی نماز کے لئے مسجدوں میں اکٹھا ہو جائے تو بھی بہت سی مسجدیں خالی رہ جائیں گی۔ میں مسجدیں بنانے پر یقین نہیں رکھتا جہاں لوگ بھوک سے خود کشیاں کرتے پھر رہے ہوں جہاں کچھ خاص طبقوں کی پوری پوری نسل جہالت کے اندھیروں میں جھکتی پھر رہی ہو وہاں مسجد کے بجائے مدرسے کی ضرورت ہے۔ اسکول کی ضرورت ہے، تعلیم اور شعور ہو گا اور رزق کمانے کے مواقع تو اللہ سے محبت ہو گی ورنہ صرف شکوہ ہی ہو گا۔"

وہ فرقان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہتا تھا۔ اس نے مستقل طور پر گھاؤں میں جانا شروع کیا تو اسے اندازہ ہوا فرقان ٹھیک کہتا تھا۔ غربت لوگوں کو کفر تک لے گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی ضرورتیں ان کے اعصاب پر سوار تھیں اور جو ان معمولی ضرورتوں کو پورا کر دیتا وہ جیسے اس کی غلامی کرنے پر تیار ہو جاتے۔ اس نے جس ویک اینڈ پر گھاؤں جانا ہوتا اسکول میں لوگ اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے جمع ہوتے۔ بعض دفعہ لوگوں کی قطاریں ہوتیں۔

"بچے کو شہر کی کسی گیسٹری میں کام پر رکھو ادیں۔ چاہے ہزار روپیہ ہی مل جائے مگر کچھ پیسہ تو آئے۔"

"وہ ہزار روپیہ مل جاتے تو میں اپنی بیٹی کی شادی کر دیتا۔"

"پارٹ نے ساری فصل خراب کر دی۔ اگلی فصل لگانے کے لئے بیج خریدنے تک کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ آپ تھوڑے پیسے قرض کے طور پر دے دیں، میں فصل کٹنے کے بعد دے دوں گا۔"

"بچے کو پولیس نے پکڑ لیا ہے، قصور بھی نہیں بتاتے، بس کہتے ہیں ہماری مرضی جب تک چاہیں اندر رکھیں، تم آئی بی کے پاس جاؤ۔"

"پنڈاری میری زمین پر جھگڑا کر رہا ہے۔ کسی اور کو الٹ کر رہا ہے۔ کہتا ہے میرے کاغذ جعلی ہیں۔"

"بیٹا کام کے لئے پاس کے گاؤں جاتا ہے۔ روز آٹھ میل چل کر آتا جانا پڑتا ہے۔ آپ ایک سائیکل لے دیں تو صہریانی ہو گی۔"

"گھر میں پانی کا بیڑ پمپ لگوانا ہے۔ آپ مدد کر دیں۔"

وہ تعجب سے ان درخواستوں کو سنتا تھا۔ کیا لوگوں کے یہ معمولی کام بھی ان کے لئے پہاڑ بن چکے ہیں۔ ایسا پہاڑ جسے عبور کرنے کے لئے وہ زندگی کے کئی سال ضائع کر دیتے ہیں۔ وہ سوچتا۔

مہینے کے ایک ویک اینڈ پر جب وہ وہاں آتا تو اپنے ساتھ دس پندرہ ہزار روپے زیادہ لے کر آتا اور روپے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بہت سے لوگوں کو بظاہر بڑی لیکن حقیقتاً بہت چھوٹی ضرورتیں پوری کر دیتے۔ ان کی زندگی میں کچھ آسانیاں لے آتے، اس کے کھسے ہوئے پنڈ سفارشی رشتے اور فون کا لڑ ان لوگوں کے کندھوں کے بوجھ اور بیروں میں پڑی نہ نظر آنے والی بیڑیوں کو کیسے اتار دیتے۔ اس کا احساس شاید سالار کو خود بھی نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

لاہور میں اپنے قیام کے دوران وہ باقاعدگی سے ڈاکٹر سہیل علی صاحب کے پاس جاتا تھا۔ ان کے ہاں ہر رات عشاء کی نماز کے بعد کچھ لوگ جمع ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کسی نہ کسی موضوع پر بات کیا کرتے تھے۔ بعض دفعہ اس موضوع کا انتخاب وہ خود کرتے بعض دفعہ ان کے پاس آنے والے لوگوں میں سے کوئی ان سے سوال کرتا اور پھر یہ سوال اس رات کا موضوع گفتگو بن جاتا۔ عام اسکالرز کے برعکس ڈاکٹر سہیل علی صاحب صرف خود نہیں بولتے تھے، نہ ہی انہوں نے اپنے پاس آنے والے لوگوں کو صرف سامع بنا دیا تھا بلکہ وہ اکثر اپنی بات کے دوران ہی چھوٹے موٹے سوالات کرتے رہتے اور پھر ان سوالات کا جواب دینے کے لئے نہ صرف لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے بلکہ ان کی رائے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ان کے اعتراضات کو بڑے تحمل اور بردباری سے سنتے۔ ان کے پاس آنے والوں میں صرف سالار سکندر تھا، جس نے ان سے کبھی سوال کیا تھا نہ کبھی ان کے کسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ کبھی کسی بات پر اعتراض کرنے والوں میں شامل ہوا نہ کسی بات پر رائے دینے والوں میں۔

وہ فرقان کے ساتھ آتا۔ فرقان نہ آتا تو اکیلا چلا آتا، مگر اسے کے آخری حصے میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ جاتا، خاموشی سے ڈاکٹر صاحب اور وہاں موجود لوگوں کی گفتگو سنتا۔ بعض دفعہ اپنے دائیں ہاتھیں آبیٹھنے والے لوگوں کے استخارہ پر اپنا ایک جملہ تعارف پیش کرتا۔

"میں سالار سکندر ہوں، ایک پیکی میں کام کرتا ہوں۔"

وہ جب تک امریکہ میں رہتا تھا ہر پختے ایک بار وہاں سے ڈاکٹر سہیل علی کو فون کرتا مگر فون پر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہونے والی اس کی گفتگو بہت مختصر اور ایک ہی نوعیت کی ہوتی تھی۔ وہ کمال

کر تا، ڈاکٹر صاحب کال ریسیو کرتے اور ایک ہی سوال کرتے۔

وہ پہلی بار اس سوال پر تب چونکا تھا جب وہ پاکستان سے چند دن پہلے ہی امریکہ آیا تھا اور ڈاکٹر صاحب اس کی واپسی کا پوچھ رہے تھے۔ اسے تعجب ہوا تھا۔
 ”ابھی تو نہیں۔“ اس نے سمجھ نہ سکتے ہوئے کہا تھا۔ بعد میں وہ سوال اسے کبھی عجیب نہیں لگا کیونکہ وہ لاشعوری طور پر جان گیا تھا کہ وہ کیا پوچھ رہے تھے۔

آخری بار انہوں نے وہ سوال اس سے تب کیا تھا جب وہ امامہ کی تلاش میں ریڈلائٹ ایریا میں پہنچا تھا۔ پیرس واپس پہنچنے کے ایک ہفتے کے بعد اس نے بیوہ کی طرح انہیں کال کیا تھا۔ بیوہ جیسی گفتگو کے بعد گفتگو اسی سوال پر آچکی تھی۔

”واپس پاکستان کب آرہے ہیں؟“

بے اختیار سالار کول بھر آیا۔ اسے خود کو کیوں کرنے میں کچھ دیر لگی۔

”اگلے ماہ آ جاؤں گا۔ میں ریڈائن کر رہا ہوں۔ واپس آکر پاکستان میں ہی کام کروں گا۔“

”پھر ٹھیک ہے، آپ سے اگلے ماہ ملاقات ہوگی۔“ ڈاکٹر صاحب نے تب کہا تھا۔

”دعا کیجئے گا۔“ سالار آخر میں کہتا۔

”کروں گا کچھ اور.....؟“

”اور کچھ نہیں۔ اللہ حافظ۔“ وہ کہتا۔

”اللہ حافظ۔“ وہ جواب دیتے۔ گفتگو کا یہ سلسلہ پاکستان آنے تک جاری رہا جب وہ ان کے پاس باقاعدگی سے جانے لگا تو یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

لاہور آنے کے بعد وہ باقاعدگی سے ان کے پاس جانے لگا تھا۔ اسے ان کے پاس سکون ملتا تھا۔ صرف ان کے پاس گزارا ہوا وقت ایسا ہوتا تھا جب وہ کچھ دیر کے لئے مکمل طور پر اپنے ذہن پریشن سے آزادی حاصل کر لیتا تھا۔ بعض دفعہ ان کے پاس خاموش بیٹھے بیٹھے بے اختیار اس کا دل چاہتا وہ ان کے سامنے وہ سب کچھ اگل دے جسے وہ اتنے سالوں سے اپنے اندر زہر کی طرح بھرے پھر رہا تھا۔ پیچھا، احساسِ جرم۔ بے چینی، بے بسی، شرمندگی، ندامت، ہر چیز۔ پھر اسے خوف پیدا ہوتا ڈاکٹر صاحب علی اس کو چاہتے تھے کن نظروں سے دیکھیں گے۔ اس کی ہمت دم توڑ جاتی۔

ڈاکٹر سید سید علی ایہام کو دور کرنے میں کمال رکھتے تھے۔ وہ ان کے پاس خاموش بیٹھا رہتا۔ صرف سنتا، صرف سمجھتا، صرف نتیجے اخذ کرتا۔ کوئی وحدت تھی جو سمجھ رہی تھی۔ کوئی چیز تھی جو نظر آنے لگی تھی۔ جن سوالوں کو وہ کئی سالوں سے سر پر بوجھ کی صورت میں لئے پھر رہا تھا ان کے پاس ان کے جواب تھے۔

”اسلام کو سمجھ کر سیکھیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ اس میں کتنی وسعت ہے۔ یہ ننگ نظری اور ننگ دل کا دین نہیں ہے نہ ہی ان دونوں چیزوں کی اس میں گنجائش ہے۔ یہ میں سے شروع ہو کر ہم پر جاتا ہے۔ فرد سے معاشرے تک۔ اسلام آپ سے یہ نہیں کہتا کہ آپ چوتھیں گھنٹے سر پر ٹوپی، ہاتھ میں تسبیح پکڑے ہر جگہ مسٹے بچھائے بیٹھے رہیں۔ ہر بات میں اس کے حوالے دیتے رہیں۔ نہیں، یہ تو آپ کی زندگی سے۔ آپ کی اپنی زندگی سے حوالہ چاہتا ہے۔ یہ تو آپ سے راست بازی اور پارسانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ دیانت داری اور ننگن چاہتا ہے۔ اخلاص اور استقامت مانگتا ہے۔ ایک اچھا مسلمان اپنا ہاتھ سے نہیں اپنے کردار سے دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔“

سالار ان کی باتوں کو ایک چھوٹے سے ریکارڈ میں ریکارڈ کر لیتا پھر گھر آکر بھی سنتا رہتا۔ اسے ایک دہریہ کی تلاش تھی، ڈاکٹر سید علی کی صورت میں اسے وہ دہریہ مل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”سالار آؤ، اب ابھی جاؤ۔ کتنی ختمیں کرواؤ گے؟“ انیتا نے اس کا بازو کھینچتے ہوئے ناراضی سے کہا۔ وہ عمار کی شادی میں شرکت کے لئے اسلام آباد آیا ہوا تھا۔ تین دن کی چھٹی لے کر حالانکہ اس کے گھر والوں کا اصرار تھا کہ وہ ایک ہفتے کے لئے آئے۔ شادی کی تقریبات کئی دن پہلے شروع ہو چکی تھیں۔ وہ ان تقریبات کی ”اہمیت“ اور ”نوعیت“ سے واقف تھا۔ اس لئے گھر والوں کے اصرار کے باوجود وہ تین دن کی رخصت لے کر آیا اور اب وہ عمار کی مہندی کے قتلشن میں شرکت کر رہا تھا جو عمار اور اس کے سسرال والے مل کر کر رہے تھے۔ عمار اور اسرٹی دونوں کے عزیز واقارب اور دوست مختلف فلمی اور پاپ گانوں پر رقص کرنے میں مصروف تھے۔ ایک طوفان بدتمیزی تھا جو وہاں برپا تھا۔ سیلو بیس شرس، کھلے گلے، جسم کے ساتھ چپکے ہوئے کپڑے، ہارک لیوسات، سنگ اور شیلون کی ساز حیاں، میٹ کے باؤڈ، اس کی فیملی کی عورتیں بھی دوسری عورتوں کی طرح اسی طرح کے لیوسات پہنے ہوئے تھیں۔

مسکد گید رنگ تھی اور وہ تقریب شروع ہونے پر اس ہنگامے سے کافی دور کچھ ایسے لوگوں کے پاس بیٹھا ہوا تھا جو کارپورٹ یا بینکنگ سکٹور سے تعلق رکھتے تھے اور سکندر یا اس کے اپنے بھائیوں کے شناسا تھے۔

مگر پھر مہندی کی رسومات کا آغاز ہونے لگا اور انیتا اسے اسٹیج کی طرف لے گئی۔ اسرٹی اور عمار بے تکلفی سے اسٹیج پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ پہلی بار اسرٹی سے مل رہا تھا۔ عمار نے اس کا اور اسرٹی کا تعارف کروایا۔ مہندی کی رسومات کے بعد اس نے وہاں سے جانے کی کوشش کی مگر کامران اور طیب نے اسے زبردستی روک دیا۔

”بھائی کی مہندی ہو رہی ہے اور تم اس طرح وہاں کونے میں بیٹھے ہو۔“ طیبہ نے اسے ڈانٹا تھا۔
”جسمیں یہاں ہونا چاہئے۔“

وہ ان کے کہنے پر وہیں کامران اور اس کی بیوی کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ایک کزن نے ایک بار پھر وہ دوپٹہ اس کے گلے میں ڈالنے کی کوشش کی جو وہ سب ڈالے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر قدرے ناگواری سے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے اسے سمجھائی۔

اگلے چند منٹوں کے بعد وہاں رقص شروع ہو چکا تھا۔ عمار سمیت اس کے سارے بہن بھائی اور کنز رقص کر رہے تھے اور اپنی اپنے سے بھی کھینچنا شروع کر دیا تھا۔

”نہیں اپنا میں نہیں کر سکتا۔ مجھے نہیں آتا۔“

اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے معذرت کی مگر اس کی معذرت قبول کرنے کے بجائے وہ اور عمار اسے کھینچ کر رقص کرنے والوں کے جہوم میں لے آئے تھے۔ کامران اور معیز کی شادی میں وہ بھی ایسے ہی رقص کرتا رہا تھا، مگر عمار کی مہندی پر وہ پچھلے سات سالوں میں اتنا لہذا ہنی سڑنے کر چکا تھا کہ وہاں اس جہوم کے درمیان خالی بازو کھڑے کرنا بھی اس کے لئے دشوار تھا۔ قدرے بے بس مسکراہٹ کے ساتھ وہ اسی طرح جہوم کے درمیان کھڑا رہا پھر اس نے اپنا کے کان میں کہا۔

”اپنا..... میں ڈانس بھول چکا ہوں۔ Please Let me go (براہ مہربانی مجھے جانے دو)۔“

”تم کرنا شروع کرو..... آجائے گا۔“ اپنا نے جو اب اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اب اسرئی بھی اس جہوم میں شامل ہو چکی تھی۔

”میں نہیں کر سکتا۔ تم لوگ کرو۔ میں انجوائے کر رہا ہوں۔ مجھے جانے دو۔“

اس نے مسکراتے ہوئے نکلنے کی کوشش کی۔ اسرئی کی آمد نے اسے اس کوشش میں کامیاب کر دیا۔
”عروج ہر قوم، ہر نسل کا خواب ہوتا ہے اور پھر وہ قومیں جن پر الہامی کتابیں نازل ہوئی ہوں وہ تو عروج کو اپنا حق سمجھتی ہیں مگر کبھی کبھی قوم پر عروج صرف اس بنا پر نہیں آیا کہ اسے ایک کتاب اور نبی دے دیا گیا جب تک اس قوم نے اپنے اعمال اور افعال سے عروج کے لئے اپنی اہلیت ثابت نہیں کر دی وہ کسی مرتبہ، کسی مقام، کسی فضیلت کے قائل نہیں ٹھہریں۔ مسلمان قوم یا امت کے ساتھ بھی ایسا ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے اعلیٰ طبقات قبیل اور نسل پرستی کا شکار ہیں۔ یہ دونوں چیزیں وہاں کی طرح ہوتی ہیں۔ ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے اور پھر یہ سلسلہ کہیں رکتا نہیں۔“ اسے وہاں کھڑے ان ناچتی ہوئے عورتوں اور مردوں کے جہوم کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ڈاکٹر سہیل علی کی باتیں یاد آنے لگیں۔

”مومن عیاش نہیں ہوتا نہ تب جب وہ رعایا ہوتا ہے نہ تب جب وہ حکمران ہوتا ہے۔ اس کی

زندگی کسی جانور یا کیرے کی زندگی جیسی نہیں ہوتی۔ کھانا چننا، اپنی نسل کو آگے بڑھانا اور فنا ہو جانا۔ یہ کسی جانور کی زندگی کا انداز تو ہو سکا ہے مگر کسی مسلمان کی نہیں۔“ سالار بے اختیار مسکرایا۔ وہ آج پھر ”جانوروں“ اور ”حشرات الارض“ کا ایک گروہ دیکھ رہا تھا۔ اسے خوشی ہوئی، وہ بہت عرصہ پہلے ان میں سے نکل چکا تھا۔ وہاں ہر ایک خوش باش، پرسکون اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ بلند قمیض اور چمکدار چہرے اور آنکھیں۔ اس کے سامنے طیبہ عمار کے سر کے ساتھ رقص کر رہی تھیں۔ اپنا اپنے سب سے بڑے بھائی کامران کے ساتھ۔

سالار نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے دائیں کینٹی کو مسلا۔ شاید یہ تیز میوزک تھا یا پھر اس وقت اس کا ذہنی اضطراب اسے اپنی کینٹی میں ہلکی سی درد کی لہر گزرتی محسوس ہوئی۔ اپنے گلاسز اتار کر اس نے ہاتھ ہاتھ سے اپنی دونوں آنکھیں مسلیں۔ وہ بارہ گلاسز آنکھوں پر لگاتے ہوئے اس نے مڑ کر راست تلاش کرنے کی کوشش کی، کچھ جدوجہد کے بعد وہ اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے اس دائرے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسے بخوشی راستہ دے دیا گیا۔

”کدھر جا رہے ہو؟“ بے ہنگم شور میں طیبہ نے بلند آواز میں جانے سے پہلے اس کا بازو پکڑ کر پوچھا تھا۔ وہ ابھی رقص کرتے کرتے کچھ تھک کر اس کے پاس کھڑی ہوئی تھیں ان کا سانس پھولا ہوا تھا۔
”مئی! میں ابھی آتا ہوں۔ نماز پڑھ کر۔“

”آج رہنے دو.....“

سالار مسکرایا مگر اس نے جواب میں کچھ کہا نہیں بلکہ لٹی میں اپنا سر بلاتے ہوئے نرمی سے ان کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹا دیا۔

وہ اب باہر نکلنے کی تھک دوہ کر رہا تھا۔

”یہ کبھی نارمل نہیں ہو سکتا۔ زندگی کو انجوائے کرنا بھی ایک آرٹ ہے اور یہ آرٹ اس بے وقوف کو کبھی نہیں آئے گا۔“ انہوں نے اپنے تیسرے بیٹے کی پشت کو دیکھتے ہوئے قدرے افسوس سے سوچا۔
سالار نے اس جہوم سے نکل کر بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔

وہ جس وقت نماز پڑھنے کے لئے اپنے گھر کے گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ سحر اس وقت بھی گانے میں مصروف تھا۔ اس وقت مسجد کی طرف جانے والا وہ اکیلا تھا۔ شاید گاڑیوں کی لمبی قطاروں کے درمیان سے سڑک پر چلتے ہوئے وہ مسلسل ڈاکٹر سہیل علی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ ”سیکڑوں“ کے اس مجمع کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا جو اس کے گھر پر تاج گانے میں مصروف تھے۔ مسجد میں کل ”چودہ“ لوگوں نے باجماعت نماز ادا کی تھی۔

پستان آنے کے بعد اسلام آباد اپنی پوسٹنگ کے دوران وہ سکندر عثمان کے گھر پر ہی رہتا رہا۔ لاہور آنے کے بعد بھی کسی پوش علاقے میں کوئی بڑا گھر رکھنے کے لئے منتخب کرنے کے بجائے اس نے فرقان کی بلڈنگ میں ایک فلیٹ کرائے پر لینے کو ترجیح دی۔

فرقان کے پاس فلیٹ لینے کی ایک وجہ اگر یہ تھی کہ وہ لاہور میں اپنی عدم موجودگی کے دوران فلیٹ کے بارے میں کسی عدم تحفظ کا شکار نہیں ہوتا تھا تو دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ فلیٹ کے بجائے کوئی گھر لینے پر اسے دو چار ملازم مستقل رکھنے پڑتے جب کہ اس کا بہت کم وقت فلیٹ پر گزارنا تھا۔ فرقان کے ساتھ آہستہ آہستہ لاہور میں اس کا سوشل سرکل بہت وسیع ہونے لگا تھا۔ فرقان بہت سوشل آدمی تھا اور اس کا حلقہ احباب بھی خاصا لمبا چڑا تھا۔ وہ سالار کے موڈ اور نمبرامنٹ کو سمجھنے کے باوجود اسے وہ خاص فوٹا اپنے ساتھ مختلف جگہوں پر کھینچتا رہتا۔

وہ اس رات فرقان کے ساتھ اس کے کسی ڈاکٹر دوست کی ایک پارٹی اور محفل غزل میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ وہ ایک فارم پر ہونے والی پارٹی تھی۔ اس نے سالار کو مدعو کر لیا اور محفل غزل کا سن کر وہ انکار نہیں کر سکا۔

فارم پر شہر کی ایلٹ کلاس کا اجتماع تھا۔ وہ ان میں سے اکثریت کو جانتا تھا۔ وہ اپنے شناسا کچھ لوگوں کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ ڈرنجیل رہا تھا اور ان ہی باتوں کے دوران اس نے فرقان کی تلاش میں نظر دوڑائی تھی وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ سالار ایک بار پھر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کھانے کے بعد اسے چند لوگوں کے ساتھ فرقان کھڑا نظر آ گیا۔ وہ بھی اس طرف بڑھ آیا۔

”آؤ سالار! میں تمہارا تعارف کروا تا ہوں۔“ فرقان نے اس کے قریب آنے پر چند جملوں کے تبادلے کے بعد کہا۔ ”یہ ڈاکٹر ضابطہ ہیں۔ گنگرام ہاسپتال میں کام کرتے ہیں۔ چاکلڈا اسپیشلسٹ ہیں۔“ سالار نے ہاتھ ملایا۔

”یہ ڈاکٹر جلال انصر ہیں۔“ سالار کو اس شخص سے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ فرقان اب کیا کہہ رہا تھا وہ سن نہیں پایا۔ اس نے جلال انصر کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ دونوں کے درمیان بہت رسمی سا مصافحہ ہوا۔ جلال انصر نے بھی یقیناً اسے پہچان لیا تھا۔

سالار وہاں ایک اچھی شام گزارنے آیا تھا مگر اس وقت اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک اور بری رات گزارنے آیا تھا۔ یادوں کا ایک سیلاب تھا جو ایک بار پھر ہر بند توڑ کر اس پر چڑھائی کر رہا تھا۔ وہ سب اب اس طرف جا رہے تھے جہاں بیٹھے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ اب فرقان تھا۔ جلال انصر اب اس سے کچھ آگے دوسرے ڈاکٹر کے ساتھ تھا۔ سالار نے سنے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کی پشت کو دیکھا۔

دشت تنہائی میں اے جان جہاں

لرزاں ہیں

تیری آواز کے سائے

تیرے ہونٹوں کے سراب

اقبال بانو کا ناشروع کر چکی تھیں۔

دشت تنہائی میں

ذوری کے

خس و خاشاک سے

نکل رہے ہیں

تیرے پہلو کے سخن اور گلاب

اس کے ارد گرد بیٹھے لوگ اپنا سر دھن رہے تھے۔ سالار چند ٹیبلوں کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے اس

شخص کو دیکھ رہا تھا جو اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ اسے زندگی

میں کبھی کسی شخص کو دیکھ کر رشک نہیں آیا تھا، اس دن پہلی بار آ رہا تھا۔

آدھا گھنٹہ گزر جانے کے بعد اس نے فرقان سے کہا۔

”چلیں؟“ فرقان نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کہاں...؟“

”گھر۔“

”ابھی تو پروگرام شروع ہوا ہے۔ تمہیں بتایا تو تھا، رات دیر تک یہ محفل چلے گی۔“

”ہاں، مگر میں جانا چاہتا ہوں۔ کسی کے ساتھ بیگو اور۔ تم بعد میں آ جانا۔“

فرقان نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

”تم کیوں جانا چاہتے ہو؟“

”مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔“ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”اقبال بانو کو سنتے ہوئے بھی کوئی دوسرا کام یاد آ گیا ہے؟“ فرقان نے قدر سے ملامتی انداز

میں کہا۔

”تم بیٹھو میں چلا جاتا ہوں۔“ سالار نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے کھڑے ہونے ہوئے کہا۔

”عجیب باتیں کرتے ہو۔ یہاں سے کیسے جاؤ گے۔ فارم اتنا دور ہے۔ چلو اگر اتنی ہی جلدی ہے تو

چلے ہیں۔“ فرقان بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میزبان سے اجازت لیتے ہوئے وہ دونوں فرقان کی گاڑی میں آ بیٹھے۔

”اب تازہ۔ یوں اچانک کیا ہوا ہے؟“ گاڑی کو فارم سے باہر لاتے ہوئے فرقان نے کہا۔

”میرا وہاں ٹھہرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔“

”کیوں.....؟“ سالار نے جواب نہیں دیا۔ وہ باہر سڑک کو دیکھتا رہا۔

”وہاں سے اٹھ آئے کی وجہ جلال ہے؟“

سالار نے بے اختیار گردن موڑ کر فرقان کو دیکھا۔ فرقان نے ایک گہرا سانس لیا۔

”یعنی میرا اندازہ ٹھیک ہے۔ تم جلال انصر کی وجہ سے ہی فنکشن سے بھاگ آئے ہو۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ سالار نے ہتھیار ڈالنے والے انداز میں کہا۔

”تم دونوں بڑے عجیب انداز میں آپس میں ملے تھے۔ جلال انصر نے خلاف معمول تمہیں کوئی

اہمیت نہیں دی جب کہ تمہارے جیسی شہرت والے ٹینکر کے سامنے تو اس جیسے آدمی کو کھل اٹھنا چاہئے

تھا۔ وہ تعلقات بنانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا، خود تم بھی مسلسل اسے دیکھ رہے تھے۔“ فرقان بہت

آرام سے کہہ رہا تھا۔

”تم جلال انصر کو جانتے ہو؟“

سالار نے گردن سیدھی کر لی۔ وہ ایک بار پھر سڑک کو دیکھ رہا تھا۔

”امامہ اسی شخص سے شادی کرنا چاہتی تھی۔“ بہت دیر بعد اس نے مدہم آواز میں کہا۔ فرقان کچھ

بول نہیں سکا۔ اسے توقع نہیں تھی جلال اور سالار کے درمیان اس طرح کی شناسائی ہوگی ورنہ وہ شاید یہ

سوال بھی نہ کرتا۔

گاڑی میں بہت دیر خاموشی رہی پھر فرقان نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

”مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی ہے کہ وہ جلال جیسے آدمی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔ یہ تو بڑا

خراش آدمی ہے۔ ہم لوگ اس کو ”قصائی“ کہتے ہیں۔ اس کی واحد دلچسپی پیسہ ہے۔ مریض کیسے لاکر

دے گا، کہاں سے لاکر دے گا، اسے دلچسپی نہیں ہوتی۔ تم دیکھنا آٹھ دس سال میں یہ ایسا رفتار کے ساتھ

پیسہ کماتے ہوئے لاہور کا سب سے امیر ڈاکٹر ہو گا۔“

فرقان اب جلال انصر کے بارے میں تبصرہ کر رہا تھا۔ سالار خاموشی سے سن رہا تھا۔ جب فرقان

نے اپنی بات ختم کر لی تو اس نے کہا۔

”اس کو قسمت کہتے ہیں۔“

”تمہیں اس پر رٹک آ رہا ہے؟“ فرقان نے قدرے حیرانی سے کہا۔

”حسد تو میں کر نہیں سکتا۔“ سالار عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ”یہ جو کچھ تم مجھے اس کے بارے

میں بتا رہے ہو۔ یہ سب کچھ مجھے بہت سال پہلے پتا تھا۔ تب ہی جب میں امامہ کے سلسلے میں اس سے ملا

تھا۔ یہ کیسا ڈاکٹر بننے والا تھا، مجھے اندازہ تھا مگر آج اس فنکشن میں اسے دیکھ کر مجھے اس پر بے تحاشا رشک

آیا۔ کچھ بھی نہیں ہے اس کے پاس۔ معمولی شکل و صورت ہے۔ خامد ان بھی خاص نہیں ہے۔ اس جیسے

ہزاروں ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ لالچی، مادہ پرست بھی ہے مگر قسمت دیکھو کہ امامہ ہاشم جیسی لڑکی اس کے

مشق میں جتلا ہوئی۔ اس کے پیچھے خوار ہوتی پھری۔ میں اور تم اسے قصائی کہہ لیں، کچھ بھی کہہ لیں،

صرف ہماری باتوں سے اس کی قسمت تو نہیں بدل جائے گی نہ اس کی نہ میری۔“

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ فرقان نے اس کے چہرے کو دھواں دھواں ہوتے دیکھا۔

”کوئی نہ کوئی خوبی تو ہوگی اس میں کہ..... کہ امامہ ہاشم کو اور کسی سے نہیں صرف اسی سے محبت

ہوتی۔“ وہ اب اپنا دونوں آنکھوں کو مسل رہا تھا۔

”مجھے اگر پتا ہو تاکہ یہاں تم جلال انصر سے ملو گے تو میں تمہیں بھی اپنے ساتھ یہاں نہ لاتا۔“

فرقان نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے بھی اگر یہ پتا ہو تاکہ میں یہاں اس کا سامنا کروں گا تو میں بھی کسی قیمت پر یہاں نہ آتا۔“

سالار نے وٹا اسکرین سے نظر آنے والی تاریک سڑک کو دیکھتے ہوئے اسردگی سے سوچا۔

کچھ اور سڑے حد خاموشی سے ملے ہو پھر فرقان نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔

”تم نے اسے کبھی ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی؟“

”امامہ کو.....؟ یہ ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”میں اسے کیسے ڈھونڈ سکتا ہوں۔ کئی سال پہلے ایک بار میں نے کوشش کی تھی کوئی فائدہ نہیں ہوا

اور اب..... اب تو یہ اور بھی مشکل ہے۔“

”تم تو بچہ بچہ کی مدد لے سکتے ہو۔“

”اشتبہا دوں اس کے بارے میں؟“ سالار نے قدرے نکلی سے کہا۔ ”وہ تو پتا نہیں ملے پتا ملے

لیکن اس کے گھر والے مجھ تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ شک تو ان کو مجھ پر پہلے بھی تھا اور فرض کرو میں

ایسا کچھ کر بھی لوں تو نیو زیچہ میں کیا اشتہار دوں۔ کیا کہوں؟“ اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

”پھر اسے بھول جاؤ۔“ فرقان نے بڑی سہولت سے کہا۔

”کوئی سانس لینا بھول سکتا ہے؟“ سالار نے ترکی بہ ترکی کہا۔

”سالار اب بہت سال گزر گئے ہیں۔ تم آخر کتنی دیر اس طرح اس لا حاصل عشق میں جتلا رہو

گے۔ تمہیں اپنی زندگی کو دوبارہ پلان کرنا چاہئے۔ تم اپنی ساری زندگی امامہ ہاشم کے لئے تو ضائع نہیں

کر سکتے۔"

"میں کچھ بھی ضائع نہیں کر رہا ہوں۔ نہ زندگی کو، نہ وقت کو، نہ اپنے آپ کو۔ میں اگر امام ہاشم کو یاد رکھے ہوئے ہوں تو صرف اس لئے کیونکہ میں اسے بھلا نہیں سکتا۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ مجھے اس کے بارے میں سوچنے سے بہت تکلیف ہوتی ہے لیکن میں اس تکلیف کا عادی ہو چکا ہوں۔ ہوں۔ وہ میری پوری زندگی کو dominate کرتی ہے۔ وہ میری زندگی میں نہ آتی تو میں آج یہاں پاکستان میں تمہارے ساتھ نہ بیٹھا ہوتا۔ سالار سکندر کہیں اور ہوتا یا شاید ہوتا ہی نہ۔ مجھ پر اس کا قرض بہت ہے۔ جس آدمی کے مقروض ہوں اس کو چنگی سے پکڑ کر اپنی زندگی سے کوئی باہر نہیں کر سکتا۔ میں بھی نہیں کر سکتا۔"

سالار نے وہ ٹوک انداز میں کہا۔

"فرض کرو دو بارہ نلے پھر.....؟" فرقان نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ بکثرت گاڑی میں

خاموشی چھا گئی۔ بہت دیر بعد سالار نے کہا۔

"میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ کسی اور موضوع پر بات کرتے ہیں۔" اس نے

بڑی سہولت سے بات بدل دی۔

☆.....☆.....☆

چند سالوں میں فرقان کی طرح اس نے بھی گاؤں میں بہت کام کیا تھا اور فرقان کی نسبت زیادہ تیز رفتاری سے کیونکہ فرقان کے برعکس وہ بہت زیادہ اثر و سوغ رکھتا تھا۔ اس نے چند سالوں میں اس گاؤں کی حالت بدل کر رکھ دی تھی۔ صاف پانی، بجلی اور بڑی سڑک تک جاتی ایک پختہ سڑک، اس کے پہلے دو سالوں کی کارکردگی تھی۔ تیسرے سال وہاں ڈاک خانہ، محکمہ زراعت کا دفتر اور فون کی سہولت آئی تھی اور چوتھے سال اس کے اپنے ہائی اسکول میں۔ پھر کی کلاسز میں ایک این جی او کی مدد سے لڑکیوں کے لئے دستکاری سکھانے کا آغاز کیا گیا۔ گاؤں کی ڈپنٹری میں ایس بی ایس آگئی۔ وہاں کچھ اور مشینری نصب کی گئی۔ فرقان کی طرح یہ ڈپنٹری بھی اس نے اپنے وسائل سے اسکول کے ساتھ ہی شروع کی تھی اور اسے مزید بہتر بنانے میں فرقان نے اس کی مدد کی تھی۔

فرقان کے برعکس اس کی ڈپنٹری میں ڈاکٹری عدم دستیابی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی ڈپنٹری کا باقاعدہ آغاز ہونے سے بھی پہلے ایک ڈاکٹر اس کی کوششوں کی وجہ سے وہاں موجود تھا۔

اسکول پر ہونے والے تمام اخراجات تقریباً ہی کے تھے لیکن ڈپنٹری کو قائم کرنے اور اسے چلانے کے لئے ہونے والے اخراجات اس کے کچھ دوست برداشت کر رہے تھے۔ پوہیہ میں کام کے دوران بنائے ہوئے کانٹیکٹ اور دوستیاں اب اس کے کام آ رہی تھیں اور وہ انہیں استعمال کر رہا

تھا۔ وہ پوہیہ میں اپنے بہت سے دوستوں کو پاکستان آنے پر وہاں لایا تھا۔ وہ اب وہاں وہ کینٹنل ٹریننگ کی پلاننگ کرنے میں مصروف تھا، مگر چوتھے سال میں صرف یہی کچھ نہیں ہوا تھا کچھ اور بھی ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

سکندر عثمان اس دن سہ پہر کے قریب اسلام آباد آتے ہوئے گاڑی کا ناؤ پیچھے ہونے پر سڑک پر ٹوک گئے۔ ڈرائیور ناؤ بدلنے لگا اور وہ سڑک کے اطراف نظریں دوڑانے لگے۔ تب ان کی نظر ایک سائین بورڈ پر پڑی۔ وہاں لکھے ہوئے گاؤں کے نام نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ سالار سکندر کے حوالے سے وہ نام ان کے لئے نا آشنا نہیں تھا۔

ڈرائیور جب ڈر بدل کر واپس ڈرائیو تک سیٹ پر آکر بیٹھا تو سکندر عثمان نے اس سے کہا۔

"اس گاؤں میں چلو۔" انہیں اچانک ہی تجسس پیدا ہوا تھا۔ اس اسکول کے بارے میں جو سالار

سکندر پچھلے کئی سالوں سے وہاں چلا رہا تھا۔

پکی سڑک پر تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے دس منٹ میں وہ گاؤں کے اندر موجود تھے۔

آبادی شروع ہو چکی تھی۔ کچھ کچی دکانیں نظر آنے لگی تھیں۔ شاید یہ گاؤں کا "کنٹرول ایریا" تھا۔

"یہاں نیچے اتر کر کسی سے پوچھو کہ سالار سکندر کا اسکول کہاں ہے۔" سکندر عثمان نے ڈرائیور کو

ہدایت دی۔ اس وقت انہیں یاد آیا تھا کہ اس نے بھی ان کے سامنے اسکول کا نام نہیں لیا تھا اور جہاں ان کی گاڑی موجود تھی وہاں اس پاس کسی اسکول کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ گاؤں کے لوگوں کے لئے چند سال پہلے سکندر عثمان کی گاڑی بے حد اشتیاق یا تجسس کا باعث بنتی مگر پچھلے کچھ سالوں میں سالار اور فرقان کی وجہ سے وہاں وقتاً فوقتاً گاڑیوں کی آمد ہوتی رہتی تھی۔ یہ پہلے کی طرح ان کے لئے تعجب انگیز نہیں رہی تھی مگر وہ گاڑی وہاں سے ہمیشہ کی طرح گزر جانے کے بجائے جب وہیں کھڑی ہو گئی تو یک دم لوگوں میں تجسس بیدار ہوا۔

سکندر عثمان کی ہدایت پر ڈرائیور نیچے اتر کر پاس کی ایک دکان کی طرف گیا اور وہاں بیٹھے چند

لوگوں سے اسکول کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"یہاں سالار سکندر صاحب کا کوئی اسکول ہے؟" علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا۔

"ہاں جی ہے۔۔۔۔۔ یہ اسی سڑک پر آگے دائیں طرف موڑ مرنے پر بڑی سی عمارت ہے۔" ایک

آدمی نے بتایا۔

"آپ ان کے کوئی دوست ہیں؟" اس آدمی نے جواب کے ساتھ ساتھ سوال بھی کیا۔

"نہیں میں ان کے والد کے ساتھ آیا ہوں۔"

”والد؟“ اس آدمی کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگ یک دم سکندر عثمان کی گاڑی کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر اس آدمی نے اٹھ کر ڈرائیور سے ہاتھ ملایا۔

”سالار صاحب کے والد آئے ہیں بڑی خوش قسمتی ہے۔“ اس آدمی نے کہا اور پھر ڈرائیور کے ساتھ گاڑی کی طرف آنے لگا۔ وہاں بیٹھے ہوئے باقی لوگ بھی کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے آئے۔ سکندر عثمان نے دور سے انہیں ایک گروپ کی شکل میں اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ کچھ الجھن کا شکار ہو گئے۔ ڈرائیور کے پیچھے آنے والے آدمی نے بڑی عقیدت کے ساتھ کھڑکی سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ سکندر عثمان نے کچھ تذبذب کے عالم میں اس سے ہاتھ ملایا جب کہ اس آدمی نے بڑے جوش و خروش سے دونوں ہاتھوں کے ساتھ ان سے مصافحہ کیا۔ اس کے ساتھ آنے والے دوسرے آدمی بھی اب یہی کر رہے تھے۔ سکندر کچھ الجھن کے انداز میں ان سے ہاتھ مل رہے تھے۔

”آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ صاب!“

پہلے ادھیڑ عمر آدمی نے عقیدت بھرے انداز میں کہا۔

”آپ کے لئے چائے لائیں یا پھر بوتل.....“ وہ آدمی اسی جوش و خروش سے پوچھ رہا تھا۔

ڈرائیور اب گاڑی اشارت کر چکا تھا۔

”نہیں..... کوئی ضرورت نہیں۔ بس راستہ ہی پوچھنا تھا۔“ انہوں نے جلدی سے کہا۔

ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ آدمی اور اس کے ساتھ کھڑے دوسرے لوگ وہیں کھڑے گاڑی کو آگے جاتے دیکھتے رہے پھر اس آدمی نے قدمے مایوسی سے سر ہلایا۔

”سالار صاحب کی اور بات ہے۔“

”ہاں سالار صاحب کی اور ہی بات ہے، وہ کبھی کبھار کھائے پیئے بغیر یہاں سے اس طرح جاتے تھے۔“ ایک دوسرے آدمی نے تائیدی۔ وہ لوگ اب واپس قدم بڑھانے لگے۔

سالار گاؤں میں موجود ان چند دکانوں کے پاس ہی اپنی گاڑی کھڑی کر دیا کرتا تھا اور پھر وہاں موجود لوگوں سے ملنے ان کی پیش کردہ چھوٹی موٹی چیزیں کھاتا پیتا وہاں سے پیدل دس منٹ میں اپنے اسکول چلا جاتا تھا۔ وہ لوگ مایوس ہوئے تھے۔ سکندر عثمان نے لوگاڑی سے اترنے تک کا تکلف نہیں کیا تھا، کھانا پینا تو دور کی بات تھی۔

گاڑی اب موڑ مڑ رہی تھی اور موڑ مڑتے ہی ڈرائیور سے مزید کچھ کہتے کہتے سکندر عثمان خاموش ہو گئے۔ گیجیٹی سیٹ پر بیٹھے وڈا سکرین کے پار نظر آنے والی وسیع و عریض عمارت ان چھوٹے چھوٹے کپکپے مکانات اور کھلے کھیتوں کے درمیان دور سے بھی حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی تھی۔ سکندر کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ وہاں اتنا بڑا اسکول چلا رہا تھا مگر ان کو دم بخود اس اسکول کی دور تک پہنچی ہوئی عمارت

نے نہیں کیا تھا بلکہ اسکول کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر لگے اس سائین بورڈ نے کیا جس پر تیر کے ایک نشان کے اوپر علی حروف میں اردو میں تحریر تھا۔ سکندر عثمان ہائی اسکول، ڈرائیور گاڑی اسکول کے سامنے روک چکا تھا۔

سکندر عثمان نے گاڑی سے اتر کر اس عمارت کے گیٹ کے پار عمارت کے ماتھے پر چمکتے ہوئے اپنے نام کو دیکھا، ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر گئی۔ سالار سکندر نے ایک بار پھر انہیں کچھ بولنے کے قابل نہیں رکھا تھا۔ گیٹ بند تھا مگر اس کے دوسری طرف چوکیدار موجود تھا جو گاڑی کو وہاں رکنے دیکھ کر گیٹ کھول رہا تھا۔ ڈرائیور جب تک گاڑی سے اتر چوکیدار باہر آ گیا۔

”صاحب شہر سے آئے ہیں ڈرا اسکول دیکھنا چاہتے ہیں۔“ ڈرائیور نے چوکیدار سے کہا۔ سکندر عثمان ہنوز اس اسکول پر لگے اپنے نام کو دیکھ رہے تھے۔

”سالار صاحب کے حوالے سے آئے ہیں؟“ چوکیدار نے پوچھا۔

”نہیں.....“ ڈرائیور نے بلا توقف کہا۔ ”ویسے ہی آئے ہیں۔“ سکندر عثمان نے پہلی بار اپنی

نظریں ہٹا کر ڈرائیور اور پھر چوکیدار کو دیکھا۔

”میں سالار سکندر کا باپ ہوں۔“ سکندر عثمان نے مستحکم مگر بھرتائی ہوئی آواز میں کہا۔ ڈرائیور

نے حیرانی سے ان کو دیکھا۔ چوکیدار ایک دم بوکھلا گیا۔

”آپ..... آپ سکندر عثمان صاحب ہیں؟“ سکندر کچھ کہے بغیر میکاگی انداز میں گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ شام کو جاگلگ ٹریک پر تھا جب موہاگل پر سکندر عثمان کی کال آئی۔ اپنی بے ترتیب سانس پر قابو پاتے ہوئے وہ جاگلگ کرتے کرتے رُک گیا اور ٹریک کے پاس ایک شیٹ پر بیٹھ گیا۔

”ہیلو یار! السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام..... ٹریک پر ہو؟“ انہوں نے اس کے پھولے ہوئے سانس سے اندازہ لگایا۔

”جی..... آپ کیسے ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں.....“

”مئی کیسی ہیں؟“

”وہ بھی ٹھیک ہیں۔“ سالار ان کی طرف سے کچھ مزید کہنے یا پوچھنے کا انتظار کرتا رہا۔ دوسری طرف اب خاموشی تھی پھر چند لمحوں کے بعد وہ بولے۔

”میں آج تمہارا اسکول دیکھ کر آیا ہوں۔“

”رنگی! سالار نے بے ساختہ کہا۔

”کیسا لگا آپ کو؟“

”تم نے یہ سب کیسے کیا ہے سالار؟“

”کیا۔؟“

”وہ سب کچھ جو وہاں پر ہے۔“

”ہنا نہیں۔ بس ہوتا گیا۔ مجھے پتا ہوتا تو میں آپ کو خود ساتھ لے جاتا۔ کوئی پر اہم تو نہیں ہوتی؟“ سالار کو تشویش ہوئی۔

”وہاں سالار سکندر کے باپ کو کوئی پر اہم ہو سکتی ہے؟“ انہوں نے جواب کہا۔ سالار جانتا تھا وہ سوال نہیں تھا۔

”تم کس طرح کے آدمی ہو سالار؟“

”ہنا نہیں۔ آپ کو پتا ہونا چاہئے۔ میں آپ کا پتا ہوں۔“

”نہیں مجھے۔ مجھے تو کبھی بھی پتا نہیں چل سکا۔“ سکندر کا لہجہ عجیب تھا۔ سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔

”مجھے بھی کبھی پتا نہیں چل سکا۔ میں تو اب بھی اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”تم۔ تم۔ سالار ایک انتہائی احمق، کہینے اور غیبت انسان ہو۔“

سالار ہنسا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں واقعی ایسا ہوں۔ اور کچھ۔۔۔؟“

”اور۔۔۔ یہ کہ میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ تم میری اولاد ہو۔“ سکندر جھمن کی آواز لرز رہی تھی۔ اس بار چپ رہنے کی باری سالار کی تھی۔

”مجھے اس اسکول کے ہر ماہ کے اخراجات کے بارے میں بتا دینا۔ میری فرم ہر ماہ اس رقم کا چیک تمہیں بھجو دیا کرے گی۔“

اس سے پہلے کہ سالار کچھ کہتا ہوا بند ہو چکا تھا۔ سالار نے پارک میں پھیلی تاریکی میں ہاتھ میں پکڑے موبائل کی روشنی اسکرین کو دیکھا۔ پھر جاگنگ ٹریک پر لگی رہ شینیوں میں وہاں دوڑتے لوگوں کو کچھ دور دورہ ہیں بٹھانالی لذہنی کے عالم میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوا پھر اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ پھرتے ہوئے ٹریک پر آ گیا۔

☆—☆—☆

رمحہ سے سالار کی پہلی ملاقات لاہور آنے کے ایک سال بعد ہوئی تھی۔ وہ لندن اسکول آف

انکس کی گریجویٹ تھی اور سالار کے بینک میں اس کی تعیناتی ہوئی تھی۔ اس کے والد بہت عرصے سے اس بینک کے کسٹمرز میں سے تھے اور سالار انہیں ذاتی طور پر جانتا تھا۔

رمحہ بہت خوب صورت، ذہین اور خوش مزاج لڑکی تھی اور اس نے وہاں آنے کے کچھ عرصے کے بعد ہی ہر ایک سے خاصا بے تکلفی پیدا کر لی تھی۔ ایک کو ٹیک کے طور پر سالار کے ساتھ بھی اس کی اچھی سلام دعا تھی اور کچھ اس کے والد کے حوالے سے بھی وہ اس کی خاصی عزت کرتا تھا۔ بینک میں کام کرنے والی چند دوسری لڑکیوں کی نسبت رمحہ سے اس کی کچھ زیادہ بے تکلفی تھی۔

لیکن سالار کو قطعاً اندازہ نہیں ہوا کہ کس وقت رمحہ نے اسے کچھ زیادہ پیچیدگی سے لینا شروع کر دیا۔ وہ سالار کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ وہ اس کے آفس میں بھی زیادہ آنے جانے لگی تھی اور آفس کے بعد بھی اکثر اوقات اسے کال کرتی رہتی۔ سالار کو چند بار اس کا رویہ کچھ خلاف معمول لگا لیکن اس نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے شبہات کو جھٹک دیا مگر اس کا یہ اطمینان پورے ایک سال کے بعد ایک واقعے کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

☆—☆—☆

سالار صبح آفس میں داخل ہوا اور داخل ہوتے ہی چونک گیا۔ اس کی ٹیبل پر ایک بہت بڑا اور خوب صورت جیکے پڑا ہوا تھا۔ اپنا بریف کیس ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے وہ جیکے اٹھا کر اس پر موجود کارڈ کھولا۔

”پتی برتھ ڈے نو سالار سکندر“

رمحہ بدلتی

سالار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ آج اس کی سالگرہ تھی مگر رمحہ یہ کیسے جانتی تھی وہ کچھ دیر کسی سوچ میں گم ٹیبل کے پاس کھڑا ہوا پھر اس نے جیکے ٹیبل پر ایک طرف رکھ دیا۔ اپنا کوٹ اُتار کر اس نے ریگ الوٹنگ چیئر کی پشت پر لٹکایا اور ہنجر پر بیٹھ گیا۔ جیکے کے نیچے ٹیبل پر بھی ایک کارڈ پڑا ہوا تھا۔ اس نے پلٹنے کے بعد اس کارڈ کو کھولا۔ چند لمبے تک وہ اس میں گھسی ہوئی تحریر پڑھتا رہا پھر کارڈ بند کر کے اس نے اپنی درواز میں رکھ دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا اس کارڈ اور اس جیکے پر کس ردعمل کا اظہار کرے، چند لمبے وہ کچھ سوچتا رہا پھر اس نے کندھے سے جھٹک کر اپنا بریف کیس کھولا شروع کر دیا۔ وہ اس میں سے اپنا لپ ٹاپ نکال کر بریف کیس کو نیچے کارپٹ پر اپنی ٹیبل کے ساتھ رکھ رہا تھا جب رمحہ اندر داخل ہوئی۔

”پتی برتھ ڈے سالار۔“ اس نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔

سالار مسکرایا۔

”تھنکس.....“ رمدہ اب ٹیبل کے سامنے پڑی کرسی کھینچ کر بیٹھ رہی تھی، جب کہ سالار لیپ ٹاپ کو کھولنے میں مصروف تھا۔

”بیکے اور کارڈ کے لئے بھی شکریہ۔ یہ ایک خوشگوار سربراہ تھا۔“

سالار نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا وہ اب اپنا فون لیپ ٹاپ کے ساتھ منبج کرنے میں مصروف تھا۔

”مگر تمہیں میری برتھ ڈے کے بارے میں بتا کیسے چلا؟“ وہ پوچھتے بغیر نہیں رہ سکا۔

”جناب یہ تو میں نہیں بتاؤں گی۔ بس پتا چلانا تھا۔ چلا لیا۔“ رمدہ نے قلمتنگی سے کہا۔ ”اور ویسے بھی دوست آپس میں یہ سوال کبھی نہیں کرتے۔ اگر دوستوں کو ایسی چیزوں کا بھی پتہ نہیں ہوگا تو پھر وہ دوست تو نہیں ہوئے۔“

سالار لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظریں جمائے مسکراتے ہوئے اس کی بات سنتا رہا۔

”اب میں سارے اسٹاف کی طرف سے پارٹی کی ڈیمانڈ کے لئے آئی ہوں۔ آج کا ڈنر تمہیں ارا شیج کرنا چاہئے۔“ سالار نے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

”رمدہ! میں اپنی برتھ ڈے سلیمیرٹ نہیں کرتا۔“

”کیوں.....؟“

”ویسے ہی.....“

”کوئی وجہ تو ہوگی۔“

”کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ بس میں ویسے ہی سلیمیرٹ نہیں کرتا۔“

”پہلے نہیں کرتے ہو گے مگر اس بار تو کرنی پڑے گی۔ اس بار تو سارے اسٹاف کی ڈیمانڈ ہے۔“ رمدہ نے بے تکلفی سے کہا۔

”میں کسی بھی دن آپ سب لوگوں کو کھانا کھلا سکتا ہوں۔ میرے گھر پر، ہوٹل میں، جہاں آپ چاہیں مگر میں برتھ ڈے کے سلسلے میں نہیں کھلا سکتا۔“ سالار نے صاف گوئی سے کہا۔

”یعنی تم چاہتے ہو کہ ہم تمہارے لئے پارٹی ارا شیج کر دیں۔“ رمدہ نے کہا۔

”میں نے ایسا نہیں کہا۔“ وہ کچھ حیران ہوا۔

”اگر تم پورے اسٹاف کو پارٹی نہیں دے سکتے تو کم از کم مجھے ڈنر پر تولے جاسکتے ہو۔“

”رمدہ! میں آج رات کچھ مصروف ہوں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ۔“ سالار نے ایک بار پھر معذرت کی۔

”کوئی بات نہیں میں بھی آ جاؤں گی۔“ رمدہ نے کہا۔

”نہیں یہ مناسب نہیں ہوگا۔“

”کیوں.....؟“

”وہ سب مرد ہیں اور تم ان سے واقف بھی نہیں ہو۔“ اس نے بہانا بنایا۔

”میں سمجھتی ہوں۔“ رمدہ نے کہا۔

”پھر کل چلتے ہیں؟“

”کل نہیں..... پھر کبھی چلیں گے۔ میں تمہیں بتا دوں گا۔“

رمدہ کچھ ماپوس ہوئی مگر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اسے فی الحال باہر نہیں لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔

”اوکے.....“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”مجھے اُمید ہے، تم نے مانسڈ نہیں کیا ہوگا۔“ سالار نے اسے اُٹھتے دیکھ کر کہا۔

”نہیں بالکل نہیں۔ It's alright“ وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ سالار اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کا خیال تھا سالگرہ کا وہ معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔ یہ اس کی غلط فہمی تھی۔

لُچ آؤر کے دوران اس کے لئے ایک سربراہ پارٹی تیار تھی۔ اس کے پاس مسٹریال طرنے بڑی گرم جوشی سے سالگرہ پر مبارکباد دی تھی۔ وہ پارٹی رمدہ نے ارا شیج کی تھی اور ایک اور دوسرے لوازمات کو دیکھتے ہوئے وہ پہلی بار صحیح معنوں میں تشویش میں مبتلا ہوا تھا اگر پہلے رمدہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنی پسندیدگی ظاہر کر رہی تھی تو اس دن اس نے بہت واضح انداز میں یہ بات ظاہر کر دی تھی۔ وہ لُچ آؤر کے بعد تقریباً آدھ گھنٹہ اپنے آفس میں بیٹھا پہلی بار رمدہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس سے کون سی ایسی لٹلٹی ہوئی تھی، جس سے رمدہ کو اس میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ پچھلے کچھ عرصے میں ملنے والی چند اچھی لڑکیوں میں سے ایک تھی مگر وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس میں انوالو ہونے لگے۔ وہ پچھلے کچھ عرصے سے رمدہ کے اپنے لئے خاص رویے کو اس کی خوش اخلاقی سمجھ کر نالارہا تھا، مگر اس دن آفس سے نکلنے ہوئے اس کی طرف سے دیئے جانے والے چند سیکس کو گھر جا کر کھولنے پر اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ وہ ابھی ان تحائف کو دیکھ کر تشویش میں مبتلا رہا تھا، جب فرقان آ گیا۔ ڈرائنگ روم میں پڑے وہ سیکس فور اس کی نظر میں آ گئے۔

”واؤ، آج تو خاصے تحائف ہو رہے ہیں۔ دیکھ لوں؟“ فرقان نے صوفہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

سالار نے صرف سر ہلایا، گھڑی، پرفیومز، ٹائیاں، شٹس، وہ کیے بعد دیگرے ان چیزوں کو نکال نکال کر دیکھتا رہا۔

”یہ تمہاری بری کا سامان اکٹھا نہیں ہو گیا؟“ فرقان نے مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا۔ ”خاصا دل

کھول کر گفٹس دے دیے ہیں تمہارے کو لیکرنے۔“

”صرف ایک کو لیک نے۔“ سالار نے مد اعلت کی۔

”یہ سب کچھ ایک نے دیا ہے؟“ فرقان کچھ حیران ہوا۔

”ہاں۔“

”کس نے؟“

”رمضہ نے۔“

فرقان نے اپنے ہونٹ سکوڑے۔

”تم جانتے ہو یہ تمام گفٹس ایک ڈیڑھ لاکھ کی رشٹ میں ہوں گے۔“ وہ اب دوبارہ ان چیزوں پر

نظر ڈال رہا تھا۔

صرف یہ گھڑی ہی پچاس ہزار کی ہے۔ کوئی صرف کو لیک سمجھ کر تو اتنی مہنگی چیزیں نہیں دے گا۔ تم

لوگوں کے درمیان کوئی.....“ فرقان بات کرتے کرتے رک گیا۔

”ہم دونوں کے درمیان کچھ نہیں ہے۔ کم از کم میری طرف سے، مگر آج میں پہلی بار پریشان ہو گیا

ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ رمضہ..... مجھ میں کچھ ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔“ سالار نے ان

چیزوں پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

”بہت اچھی بات ہے۔ چلو تم میں بھی کسی لڑکی نے دلچسپی لی۔“ فرقان نے ان ٹیکٹس کو واپس

سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

”ویسے بھی تم بہت کنوارے رہ لے۔ لگے ہاتھوں اس سال یہ کام کر لو۔“

”جب مجھے شادی نہیں کرنی تو میں اس سلسلے کو آگے کیوں بڑھاؤں۔“

”سالاروں پہ دن تم بہت impractical کیوں ہوتے جا رہے ہو؟ تمہیں اب سیمٹل ڈاؤن ہونے

کے بارے میں شجیدگی سے سوچنا چاہئے۔ ہر لڑکی سے کب تک اس طرح بھاگتے پھرو گے۔ تمہیں اپنی

ایک فیملی شروع کر لینی چاہئے۔ رمضہ اچھی لڑکی ہے۔ میں اس کی فیملی کو جانتا ہوں۔ کچھ ماڈرن ضرور ہے

مگر اچھی لڑکی ہے اور چلو اگر رمضہ نہیں تو پھر تم کسی اور کے ساتھ شادی کر لو۔ میں اس سلسلے میں

تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ تم اپنے پرنس کی مدد لے سکتے ہو مگر اب تمہیں اس معاملے کے بارے میں

شجیدگی سے سوچنا چاہئے۔ تمہیں ان تمام باتوں کے بارے میں غور کرنا چاہئے اور کم از کم دوسرے کی

بات کے جواب میں کچھ کہہ ضرور دینا چاہئے۔“

فرقان نے آخری جملے پر زور دیتے ہوئے کہا اس کا اشارہ اس کی خاموشی کی طرف تھا۔

”اس سے دوسرے کو یہ تسلی ہو جاتی ہے کہ وہ کسی مجھے کے سامنے تقریر نہیں کرتا رہا۔“ فرقان

نے کہا۔

”تم کبھی اپنی شادی کے بارے میں سوچتے نہیں ہو؟“

”کون اپنی شادی کے بارے میں نہیں سوچتا؟“ سالار نے مدہم آواز میں کہا۔ ”میں بھی سوچتا

ہوں مگر میں اس طرح نہیں سوچتا جس طرح تم سوچتے ہو۔ چائے پیو گے؟“

”آخری جملے کے بجائے تمہیں کہنا چاہئے تھا کہ کب تو اس بند کرو۔“

فرقان نے ناراضی سے کہا۔ سالار نے مسکرا کر کندھے اچکا دیے وہ اب چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

رمضہ نے حیرانی سے اپنے سامنے پڑے ان ٹیکٹس کو دیکھا۔ ”لیکن سالار! یہ سب چیزیں تمہارا

برتھ ڈے گفٹ ہیں۔“

سالار اگلی صبح ایک ٹائی چھوڑ کر تمام چیزیں واپس اٹھالایا تھا اور اب وہ رمضہ کے آفس میں تھا۔

”میں کسی سے اتنا ہنگامہ نہیں لیا کرتا۔ ایک ٹائی کافی ہے۔“

”سالار، میں اپنے فرینڈز کو اتنے ہی مہنگے گفٹس دیتی ہوں۔“ رمضہ نے وضاحت کی کوشش کی۔

”یقیناً تم دیتی ہو گی مگر میں نہیں لیتا..... اگر تم نے زیادہ اصرار کیا تو میں وہ ٹائی بھی لا کر واپس

تمہیں دے دوں گا.....“ سالار نے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے نکل آیا۔ رمضہ

پچکے چہرے کے ساتھ اسے کمرے سے نکلتا دیکھتی رہی۔

باب ۷

سالار اس دن ہمیشہ کی طرح ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ابھی اپنا بیچر شروع نہیں کیا تھا جب ان کے پاس بیٹھے ایک ادبیز عمر آدمی نے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! آدمی کو بیر کامل مل جائے تو اس کی تقدیر بدل جاتی ہے۔“

سالار نے گردن موڑ کر اس شخص کو دیکھا، وہ وہاں پچھلے چند دن سے آرہا تھا۔

”اس کی تسلیں سنور جاتی ہیں۔ میں جب سے آپ کے پاس آنے لگا ہوں، مجھے لگتا ہے میں ہدایت پا گیا ہوں۔ میرے اٹنے کا کام سیدھے ہونے لگے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ مجھے بیر کامل مل گیا ہے۔ میں..... میں آپ کے ہاتھوں پر بیعت کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ بڑی عقیدت مندی سے ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ پکڑے ہوئے کہنے لگا۔ کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے نرمی سے اس شخص کے ہاتھ پر چھکی دیتے ہوئے اپنا ہاتھ چمڑا لیا۔

”تقی صاحب! میں نے زندگی میں آج تک کسی سے بیعت نہیں لی۔ آپ کے منہ سے بیر کامل کا ذکر سنا..... بیر کامل کون ہوتا ہے..... بیر کامل کس کو کہتے ہیں..... وہ کیا کرتا ہے..... اس کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟“

وہ بڑی سنجیدگی سے اس شخص سے پوچھ رہے تھے۔

”آپ بیر کامل ہیں۔“ اس شخص نے کہا۔

”نہیں، میں بیر کامل نہیں ہوں۔“ ڈاکٹر سبط علی نے کہا۔

”آپ سے مجھے ہدایت ملتی ہے۔“ اس شخص نے اصرار کیا۔

”ہدایت تو استاد بھی دیتا ہے، ماں باپ بھی دیتے ہیں، لیڈر بھی دیتے ہیں، دوست احباب بھی دیتے ہیں، کیا وہ بیر کامل ہو جاتے ہیں؟“

”آپ..... آپ گناہ نہیں کرتے۔“ وہ آدمی گڑبڑا گیا۔

”ہاں، دانستہ طور پر نہیں کرتا، اس لئے نہیں کرتا، کیونکہ گناہ سے مجھے خوف آتا ہے۔ یہاں پر بیٹھے بہت سے لوگ دانستہ طور پر گناہ نہیں کرتے ہوں گے، کیونکہ میری طرح انہیں بھی گناہ سے خوف آتا ہو گا مگر نادانستگی میں مجھ سے کیا سرزد ہو جاتا ہے، اسے میں نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے نادانستگی میں مجھ سے بھی گناہ سرزد ہو جاتے ہوں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ کی دعا قبول ہوتی ہے۔“ وہ آدمی اپنے موقف سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

”دعا تو ماں باپ کی بھی قبول ہوتی ہے، مجبور اور مظلوم کی بھی قبول ہوتی ہے اور بھی بہت سے لوگوں کی قبول ہوتی ہے۔“

”لیکن آپ کی تو ہر دعا قبول ہو جاتی ہے۔“ اس نے اصرار کیا۔

ڈاکٹر سبط علی صاحب نے انکار میں سر ہلایا۔

”نہیں، ہر دعا تو قبول نہیں ہوتی۔ میں کئی سالوں سے ہر روز مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی دعا کرتا ہوں، ابھی تک تو قبول نہیں ہوئی۔ ہر روز میری کی جانے والی کئی دعائیں قبول نہیں بھی ہوتیں۔“

”لیکن آپ کے پاس جو شخص دعا کروانے کے لئے آتا ہے، اس کے لئے آپ کی دعا ضرور قبول ہو جاتی ہے۔“

ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

”آپ کے لئے کی جانے والی دعا قبول ہو گئی ہوگی، یہاں بہت سے ایسے ہیں جن کے لئے میری

دعا قبول نہیں ہوتی یا نہیں ہوئیں۔“

وہ اب کچھ بول نہیں سکا۔

”آپ میں سے اگر کوئی بتائے کہ حیر کامل کون ہوتا ہے؟“
وہاں موجود لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر ایک نے کہا۔
”حیر کامل نیک شخص ہوتا ہے، عبادت گزار شخص، پیار سا آدمی۔“
ڈاکٹر سید علی نے سر ہلایا۔

”بہت سے لوگ نیک ہوتے ہیں، عبادت گزار ہوتے ہیں، پیار سا ہوتے ہیں۔ آپ کے ارد گرد ایسے بہت سارے لوگ ہوتے ہیں تو کیا وہ سب حیر کامل ہوتے ہیں؟“

”نہیں، حیر کامل وہ آدمی ہوتا ہے جو دکھاوے کے لئے عبادت نہیں کرتا۔ دل سے عبادت کرتا ہے، صرف اللہ کے لئے۔ اس کی نیکی اور پارسائی ڈھونگ نہیں ہوتی۔“ ایک اور شخص نے اپنا رائے دی۔
”اپنے حلقہ احباب میں آپ میں سے ہر ایک کسی نہ کسی ایسے شخص کو ضرور جانتا ہو گا، جس کی عبادت کے بارے میں اسے یہ شبہ نہیں ہوتا کہ وہ ڈھونگ ہے، جس کی نیکی اور پارسائی کا بھی آپ کو یقین ہوتا ہے تو کیا وہ شخص حیر کامل ہے؟“

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایک اور شخص نے کہا۔

”حیر کامل ایک ایسا شخص ہوتا ہے، جس کے الفاظ میں تاثیر ہوتی ہے کہ وہ انسان کا دل بدل دیتے ہیں۔“

”تاثیر بھی بہت سے لوگوں کے الفاظ میں ہوتی ہے۔ کچھ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ میں، کچھ کے قلم سے نکلنے والے الفاظ میں، تاثیر تو اسٹیج پر کھڑے ایک کمپیئر اور اخبار کا کالم لکھنے والے ایک جرنلسٹ کے الفاظ میں بھی ہوتی ہے تو کیا وہ حیر کامل ہوتے ہیں؟“

ایک اور شخص بولا۔ ”حیر کامل وہ ہوتا ہے جسے الہام اور وجدان ہو، جو مستقبل کو بوجھ سکے۔“

”ہم میں سے بہت سارے لوگ ایسے خواب دیکھتے ہیں جن میں مستقبل میں درپیش آنے والے حالات سے ہمیں آگہی ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ استعارہ بھی کرتے ہیں اور چیزوں کے بارے میں کسی حد تک جان جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے، وہ خطرہ کو بھانپ جاتے ہیں۔“

”حیر کامل کون ہوتا ہے؟“ ڈاکٹر صاحب کچھ دیر خاموش رہے، انہوں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

”حیر کامل کون ہو سکتا ہے؟“ سالار ابھین آمیز انداز میں ڈاکٹر سید علی کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

”کیا ڈاکٹر سید علی کے علاوہ کوئی اور حیر کامل ہو سکتا تھا اور اگر وہ نہیں تھے تو پھر کون تھا اور کون ہو سکتا ہے؟“

وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے دل و دماغ میں ایک ہی گونج تھی۔ ڈاکٹر سید علی ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہے تھے، پھر ان کے چہرے کی مسکراہٹ آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی۔

”حیر کامل میں کاملیت ہوتی ہے۔ کاملیت ان تمام چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے جو آپ کہہ رہے تھے۔ حیر کامل وہ شخص ہوتا ہے جو دل سے اللہ کی عبادت کرتا ہے، نیک اور پیار سا ہوتا ہے۔ اس کی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ اس حد تک جس حد تک اللہ چاہے۔ اس کے الفاظ میں تاثیر بھی ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو ہدایت بھی دیتا ہے مگر اسے الہام نہیں ہوتا، اسے وجدان ہوتا ہے۔ وحی آترتی ہے اس پر اور وحی کسی عام انسان پر نہیں آترتی۔ صرف پیغمبر پر آترتی ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کامل تھا مگر حیر کامل وہ ہے جس پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا جاتا ہے۔“

ہر انسان کو زندگی میں کبھی نہ کبھی کسی حیر کامل کی ضرورت ضرور پڑتی ہے۔ کبھی نہ کبھی انسانی زندگی اس موڑ پر آکر ضرور کھڑی ہو جاتی ہے جب یہ لگتا ہے کہ ہمارے لیوں اور دل سے نکلنے والی دعائیں بے اثر ہو گئی ہیں۔ ہمارے سجدے اور ہمارے پھیلے ہوئے ہاتھ رمتوں اور نعمتوں کو اپنی طرف موڑ نہیں پارہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی تعلق تھا جو ٹوٹ گیا ہے پھر آدمی کا دل چاہتا ہے اب اس کے لئے کوئی اور ہاتھ اٹھائے، کسی اور کے لب اس کی دعا اللہ تک پہنچائیں، کوئی اور اللہ کے سامنے اس کے لئے گونگاڑائے، کوئی ایسا شخص جس کی دعائیں قبول ہوتی ہوں، جس کے لیوں سے نکلنے والی التجائیں اس کے اپنے نظموں کی طرح واپس نہ موڑ دی جاتی ہوں پھر انسان حیر کامل کی تلاش شروع کرتا ہے، بھاگتا پھرتا ہے، دنیا میں کسی ایسے شخص کے لئے جو کاملیت کی کسی نہ کسی سیرگی پر کھڑا ہو۔

حیر کامل کی یہ تلاش انسانی زندگی کے ارتقاء سے اب تک جاری ہے۔ یہ تلاش وہ خواہش ہے جو اللہ خود انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے۔ انسان کے دل میں یہ خواہش، یہ تلاش نہ اُتاری جاتی تو وہ پیغمبروں پر کبھی یقین نہ لاتا۔ کبھی ان کی بیرونی اور اطاعت کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ حیر کامل کی یہ تلاش ہی انسان کو ہر زمانے میں اُتارے جانے والے پیغمبروں کی طرف لے جاتی رہی پھر پیغمبروں کی مبعوثیت کا یہ سلسلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ختم کر دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی اور حیر کامل کی گنجائش نہیں رکھی گئی۔

کون ہے جسے اب یا آئندہ آنے والے زمانے میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر کوئی مقام دیا جائے؟

کون ہے جسے آج یا آئندہ آنے والے زمانے میں کسی شخص کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کاملیت دے دی جائے؟

کون ہے جو آج یا آئندہ آنے والے زمانے میں کسی شخص کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر شفاعت کا دعویٰ کر سکے؟

جلد اور مستقل خاموشی کی صورت میں آنے والا نئی میں یہ جواب ہم سے صرف ایک سوال

کرتا ہے۔

بیر کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ کر ہم دنیا میں اور کس وجود کو کھونے نکل کھڑے ہوئے ہیں؟ بیر کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیعت شدہ ہوتے ہوئے ہمیں دوسرے کس شخص کی بیعت کی ضرورت رہ گئی ہے؟

بیر کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے پر چلنے کے بجائے ہمیں دوسرا کون سا راستہ اپنی طرف کھینچ رہا ہے؟

کیا مسلمانوں کے لئے ایک اللہ، ایک قرآن، ایک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی سنت کافی نہیں؟

اللہ اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کی کتاب کے علاوہ اور کون سا شخص کون سا کلام ہے جو ہمیں دنیا اور آخرت کی تکلیفوں سے بچا سکے گا؟

جو ہماری دعاؤں کو قبولیت بخشے، جو ہم پر نعمتیں اور رحمتیں نازل کر سکے؟

کوئی بیر کامل کافر قہرنا سکتا ہے؟ نہیں بنا سکتا۔“

ڈاکٹر سید علی کہہ رہے تھے۔

”وہ صرف مسلمان تھے، وہ مسلمان جو یہ یقین رکھتے تھے کہ اگر وہ صراطِ مستقیم پر چلیں گے تو وہ جنت میں جائیں گے، اس راستے سے نہیں گئے تو اللہ کے عذاب کا نشانہ بنیں گے۔“

اور صراطِ مستقیم وہ راستہ ہے جو اللہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے قرآن پاک میں بتاتا ہے۔ صاف، دو ٹوک اور واضح الفاظ میں۔ وہ کام کریں جس کا حکم اللہ اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے دیتا ہے اور اس کام سے رُک جائیں جس سے منع کیا جاتا ہے۔

اللہ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کسی بات میں کوئی ابہام نہیں رکھتے۔ قرآن کو کھولنے، اگر اس میں کہیں دو ٹوک اور غیر مبہم الفاظ میں کسی دوسرے بیر کامل یا پیغمبر کا ذکر ملے تو اس کی تلاش کرتے رہئے اور اگر ایسا کچھ نظر نہیں آتا تو پھر صرف خوف کھائیے کہ آپ اپنے پیروں کو کس

دلدار میں لئے جا رہے ہیں۔ اپنی پچاس ساٹھ سالہ زندگی کو کس طرح اپنی ابدی زندگی کی جہاں کے لئے استعمال کر رہے ہیں کس طرح خسارے کا سودا کر رہے ہیں۔ ہدایت کی تلاش ہے، قرآن کھولنے۔ کیا ہے جو وہ آپ کو نہیں بتا دیتا۔ وہ آپ کو معصوم، انجان اور بے خبر نہیں رہنے دیتا۔ آپ کا اصل آپ کے

منہ پر دے مارتا ہے۔ کیا اللہ انسان کو نہیں جانتا ہو گا؟ اس مخلوق کو، جو اس کی اربوں کھریوں تخلیقات میں سے ایک ہے۔

دعا قبول نہیں ہوتی تو آسرے اور وسیلے تلاش کرنے کے بجائے صرف ہاتھ اٹھا لیجئے، اللہ سے

خود مانگیں۔ دے دے تو شکر کریں، نہ دے تو صبر..... مگر ہاتھ آپ خود ہی اٹھائیں۔

زندگی کا قرینہ اور سلیقہ نہیں آ رہا تو اسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف چلے جائیں، سب کچھ مل جائے گا آپ کو۔

احترام ہر ایک کا کریں۔ ہر ولی کا، ہر مومن کا، ہر بزرگ کا، ہر شہید کا، ہر صالح کا، ہر پارہ ساکا..... مگر اپنی زندگیوں میں ہدایت اور رہنمائی صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لیں کیونکہ انہوں نے آپ تک اپنے ذاتی احکامات نہیں پہنچائے جو کچھ بتایا ہے وہ اللہ کا نازل کردہ ہے۔

ڈاکٹر سید سید علی کون ہے، کیا ہے، کون جانتا ہے اسے؟ آپ.....؟ آپ کے علاوہ چند سو لوگ..... چند ہزار لوگ مگر جس بیر کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کر رہا ہوں انہیں تو ایک ارب کے قریب لوگ اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں۔ میں تو وہی کچھ کہتا، دہراتا پھر رہا ہوں، جو چودہ سو سال پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما چکے ہیں۔ کیا نئی بات کہی میں نے؟“

ڈاکٹر سید علی خاموش ہو گئے تھے۔ کمرے میں موجود ہر شخص پہلے ہی خاموش تھا۔ انہوں نے وہاں بیٹھے ہر شخص کو جیسے آئینہ دکھایا تھا اور آئینے میں نظر آنے والا عکس کسی کو بولا رہا تھا، کسی کو لرز رہا تھا۔

وہاں سے باہر آکر سالار بہت دیر تک اپنی گاڑی کی سیٹ پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں پر بندھی آخری پٹی بھی آج کھول دی گئی تھی۔

کئی سال پہلے جب امامہ ہاشم سوچے کبھی بغیر گھر سے نکل پڑی تھی تو وہ اس لگن کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ اس کے نزدیک وہ حماقت تھی۔ بعد میں اس نے اپنے خیالات میں ترمیم کر لی تھی۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ کوئی بھی واقعی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اس حد تک گرفتار ہو سکتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ دے۔

اس نے اسلام کے بارے میں جانا شروع کیا تو اسے پتا چلا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی اسی طرح کی قربانیاں دیا کرتے تھے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک ان گنت لوگ تھے اور ہر زمانے میں تھے اور سالار سکندر نے اقرار کر لیا تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اتنی طاقت تھی کہ وہ کسی کو بھی کچھ بھی چھوڑنے پر مجبور کر دیتا۔ اس نے کبھی اس محبت کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ آج وہاں بیٹھا کھلی بار یہ کام کر رہا تھا۔

یہ صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہیں تھی، جس نے امامہ ہاشم کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ صراطِ مستقیم کو دیکھ کر اس طرف چلی گئی تھی۔ اس صراطِ مستقیم کی طرف جسے وہ کسی زمانے میں اندھوں کی طرح ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ وہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی اسی صراطِ مستقیم کی طرف جاتے تھے۔

امامہ ہاشم نے کئی سال پہلے بیر کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پایا تھا۔ وہ بے خوفی اسی ہدایت اور رہنمائی کی عطا کردہ تھی جو اسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے ملی تھی۔ وہ آج تک

بیر کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خود شناخت نہیں کر پایا تھا اور امام ہاشم نے ہر کام خود کیا تھا۔ شناخت سے اطاعت تک۔۔۔ اس کو سالار سکندر کی طرح دوسروں کے کندھوں کی ضرورت نہیں پڑی۔

سالار سکندر نے پچھلے آٹھ سالوں میں امام ہاشم کے لئے ہر جذبہ محسوس کیا تھا۔ حقارت، تضحیک، پھینچتاوا، نفرت، محبت، سب کچھ۔۔۔ مگر آج وہاں بیٹھے پہلی بار اسے امام ہاشم سے حسد ہو رہا تھا۔ تھی کیا وہ۔۔۔؟ ایک عورت۔۔۔ ذرا سی عورت۔۔۔ آسمان کی حور نہیں تھی۔۔۔ سالار سکندر جیسے آدمی کے سامنے کیا اوقات تھی اس کی۔

کیا میرے جیسا آئی کیو تھا اس کا؟

کیا میرے جیسی کامیابیاں تھیں اس کی؟

کیا میرے جیسا کام کر سکتی تھی وہ؟

کیا میرے جیسا نام کما سکتی تھی؟

کچھ بھی نہیں تھی وہ اور اس کو سب کچھ پلیٹ میں رکھ کر دے دیا اور میں۔۔۔ میں جس کا آئی کیو ۱۵۰+ ہے مجھے سامنے کی چیزیں دیکھنے کے قابل نہیں رکھا؟

وہ اب آنکھوں میں نمی لے لے اندھیرے میں ونڈا سکرین سے باہر دیکھتے ہوئے بڑ بڑا رہا تھا۔

”مجھے بس اس قابل کر دیا کہ میں باہر لنگھوں اور دنیا فتح کر لوں۔ وہ دنیا جس کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے اور وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“

وہ ڈک گیا۔ اسے امام پر غصہ آرہا تھا۔ آٹھ سال پہلے کا وقت ہو تا تو وہ اسے ”بچ“ کہتا، اب امام پر غصہ آنے پر وہ اسے یہی کہا کرتا تھا مگر آٹھ سال کے بعد آج وہ زبان پر اس کے لئے گالی نہیں لاسکتا تھا۔ وہ امام ہاشم کے لئے کوئی برا لفظ نکالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ صراط مستقیم پر خود سے بہت آگے کھڑی اس عورت کے لئے کون زبان سے برا لفظ نکال سکتا تھا؟

اپنے گلاسز اتار کر اس نے اپنی آنکھیں مسلیں۔ اس کے انداز میں شکست خوردگی تھی۔

”بیر کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔۔۔ صراط مستقیم۔“ آٹھ سال لگے تھے، مگر تلاش ختم ہو گئی تھی۔

جو اب مل چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

دو دنوں ایک ریسٹوران میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رمضہ آج خاص طور پر تیار ہو کر آئی تھی۔ وہ خوش تھی اور کوئی بھی اس کے چہرے سے اس کی خوشی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ سالار بھی۔

ویٹر سے مینیو کارڈ لے کر سالار نے بند کر کے نمبل پر رکھ دیا۔ رمضہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ اپنا کارڈ کھولے ہوئے تھی۔

”بچ میری طرف سے ہے مگر مینیو آپ ملے کریں۔“ سالار نے مدغم مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”اوکے۔“ رمضہ بے اختیار مسکرائی پھر وہ مینیو کارڈ پر نظر دوڑانے لگی اور سالار قرب و جوار میں۔

رمضہ نے ویٹر کو کچھ ڈسزنوٹ کروائیں۔ جب ویٹر چلا گیا تو اس نے سالار سے کہا۔

”تمہاری طرف سے بچ کی یہ دعوت بڑا اچھا سہرا ہے میرے لئے۔ پہلے تو کبھی تم نے ایسی کوئی دعوت نہیں دی؟ بلکہ میری دعوت بھی رد کرتے رہے۔“

”ہاں لیکن اب ہم دونوں کے لئے کچھ باتیں کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ مجھے اسی لئے تمہیں یہاں بلانا پڑا۔“ سالار نے کہا۔

رمضہ نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

”کچھ باتیں؟۔۔۔ کون سی باتیں؟“

”پہلے بچ کر لیں، اس کے بعد کریں گے۔“ سالار نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

”مگر بچ آنے اور کھانے میں کافی وقت لگے گا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم وہ باتیں ابھی کر لیں؟“

رمضہ نے قدرے بے تابئی سے کہا۔

”نہیں، یہ بہتر نہیں ہے۔“ بچ کے بعد۔“ سالار نے مسکراتے ہوئے مگر حتمی انداز میں کہا۔

رمضہ نے اس بار اصرار نہیں کیا۔ وہ دونوں ہلکی پہلکی گفتگو کرنے لگے پھر بچ آ گیا اور دونوں بچ میں مصروف ہو گئے۔

بچ سے فارغ ہونے میں تقریباً پون گھنٹہ لگا، پھر سالار نے ویٹر سے کافی منگوائی۔

”میرا خیال ہے، اب بات شروع کرنی چاہئے۔“

رمضہ نے کافی کا پہلا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ سالار اب بہت سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنی کافی میں تھج ہار رہا تھا۔ رمضہ کی بات پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں تم سے اس کارڈ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں، جو تم نے دو دن پہلے مجھے بھیجا ہے۔“

رمضہ کا چہرہ قدرے سرخ ہو گیا۔

دو دن پہلے جب وہ شام کو اپنے قلیت پر پہنچا تو وہاں ایک کارڈ اور کیے اس کا منتظر تھا۔ وہ ایک ہفتہ بانگ کانگ میں بینک کے کسی کام کے لئے رہا تھا اور اسی شام وہ واپس آیا تھا۔ کارڈ رمضہ کا بھیجا ہوا تھا۔

”تمہیں دو بارہ دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو گی اس کا اظہار ناممکن ہے۔“

سالار کارڈ پر لکھے پیغام کو پڑھ کر چند لمحوں کے لئے ساکت رہ گیا۔ اس کے بدترین خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ رمضہ اس کے لئے اپنے احساسات کا اظہار کر رہی تھی۔

سالار نے اگلے دو دن اس کارڈ کے بارے میں رمضہ سے کوئی تذکرہ نہیں کیا لیکن اس نے ویک

ایڈ پر اسے لٹکی دعوت دے ڈالی۔ رمہ کے ساتھ اب ان تمام باتوں کو کلیئر کرنا ضروری ہو گیا تھا۔
”تمہیں کارڈ برانکا؟“ رمہ نے کہا۔

”نہیں، بیٹام۔“

رمہ کچھ شرمندہ ہو گئی۔

”آئی ایم سوری، مگر میں صرف..... سالارا میں تمہیں بتانا چاہ رہی تھی کہ میں نے تمہیں کتنا مس کیا۔“

سالار نے کافی کا ایک گھونٹ لیا۔

”تم مجھے اچھے لگتے ہو، میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

رمہ نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

”ہو سکتا ہے یہ پروپوزل تمہیں عجیب لگے لیکن میں بہت عرصے سے اس سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ میں تم سے فلرٹ نہیں کر رہی ہوں جو کچھ کارڈ میں نے لکھا ہے میں واقعی تمہارے لئے وہی جذبات رکھتی ہوں۔“

سالار نے اسے بات مکمل کرنے دی۔ اب وہ کافی کا کپ نیچے رکھ چکا تھا۔

”لیکن میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ جب وہ خاموش ہو گئی تو اس نے دونوں انداز میں کہا۔
”کیوں؟“

”کیا اس سوال کا جواب ضروری ہے؟“ سالار نے کہا۔

”نہیں، ضروری نہیں ہے مگر بتانے میں کیا حرج ہے۔“

”تم مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتی ہو؟“ سالار نے جواباً پوچھا۔

”کیونکہ تم مختلف ہو۔“

سالار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”عام مردوں جیسے نہیں ہو، وقار ہے تم میں، پھر ڈاؤر گروڈ ہو۔“

”میں ایسا نہیں ہوں۔“

”جانت کرو۔“ رمہ نے اسے جیسے چیلنج کیا۔

”کر سکتا ہوں مگر نہیں کروں گا۔“ اس نے کافی کا کپ دوبارہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ہر مرد سالار سکندر سے بہتر ہے۔“

”کس لحاظ سے؟“

”ہر لحاظ سے۔“

”میں نہیں مانتی۔“

”تمہارے نہ ماننے سے حقیقت نہیں بدلے گی۔“

”میں تمہیں جانتی ہوں، ڈیڑھ سال سے تمہارے ساتھ کام کر رہی ہوں۔“

”مردوں کے بارے میں اتنی جلدی کسی رائے پر پہنچنا مناسب نہیں ہوتا۔“

”تمہاری کوئی بات تمہارے بارے میں میری رائے کو تبدیل نہیں کر سکتی۔“ رمہ اب بھی اپنی بات پر قائم تھی۔

”تم جس فیملی سے تعلق رکھتی ہو، جس سوسائٹی میں مود کرتی ہو، وہاں تمہیں مجھ سے زیادہ اچھے مرد مل سکتے ہیں۔“

”تم مجھ سے صرف اپنی بات کرو۔“

”رمہ! میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔“

اس نے بالآخر کہہ دیا۔ اس ساری گفتگو میں پہلی بار رمہ کی رنگت زرد پڑی۔

”تم نے..... تم نے کبھی..... کبھی نہیں بتایا۔“

سالار آہستہ سے مسکرایا۔ ”ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی تو کبھی بھی نہیں رہی۔“

”تم اس سے شادی کر رہے ہو؟“

دونوں کے درمیان اس بار خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔

”ہو سکتا ہے کچھ مشکلات کی وجہ سے میری وہاں شادی نہ ہو سکے۔“ سالار نے کہا۔

”میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکی۔ تم کسی سے محبت کر رہے ہو، یہ جانتے ہوئے کہ وہاں تمہاری شادی نہیں ہو سکتی؟“

”کچھ ایسا ہی ہے۔“

”سالارا! تم..... تم اتنے جذباتی تو نہیں ہو۔ ایک پریکٹیکل آدمی ہو کر تم کس طرح کی عجیب بات کر رہے ہو۔“

رمہ استہزائیہ انداز میں ہنس دی۔

”فرض کیا کہ وہاں تمہاری شادی نہیں ہوئی تو پھر..... پھر کیا تم کبھی شادی نہیں کرو گے؟“

”نہیں۔“

رمہ نے نفی میں سر ہلایا۔ I can't believe it (مجھے یقین نہیں آرہا)۔

”مگر ایسا ہی ہے، میں نے اگر کبھی شادی کا سوچا بھی تو دس پندرہ سال بعد ہی سوچوں گا اور دس پندرہ سال تک ضروری نہیں کہ میں زندہ رہوں۔“

اس نے بے حد خشک لہجے میں کہتے ہوئے وینر کو ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلا دیا۔

”میں چاہتا ہوں رمہ! اگر آج کی اس گفتگو کے بعد ہم دونوں کے درمیان دوبارہ ایسا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو۔ ہم اچھے کو لیک ہیں۔ میں چاہتا ہوں یہ تعلق ایسے ہی رہے۔ میرے لئے اپنا وقت ضائع مت کرو، میں وہ نہیں ہوں، جو تم مجھے سمجھ رہی ہو۔“

وینر قریب آ گیا تھا۔ سالار اس کا لایا ہوا اٹل ادا کرنے لگا۔

رمہ، سالار کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ اب کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

سالار اس روز کسی کام سے بیچ بریک کے بعد آفس سے نکل آیا۔ ریلوے کراسنگ پر ٹریفک کا اژدحام دیکھ کر اس نے دور سے ہی گاڑی موڑ لی۔ وہ اس وقت کسی ٹریفک جام میں پھنس کر وقت ضائع کرتا نہیں چاہتا تھا۔

گاڑی کو پیچھے موڑ کر اس نے ایک دوسری سڑک پر ٹرن لے لیا۔ وہ اس سڑک پر تھوڑی ہی آگے گیا تھا جب اس نے سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر ایک بوڑھی خاتون کو بیٹھے دیکھا۔ وہ ایک بائی روڈ تھی اور اس وقت بالکل سناٹا تھی۔ خاتون اپنے لباس اور چہرے سے کسی بہت اچھے گھرانے کی نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سونے کی کچھ چوڑیاں بھی نظر آرہی تھیں اور سالار کو خدشہ ہوا کہ اس اکیلی سڑک پر وہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس نے گاڑی ان کے قریب لے جا کر روک دی۔ خاتون کی سفید رنگت اس وقت سرخ تھی اور سانس پھولا ہوا تھا اور شاید وہ اپنا سانس ٹھیک کرنے کے لئے ہی سڑک کے کنارے بیٹھی تھی۔

”السلام علیکم اماں! کیا مسئلہ ہے، آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟“

سالار نے اپنے سن گلاسز اتارتے ہوئے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔

”بیٹا! مجھے رکشہ نہیں مل رہا۔“

سالار ان کی بات پر حیران ہوا۔ وہ مین روڈ نہیں تھی۔ ایک رہائشی علاقے کی بائی روڈ تھی اور وہاں رکشہ ملنے کا امکان نہیں تھا۔

”اماں جی! یہاں سے تو آپ کو رکشہ مل بھی نہیں سکتا۔ آپ کو جانا کہاں ہے؟“

اس خاتون نے اسے اندرون شہر کے ایک علاقے کا نام بتایا۔ سالار کے لئے بالکل ممکن نہیں تھا کہ وہ انہیں وہاں پھوڑ آتا۔

”آپ میرے ساتھ آ جائیں۔ میں آپ کو مین روڈ پر پھوڑ دیتا ہوں۔ وہاں سے آپ کو رکشہ مل

جائے گا۔“

سالار نے پچھلے دروازے کا لاک کھولا اور پھر اپنی سیٹ سے اتر گیا مگر اماں جی اسے خاصی متامل نظر آئیں۔ وہ ان کے اندیشوں کو بھانپ گیا۔

”اماں جی! ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں شریف آدمی ہوں۔ آپ کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں صرف آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ اس سڑک سے تو آپ کو رکشہ ملے گا نہیں اور اس وقت سڑک سناٹا ہے، آپ نے زیور پہنا ہوا ہے، کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے آپ کو۔“

سالار نے نرمی سے ان کے اندیشے دور کرنے کی کوشش کی۔ خاتون نے اپنی ٹیک دست کرتے ہوئے اپنی چوڑیوں کو دیکھا اور پھر سالار سے کہا۔

”لو..... یہ ساراز یور تو نطقی ہے۔“

”چلیں، یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر کوئی بھی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ کوئی آپ سے یہ تھوڑی پوچھے گا کہ یہ زیور اصل ہے یا نقلی۔“

سالار نے ان کے جھوٹ کا پردہ دھکتے ہوئے کہا۔

وہ اب سوچ میں پڑ گئیں۔ سالار کو دیر ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے اماں جی! آپ اگر مناسب نہیں.....“

اس نے واپس اپنی گاڑی کی طرف قدم بڑھائے تو اماں جی فوراً بول اٹھیں۔

”نہیں، نہیں۔ میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔ پہلے ہی ٹانگیں ٹوٹ رہی ہیں چل چل کے۔“

وہ ٹانگوں پر زور دیتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

سالار نے ان کا ہانڈ پکڑ کر انہیں اٹھایا۔ چھٹی سیٹ کا دروازہ کھول کر انہیں اندر بٹھادیا۔

بائی روڈ کو تیزی سے کراس کر کے وہ مین روڈ پر آ گیا۔ اب وہ کسی خالی رکشہ کی تلاش میں تھا مگر اسے رکشہ نظر نہیں آیا۔ وہ آہستہ آہستہ گاڑی چلاتے ہوئے کسی خالی رکشہ کی تلاش میں ٹریفک پر نظریں دوڑانے لگا۔

”نام کیا ہے بیٹا تمہارا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”سالار۔“

”سالار؟“ انہوں نے جیسے تصدیق چاہی۔ وہ بے اختیار مسکرایا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنے نام کو بگڑتے سنا تھا۔ تصحیح کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ ہنگامی خاتون تھیں اور اس سے بمشکل اردو میں بات کر رہی تھیں۔

”جی۔“ سالار نے تصدیق کی۔

”یہ کیا نام ہوا، مطلب کیا ہے اس کا؟“ انہوں نے یک دم دلچسپی لی۔

سالار نے انہیں اپنے نام کا مطلب اس بار پنجابی میں سمجھایا۔ اماں جی کو اس کے پنجابی بولنے پر خاصی خوشی ہوئی اور اب وہ پنجابی میں گفتگو کرنے لگیں۔

سالار کے نام کا مطلب پوچھنے کے بعد انہوں نے کہا۔

”میری بڑی بہو کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔“

وہ حیران ہوا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ نام کا مطلب جاننے کے بعد ان کا اگلا جملہ یہ ہوگا۔

”جی..... مبارک ہو۔“ فوری طور پر اسے یہی سوچھا۔

”خیر مبارک۔“

انہوں نے خاصی مسرت سے اس کی مبارکباد وصول کی۔

”میری بہو کا فون آیا تھا، پوچھ رہی تھی کہ امی! آپ نام بتائیں۔ میں تمہارا نام دے دوں؟“

اس نے بیک و بومر سے کچھ حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

”دے دیں۔“

”چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا۔“

اماں جی اب اطمینان سے ٹینک اُتار کر اپنی بڑی سی چادر کے پلو سے اس کے شیشے صاف کرنے لگیں۔ سالار کو ابھی تک کوئی رکشہ نظر نہیں آیا تھا۔

”عمر کتنی ہے تمہاری؟“ انہوں نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے توڑا تھا۔

”تیس سال۔“

”شادی شدہ ہو؟“

سالار سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ہاں کہنا چاہتا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ ہاں کی صورت میں سوالات کا

سلسلہ مزید دراز ہو جائے گا اس لئے بہتر یہی تھا کہ انکار کر دے اور اس کا یہ اندازہ اس دن کی سب سے

فاش غلطی ثابت ہوا۔

”نہیں۔“

”شادی کیوں نہیں کی؟“

”بس ایسے ہی۔ خیال نہیں آیا۔“ اس نے جھوٹ بولا۔

”اچھا۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ سالار دعا نہیں کرتا رہا کہ اسے رکشہ جلدی مل جائے۔ اسے دیر ہو رہی تھی۔

”کیا کرتے ہو تم؟“

”میں بینک میں کام کرتا ہوں۔“

”کیا کام کرتے ہو؟“

سالار نے اپنا عہدہ بتایا۔ اسے اندازہ تھا کہ اماں جی کے سر کے اوپر سے گزرے گا مگر وہ اس وقت

ہکا ہکا رہ گیا جب انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”یہ افسر ہوتا ہے نا؟“

وہ بے اختیار ہنسا۔ اس سے زیادہ اچھی وضاحت کوئی اس کے کام کی نہیں دے سکتا تھا۔

”جی اماں جی! افسر ہوتا ہے۔“ وہ محظوظ ہوا۔

”کتنا پڑھے ہو تم؟“

”سولہ جماعتیں۔“

اس بار سالار نے اماں جی کا فارمولہ استعمال کرتے ہوئے اپنی تعلیم کو آسان لفظوں میں پیش کیا۔

اماں جی کا جواب اس بار بھی حیران کن تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی سولہ جماعتیں.....؟ ایم بی اے کیا ہے یا ایم اے اکناکس؟“

سالار نے بے اختیار پلٹ کر اماں جی کو دیکھا۔ وہ اپنی ٹینک کے شیشوں سے اسے گھور رہی تھیں۔

”اماں جی! آپ کو پتا ہے ایم بی اے کیا ہوتا ہے یا ایم اے اکناکس کیا ہوتا ہے؟“ وہ واقعی حیران تھا۔

”کو مجھے نہیں پتا ہوگا؟ میرے بڑے بیٹے نے پہلے ایم اے اکناکس کیا اور ہر پاکستان سے پھر انگریز

جا کر اس نے ایم بی اے کیا۔ وہ بھی بینک میں ہی کام کرتا ہے مگر ادھر انگریز ہیں۔ اسی کا تو بیٹا ہوا ہے۔“

سالار نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے گردن واپس موڑ لی۔

”تو پھر تم نے بتایا نہیں؟“

”ہاں؟“

سالار کو فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ انہوں نے کیا پوچھا تھا۔

”اپنی تعلیم کے بارے میں؟“

”میں نے ایم بی اے کیا ہے۔“

”کہاں سے؟“

”امریکہ سے۔“

”اچھا..... ماں باپ ہیں تمہارے؟“

”جی۔“

”کتنے بہن بھائی ہیں؟“ سوالات کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا تھا۔

”پانچ۔“ سالار کو کوئی جائزے فرار نظر نہیں آ رہی تھی۔

”تقی نہیں اور کتنے بھائی؟“

”ایک بہن اور چار بھائی۔“

”شادیاں کتنوں کی ہوئی ہیں؟“

”میرے علاوہ سب کی۔“

”تم سب سے چھوٹے ہو؟“

”نہیں، چوتھے نمبر پر ہوں۔ ایک بھائی چھوٹا ہے۔“

سالار کو اب پہلی بار اپنے ”سوشل ورک“ پر چھٹا ہونے لگا۔

”اس کی بھی شادی ہوگئی؟“

”جی۔“

”تو پھر تم نے شادی کیوں نہیں کی؟ کوئی محبت کا پتھر تو نہیں ہے؟“

اس بار سالار کے بیروں کے نیچے سے حقیقت میں زمین کھسک گئی۔ وہ ان کی قیادہ شامی کا تامل ہونے لگا۔

”اماں جی! رکشہ نہیں مل رہا۔ آپ مجھے ایڈریس بتادیں، میں آپ کو خود چھوڑ آ جا ہوں۔“

سالار نے ان کے سوال کا جواب گول کر دیا۔

دیر تو اسے پہلے ہی ہو چکی تھی اور رکشے کا ابھی بھی کہیں نام و نشان نہیں تھا اور وہ اس بوڑھی خاتون

کو کہیں سڑک پر بھی کھڑا نہیں کر سکتا تھا۔

اماں جی نے اسے پتا بتایا۔

سالار کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک چوک میں کھڑے ٹریفک کانسٹیبل کو اس نے وہ پتا دہرا کر مد

کرنے کے لئے کہا۔ کانسٹیبل نے اسے علاقے کا راستہ سمجھایا۔

سالار نے وہ بارہ گاڑی چلانا شروع کی۔

”تو پھر تم نے مجھے بتایا نہیں کہ کہیں محبت کا پتھر تو نہیں تھا؟“

سالار کا دل چاہا وہ کہیں ڈوب کر مر جائے۔ وہ خاتون ابھی تک اپنا سوال نہیں بھولی تھیں جبکہ وہ

صرف اس سوال کے جواب سے بچنے کے لئے انہیں گھر چھوڑنے پر تیار ہوا تھا۔

”نہیں اماں جی! ایسی کوئی بات نہیں۔“

اس بار اس نے سجدیگی سے کہا۔

”الحمد للہ۔“ وہ اماں جی کی اس ”الحمد للہ“ کا سیاق و سباق سمجھ نہیں پایا اور اس نے اس کا تڑد بھی

نہیں کیا۔

اماں جی اب اس کے ماں باپ کے بارے میں کرید کرید کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش فرما رہی تھیں۔ سالار واقعی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

سب سے بڑی گڑبڑ اس وقت ہوئی جب وہ اماں جی کے بتائے ہوئے علاقے میں پہنچا اور اس نے اماں جی سے مطلوبہ گلی کی طرف رہنمائی کرنے کی درخواست فرمائی اور اماں جی نے کمال اطمینان سے کہا۔

”اب یہ تو مجھے پتہ ہے کہ اس علاقے میں گھر ہے مگر پتہ مجھے معلوم نہیں۔“

وہ بھونچکا رہ گیا۔

”اماں جی! تو گھر کیسے پہنچاؤں میں آپ کو۔ پتے کے بغیر اس علاقے میں آپ کو کہاں ڈراپ کروں؟“

وہ اپنے گھر پر لکھا نمبر اور نام بتانے لگیں۔

”نہیں اماں جی! آپ مجھے گلی کا نام بتائیں۔“

وہ گلی کے نام کی بجائے نشانیاں بتانے لگیں۔

”طلوائی کی ایک دکان ہے گلی کے کونے میں..... بہت کھلی گلی ہے..... پرویز صاحب کا گھر بھی وہیں ہے، جن کے بیٹے نے جرمنی میں شادی کی ہے پچھلے ہفتے..... پہلی بیوی اس کی ادھر ہی ہے ہمارے محلے میں..... شادی کی اطلاع ملنے پر بے چاری نے رور و کر مٹھہ سر پر اٹھالیا۔“

وہ نشانیاں بتاتے بتاتے کہیں اور نکل گئیں۔

سالار نے سڑک کے کنارے گاڑی کھڑی کر دی۔

”اماں جی! آپ کے شہر کا کیا نام ہے؟ گھر کے بارے میں اور گلی کے بارے میں کچھ تفصیل سے بتائیں، اس طرح تو میں کبھی بھی آپ کو گھر نہیں پہنچا سکوں گا۔“

اس نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”میں سعیدہ اماں کے نام سے جانی جاتی ہوں۔ میاں بے چارے تو دس سال پہلے فوت ہو گئے۔ ان کو تو لوگ بھول بھال گئے اور گلی کا میں تمہیں بتا رہی ہوں، بہت بڑی گلی ہے۔ تین دن پہلے گھر کے دو ڈھکن لگا کر گئے ہیں، بالکل نئے۔ سینٹ سے جوڑ کر گئے ہیں۔ ہر ماہ کوئی نہ کوئی اتار کر لے جاتا تھا، اب بے فکری ہو گئی ہے۔“

سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

”اماں جی! کیا میں یہ کہہ کر لوگوں سے آپ کی گلی کا پوچھوں کہ گھر کے دو نئے ڈھکنوں والی گلی۔“

آپ وہاں کے کسی ایسے شخص کا نام بتائیں جسے لوگ جانتے ہوں جو قدرے معروف ہو۔“

”وہ مرتضیٰ صاحب ہیں جن کے بیٹے مظفر کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی کل صبح۔“

”اماں جی! یہ کوئی تعارف نہیں ہوتا۔“

وہ اس کی بات پر برلمان گئیں۔

”لو بھلا، اب کیا ہر گھر میں ٹانگ ٹوٹی ہے کسی نہ کسی کی۔“

سالار چپ چاپ گاڑی سے اتر گیا۔ آس پاس کی دکانوں سے اس نے سعید و اماں کے بتائے ہوئے ”کوائف“ کے مطابق گلی تلاش کرنا شروع کی، مگر جلد ہی اسے پتہ چل گیا کہ ان نشانوں کے ساتھ وہ کم از کم آج کی تاریخ میں گھر نہیں ڈھونڈ سکتا۔

وہ مایوس ہو کر واپس لوٹا۔

”اماں جی! گھر میں فون ہے آپ کے؟“ گاڑی کے اندر گھستے ہی اس نے پوچھا۔

”ہاں ہے۔“

سالار نے سکون کا سانس لیا۔

”اس کا نمبر بتائیں مجھے۔“ سالار نے اپنا موبائل نکالتے ہوئے کہا۔

”نمبر کا تو مجھے نہیں پتا۔“

وہ ایک بار پھر دھک سے رو گیا۔

”فون نمبر بھی نہیں پتا؟“ اس نے شدید صدمے کے عالم میں کہا۔

”بیٹا! میں نے کون سا کبھی فون کیا ہے۔ میرے بیٹے خود کر لیتے ہیں، ارشہ دار بھی خود کر لیتے ہیں

یا ضرورت ہو تو بیٹی فون ملا دیتی ہے۔“

”ادھر ماڈل ٹاؤن میں کس کے پاس گئی تھیں؟“

سالار کو یک دم خیال آیا۔

”ادھر کچھ رشتہ دار ہیں میرے۔ پوتے کی مشائی دینے گئی تھی۔“

انہوں نے فخریہ بتایا۔

سالار نے سکون کا سانس لیتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔

”ٹھیک ہے، ادھر ہی چلتے ہیں۔ وہاں کا پتہ بتائیں۔“

”پتہ تو مجھے نہیں پتا۔“

سالار اس بار صدمے سے کچھ دیر کے لئے بول بھی نہ سکا۔

”تو پھر گئی کیسے تھیں آپ؟“

”بیٹا! اصل میں جہاں جانا ہو مسائے کے بچے چھوڑ آتے ہیں، ان ہی کو گھر کا پتہ ہے۔ پچھلے دس

سال سے مجھے وہی لے کر جا رہے ہیں۔ وہ چھوڑ آتے ہیں اور پھر وہاں سے بلال وغیرہ واپس چھوڑ جاتے

ہیں۔ اصل میں یہ بلال وغیرہ بھی پہلے میرے محلے میں ہی رہتے تھے۔ یہی کوئی دس بارہ سال پہلے ادھر گئے ہیں اس لئے میرے پورے محلے کو ان کے گھر کا پتہ ہے۔“

سالار نے کچھ نہیں کہا۔ اسے اب بھی اُمید تھی کہ جہاں سے اس نے ان خاتون کو پک کیا ہے بلال وغیرہ کا گھر وہیں کہیں ہو گا۔

سعید و اماں کی گفتگو جاری تھی۔

”آج تو ایسا ہوا کہ بلال کے گھر پر کوئی قہاری نہیں، صرف ملازمہ تھی۔ میں کچھ دیر بیٹھی رہی پھر بھی وہ لوگ نہیں آئے تو میں نے سوچا کہ خود گھر چلی جاؤں اور پھر ماشاء اللہ تم مل گئے۔“

”اماں جی! آپ رکشے والے کو کیا بتائیں؟“

”وہی جو تمہیں بتایا ہے۔“

وہ ان کی ذہانت پر باغ باغ ہو گیا۔

”اس سے پہلے کبھی آپ اس طرح پتہ بنا کر گھر پہنچیں ہیں؟“

اس نے قدرے افسوس بھرے لہجے میں گاڑی کو ریورس کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہ۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ ضرورت ہی نہیں پڑی۔“

سعید و اماں کا اطمینان قابل رشک تھا۔ سالار مزید کچھ کہے بغیر گاڑی سڑک پر لے آیا۔

”اب تم کہاں جا رہے ہو؟“

سعید و اماں زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکیں۔

”جہاں سے میں نے آپ کو لیا تھا گھر اسی سڑک پر ہو گا، آپ نے کوئی ٹرن تو نہیں لیا تھا؟“

سالار نے بیک ویو مرر سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، میں نے نہیں لیا۔“

سعید و اماں نے قدرے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

سالار نے ان کے لہجے پر غور نہیں کیا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کا مطلب تھا گھر اس

سڑک پر ہی کہیں تھا اور گلیوں کی نسبت کالونی میں گھر تلاش کرنا آسان تھا۔ وہ بھی اس صورت میں جب

اسے صرف ایک سڑک کے گھر دیکھنے تھے۔

”تم سگریٹ پیتے ہو؟“

خاموشی یک دم ٹوٹی۔ وہ گاڑی ڈرائیو کرتے کرتے چونک گیا۔

”میں۔۔۔؟“

اس نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ سعید و اماں بھی بیک ویو مرر میں ہی دیکھ رہی تھیں۔

”آ..... نہیں۔“

وہ سوال کو سمجھ نہیں سکا تھا۔

”کوئی اور نشہ وغیرہ۔“

وہ اس بار سوال سے زیادہ ان کی بے تکلفی پر حیران ہوا۔

”آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”بس ویسے ہی۔ اب اتنا لمبا راستہ میں خاموش کیسے رہوں گی۔“

انہوں نے اپنی مجبوری بتائی۔

”آپ کو کیا لگتا ہے، میں کرتا ہوں گا کوئی نشہ؟“

سالار نے جواباً ان سے پوچھا۔

”نہیں، کہاں..... اسی لئے تو میں پوچھ رہی ہوں..... تو پھر نہیں کرتے؟“

ان کے انداز نے اس بار سالار کو مفلطہ کیا۔

”نہیں۔“ اس نے مختصر آکھا۔ وہ اب سکتل پر رزکے ہوئے تھے۔

”کوئی گرل فرینڈ ہے؟“ سالار کو لگا اُسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اس نے پلٹ کر سعیدہ اماں

کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ نے کیا پوچھا ہے؟“

”میں نے کہا ہے، کوئی گرل فرینڈ ہے؟“ سعیدہ اماں نے ”گرل فرینڈ“ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

سالار کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”آپ کو پتا ہے گرل فرینڈ کیا ہوتی ہے؟“

سعیدہ اماں اس کے سوال پر برامان گئیں۔

”کیوں بھئی..... دو بیٹے ہیں میرے، مجھے پتا نہیں ہو گا کہ گرل فرینڈ کیا ہوتی ہے۔ جب انہیں

باہر پڑھنے کے لئے بھیجا تھا تو کہہ کر بھیجا تھا میرے شوہرنے کہ گرل فرینڈ نہیں ہونی چاہئے اور پھر مینے

میں ایک بار فون آتا تھا دونوں کا۔“

سکتل کھل گیا۔ سالار مسکراتے ہوئے سیدھا ہو گیا اور ایک سیلیٹر پر پاؤں دبا دیا۔

سعیدہ اماں نے بات جاری رکھی۔

”میں دونوں سے کتنی تھی کہ قسم کھا کر بتائیں، انہوں نے کوئی گرل فرینڈ بتائی تو نہیں۔ جب تک

شادیاں نہیں ہو گئیں۔ ہر بار فون پر سب سے پہلے دونوں قسم کھا کر یہی بتا کرتے تھے مجھے۔ سلام بھی بعد

میں کیا کرتے تھے۔“

وہ فخریہ انداز میں بتاتی جا رہی تھیں۔

”بڑے تابعدار بنچے ہیں میرے۔ دونوں نے گرل فرینڈ نہیں بنائی۔“

”آپ نے اپنی پسند سے دونوں کی کہیں شادیاں کی ہیں؟“

سالار نے پوچھا۔

”نہیں، دونوں نے اوہری اپنی پسند سے شادیاں کی ہیں۔“

انہوں نے سادگی سے کہا۔ سالار کے حلق سے بے اختیار قبضہ نکلا۔

”کیا ہوا؟“ سعیدہ اماں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں، آپ کی ہونٹیں انگریز ہیں؟“

”نہیں، پاکستانی ہیں مگر وہیں رہتی تھیں۔ میرے بیٹوں کے ساتھ کام کرتی تھیں مگر تم ہنسے کیوں؟“

سعیدہ اماں نے اپنا سوال دہرایا۔

”کوئی خاص بات نہیں۔“

سعیدہ اماں کچھ دیر خاموش رہیں پھر انہوں نے کہا۔

”تو تم نے بتایا نہیں کہ گرل فرینڈ.....“

سالار نے بات کاٹ دی۔

”نہیں ہے سعیدہ اماں! گرل فرینڈ بھی نہیں ہے۔“

”ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ۔“ وہ ایک بار پھر اس ماشاء اللہ کا سیاق و سباق سمجھنے میں ناکام رہا۔

”گھرا پتا ہے؟“

”نہیں کرائے کا ہے۔“

”کوئی ملازم وغیرہ ہے؟“

”مستقل تو نہیں ہے مگر صفائی وغیرہ کے لئے ملازم رکھا ہوا ہے۔“

”اور یہ گاڑی تو اپنی ہی ہو گی؟“

”جی۔“

”اور تنخواہ کتنی ہے؟“

سالار روانی سے جواب دیتے دیتے ایک بار پھر چونکا۔ گفتگو کس نوعیت پر جا رہی تھی، فوری طور

پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

”سعیدہ اماں! آپ یہاں اکیلی کیوں رہتی ہیں۔ اپنے بیٹوں کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں؟“

سالار نے موضوع بدلا۔

”ہاں، میرا یہی ارادہ ہے۔ پہلے تو میرا دل نہیں چاہتا تھا مگر اب یہ سوچا ہے کہ بیٹی کی شادی کر لوں تو پھر باہر چلی جاؤں گی۔ اکیلے رہتے رہتے تنگ آگئی ہوں۔“

سالار اب اس سڑک پر آگیا تھا جہاں سے اس نے سعیدہ اماں کو پک کیا تھا۔

”میں نے آپ کو یہاں سے لیا تھا۔ آپ بتائیں، ان میں سے کون سا گھر ہے؟“ سالار نے گاڑی کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے دائیں طرف کے گھروں پر نظر ڈالی۔

”نمبر کا نہیں ہے، گھر کی تو پہچان ہوگی آپ کو؟“

سعیدہ اماں بغور گھروں کو دیکھ رہی تھیں۔

”ہاں..... ہاں گھر کی پہچان ہے۔“

وہ گھر کی نشانیاں بتانے لگیں جو اتنی ہی مبہم تھیں، جتنا ان کے اپنے گھر کا پتہ۔ وہ سڑک کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ سعیدہ اماں گھر نہیں پہچان سکیں۔ سالار، بالال کے والد کا نام پوچھ کر گاڑی سے نیچے اتر گیا اور باری باری دونوں اطراف کے گھروں سے سعیدہ اماں کے بارے میں پوچھنے لگا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد وہ اس سڑک پر موجود ہر گھر میں جا چکا تھا۔ مطلوبہ نام کے کسی آدمی کا گھر وہاں نہیں تھا۔

”آپ کو ان کا نام ٹھیک سے یاد ہے؟“

وہ تھک ہار کر سعیدہ اماں کے پاس آیا۔

”ہاں..... لو بھلا اب مجھے نام بھی بتانا نہیں ہوگا۔“

سعیدہ اماں نے برامانا۔

”لیکن اس نام کے کسی آدمی کا گھر یہاں نہیں ہے، نہ ہی کوئی آپ کے بارے میں جانتا ہے۔“

سالار نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو..... یہ ساتھ والی سڑک پر دیکھ لو۔“

سعیدہ اماں نے کچھ فاصلے پر ایک اور سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

”لیکن سعیدہ اماں! آپ نے کہا تھا کہ گھر اسی سڑک پر ہے۔“ سالار نے کہا۔

”میں نے کب کہا تھا؟“ وہ معترض ہوئیں۔

”میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے ٹرن تو نہیں لیا۔ آپ نے کہا نہیں۔“ سالار نے انہیں یاد کروایا۔

”وہ تو میں نے کہا تھا مگر یہ ہوتا کیا ہے؟“

سالار کا دل ڈوبا۔

”ٹرن؟“

”ہاں، یہی۔“

”آپ کسی اور سڑک سے سڑک تو یہاں نہیں آئیں؟“

”لو تو اس طرح کہو نا۔“ سعیدہ اماں کو تسلی ہوئی۔

”میں کیوں یہاں بیٹھ گئی تھی۔ تھک گئی تھی چل چل کر اور یہ سڑک تو چھوٹی سی ہے۔ یہاں میں چل کر کیا تھک سکتی تھی؟“

سالار نے گاڑی اشارت کر لی۔ وہ دن بہت خراب تھا۔

”کس سڑک سے سڑک یہاں آئی تھیں آپ؟“

اس نے سعیدہ اماں سے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھائی۔

”میرا خیال ہے.....“ وہ پہلی سڑک کو دیکھتے ہوئے الجھیں۔

”یہ ہے۔“ انہوں نے کہا۔

سالار کو یقین تھا وہ سڑک نہیں ہوگی مگر اس نے گاڑی اس سڑک پر موڑ لی۔ یہ تو طے تھا کہ آج اس کا سارا دن اسی طرح ضائع ہوتا تھا۔

اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہ وہاں اس پاس کی مختلف سڑکوں پر سعیدہ اماں کو لے کر پھر تارہا مگر اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ سعیدہ اماں کو ہر گھر دور سے شناسا لگتا۔ پاس جانے پر وہ کہنا شروع کر دیتیں۔

”نہ..... نہ..... نہ..... یہ نہیں ہے۔“

وہ بالآخر کالونی میں تلاش چھوڑ کر انہیں واپس اسی محلہ میں لے آیا جہاں وہ پہلے ان کا گھر ڈھونڈتا رہا تھا۔

مزید ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہاں ضائع کرنے کے بعد جب وہ تھک کر واپس گاڑی کے پاس آیا تو شام ہو چکی تھی۔

سعیدہ اماں اس کے برعکس اطمینان سے گاڑی میں بیٹھی تھیں۔

”لما؟“

انہوں نے سالار کے اندر بیٹھتے ہی پوچھا۔

”نہیں، اب تو رات ہو رہی ہے، تلاش بے کار ہے۔ میں پولیس میں رپورٹ کروا دیتا ہوں آپ کی۔ آپ کی بیٹی یا آپ کے محلے والے آپ کے نہ ملنے پر پولیس سے رابطہ تو کریں گے ہی..... پھر وہ لے جائیں گے آپ کو۔“

سالار نے ایک بار پھر گاڑی اشارت کرتے ہوئے تجویز پیش کی۔

”ہاں، میرا یہی ارادہ ہے۔ پہلے تو میرا دل نہیں چاہتا تھا مگر اب یہ سوچا ہے کہ بیٹی کی شادی کر لوں تو پھر باہر چلی جاؤں گی۔ اکیلے رہتے رہتے تنگ آگئی ہوں۔“

سالار اب اس سڑک پر آگیا تھا جہاں سے اس نے سعیدہ اماں کو پک کیا تھا۔

”میں نے آپ کو یہاں سے لیا تھا۔ آپ بتائیں، ان میں سے کون سا گھر ہے؟“ سالار نے گاڑی کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے دائیں طرف کے گھروں پر نظر ڈالی۔

”نمبر کا نہیں ہے، گھر کی تو پہچان ہوگی آپ کو؟“

سعیدہ اماں بغور گھروں کو دیکھ رہی تھیں۔

”ہاں..... ہاں گھر کی پہچان ہے۔“

وہ گھر کی نشانیاں بتانے لگیں جو اتنی ہی مبہم تھیں، جتنا ان کے اپنے گھر کا پتہ۔ وہ سڑک کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ سعیدہ اماں گھر نہیں پہچان سکیں۔ سالار، بالال کے والد کا نام پوچھ کر گاڑی سے نیچے اتر گیا اور باری باری دونوں اطراف کے گھروں سے سعیدہ اماں کے بارے میں پوچھنے لگا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد وہ اس سڑک پر موجود ہر گھر میں جا چکا تھا۔ مطلوبہ نام کے کسی آدمی کا گھر وہاں نہیں تھا۔

”آپ کو ان کا نام ٹھیک سے یاد ہے؟“

وہ تھک ہار کر سعیدہ اماں کے پاس آیا۔

”ہاں..... لو بھلا اب مجھے نام بھی بتانا نہیں ہوگا۔“

سعیدہ اماں نے برامانا۔

”لیکن اس نام کے کسی آدمی کا گھر یہاں نہیں ہے، نہ ہی کوئی آپ کے بارے میں جانتا ہے۔“

سالار نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو..... یہ ساتھ والی سڑک پر دیکھ لو۔“

سعیدہ اماں نے کچھ فاصلے پر ایک اور سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

”لیکن سعیدہ اماں! آپ نے کہا تھا کہ گھر اسی سڑک پر ہے۔“ سالار نے کہا۔

”میں نے کب کہا تھا؟“ وہ معترض ہوئیں۔

”میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے ٹرن تو نہیں لیا۔ آپ نے کہا نہیں۔“ سالار نے انہیں یاد

کروایا۔

”وہ تو میں نے کہا تھا مگر یہ ہوتا کیا ہے؟“

سالار کا دل ڈوبا۔

”ٹرن؟“

”ہاں، یہی۔“

”آپ کسی اور سڑک سے سڑک تو یہاں نہیں آئیں؟“

”لو تو اس طرح کہو نا۔“ سعیدہ اماں کو تسلی ہوئی۔

”میں کیوں یہاں بیٹھ گئی تھی۔ تھک گئی تھی چل چل کر اور یہ سڑک تو چھوٹی سی ہے۔ یہاں میں

چل کر کیا تھک سکتی تھی؟“

سالار نے گاڑی اشارت کر لی۔ وہ دن بہت خراب تھا۔

”کس سڑک سے سڑک یہاں آئی تھیں آپ؟“

اس نے سعیدہ اماں سے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھائی۔

”میرا خیال ہے.....“ وہ پہلی سڑک کو دیکھتے ہوئے الجھیں۔

”یہ ہے۔“ انہوں نے کہا۔

سالار کو یقین تھا وہ سڑک نہیں ہوگی مگر اس نے گاڑی اس سڑک پر موڑ لی۔ یہ تو طے تھا کہ آج

اس کا سارا دن اسی طرح ضائع ہوتا تھا۔

اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہ وہاں اس پاس کی مختلف سڑکوں پر سعیدہ اماں کو لے کر پھر تارہا مگر اسے

کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ سعیدہ اماں کو ہر گھر دور سے شناسا لگتا۔ پاس جانے پر وہ کہنا شروع کر دیتیں۔

”نہ..... نہ..... نہ..... یہ نہیں ہے۔“

وہ بالآخر کالونی میں تلاش چھوڑ کر انہیں واپس اسی محلہ میں لے آیا جہاں وہ پہلے ان کا گھر ڈھونڈتا

رہا تھا۔

مزید ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہاں ضائع کرنے کے بعد جب وہ تھک کر واپس گاڑی کے پاس آیا تو شام

ہو چکی تھی۔

سعیدہ اماں اس کے برعکس اطمینان سے گاڑی میں بیٹھی تھیں۔

”لما؟“

انہوں نے سالار کے اندر بیٹھتے ہی پوچھا۔

”نہیں، اب تو رات ہو رہی ہے، تلاش بے کار ہے۔ میں پولیس میں رپورٹ کروا دیتا ہوں آپ

کی۔ آپ کی بیٹی یا آپ کے محلے والے آپ کے نہ ملنے پر پولیس سے رابطہ تو کریں گے ہی..... پھر وہ لے

جائیں گے آپ کو۔“

سالار نے ایک بار پھر گاڑی اشارت کرتے ہوئے تجویز پیش کی۔

”جی... جی... آندے چاری پریشان ہو رہی ہوگی۔“

سعیدہ اماں کو اپنی بیٹی کا خیال آیا۔ سالار کا دل چاہا وہ ان سے کہے کہ وہ ان کی بیٹی سے زیادہ پریشان ہے مگر وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتے ہوئے گاڑی پولیس اسٹیشن لے آیا۔

رپورٹ درج کروانے کے بعد وہ اٹھ کر وہاں سے نکلنے لگا۔ سعیدہ اماں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آپ بیٹھیں... آپ بیٹھیں رہیں گی۔“

سالار نے ان سے کہا۔

”نہیں... ہم انہیں یہاں کہاں رکھیں گے، آپ انہیں ساتھ لے جائیں، کسی نے ہم سے رابطہ کیا تو ہم انہیں آپ کا پتہ دے دیں گے۔“ پولیس انسپکٹر نے کہا۔

”لیکن میں تو انہیں آپ کے حوالے کر دینا چاہتا ہوں۔“ سالار معترض ہوا۔

”دیکھیں، بوڑھی خاتون ہیں، اگر کوئی رابطہ نہیں کرتا ہم سے تو رات کہاں رہیں گی یہ... اور اگر کچھ دن اور گزر گئے...“

پولیس انسپکٹر کہتا گیا۔ سعیدہ اماں نے اسے بات مکمل کرنے نہیں دی۔

”نہیں، مجھے ادھر نہیں رہنا۔ جینا میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گی۔ میں ادھر کہاں بیٹھوں گی آدمیوں میں۔“

سالار نے انہیں پہلی بار گھبرائے ہوئے دیکھا۔

”لیکن میں تو...“ اکیلا رہتا ہوں، وہ کہتے کہتے رک گیا، پھر اسے فرقان کے گھر کا خیال آیا۔

”اچھا ٹھیک ہے، چلیں۔“ اس نے ایک گھر اسانس لیتے ہوئے کہا۔

باہر گاڑی میں آکر اس نے موبائل پر فرقان سے رابطہ قائم کیا۔ وہ انہیں فرقان کے ہاں ٹھہرانا چاہتا تھا۔ فرقان ابھی ہاسپتال میں ہی تھا۔ اس نے موبائل پر ساری صورت حال اسے بتائی۔

”نوشین تو گاڈس گئی ہوئی ہے۔“ فرقان نے اسے بتایا۔

”مگر کوئی مسئلہ نہیں، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ انہیں اپنے فلیٹ پر لے جاؤں گا۔ وہ کون سی کوئی نوجوان خاتون ہیں کہ مسئلہ ہو جائے گا۔ تم ضرورت سے کچھ زیادہ ہی محتاط ہو رہے ہو۔“

”نہیں، میں ان کے آرام کے حوالے سے کہہ رہا تھا۔ آگورڈ نہ لگے انہیں۔“ سالار نے کہا۔

”نہیں لگتا یار اچھو لینا تم ان سے، ورنہ پھر کسی ساتھ والے فلیٹ میں ٹھہرا دیں گے، عالم صاحب کی فیلٹی کے ساتھ۔“

”اچھا، تم آؤ پھر دیکھتے ہیں۔“

سالار نے موبائل بند کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا میں تمہارے پاس ہی رہ لوں گی۔ تم میرے بیٹے کے برابر ہو، مجھے اعتماد ہے تم پر۔“

سعیدہ اماں نے مطمئن لہجے میں کہا۔

”سالار نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔“

اس نے راستے میں ٹک کر ایک ریسٹورنٹ سے کھانا لیا۔ بھوک سے اس کا برا حال ہو رہا تھا اور ایک دم اسے احساس ہوا کہ سعیدہ اماں بھی دوپہر سے اس کے ساتھ کچھ کھائے پینے بغیر ہی پھر رہی ہیں۔

اسے عداوت کا احساس ہوا۔ اپنے فلیٹ کی طرف جاتے ہوئے اس نے راستے میں ایک جگہ ٹک کر سعیدہ اماں کے ساتھ سیب کا تازہ جوس پیا۔ وہ زندگی میں پہلی بار کسی بوڑھے شخص کے ساتھ اتنا وقت گزار رہا تھا اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ کام آسان نہیں تھا۔

فلیٹ میں پہنچ کر وہ ابھی سعیدہ اماں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا جب فرقان آ گیا۔

اس نے سعیدہ اماں سے خود ہی اپنا تعارف کر دیا اور پھر کھانا کھانے لگا۔ چند منٹوں میں ہی وہ سعیدہ اماں کے ساتھ اتنی بے تکلفی کے ساتھ ٹھیکہ بنیابی میں گفتگو کر رہا تھا کہ سالار کو رشک آنے لگا۔

اس نے فرقان سے اچھی گفتگو کرنے والا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے گفتگو کے انداز میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا کہ دوسرا اپنا دل اس کے سامنے کھول کر رکھ دینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اتنے سالوں سے دوستی کے باوجود وہ فرقان کی طرح گفتگو کرنا نہیں سیکھ سکا تھا۔

دس منٹ کے بعد وہ وہاں خاموشی سے کھانا کھانے والے ایک سامع کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جبکہ فرقان اور سعیدہ اماں مسلسل گفتگو میں مصروف تھے۔ سعیدہ اماں یہ جان کر کہ فرقان ڈاکٹر ہے، اس سے طبی مشورے لینے میں مصروف تھیں۔ کھانے کے خاتمے تک وہ فرقان کو مجبور کر چکی تھیں کہ وہ اپنا میڈیکل باکس لا کر ان کا چیک اپ کرے۔

فرقان نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ اوکو لو جسٹ تھا۔ وہ بڑی جمل مزاجی سے اپنا بیگ لے آیا۔ اس نے سعیدہ اماں کا ہلڈ پر بیٹر چیک کیا پھر اسٹیجو سکوپ سے ان کے دل کی رفتار کو ماپا اور آخر میں نبض چیک کرنے کے بعد انہیں یقین دلایا کہ وہ بے حد تندرست حالت میں ہیں اور ہلڈ پر بیٹر یا دل کی کوئی بیماری انہیں نہیں ہے۔

سعیدہ اماں ایک دم بے حد ہشاش بشاش نظر آنے لگیں۔ سالار ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتے ہوئے کچن میں برتن دھو رہا تھا۔ وہ دونوں لاؤنج کے صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

پھر اسی دوران اس نے فون کی گھنٹی سنی۔ فرقان نے فون اٹھایا تھا۔ دوسری طرف ڈاکٹر سبط علی تھے۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے کہا۔

”سالار نے پولیس اسٹیشن پر کسی سعیدہ نام کی خاتون کے بارے میں اطلاع دی تھی۔“

فرقان حیران ہوا۔

”جی وہ نہیں ہیں، ہمارے پاس۔“

”ڈاکٹر سیٹھ علی نے بے اختیار کہا۔“

”ہاں، وہ میری عزیزہ ہیں، ہم انہیں تلاش کر رہے تھے چند گھنٹوں سے۔ پولیس سے رابطہ کیا تو

سالار کا نام اور نمبر دے دیا انہوں نے۔“

فرقان نے انہیں سعیدہ اماں کے بارے میں بتایا پھر سعیدہ اماں کی بات فون پر ان سے کروائی۔

سالار بھی باہر لاؤنج میں آ گیا۔

سعیدہ اماں فون پر گفتگو میں مصروف تھیں۔

”ڈاکٹر صاحب کی عزیزہ ہیں یہ۔“

فرقان نے دھیمی آواز میں اس کے قریب آ کر کہا۔

”ڈاکٹر سیٹھ علی صاحب کی؟“ سالار حیران ہوا۔

”ہاں، ان ہی کی۔“

سالار نے بے اختیار اطمینان بھرا سانس لیا۔

”بھائی صاحب کہہ رہے ہیں تم سے بات کروانے کو۔“

سعیدہ اماں نے فرقان سے کہا۔

فرقان تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور ریسیور لے کر کاغذ پر کچھ نوٹ کرنے لگا۔ ڈاکٹر سیٹھ علی

اسے ایڈریس لکھوا رہے تھے۔

سعیدہ اماں نے قدرے حیرانی سے لاؤنج کے دروازے میں کھڑے سالار کو دیکھا۔

”تم کیا کر رہے ہو؟“ ان کی نظریں سالار کے اچرن پر جمی تھیں۔

وہ کچھ شرمندہ ہو گیا۔

”میں..... برتن دھو رہا تھا۔“

سالار وہاں یکن میں آیا اور اس نے اچرن اُتار دیا۔ ویسے بھی برتن وہ تقریباً دھو چکا تھا۔

”سالار! آؤ پھر انہیں چھوڑ آتے ہیں۔“

اسے اپنے عقب میں فرقان کی آواز آئی۔

”یہ کام بعد میں کر لیتا۔“

”تم گاڑی کی چابی لو، میں ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔“ سالار نے کہا۔

اگلے دس منٹ میں وہ نیچے سالار کی گاڑی میں تھے۔ فرقان اگلی سیٹ پر تھا اور اس کے باوجود

بچھلی سیٹ پر بیٹھی سعیدہ اماں سے گفتگو میں مصروف تھا۔ ساتھ ساتھ وہ سالار کو راستے کے پارے میں

جہاںات بھی دیتا جا رہا تھا۔

بہت تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ بیس منٹ میں مطلوبہ محلے اور گلی میں تھے۔ بڑی

گلی میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد وہ دونوں انہیں اندر گلی میں ان کے گھر تک چھوڑنے گئے۔ سعیدہ

اماں کو اب رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی گلی کو پہچانتی تھیں۔

وہ فخریہ انداز میں کچھ جتاتے ہوئے سالار کو بتاتی گئیں۔

”حلوائی کی دکان..... گٹر کے سینٹ والے ڈھکن..... پریز صاحب کا گھر.....“

”جی!“ سالار مسکراتے ہوئے سر ہلاتا رہا۔

اس نے ان کو یہ نہیں بتایا کہ ان کی بتائی ہوئی ساری نشانیاں صحیح تھیں۔ صرف وہ اسے ایک غلط

علاقے میں لے گئی تھیں۔

”آمنہ بے چاری پریشان ہو رہی ہو گی۔“ انہوں نے سرخ اینٹ کی بنی ہوئی ایک حویلی نما دو

منزل مکان کے سامنے رکتے ہوئے ۲۷۵ فٹہ کہا۔

فرقان نے آگے بڑھ کر تیل بھائی۔ سالار قدرے ستائشی انداز میں حویلی پر نظریں دوڑاتا رہا۔ وہ

یقیناً کافی پرانی حویلی تھی مگر مسلسل دیکھ بھال کی وجہ سے وہ اس گلی میں سب سے باوقار لگ رہی تھی۔

”تم لوگوں کو اب میں نے چائے پینے بغیر جانے نہیں دیتا۔“ سعیدہ اماں نے کہا۔

”میری وجہ سے تم لوگوں کو بہت پریشانی ہوئی۔ خاص طور پر سالار کو۔ بچہ مجھے سارا دن لے

پھرتا رہا۔“ سعیدہ اماں نے سالار کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں، سعیدہ اماں! چائے ہم بھر بھی نہیں گے، آج ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

”ہاں سعیدہ اماں! آج چائے نہیں بنیں گے۔ کبھی آکر آپ کے پاس کھانا کھائیں گے۔“

فرقان نے بھی جلدی سے کہا۔

”دیکھ لینا، ایسا نہ ہو کہ یاد ہی نہ رہے تمہیں۔“

”لیں، بھلا کھانا کیسے بھولیں گے ہم۔ وہ جو آپ پالک گوشت کی ترکیب بتا رہی تھیں، وہی بنا کر

کھائے گا۔“

فرقان نے کہا۔ اندر سے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ سعیدہ اماں کی بیٹی دروازہ کھولنے آرہی تھی

اور اس نے دروازے سے کچھ فاصلے پر ہی سعیدہ اماں اور فرقان کی آوازیں سن لی تھیں، اس لئے اس

نے کچھ بھی پوچھے بغیر دروازے کا بولٹ اندر سے اُتارے ہوئے دروازہ تھوڑا سا کھول دیا۔

”اچھا سعیدہ اماں! خدا حافظ۔“ فرقان نے سعیدہ اماں کو دروازے کی میز چیاں چڑھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ سالار اس سے پہلے ہی پلٹ چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

گاڑی میں بیٹھ کر اسے اشارت کرتے ہوئے سالار نے فرقان سے کہا۔

”تمہاری سب سے ناپسندیدہ ڈش، پالک گوشت ہے اور تم ان سے کیا کہہ رہے تھے؟“

فرقان نے قہقہہ لگایا۔ ”کہنے میں کیا حرج ہے۔ ویسے ہو سکتا ہے وہ واقعی اتنا اچھا پکائیں کہ میں

کھانے پر مجبور ہو جاؤں۔“

”تم جاؤ گے ان کے گھر؟“

سالار گاڑی میں روڈ پر لاتے ہوئے حیران ہوا۔

”ہائلک جاؤں گا، وعدہ کیا ہے میں نے اور تم؟“

”میں تو نہیں جاؤں گا۔“ سالار نے انکار کیا۔

”جان نہ پہچان، منہ اٹھا کر ان کے گھر کھانا کھانے پہنچ جاؤں۔“

”ڈاکٹر سبط علی صاحب کی فرسٹ کزن ہیں وہ اور مجھ سے زیادہ تو تمہاری جان پہچان ہے ان کے

ساتھ۔“ فرقان نے کہا۔

”وہ اور معاملہ تھا، انہیں مدد کی ضرورت تھی، میں نے مدد کر دی اور بس اتنا ہی کافی ہے۔ ان کے

بیٹے یہاں ہوتے تو اور بات تھی لیکن اس طرح اکیلی عورتوں کے گھر میں تو کبھی نہیں جاؤں گا۔“ سالار

سنجیدہ تھا۔

”میں کون سا اکیلا جانے والا ہوں یا! بیوی بچوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ جانتا ہوں میرا اکیلا

ان کے ہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ فوشین بھی ان سے مل کر خوش ہوگی۔“

”ہاں، بھابھی کے ساتھ چلے جانا، کوئی حرج نہیں۔“ سالار مطمئن ہوا۔

”میں جاؤں.....؟ تم کو بھی ساتھ چلنا ہے، انہوں نے تمہیں بھی دعوت دی ہے۔“

”میں تو نہیں جاؤں گا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ تم ہو آنا، کافی ہے۔“ سالار نے لاپرواہی

سے کہا۔

”تم ان کے خاص مہمان ہو، تمہارے بغیر تو سب کچھ پیکار ہے گا۔“

سالار کو اس کا لہجہ کچھ عجیب سا لگا۔ اس نے گردن موڑ کر فرقان کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

”کیا مطلب؟“

”میرا خیال ہے انہیں تم داماد کے طور پر پسند آگئے ہو۔“

”فضول باتیں مت کیا کرو۔“ سالار نے اسے ناراضی سے دیکھا۔

”اچھا..... دیکھ لینا، پروپوزل آئے گا تمہارا اس گھر سے۔ سعیدہ اماں کو تم ہر طرح سے اچھے لگے

ہو۔ ہر بات پوچھی ہے انہوں نے مجھ سے تمہارے بارے میں۔ یہ بھی کہ تمہارا شادی کا کوئی ارادہ ہے کہ

نہیں اور ہے تو کب تک کرنے کا ارادہ ہے۔ میں نے کہا کہ جیسے ہی کوئی اچھا پروپوزل ملا وہ فوراً کر لے گا

پھر وہ اپنی بیٹی کے بارے میں بتانے لگیں۔ اب جتنی تعریفیں وہ اپنی بیٹی کی کر رہی تھیں اگر ہم اس میں سے

پچاس فیصد بھی بچ کچھ لیں تو بھی وہ لڑکی..... کیا نام لے رہی تھیں..... ہاں آمنہ..... تمہارے لئے

بہترین ہوگی۔“

”شرم آئی چاہئے تمہیں ڈاکٹر سبط علی صاحب کی رشتہ دار ہیں وہ اور تم ان کے بارے میں فضول

باتیں کر رہے ہو۔“ سالار نے اسے جھڑکا۔

فرقان سنجیدہ ہو گیا۔

”میں کوئی غلط بات نہیں کر رہا ہوں، تمہارے لئے تو یہ اعزاز کی بات ہوتی چاہئے کہ تمہاری

شادی ڈاکٹر سبط علی صاحب کے خاندان میں ہو.....“

”جسٹ اسٹاپ اٹ فرقان! یہ مسئلہ کافی ڈسکس ہو گیا، اب ختم کرو۔“ سالار نے سختی سے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے، ختم کرتے ہیں پھر کبھی بات کریں گے۔“

فرقان نے اطمینان سے کہا۔ سالار نے گردن موڑ کر چھٹی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ڈرائیونگ کر رہے ہو، سڑک پر دھیان رکھو۔“ فرقان نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ سالار کچھ

ناراضی کے عالم میں سڑک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

سعیدہ اماں کے ساتھ ان کا رابطہ وہیں ختم نہیں ہوا۔

کچھ دنوں کے بعد وہ ایک شام ڈاکٹر سبط علی کے ہاں تھے جب انہوں نے اپنے لیچر کے بعد ان

دونوں کو روک لیا۔

”سعیدہ آپ لوگوں سے ملنا چاہتی ہیں، مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میں آپ لوگوں کے ہاں

انہیں لے جاؤں۔ میں نے ان کو بتایا کہ شام کو وہ لوگ میری طرف آئیں گے، آپ یہیں مل لیں۔ آپ

لوگوں نے شاید کوئی وعدہ کیا تھا ان کے ہاں جانے کا، مگر گئے نہیں۔“

فرقان نے معنی خیز نظروں سے سالار کو دیکھا۔ وہ نظریں چرا گیا۔

”نہیں، ہم لوگ سوچ رہے تھے مگر کچھ مصروفیت تھی اس لئے نہیں جاپائے۔“ فرقان نے جواباً کہا۔

وہ دونوں ڈاکٹر سبط علی کے ساتھ ان کے ڈائیننگ روم میں چلے آئے جہاں کچھ دیر بعد سعیدہ اماں

بھی آگئیں اور آتے ہی ان کی شکایات اور ناراضی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فرقان انہیں مطمئن کرنے میں مصروف رہا جبکہ سالار خاموشی سے بیٹھا رہا۔

اگلے ویک اینڈ پر فرقان نے سالار کو سعیدہ اماں کی طرف جانے کے پروگرام کے بارے میں بتایا۔ سالار کو اسلام آباد اور پھر وہاں سے گاؤں جانا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی مصروفیت بتا کر سعیدہ اماں سے معذرت کر لی۔

ویک اینڈ گزرنے کے بعد لاہور واپسی پر فرقان نے اسے سعیدہ اماں کے ہاں گزارے جانے والے وقت کے بارے میں بتایا۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ وہاں گیا تھا۔

”سالار! میں سعیدہ اماں کی بیٹی سے بھی ملا تھا۔“

فرقان نے بات کرتے ہوئے اچانک کہا۔

”بہت اچھی لڑکی ہے۔ سعیدہ اماں کے برعکس خاصی خاموش طبع ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔ تم دونوں کی بڑی اچھی گزرے گی۔ نوٹین کو بھی بہت اچھی لگی ہے۔“

”فرقان! تم صرف دعوت تک ہی رہو تو بہتر ہے۔“ سالار نے اسے ٹوکا۔

”میں بہت سیریس ہوں سالار! فرقان نے کہا۔

”میں بھی سیریس ہوں۔“ سالار نے اسی انداز میں کہا۔ ”تمہیں پتا ہے فرقان! تم جتنا شادی پر اصرار کرتے ہو، میرا شادی سے اتنا ہی دل اٹھتا جاتا ہے اور یہ سب تمہاری ان باتوں کی وجہ سے ہے۔“

سالار نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”میری باتوں کی وجہ سے نہیں۔ تم صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم امامہ کی وجہ سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔“

فرقان یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”اوکے..... صاف صاف کہہ دیتا ہوں، میں امامہ کی وجہ سے شادی کرنا نہیں چاہتا پھر.....؟“

سالار نے سرد مہری سے کہا۔

”یہ ایک بچکانہ سوچ ہے۔“ فرقان اسے بخور دیکھتے ہوئے بولا۔

”اوکے، فائن۔ بچکانہ سوچ ہے پھر؟“ سالار نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

”Then you should get rid of it.“ (جب تمہیں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہئے)۔ فرقان

نے نرمی سے کہا۔

”I don't want to get rid of it.... so?“ (میں اس سے چھٹکارا نہیں چاہتا..... پھر؟)۔

سالار نے ترکی بہ ترکی کہا۔ فرقان کچھ دیر لاجواب ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

”میرے سامنے دو بارہ تم سعیدہ اماں کی بیٹی کی بات مت کرنا اور اگر تم سے وہ اس بارے میں بات کریں بھی تو تم صاف صاف کہہ دینا کہ مجھے شادی نہیں کرنی، میں شادی شدہ ہوں۔“

”اوکے، نہیں کروں گا اس بارے میں تم سے بات۔ غصے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

فرقان نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے صلح جوئی سے کہا۔

☆.....☆.....☆

”مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں اس لئے تمہیں بلوایا ہے۔“ سکندر نے مسکراتے ہوئے سالار کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ طیبہ کے ساتھ اس وقت لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے اور سالار ان کے فون کرنے پر اس ویک اینڈ پر اسلام آباد آیا ہوا تھا۔

سکندر عثمان نے قدرے ستائشی نظروں سے اپنے تیسرے بیٹے کو دیکھا۔ دو کچھ دیر پہلے ان کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد اب کپڑے تبدیل کر کے ان کے پاس آیا تھا۔ سفید شلوار قمیص اور گھر میں پہنی جانے والی سیاہ جپل میں وہ اپنے عام سے حلیے کے باوجود بہت باوقار لگ رہا تھا۔ شاید یہ اس کے چہرے کی سنجیدگی تھی یا پھر شاید وہ آج پہلی بار کئی سالوں کے بعد اسے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے اور وہ اعتراف کر رہے تھے کہ اس کی شخصیت میں بہت وقار اور ظہر آؤ آ گیا ہے۔

انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ سالار کی وجہ سے انہیں اپنے سوشل سرکل میں اہمیت اور عزت ملے گی۔ وہ جانتے تھے بہت جگہوں پر اب ان کا تعارف سالار سکندر کے حوالے سے ہوتا تھا اور انہیں اس پر خوشگوار حیرت ہوتی تھی۔ اس نے اپنی پوری ٹیم اس میں انہیں بری طرح خوار اور پریشان کیا تھا اور ایک وقت تھا، جب انہیں اپنے اس بیٹے کا مستقبل سب سے تاریک لگتا تھا۔ اپنی تمام عمر معمولی ملاجیتوں اور قابلیت کے باوجود مگر ان کے اندازے اور خدشات صحیح ثابت نہیں ہوئے تھے۔

طیبہ نے خشک میوے کی پلیٹ سالار کی طرف بڑھائی۔

سالار نے چند کاجو اٹھائے۔

”میں تمہاری شادی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

کاجو منہ میں ڈالتے ہوئے وہ ایک دم رک گیا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ سکندر عثمان اور طیبہ بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔

”اب تمہیں شادی کرنی چاہئے سالار!“

سکندر نے کہا۔ سالار نے غیر محسوس انداز میں ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاجو دوبارہ خشک میوے کی پلیٹ میں رکھ دیئے۔

”میں اور طیبہ تو جیران ہو رہے تھے کہ اتنے رشتے تو تمہارے بھائیوں میں سے کسی کے نہیں آئے

جتنے تمہارے لئے آرہے ہیں۔"

سکندر نے بڑے گفتگو انداز میں کہا۔

"میں نے سوچا، کچھ بات دات کریں تم سے۔"

وہ چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔

"زاد ہمدانی صاحب کو جانتے ہو؟" سکندر عثمان نے ایک بڑی لمبی بیٹھل کہنی کے ہیڈ کا نام لیا۔

"جی۔۔۔ ان کی بیٹی میری کوئیگ ہے۔"

"رمہ نام ہے شاید؟"

"جی۔"

"کیسی لڑکی ہے؟"

وہ سکندر عثمان کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ ان کا سوال بہت "واضح" تھا۔

"اچھی ہے۔" اس نے چند لمحوں کے بعد کہا۔

"تمہیں پسند ہے؟"

"کس لحاظ سے؟"

"میں رمہ کے پروپوزل کی بات کر رہا ہوں۔" سکندر عثمان نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"زاد بچھلے کئی ہفتے سے مجھ سے اس سلسلے میں بات کر رہا ہے۔ اپنی وانف کے ساتھ وہ ایک دو

بار ہماری طرف آیا بھی ہے۔ ہم لوگ بھی ان کی طرف گئے ہیں۔ بچھلے ویک اینڈ پر رمہ سے بھی ملے

ہیں۔ مجھے اور طیبہ کو تو بہت اچھی لگی ہے۔ خوب صورت ہے، بہت well behaved ہے اور تمہارے

ساتھ بھی اس کی اچھی خاصی دوستی ہے۔ ان لوگوں کی خواہش ہے بلکہ اصرار ہے کہ تمہارے ذریعہ

دونوں ٹیلیز میں کوئی رشتہ داری بن جائے۔"

"پاپا! میری رمہ کے ساتھ دوستی نہیں ہے۔" سالار نے مدہم اور خمیرے ہوئے انداز میں کہا۔

"وہ میری کوئیگ ہے، جان پہچان ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت اچھی لڑکی ہے مگر میں

اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"تم کہیں اور انٹرنشل ہو؟"

سکندر نے اس سے پوچھا۔ وہ خاموش رہا۔ سکندر اور طیبہ کے درمیان نظروں کا تالوہ ہوا۔

"اگر تمہاری کہیں اور دلچسپی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں بلکہ ہمیں خوشی ہوگی وہاں تمہاری

شادی کی بات کرتے ہوئے اور یقیناً ہم تم پر بھی کوئی دباؤ نہیں ڈالیں گے اس سلسلے میں۔"

سکندر نے تڑپ سے کہا۔

"میں بہت عرصہ پہلے شادی کر چکا ہوں۔"

ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے مدہم لہجے میں کہا۔ سکندر کو کوئی
دشواری نہیں ہوئی یہ سمجھنے میں کہ اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ ان کے چہرے پر یک دم سنجیدگی آگئی۔

"امامہ کی بات کر رہے ہو؟"

وہ خاموش رہا۔ سکندر بہت دیر تک بے نتیجی سے اسے دیکھتے رہے۔

"اسنے عرصے سے اس لئے شادی نہیں کر رہے؟"

سکندر کو جیسے ایک شاگ لگا تھا۔ ان کا خیال تھا وہ اسے بھلا چکا تھا۔ آخر یہ آٹھ سال پرانی بات تھی۔

"اب تک تو وہ شادی کر چکی ہوگی، اپنی زندگی آرام سے گزار رہی ہوگی۔ تمہاری اور اس کی

شادی تو کب کی ختم ہو چکی۔"

سکندر نے اس سے کہا۔

"نہیں پاپا! اس کے ساتھ میری شادی ختم نہیں ہوئی۔" اس نے پہلی بار سر اٹھا کر کہا۔

"تم نے اسے نکاح نامے میں طلاق کا اختیار دیا تھا اور۔۔۔ مجھے یاد ہے تم اسے ڈھونڈنا چاہتے تھے

تا کہ طلاق دے سکو۔"

سکندر نے جیسے اسے یاد کروایا۔

"میں نے اسے ڈھونڈا تھا مگر وہ مجھے نہیں ملی اور وہ یہ بات نہیں جانتی کہ اس کے پاس طلاق کا

اختیار ہے۔ وہ جہاں بھی ہوگی ابھی تک میری ہی بیوی ہوگی۔"

"سالار! آٹھ سال گزر چکے ہیں۔ ایک دو سال کی بات تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ یہ جان گئی ہو

کہ طلاق کا اختیار اس کے پاس ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اب بھی تمہاری بیوی ہی ہو۔"

سکندر نے قدرے مضطرب ہو کر کہا۔

"میرے علاوہ کوئی دوسرا تو اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا اور میں نے اسے اس حق کے بارے میں نہیں

بتایا اور جب تک وہ میرے نکاح میں ہے مجھے کہیں اور شادی نہیں کرنی۔"

"تمہارا کالیکٹ ہے اس کے ساتھ؟" سکندر نے بہت مدہم آواز میں کہا۔

"نہیں۔"

"آٹھ سال سے اس سے تمہارا رابطہ نہیں ہوا۔ اگر ساری عمر نہ ہوا تب تم کیا کرو گے؟"

وہ خاموش رہا۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

سکندر عثمان کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرتے رہے۔

"تم نے مجھ سے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم اس لڑکی کے ساتھ ایڈیشنل انوالوڈ ہو۔ تم نے تو مجھے بس بتایا

تھا کہ تم نے صرف وقتی طور پر اس کی مدد کی تھی وہ کسی اور لڑکے سے شادی کرنا چاہتی تھی وغیرہ وغیرہ۔“
سالار اس بار بھی خاموش رہا۔

سکندر عثمان چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔ وہ اپنے اس تیسرے بیٹے کو بھی نہیں جان سکے تھے۔ اس کے دل میں کیا تھا وہ اس تک بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ جس لڑکی کے لئے وہ آٹھ سال شائع کر چکا تھا اور باقی کی زندگی شائع کرنے کے لئے تیار تھا، اس کے ساتھ اس کے جذباتی تعلق کی شدت کیسی ہو سکتی تھی یہ اب شاید اسے لفظوں میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کمرے میں خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آیا پھر سکندر عثمان اٹھ کر اپنے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ ان کی واپسی چند منٹوں کے بعد ہوئی۔ صوفہ پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے سالار کی طرف ایک لفافہ بڑھا دیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے وہ لفافہ پکڑ لیا۔

”امامہ نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔“

وہ سانس نہیں لے سکا۔ سکندر عثمان ایک بار پھر صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔

”یہ پانچ جیسے سال پہلے کی بات ہے وہ تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔“ فون ناصر نے اٹھایا تھا اور اس نے امامہ کی آواز پہچان لی۔ ”جب تم پاکستان میں تھے، ناصر نے تمہاری بیبائے مجھ سے اس کی بات کروائی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے اس کی بات کرواؤں۔ میں نے اس سے کہا کہ تم مر چکے ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ تم سے رابطہ کرے اور جس مصیبت سے ہم چھٹکارا پا چکے ہیں اس میں دوبارہ پڑیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری بات پر یقین کر لے گی کیونکہ تم کئی بار خودکشی کی کوشش کر چکے تھے۔ وہ ویم کی بہن تھی تمہارے بارے میں یہ سب کچھ جانتی ہو گی۔ کم از کم ایک ایسی کوشش کی تو وہ خود گواہ تھی۔ میں اسے نکاح نامے میں موجود طلاق کے اختیار کے بارے میں نہیں بتا سکا۔ ہی اس طلاق نامے کے بارے میں جو میں نے تمہاری طرف سے تیار کروایا تھا۔ تمہیں جب میں نے امریکہ بھجوا دیا تھا تو تم سے ایک سادہ کاغذ پر سائن لئے تھے، میں چاہتا تھا کہ مجھے ضرورت پڑے تو میں خود ہی طلاق نامہ تیار کروا لوں۔ یہ قانونی یا جائز تھا کہ نہیں اس کا پتہ نہیں مگر میں نے اسے تیار کروا دیا تھا اور میں امامہ کو اس کے بارے میں بتانا چاہتا تھا اور اسے تمام ہجے زبھی دینا چاہتا تھا مگر اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے نمبر ٹریس آؤٹ کر دیا وہ کسی پنی سی او کا تھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد میں ہزار کے کچھ ریو لوز چیک مجھے اس نے ڈاک کے ذریعے بھجوائے اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ شاید تم نے اسے کچھ رقم دی تھی۔ اس نے وہ واپس کی تھی۔ میں نے تمہیں اس لئے نہیں بتایا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم دوبارہ اس معاملے میں انوالو ہو۔ میں امامہ کی فیملی سے خوفزدہ تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ جب بھی تمہاری تاک میں ہوں گے اور میں چاہتا تھا تم اپنا کیریئر بناتے رہو۔“

وہ لفافہ ہاتھ میں پکڑے رنگ بدلتے ہوئے چہرے کے ساتھ سکندر عثمان کو دیکھتا رہا، کسی نے بہت آہستگی کے ساتھ اس کے وجود سے جان نکال لی تھی۔ اس نے لفافے کو نمیل پر رکھ دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ طیبہ اور سکندر اس کے ہاتھ کی کپکپاہٹ کو دیکھ سکیں۔ وہ دیکھ چکے تھے مگر اس کے جو اس چند لمحوں کے لئے بالکل کام کرنا چھوڑ گئے تھے۔ اپنے سامنے پڑی نمیل پر رکھے اس لفافے پر ہاتھ رکھے وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اسے نمیل پر رکھے رکھے اس نے اس کے اندر موجود کاغذ کو نکال لیا۔
ڈیر اگل سکندر!

مجھے آپ کے بیٹے کی موت کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا۔ میری وجہ سے آپ لوگوں کو چند سال پہلے بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے سالار کو کچھ رقم ادا کرنی تھی۔ وہ میں آپ کو بھجوا رہی ہوں۔

خدا حافظ

امامہ ہاشم

سالار کو لگا وہ واقعی مر گیا ہے۔ سفید چہرے کے ساتھ اس نے کاغذ کے اس ٹکڑے کو دوبارہ لفافے میں ڈال دیا۔ کچھ بھی کہے بغیر اس نے لفافہ تھاما اور اٹھ کر کھڑا ہوا۔ سکندر اور طیبہ دم بخود اسے دیکھ رہے تھے جب وہ سکندر کے پاس سے گزرنے لگا تو وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”سالار.....!“

وہ رُک گیا۔ سکندر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”جو کچھ بھی ہوا..... نادانستگی میں ہوا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم..... اگر تم نے بھی مجھے امامہ کے بارے میں اپنی فینکٹر بتائی ہو تو میں کبھی یہ سب نہ کرتا۔ میں اس سارے معاملے کو کسی اور طرح ہینڈل کرتا یا پھر اس کے ساتھ تمہارا رابطہ کروا دیتا۔ میرے بارے میں اپنے دل میں کوئی شکایت یا گلہ مت رکھنا۔“

سالار نے سر نہیں اٹھایا۔ ان سے نظر نہیں ملائی مگر سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ اسے ان سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ سکندر نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا لیا۔

وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا، سکندر چاہتے تھے وہ وہاں سے چلا جائے۔ انہوں نے اس کے ہونٹوں کو کسی بیچے کی طرح کپکپاتے دیکھا تھا۔ وہ بار بار انہیں بھینچ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند منٹ اور وہاں رہتا تو شاید پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ سکندر اپنے بیچتاہوے میں مزید اضافہ نہیں چاہتے تھے۔

طیبہ نے اس ساری گفتگو میں کوئی مداخلت نہیں کی، مگر سالار کے باہر جانے کے بعد انہوں نے

سکندر کی دل دہی کرنے کی کوشش کی۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے جو کچھ کیا اس کی بہتری کے لئے کیا۔ وہ سمجھ جائے گا۔“

وہ سکندر کے چہرے سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکتی تھیں۔ سکندر ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کمرے میں پیکر لگا رہے تھے۔

”یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ مجھے سالار سے پوچھتے بغیر یا اس کو بتائے بغیر یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مجھے امامہ سے اس طرح کا جھوٹ بھی نہیں بولنا چاہئے تھا..... مجھے.....“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر تاسف آمیز انداز میں ایک ہاتھ کو مٹھی کی صورت میں جینچتے ہوئے کھڑکی میں جا کر کھڑے ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

گاڑی بہت محتاط انداز میں اس سڑک پر پھسل رہی تھی۔ سالار کئی سال بعد پہلی بار اس سڑک پر رات کے اس پہر گاڑی چلا رہا تھا۔ وہ رات اس کی آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح چل رہی تھی۔ اسے لگا آٹھ سال اڑ کر غائب ہو گئے تھے۔ سب کچھ وہی تھا۔ وہیں تھا۔

کوئی بڑی آہستگی سے اس کے برابر میں آ بیٹھا۔ اس نے اپنے آپ کو فریب کی گرفت میں آنے دیا۔ گردن موڑ کر برابر والی سیٹ کو نہیں دیکھا۔ الوٹن کو حقیقت بننے دیا۔ جانتے بوجھتے کھلی آنکھوں کے ساتھ۔ کوئی اب سسکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔

”ڈنیر اٹکل سکندر!“

مجھے آپ کے بیٹے کی موت پر بہت افسوس ہوا۔ چند سال پہلے میری وجہ سے آپ کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی، میں اس کے لئے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے سالار کو کچھ رقم ادا کرنی تھی۔ وہ اب میں آپ کو بھیج رہی ہوں۔“

خدا حافظ

امامہ ہاشم

ایک بار پھر اس خط کی تحریر اس کے ذہن میں گونجنے لگی تھی۔

وہ سکندر عثمان کے پاس سے آ کر بہت دیر تک خط لے اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔

اس نے امامہ کو کوئی رقم نہیں دی تھی مگر وہ جانتا تھا اس نے اس کا کون سا قرض لوٹا تھا۔ موبائل فون کی قیمت اور اس کے بجز وہ خالی الذہنی کے عالم میں اپنے بیڈ پر بیٹھے نیم تاریک کمرے کی کھڑکیوں سے باہر اس کے گھر کی عمارت کو دیکھتا رہا۔ ہماری دنیا ایک دم جیسے ہر زندہ شے سے خالی ہو گئی تھی۔

اس نے خط پر تاریخ پڑھی، وہ امامہ کے گھر سے جانے کے تقریباً ڈھائی سال بعد بھیجا گیا تھا۔ ڈھائی سال کے بعد اگر وہ بیس ہزار روپے اسے بھجوا رہی تھی تو اس کا مطلب تھا وہ خیریت سے تھی۔ کم از کم اس کے امامہ کے بارے میں بدترین اندیشے درست ثابت نہیں ہوئے تھے۔ اسے خوشی تھی لیکن اگر اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ سالار مر چکا تھا تو پھر وہ اس کی زندگی سے بھی نکل گیا تھا اور اس کا کیا مطلب تھا وہ یہ بھی جانتا تھا۔

کئی گھنٹے وہ اسی طرح وہیں بیٹھا رہا پھر بتا نہیں اس کے دل میں کیا آیا، اپنا بیگ پیک کر کے وہ گھر سے نکل آیا۔

اور اب وہ اس سڑک پر تھا۔ اسی دھند میں، اسی موسم میں، سب کچھ جیسے دھواں بن رہا تھا یا پھر دھند چند گھنٹوں کے بعد وہ اسی ہوٹل نما سروس اسٹیشن کے پاس جا پہنچا۔ اس نے گاڑی روک لی۔ دھند میں مٹوف وہ عمارت اب بالکل بدل چکی تھی۔ گاڑی کو موڑ کر وہ سڑک سے اتار کر اندر لے آیا۔ پھر دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا، آٹھ سال پہلے کی طرح آج بھی وہاں خاموشی کا راج تھا۔ صرف لائٹس کی تعدد پہلے سے زیادہ تھی، اس نے ہارن نہیں دیا۔ اس لئے اندر سے کوئی نہیں نکلا۔ برآمدے میں اب وہ پانی کا ڈرم نہیں تھا۔ وہ برآمدے سے گزرتے ہوئے اندر جانے لگا، تب ہی اندر سے ایک شخص نکل آیا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا سالار نے اس سے کہا۔

”میں چائے پینا چاہتا ہوں۔“

اس نے ہنسی لی اور واپس مڑ گیا۔

”آجائیں.....“

سالار اندر چلا گیا۔ یہ وہی کمرہ تھا مگر اندر سے کچھ بدل چکا تھا۔ پہلے کی نسبت میزوں اور کرسیوں کی تعداد زیادہ تھی اور کمرے کی حالت بھی بہتر ہو چکی تھی۔

”چائے لیں گے یا ساتھ کچھ اور بھی؟“ اس آدمی نے مڑ کر اچانک پوچھا۔

”صرف چائے۔“

سالار ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

آدمی کاؤنٹر کے عقب میں اب اسٹوڈ جلائے میں مصروف ہو چکا تھا۔

”آپ کہاں سے آئے ہیں؟“ اس نے چائے کے لئے کیتلی اوپر رکھتے ہوئے سالار سے پوچھا۔

جواب نہیں آیا۔

اس شخص نے گردن موڑ کر دیکھا۔ چائے پینے کے لئے آنے والا وہ شخص کمرے کے ایک کونے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ بالکل پتھر کے کسی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت۔

وہ نماز پڑھ کر اس کے بالمقابل میز کے دوسری جانب کرسی پر آ بیٹھی تھی۔ کچھ کہے بغیر اس نے میز پر پڑا چائے کا کپ اٹھایا اور اسے پینے لگی۔ لڑکا تب تک برگر لے آیا تھا اور اب ٹیبل پر برگر رکھ رہا تھا۔ سالار ٹیکسی نظروں کے ساتھ اس برگر کی پلیٹ کو دیکھ رہا تھا، جو اس کے سامنے رکھی جا رہی تھی۔ جب لڑکے نے پلیٹ رکھ دی تو سالار نے کانٹے کے ساتھ برگر کا پورا والا حصہ اٹھایا اور تنقیدی نظروں سے فلنگ کا جائزہ لیا پھر چھری اٹھا کر اس نے لڑکے سے کہا جو اب امامہ کے برگر کی پلیٹ اس کے سامنے رکھ چکا تھا۔

”یہ شامی کہا ہے۔“

وہ fillings کی اوپر والی تہ کو الگ کر رہا تھا۔

”یہ آلیٹ ہے۔“ اس نے نیچے موجود آلیٹ کو چھری کی مدد سے توڑا اور نکھایا۔

”اور یہ کچپ، تو چکن کہاں ہے؟ میں نے تمہیں چکن برگر لانے کو کہا تھا؟“

اس نے اکھڑ لہجے میں لڑکے سے کہا۔

امامہ تب تک خاموشی سے برگر اٹھا کر کھانے میں مصروف ہو چکی تھی۔

”یہ چکن برگر ہے۔“ لڑکے نے قدرے گڑبڑا کر کہا۔

”کیسے چکن برگر ہے؟ اس میں کیسے چکن نہیں۔“ سالار نے چیلنج کیا۔

”ہم اسے ہی چکن برگر کہتے ہیں۔“ وہ لڑکا اب زورس ہو رہا تھا۔

”اور جو سادہ برگر ہے اس میں کیا ڈالتے ہو؟“

”اس میں بس شامی کہا ہے۔“ لڑکے نے کہا۔

”اور انڈہ ڈال کر سادہ برگر چکن برگر بن جاتا ہے، چونکہ انڈے سے مرئی نکلتی ہے اور مرئی کے

گوشت کو چکن کہتے ہیں اس لئے directly نہیں indirectly یہ چکن برگر بنتا ہے۔“

سالار نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ وہ لڑکا کھانے انداز میں ہنسنا۔ امامہ ان دونوں کی گفتگو پر توجہ

دیئے بغیر ہاتھ میں پکڑا برگر کھانے میں مصروف تھی۔

”ٹھیک ہے جاؤ۔“ سالار نے کہا۔

لڑکے نے یقیناً سکون کا سانس لیا اور وہاں سے غائب ہو گیا۔ چھری اور کانٹے کو رکھ کر سالار نے

باکس ہاتھ سے برگر کو اٹھالیا۔ برگر کھاتے ہوئے امامہ نے کبلی ہار پلیٹ سے سالار کے ہونٹوں تک

باکس ہاتھ میں پکڑے ہوئے برگر کے سبز کو تھپ آمیز نظروں سے دیکھا اور یہ تعجب ایک لمحہ میں غائب

ہو گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر برگر کھانے میں مصروف تھی۔ سالار نے اپنے برگر کو دانتوں سے کاٹا ایک لمحہ

کے لئے منہ چلایا اور پھر برگر کو اپنی پلیٹ میں اچھال دیا۔

”فضول برگر ہے۔ تم کس طرح کھا رہی ہو؟“ سالار نے لقمے کو بمشکل حلق سے نکلنے ہوئے کہا۔

”انتہا برا نہیں ہے جتنا تمہیں لگ رہا ہے۔“ امامہ نے بے تاثر انداز میں کہا۔

”ہر چیز میں تمہارا اسٹینڈرڈ ڈیوالو ہے امامہ! وہ چاہے برگر ہو یا شوہر۔“

برگر کھاتے ہوئے امامہ کا ہاتھ رک گیا۔ سالار نے اس کے سفید چہرے کو ایک بل میں سرخ

ہوتے دیکھا۔ سالار کے چہرے پر ایک تپا دینے والی مسکراہٹ آئی۔

”میں جلال الصحر کی ہات کر رہا ہوں۔“ اس نے جیسے امامہ کو یاد دلایا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ امامہ نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”میرا اسٹینڈرڈ واقعی بہت لو ہے۔“ وہ ایک بار پھر برگر کھانے لگی۔

”میں نے سوچا تم برگر میرے منہ پر دے مارو گی۔“ سالار نے دہلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”میں رزق جیسی نعمت کو کیوں ضائع کروں گی۔“

یہ انتہا برا برگر نعمت ہے؟“ اس نے تھیک آمیز انداز میں کہا۔

”اور کون کون سی نعمتیں ہیں اس وقت تمہارے پاس.....“

”انسان اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا۔ یہ میری زبان پر ڈالنا کہہ سکتی ہے یہ سکتی

بڑی نعمت ہے کہ میں اگر کوئی چیز کھاتی ہوں تو میں اس کا ڈالنا کہہ سکتی ہوں۔ بہت سے لوگ اس

نعمت سے بھی محروم ہوتے ہیں۔“

”اور ان لوگوں میں ٹاپ آف وی لسٹ، سالار سکندر کا نام ہو گا ہے نا؟“

اس نے امامہ کے بات مکمل کرنے سے پہلے ہی تیز آواز میں اس کی بات کاٹی۔

”سالار سکندر کم از کم اس طرح کی چیزیں کھا کر انجوائے نہیں کر سکتا۔“

اس شخص نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔ سالار یک دم چونک گیا۔ سامنے والی کرسی

اب خالی تھی۔

”ساتھ میں کچھ اور چاہئے؟“ آدمی نے کھڑے کھڑے پوچھا۔

”نہیں، بس چائے کافی ہے۔“ سالار نے چائے کا کپ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

”آپ اسلام آباد سے آئے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”لاہور جا رہے ہیں؟“ اس نے ایک اور سوال کیا۔

اس بار سالار نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ وہ اب چائے کا گھونٹ لے رہا تھا۔ اس آدمی کو

شبہ ہوا اس نے چائے پینے والے شخص کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی دیکھی ہے۔

”میں کچھ دیر یہاں اکیلا بیٹھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے سر اٹھائے بغیر کہا۔

وہ شخص کچھ تعجب سے اسے دیکھتا رہا، لیکن میں چلا گیا اور ثانوی نوعیت کے کاموں میں مصروف گا ہے بگا ہے دور سے سالار پر نظریں دوڑاتا رہا۔

پورے پندرہ منٹ بعد اس نے سالار کو ٹیبل چھوڑ کر کمرے سے نکلے دیکھا۔ وہ آدمی بڑی تیز رفتاری کے ساتھ لیکن سے کمرے میں آیا مگر اس سے پہلے کہ وہ سالار کے پیچھے باہر جاتا، میز پر خالی کپ کے نیچے پڑے ایک نوٹ نے اسے روک لیا۔ وہ جو بچکا سا نوٹ کو دیکھتا رہا، پھر اس نے آگے بڑھ کر اس نوٹ کو پکڑا اور تیزی سے کمرے سے باہر آ گیا۔ سالار کی گاڑی اس وقت ریورس ہوتے ہوئے مین روڈ پر جارہی تھی۔ اس آدمی نے حیرانی سے اس دور جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھا پھر ہاتھ میں پکڑے اس ہزار روپے کے نوٹ کو برآمدے میں لگی نیوب لائٹ کی روشنی میں دیکھا۔

”نوٹ اصلی ہے مگر آدمی بے وقوف۔“

اس نے اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے زیر لب تبصرہ کیا اور نوٹ کو جیب میں ڈال لیا۔

☆.....☆.....☆

سکندر عثمان صبح ناشتے کی میز پر آئے تو بھی ان کے ذہن میں سب سے پہلے سالار کا ہی خیال آیا تھا۔

”سالار کہاں ہے؟ اسے بلاؤ۔“

انہوں نے ملازم سے کہا۔ ”سالار صاحب تو رات کو ہی چلے گئے۔“

طیبہ اور سکندر نے بے اختیار ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا۔

”کہاں چلے گئے۔؟ گاڑی؟“

”نہیں، وہاں لاہور چلے گئے، کہہ رہے تھے کوئی ضروری کام ہے، میں صبح آپ کو بتا دوں۔“

سکندر ایک دم اٹھ کر فون کی طرف چلے گئے۔ انہوں نے سالار کا نمبر ڈائل کیا۔ موبائل آف تھا۔ انہوں نے اس کے فلیٹ کا نمبر ڈائل کیا۔

وہاں جوائی مشین لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے پیغام ریکارڈ کروائے بغیر فون بند کر دیا۔ کچھ پریشان سے دو دو بارہ ناشتے کی میز پر آ بیٹھے۔

”فون پر کال ٹیکٹ نہیں ہوا؟“ طیبہ نے پوچھا۔

”نہیں موبائل آف ہے۔ اس کے فلیٹ پر آنسرفون لگا ہوا ہے۔ پتا نہیں کیوں چلا گیا؟“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ ناشتہ کریں۔“ طیبہ نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

”تم کرو۔ میرا موڈ نہیں ہے۔“

وہ اٹھ کر باہر نکل گئے۔ طیبہ بے اختیار سانس لے کر رہ گئیں۔

☆.....☆.....☆

سالار نے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا، باہر فرقان تھا۔ وہ پلٹ کر اندر آ گیا۔

”تم کب آئے؟“ فرقان نے قدرے حیرانی سے اس کے پیچھے اندر آتے ہوئے کہا۔

”آج صبح۔“ سالار نے صوفے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ تمہیں گاڑی جانا تھا؟“ فرقان نے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں تو پارکنگ میں تمہاری گاڑی دیکھ کر آ گیا۔ بندہ آتا ہے تو بتا ہی دیتا ہے۔“

سالار جواب میں کچھ کہے بغیر صوفہ پر بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا؟“ فرقان نے پہلی بار اس کے چہرے کو دیکھا اور تشویش میں مبتلا ہوا۔

”کیا ہوا؟“ سالار نے جواب دیا۔

”میں تم سے پوچھ رہا ہوں، تمہیں کیا ہوا ہے؟“ فرقان نے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں۔“

”گھر میں سب خیریت ہے؟“

”ہاں۔“

”تو پھر تم۔۔۔۔۔ سر میں درد ہے؟ میگرین؟“

فرقان اب اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ سالار نے مسکرانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی

آنکھوں کو مسلا۔

”تو پھر ہوا کیا ہے تمہیں؟ آگے میں سرخ ہو رہی ہیں۔“

”میں رات سو یا نہیں۔ ڈرائیو کرتا رہا ہوں۔“

سالار نے بڑے عام سے انداز میں کہا۔

”تو اب سو جاتے۔ یہاں آکر فلیٹ پر، صبح سے کیا کر رہے ہو؟“ فرقان نے کہا۔

”کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔“

”سوئے کیوں نہیں۔۔۔۔۔؟“

”خینڈ نہیں آرہی۔۔۔۔۔“

”تم تو سلیپنگ بلو لے کر سو جاتے ہو، پھر خینڈ نہ آتا کیا معنی رکھتا ہے؟“

فرقان کو تعجب ہوا۔

”بس آج نہیں لینا چاہتا تھا میں۔ یا یہ سمجھ لو کہ آج میں سونا نہیں چاہتا تھا۔“

”کھانا کھایا ہے؟“

”نہیں، بھوک نہیں لگی۔“

”دونچ رہے ہیں۔“ فرقان نے جیسے اسے بتایا۔

”میں کھانا بھجواتا ہوں کھالو۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر سو جاؤ پھر رات کو نکلے ہیں آؤنگ کے لئے۔“

”نہیں، کھانا مت بھجواتا۔ میں سونے جا رہا ہوں۔ شام کو اٹھوں گا تو باہر جا کر کہیں کھاؤں گا۔“

سالار کہتے ہوئے صوفہ پر لیٹ گیا اور اپنا بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ فرقان کچھ دیر بیٹھا اسے دیکھتا رہا، پھر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“

رمضہ نے سالار کے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔ اس نے ریسپشن کی طرف جاتے ہوئے سالار کے کمرے کی کھڑکیوں کے چند کھلے ہوئے بارنڈز میں اسے اندر دیکھا تھا۔ کوریڈور میں سے گزر جانے کی بجائے وہ رک گئی۔ سالار ٹیبل پر اپنی کہنیاں ٹکائے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے ہوئے تھا۔ رمضہ جانتی تھی کہ اسے کبھی بکھار میگزین کا درد ہو تا تھا۔ وہ ریسپشن کی طرف جانے کے بجائے اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

سالار اسے دیکھ کر سیدھا ہو گیا۔ وہ اب ٹیبل پر کھلی ایک فائل کو دیکھ رہا تھا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ رمضہ نے فکر مندی سے پوچھا۔

”ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔“

اس نے رمضہ کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ رمضہ واپس جانے کے بجائے آگے بڑھ آئی۔

”نہیں تم ٹھیک نہیں لگ رہے؟“ اس نے سالار کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم پلیز اس فائل کو لے جاؤ۔۔۔۔۔ اسے دیکھ لو۔۔۔۔۔ میں دیکھ نہیں پا رہا۔۔۔۔۔“

سالار نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے فائل بند کر کے ٹیبل پر اس کی طرف کھسکادی۔

”میں دیکھ لیتی ہوں، تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہے تو گھر چلے جاؤ۔“

رمضہ نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

”ہاں، بہتر ہے۔ میں گھر چلا جاؤں۔“ اس نے اپنا بریف کیس نکال کر اسے کھولا اور اپنی چیزیں

اندر رکھنا شروع کر دیں۔ رمضہ بخور اس کا جائزہ لیتی رہی۔

☆.....☆.....☆

وہ گیارہ بجے آفس سے واپس گھر آیا تھا۔ یہ چوتھا دن تھا جب وہ مسلسل اسی حالت میں تھا۔ یک دم، ہر چیز میں اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔

بینک میں اپنی جاگ۔

لمو (LUMS) کے لیکچررز۔

ڈاکٹر سیٹھ علی کے ساتھ نشست۔۔۔۔۔

فرقان کی کہنی۔

گاؤں کا اسکول۔

مستقبل کے منصوبے اور پلاننگ۔

اسے کوئی چیز بھی اپنی طرف کھینچ نہیں پارہی تھی۔

وہ جس امکان کے پیچھے کئی سال پہلے سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آ گیا تھا وہ ”امکان“ ختم ہو گیا تھا اور اسے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ختم ہونے سے اس کے لئے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ وہ مسلسل اپنے آپ کو اس حالت سے باہر لانے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا اور وہ مسلسل ناکام ہو رہا تھا۔

محض یہ تصور کہ وہ کس اور شخص کی بیوی بن کر کسی اور کے گھر میں رہ رہی ہوگی۔ سالار سکندر کے لئے اتنا ہی جان لیوا تھا جتنا ماضی کا یہ اندیشہ کہ وہ غلط ہاتھوں میں نہ چلی گئی ہو اور اس ذہنی حالت میں اس نے عمرہ پر جانے کا فیصلہ کیا تھا وہ واحد جگہ تھی جو اس کی زندگی میں اچانک آ جانے والی اس بے معنویت کو ختم کر سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ احرام باندھے خانہ کعبہ کے صحن میں کھڑا تھا۔ خانہ کعبہ میں کوئی نہیں تھا۔ دور دور تک کسی وجود کا نشان نہیں تھا۔ رات کے پچھلے پہر آسمان پر چاند اور ستاروں کی روشنی نے صحن کے ماربل سے منعکس ہو کر وہاں کی ہر چیز کی ایک عجیب سی دودھیاروشنی میں نہلا دیا تھا۔ چاند اور ستاروں کے علاوہ وہاں اور کوئی روشنی نہیں تھی۔

خانہ کعبہ کے خلاف پرکھی ہوئی آیات، سیاہ غلاف پر عجیب طرح سے روشن تھیں۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا اور اس گہرے سکوت کو صرف ایک آواز توڑ رہی تھی۔ اس کی آواز۔۔۔۔۔ اس کی اپنی آواز۔۔۔۔۔ وہ مقام ملترم کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی نظریں خانہ کعبہ کے دروازے پر تھیں اور وہ سر اٹھائے بلند آواز سے کہنے لگا۔

”لیک اللہم لیک ۵ لیک لا شریک لک لیک ۵ ان الحمد والنعمه لک والملك

لا شریک لک ۵“

(حاضر ہوں میرے اللہ میں حاضر ہوں، حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، بیٹک حمد و ثنا تیرے لئے ہے، نعمت تیری ہے، بادشاہی تیری ہے کوئی تیرا شریک نہیں)۔
پوری قوت سے گونجتی ہوئی اس کی آواز خانہ کعبہ کے سکوت کو توڑ رہی تھی۔ اس کی آواز خلا کی دستوں تک چار رہی تھی۔

"لیک اللہم لیک....."

ٹنگے پاؤں، نیم بر بند وہاں کھڑا وہ اپنی آواز پہچان رہا تھا۔

"لیک لا شریک لک لیک..... وہ صرف اس کی آواز تھی۔ ان الحمد والنعمة لک والملک۔"

اس کی آنکھوں سے پتے ہوئے آنسو اس کی ٹھوڑی سے نیچے اس کے پیروں کی انگلیوں پر گر رہے تھے۔

"لا شریک لک....."

اس کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔

"لیک اللہم لیک....."

اس نے خانہ کعبہ کے خلاف پر کندہ آیات کو یک دم بہت روشن دیکھا۔ اتنا روشن کہ وہ جھگانے لگی تھیں۔ آسمان پر ستاروں کی روشنی بھی اچانک بڑھ گئی تھی۔ وہ ان آیات کو دیکھ رہا تھا۔ مبہوت سحر زدہ۔ کسی معمول کی طرح، زبان پر ایک ہی جملہ لئے..... اس نے خانہ کعبہ کے دروازے کو بہت آہستہ آہستہ کھٹکے دیکھا۔

"لیک اللہم لیک....."

اس کی آواز اور بلند ہو گئی۔ ایک ورد کی طرح۔ ایک سانس۔ ایک لے۔

"لیک لا شریک لک لیک....."

اس وقت پہلی بار اس نے اپنی آواز میں کسی اور آواز کو دم ہوتے محسوس کیا۔

"ان الحمد والنعمة....."

اس کی آواز کی طرح وہ آواز بلند نہیں تھی۔ کسی سرگوشی کی طرح تھی۔ کسی گونج کی طرح، مگر وہ پہچان سکتا تھا وہ اس کی آواز کی گونج نہیں تھی۔ وہ کوئی اور آواز تھی۔

"لک والملک....."

اس نے پہلی بار خانہ کعبہ میں اپنے علاوہ کسی اور کی موجودگی کو محسوس کیا۔

"لا شریک لک....."

خانہ کعبہ کا دروازہ کھل رہا تھا۔

"لیک اللہم لیک....."

وہ اس نسوانی آواز کو پہچانتا تھا۔

"لیک لا شریک لک....."

وہ اس کے ساتھ وہی الفاظ دہرا رہی تھی۔

"لیک ان الحمد والنعمة"

آواز دائیں طرف نہیں تھی، بائیں طرف تھی۔ کہاں..... اس کی پشت پر۔ چند قدم کے فاصلے پر۔

"لک والملک لا شریک لک....."

اس نے جھک کر اپنے پاؤں پر گرنے والے آنسوؤں کو دیکھا اس کے پاؤں بھیگ چکے تھے۔

اس نے سر اٹھا کر خانہ کعبہ کے دروازے کو دیکھا۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ اندر روشنی تھی۔ دودھیا روشنی۔ اتنی روشنی کہ اس نے بے اختیار گھٹنے ٹیک دیئے۔ وہ اب سجدہ کر رہا تھا، روشنی کم ہو رہی تھی۔ اس نے سجدے سے سر اٹھایا۔ روشنی اور کم ہو رہی تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خانہ کعبہ کا دروازہ اب بند ہو رہا تھا۔ روشنی اور کم ہوتی جا رہی تھی اور تب اس نے ایک پار پھر سرگوشی کی صورت میں وہی نسوانی آواز سنی۔

اس بار اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

سالار کی آنکھ کھل گئی۔ وہ حرم شریف کے ایک برآمدے کے ستون سے سرٹکائے ہوئے تھا۔ وہ کچھ دیر ستانے کے لئے وہاں بیٹھا تھا مگر نیند نے مجیب انداز میں اس پر نلبہ پایا۔

وہ امامہ تھی۔ بے شک امامہ تھی۔ سفید احرام میں اس کے پیچھے کھڑی۔ اس نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی مگر ایک جھلک بھی اسے یقین دلانے کے لئے کافی تھی کہ وہ امامہ کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ خالی الذہنی کے عالم میں لوگوں کو ادھر سے ادھر جاتے دیکھ کر بے اختیار اس کا دل بھر آیا۔

آٹھ سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا اسے اس عورت کو دیکھے جسے اس نے آج وہاں حرم شریف میں خواب میں دیکھا تھا کسی زخم کو پھر اویزا گیا تھا۔ اس نے گلاسز اتار دیئے اور دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔

آنکھوں سے ایلنے گرم پانی کو رگڑتے، آنکھوں کو مسلتے اسے خیال آیا۔ یہ حرم شریف تھا۔ یہاں اسے کسی سے آنسو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں سب آنسو بہانے کے لئے ہی آتے تھے۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس پر رقت طاری ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکائے بہت دیر وہاں بٹھا رہا۔

پھر اسے یاد آیا وہ ہر سال وہاں عمرہ کرنے کے لئے آیا کرتا تھا۔ وہ امام ہاشم کی طرف سے بھی عمرہ کیا کرتا تھا۔

وہ اس کی معافیت اور لمبی زندگی کے لئے بھی دعا مانگا کرتا تھا۔

وہ امام ہاشم کو ہر پریشانی سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی دعا مانگا کرتا تھا۔

اس نے وہاں حرم شریف میں اسی سالوں میں اپنے اور امام کے لئے ہر دعا مانگ چھوڑی تھی جہاں بھری دعائیں، مگر اس نے وہاں حرم شریف میں کبھی امام کو اپنے لئے نہیں دعا مانگا تھا۔ عجیب بات تھی مگر اس نے وہاں کبھی امام کے حصول کے لئے دعائیں کی تھی۔ اس کے آسویک دم ختم کئے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وضو کے بعد اس نے عمرے کے لئے احرام باندھا۔ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے اس بار دعا مانگا اسے مقام ملتزم کے پاس جگہ مل گئی۔ وہاں، جہاں اس نے اپنے آپ کو خواب میں کھڑے دیکھا تھا۔

اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے دعا کرتا شروع کی۔

”یہاں کھڑے ہو کر تجھ سے انبیاء دعا مانگا کرتے تھے۔ ان کی دعاؤں میں اور میری دعا میں بہت فرق ہے۔“

وہ گڑگڑا رہا تھا۔

”میں نبی ہوتا تو نبیوں جیسی دعا کرتا مگر میں تو عام بشر ہوں اور گناہگار بشر۔ میری خواہشات، میری آرزوئیں سب عام ہیں۔ یہاں کھڑے ہو کر کبھی کوئی کسی عورت کے لئے نہیں رویا ہو گا، میری ذلت اور بستی کی اس سے زیادہ اہتیا کیا ہو گی کہ میں یہاں کھڑا۔ حرم پاک میں کھڑا۔ ایک عورت کے لئے گڑگڑا رہا ہوں مگر مجھے نہ اپنے دل پر اختیار ہے نہ اپنے آسویکوں پر۔“

یہ میں نہیں تھا جس نے اس عورت کو اپنے دل میں جگہ دی، یہ تو نے کیا۔ کیوں میرے دل میں اس عورت کے لئے اتنی محبت ڈال دی کہ میں تیرے سامنے کھڑا بھی اس کو یاد کر رہا ہوں؟ کیوں مجھے اس قدر بے بس کر دیا کہ مجھے اپنے وجود پر بھی کوئی اختیار نہیں رہا؟ میں وہ بشر ہوں جسے تو نے ان تمام کمزوریوں کے ساتھ بنایا۔ میں وہ بشر ہوں جسے تیرے سوا کوئی راستہ دکھانے والا نہیں اور وہ عورت وہ میری زندگی کے ہر راستے پر کھڑی ہے۔ مجھے کہیں جانے کہیں پہنچنے نہیں دے رہی یا تو اس کی محبت کو اس طرح میرے دل سے نکال دے کہ مجھے کبھی اس کا خیال تک نہ آئے یا پھر اسے مجھے دے دے۔ وہ نہیں ملے گی تو میں ساری زندگی اس کے لئے ہی روتا رہوں گا۔ وہ مل جائے گی تو تیرے علاوہ میں کسی کے لئے آسویک نہیں بہا سکوں گا۔ میرے آسویکوں کو خالص ہونے دے۔“

میں یہاں کھڑا تجھ سے پاک عورتوں میں سے ایک کو مانگتا ہوں۔

میں امام ہاشم کو مانگتا ہوں۔

میں اپنی نسل کے لئے اس عورت کو مانگتا ہوں، جس نے آپ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں کسی کو شریک نہیں کیا۔ جس نے ان کے لئے اپنی زندگی کی تمام آسائشوں کو چھوڑ دیا۔

اگر میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی نیکی کی ہے، تو مجھے اس کے عوض امام ہاشم دے دے۔ تو چاہے تو یہ اب بھی ہو سکتا ہے۔ اب بھی ممکن ہے۔

مجھے اس آزمائش سے نکال دے۔ میری زندگی کو آسان کر دے۔

آٹھ سال سے میں جس تکلیف میں ہوں مجھے اس سے رہائی دے دے۔

سالار سکندر پر ایک بار پھر رحم کرو، وہی جو تیری صفات میں افضل ترین ہے۔

وہ سر جھکانے وہاں بلک رہا تھا اسی جگہ پر جہاں اس نے خود کو خواب میں دیکھا تھا مگر اس بار اس کی پشت پر امام ہاشم نہیں تھی۔

بہت دیر تک وہاں گڑگڑانے کے بعد وہ وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ آسمان پر ستاروں کی روشنی اب بھی مدھم مدھم تھی۔ خانہ کعبہ وہ شینوں سے اب بھی بھرا لور بنا ہوا تھا۔ لوگوں کا بھوم رات کے اس پہر بھی اسی طرح تھا۔ خواب کی طرح خانہ کعبہ کا دروازہ بھی نہیں کھلا تھا۔ اس کے باوجود وہاں سے ہٹتے ہوئے سالار سکندر کو اپنے اندر رسکون آرتا محسوس ہوا تھا۔

وہ اس کیفیت سے باہر آ رہا تھا جس میں وہ پچھلے ایک ماہ سے تھا۔ ایک عجیب سا قرار تھا جو اس دعا کے بعد اسے ملا تھا اور وہ اسی قرار اور طمانیت کو لئے ہوئے ایک ہفتے کے بعد پاکستان لوٹ آیا تھا۔

☆.....☆

”میں اگلے سال پی ایچ ڈی کے لئے امریکہ جا رہا ہوں۔“

فرقان نے بے اختیار چونک کر سالار کو دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ سالار حیرانی سے مسکرایا۔

”کیا مطلب کا کیا مطلب؟ میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہوں۔“

”یوں اچانک؟“

”اچانک تو نہیں۔ پی ایچ ڈی کرنی تو تھی مجھے۔ بہتر ہے ابھی کر لوں۔“ سالار اطمینان سے بتا رہا تھا۔ وہ دونوں فرقان کے کاؤس سے واپس آ رہے تھے۔ فرقان ڈرائیو کر رہا تھا جب سالار نے اچانک اسے اپنی پی ایچ ڈی کے ارادے کے بارے میں بتایا۔

”میں نے جینک کو بتا دیا ہے، میں نے ریزائن کرنے کا سوچا ہے، لیکن وہ مجھے چھٹی دینا چاہ رہے ہیں۔ ابھی میں نے سوچا نہیں ہے کہ ان کی اس آفر کو قبول کر لوں یا پھر ریزائن کر دوں۔“

”تم ساری پلاننگ کئے بیٹھے ہو۔“

”ہاں یار..... میں مذاق نہیں کر رہا..... میں واقعی اگلے سال پی ایچ ڈی کے لئے جا رہا ہوں۔“

”چند ماہ پہلے تک تو تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“

”ارادے کا کیا ہے، وہ تو ایک دن میں بن جاتا ہے۔“

سالار نے کندھے جھٹکتے ہوئے کھڑکی کے شیشے سے باہر نظر آنے والے کھیتوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں ویسے بھی بینکنگ سے متعلق ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں مگر یہاں میں کچھ کچھ سالوں میں اتنا

مصروف رہا ہوں کہ اس پر کام نہیں کر سکا۔ میں چاہتا ہوں پی ایچ ڈی کے دوران میں یہ کتاب لکھ کر شائع

بھی کر دوں۔ میرے پاس کچھ فرصت ہوگی تو میں یہ کام آسانی سے کر لوں گا۔“

فرقان کچھ دیر خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا پھر اس نے کہا۔

”اور اسکول..... اس کا کیا ہو گا؟“

”اس کا کچھ نہیں ہو گا۔ یہ ایسے ہی چلتا رہے گا۔ اس کا انفراسٹرکچر بھی بہتر ہونا چاہئے گا۔ بورڈ آف

گورنرز ہے، وہ لوگ آتے جاتے رہیں گے۔ تم ہو..... میں نے پاپا سے بھی بات کی ہے وہ بھی آیا کریں

گے یہاں پر..... میرے نہ ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ یہ اسکول بہت پہلے سالار سکندر کی

تھمائی ہوئی لائسیاں چھوڑ چکا ہے۔ آئندہ بھی اسے ان کی ضرورت نہیں پڑے گی مگر میں مکمل طور پر اس

سے قطع تعلق نہیں کر رہا ہوں۔ میں اس کو دیکھتا ہوں گا۔ کبھی میری مدد کی ضرورت پڑی تو آجایا کروں

گا۔ پہلے بھی تو ایسا ہی کیا کرتا تھا۔“

وہ اب تھرمس میں سے چائے کپ میں ڈال رہا تھا۔

”پی ایچ ڈی کے بعد کیا کرو گے؟“ فرقان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”واپس آؤں گا۔ پہلے کی طرح میٹیں پر کام کروں گا۔ ہمیشہ کے لئے نہیں جا رہا ہوں۔“

سالار نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے کو تھپکا۔

”کیا چند سال بعد نہیں جاسکتے تم؟“

”نہیں، جو کام آج ہونا چاہئے اسے آج ہی ہونا چاہئے۔ میرا موڈ ہے آگے بڑھنے کا۔ چند سال

بعد شاید خواہش نہ رہے۔“

سالار نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا وہ اب بائیں ہاتھ سے ریڈیو کو ٹیون کرنے میں

مصروف تھا۔

”رورٹری (Rotary) کلب والے اگلے ایک اینڈ پر ایک فنکشن کر رہے ہیں۔ میرے پاس انویٹیشن

آیا ہے۔ چلو گے؟“

اس نے ریڈیو کو ٹیون کرتے ہوئے فرقان سے پوچھا۔

”کیوں نہیں چلوں گا۔ ان کے پروگرام دلچسپ ہوتے ہیں۔“

فرقان نے جواباً کہا۔ گفتگو کا موضوع بدل چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس دن اتوار تھا۔ سالار صبح دیر سے اٹھا۔

اخبار لے کر سرخیوں پر نظر دوڑاتے ہوئے وہ بکن میں ناشتہ تیار کرنے لگا۔ اس نے صرف منہ

ہاتھ دھویا تھا۔ شیو نہیں کی۔ نائٹ ڈریس کے اوپر ہی اس نے ایک ڈھیلا ڈھالا سوئیٹر پہن لیا اس نے کپتلی

میں چائے کا پانی ابھی رکھا ہی تھا جب ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ اخبار ہاتھ میں پکڑے بکن سے باہر آ

گیا، دروازہ کھولنے پر اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا جب اس نے سعیدہ اماں کو وہاں کھڑا پایا۔ سالار نے

دروازہ کھول دیا۔

”السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟“

اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اس نے کہا۔

”اللہ کا شکر ہے میں بالکل ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟“

انہوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس کے سر پر اپنے دونوں ہاتھ پھیرے۔

”میں بھی ٹھیک ہوں، آپ اندر آئیں۔“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک لگتے تو نہیں رہے ہو۔ کمزور ہو گئے ہو، چہرہ بھی کالا ہو رہا ہے۔“ انہوں نے اپنی ٹینک کے

شیشوں کے پیچھے سے اس کے چہرے پر غور کیا۔

”رنگ کالا نہیں ہوا۔ میں نے شیو نہیں کی۔“ سالار نے بے اختیار اپنی مسکراہٹ روکی۔ وہ ان

کے ساتھ چلتا ہوا اندر آ گیا۔

”لو بھلا شیو کیوں نہیں کی۔ اچھا ڈاڑھی رکھنا چاہتے ہو..... بہت اچھی بات ہے۔ نیکی کا کام ہے۔

بہت اچھا کر رہے ہو۔“

وہ صوف پر بیٹھے ہوئے بولیں۔

”نہیں اماں! ڈاڑھی نہیں رکھ رہا ہوں..... آج اتوار ہے۔ دیر سے اٹھا ہوں کچھ دیر پہلے ہی، اس

لئے شیو نہیں کی۔“ وہ ان کی بات پر مغلوظ ہوا۔

”دیر سے کیوں اٹھے ہو..... جینا دیر سے نہ اٹھا کرو۔ صبح جلدی اٹھ کر فجر کی نماز پڑھا کرو.....

پھر سے پر رونق آتی ہے۔ اسی لئے تو تمہارا چہرہ مرجھایا ہوا ہے۔ صبح نماز پڑھ کر بندہ قرآن پڑھے پھر میر

کو چلا جائے۔ صحت بھی ٹھیک رہتی ہے اور اللہ بھی خوش ہوتا ہے۔“

سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔

”میں نماز پڑھ کر سویا تھا۔ صرف اتوار والے دن ہی دیر تک سوتا ہوں۔ ورنہ روز صبح وہی کرتا ہوں جو آپ کہہ رہی ہیں۔“

وہ اس کی وضاحت پر بے حد خوش نظر آنے لگیں۔

”بہت اچھی بات ہے..... اسی لئے تو تمہارا چہرہ چمک رہا ہے۔ روتی نظر آ رہی ہے۔“

انہوں نے اپنے بیان میں ایک بار پھر تبدیلی کی۔

”آپ کیالیس گی؟“

وہ اپنے چہرے پر کوئی تبصرہ نہیں سننا چاہتا تھا، اس لئے اس نے موضوع بدلا۔

”ہاشتا کریں گی؟“

”نہیں، میں ہاشتا کر کے آئی ہوں۔ صبح چھ سات بجے میں ہاشتا کر لیتی ہوں۔ گیارہ ساڑھے گیارہ تو میں دوپہر کا کھانا بھی کھا لیتی ہوں۔“

انہوں نے اپنے معمولات سے آگاہ کیا۔

”تو پھر دوپہر کا کھانا کھائیں۔ ساڑھے دس تو ہو رہے ہیں۔“

”نہیں ابھی تو مجھے ہموک ہی نہیں ہے۔ تم میرے پاس آ کر بیٹھو۔“

”میں آتا ہوں ابھی.....“

وہ ان کے انکار کے باوجود کچن میں آ گیا۔

”پورے چھ ماہ سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ تم نے ایک بار بھی شکل نہیں دکھائی۔ حالانکہ وعدہ کیا تھا تم نے۔“

اسے جگان میں ان کی آواز سنائی دی۔

”میں بہت مصروف تھا اماں جی۔“

اس نے اپنے لئے چائے تیار کرتے ہوئے کہا۔

”لو ایسی بھی کیا مصروفیت..... ارے بیچے! مصروف وہ ہوتے ہیں، جن کے بیوی بیٹے ہوتے ہیں نہ تم نے گھر بسایا، نہ تم گھر والوں کے ساتھ رہ رہے ہو..... پھر بھی کہتے ہو مصروف تھا.....“

وہ ٹوسٹر سے سٹاکس نکالتے ہوئے ان کی بات پر مسکرایا۔

”اب سبھی دیکھو، یہ تمہارے کرنے کے کام تو نہیں ہیں۔“

وہ اسے چائے کی ٹرے لاتے دیکھ کر غصے سے بولیں۔

”میں تو کہتی ہوں یہ کام مرد کے کرنے والے ہی نہیں ہیں۔“

وہ کچھ کہے بغیر مسکراتے ہوئے میز پر برتن رکھنے لگا۔

”اب دیکھو بیوی ہوتی تو یہ کام بیوی کر رہی ہوتی۔ مرد اچھا لگتا ہی نہیں ایسے کام کرتے ہوئے۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں اماں جی! مگر اب مجبور ہی ہے۔ اب بیوی نہیں ہے تو کیا کیا جاسکتا ہے۔“

سالار نے چائے کا کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ انہیں اس کی بات پر ہنسا لگا۔

”یہ کیا بات ہوئی، کیا کیا جاسکتا ہے؟ ارے بیچے! دنیا لڑکیوں سے بھری ہوئی ہے۔ تمہارے تو

اپنے ماں باپ بھی ہیں۔ ان سے کہو..... تمہارا شش طے کریں۔ یا تم چاہو تو میں کوشش کروں۔“

سالار کو یک دم صورت حال کی سنگینی کا احساس ہونے لگا۔

”نہیں، نہیں اماں جی! آپ چائے پیئیں میں بہت خوش ہوں، اپنی زندگی سے..... جہاں تک گھر

کے کاموں کا تعلق ہے تو وہ تو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی کر لیا کرتے تھے۔“

”لو، اب تم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ میں تو تمہاری بات کر رہی ہوں۔“ وہ کچھ گڑبڑا گئیں۔

”آپ یہ ہنکٹ لیں اور کیک بھی.....“

سالار نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”ارے ہاں، جس کام کے لئے میں آئی ہوں وہ تو بھول ہی گئی۔“

”انہیں اچانک یاد آیا، اپنے ہاتھ میں پکڑا بڑا سا بیگ انہوں نے کھول کر اندر کچھ تلاش کرنا

شروع کر دیا۔

”تمہاری بہن کی شادی طے ہو گئی ہے۔“

سالار کو چائے پیتے بے اختیار اچھو لگا۔

”میری بہن کی..... اماں جی! میری بہن کی شادی تو پانچ سال پہلے ہو گئی تھی۔“

اس نے کچھ ہکا بکا ہوتے ہوئے بتایا۔ وہ اتنی دیر میں اپنے بیگ سے ایک کارڈ برآمد کر چکی تھیں۔

”ارے میں اپنی بیٹی کی بات کر رہی تھی۔ آمنت کی، تمہاری بہن ہی ہوئی نا.....“

انہوں نے اس کے بیٹے پر بڑے افسوس کے عالم میں اسے دیکھتے ہوئے کارڈ تھمایا۔

سالار کو بے اختیار ہنسی آئی کل تک وہ اسے اس کی بیوی بنانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں اور اب

یک دم بہن بنا دیا، مگر اس کے باوجود سالار کو بے تماشاً اطمینان محسوس ہوا۔ کم از کم اب اسے ان سے یا

ان کی بیٹی سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔

بہت مسرور سا ہو کر اس نے کارڈ پکڑ لیا۔

”بہت مبارک ہو..... کب ہو رہی ہے شادی؟“ اس نے کارڈ کھولتے ہوئے کہا۔

کو چلا جائے۔ صحت بھی ٹھیک رہتی ہے اور اللہ بھی خوش ہوتا ہے۔“
سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔

”میں نماز پڑھ کر سویا تھا۔ صرف اتوار والے دن ہی دیر تک سوتا ہوں۔ ورنہ روز جمعہ ہی کرتا ہوں جو آپ کہہ رہی ہیں۔“

وہ اس کی وضاحت پر بے حد خوش نظر آنے لگیں۔

”بہت اچھی بات ہے..... اسی لئے تو تمہارا چہرہ چمک رہا ہے۔ روتی نظر آ رہی ہے۔“
انہوں نے اپنے بیان میں ایک بار پھر تبدیلی کی۔

”آپ کیالیس گی؟“

وہ اپنے چہرے پر کوئی تبصرہ نہیں سننا چاہتا تھا، اس لئے اس نے موضوع بدلا۔

”ہاشتا کریں گی؟“

”نہیں، میں ہاشتا کر کے آئی ہوں۔ صبح چھ سات بجے میں ہاشتا کر لیتی ہوں۔ گیارہ ساڑھے گیارہ تو میں دوپہر کا کھانا بھی کھا لیتی ہوں۔“

انہوں نے اپنے معمولات سے آگاہ کیا۔

”تو پھر دوپہر کا کھانا کھائیں۔ ساڑھے دس تو ہو رہے ہیں۔“

”نہیں ابھی تو مجھے ہموک ہی نہیں ہے۔ تم میرے پاس آ کر بیٹھو۔“

”میں آتا ہوں ابھی.....“

وہ ان کے انکار کے باوجود کچن میں آ گیا۔

”پورے چھ ماہ سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ تم نے ایک بار بھی شکل نہیں دکھائی۔ حالانکہ وعدہ کیا تھا تم نے۔“

اسے جگان میں ان کی آواز سنائی دی۔

”میں بہت مصروف تھا اماں جی۔“

اس نے اپنے لئے چائے تیار کرتے ہوئے کہا۔

”لو ایسی بھی کیا مصروفیت..... ارے بیچے! مصروف وہ ہوتے ہیں، جن کے بیوی بیچے ہوتے ہیں نہ تم نے گھر بسایا، نہ تم گھر والوں کے ساتھ رہ رہے ہو..... پھر بھی کہتے ہو مصروف تھا۔“

وہ ٹوسٹر سے سٹاکس نکالتے ہوئے ان کی بات پر مسکرایا۔

”اب سبھی دیکھو، یہ تمہارے کرنے کے کام تو نہیں ہیں۔“

وہ اسے چائے کی ٹرے لاتے دیکھ کر غصگی سے بولیں۔

”میں تو کہتی ہوں یہ کام مرد کے کرنے والے ہی نہیں ہیں۔“

وہ کچھ کہے بغیر مسکراتے ہوئے میز پر برتن رکھنے لگا۔

”اب دیکھو بیوی ہوتی تو یہ کام بیوی کر رہی ہوتی۔ مرد اچھا لگتا ہی نہیں ایسے کام کرتے ہوئے۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں اماں جی! مگر اب مجبور ہی ہے۔ اب بیوی نہیں ہے تو کیا کیا جاسکتا ہے۔“

سالار نے چائے کا کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ انہیں اس کی بات پر ہنسا لگا۔

”یہ کیا بات ہوئی، کیا کیا جاسکتا ہے؟ ارے بیچے! دنیا لڑکیوں سے بھری ہوئی ہے۔ تمہارے تو

اپنے ماں باپ بھی ہیں۔ ان سے کہو..... تمہارا ششٹے کریں۔ یا تم چاہو تو میں کوشش کروں۔“

سالار کو یک دم صورت حال کی غصگی کا احساس ہونے لگا۔

”نہیں، نہیں اماں جی! آپ چائے پیئیں میں بہت خوش ہوں، اپنی زندگی سے..... جہاں تک گھر

کے کاموں کا تعلق ہے تو وہ تو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی کر لیا کرتے تھے۔“

”لو، اب تم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ میں تو تمہاری بات کر رہی ہوں۔“ وہ کچھ گڑبڑا گئیں۔

”آپ یہ ہنکٹ لیں اور کیک بھی.....“

سالار نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”ارے ہاں، جس کام کے لئے میں آئی ہوں وہ تو بھول ہی گئی۔“

”انہیں اچانک یاد آیا، اپنے ہاتھ میں پکڑا بڑا سا بیگ انہوں نے کھول کر اندر کچھ تلاش کرنا

شروع کر دیا۔

”تمہاری بہن کی شادی طے ہو گئی ہے۔“

سالار کو چائے پیتے بے اختیار اچھو لگا۔

”میری بہن کی..... اماں جی! میری بہن کی شادی تو پانچ سال پہلے ہو گئی تھی۔“

اس نے کچھ ہکا بکا ہوتے ہوئے بتایا۔ وہ اتنی دیر میں اپنے بیگ سے ایک کارڈ برآمد کر چکی تھیں۔

”ارے میں اپنی بیٹی کی بات کر رہی تھی۔ آمنت کی، تمہاری بہن ہی ہوئی نا.....“

انہوں نے اس کے بیٹے پر بڑے افسوس کے عالم میں اسے دیکھتے ہوئے کارڈ تھمایا۔

سالار کو بے اختیار ہنسی آئی کل تک وہ اسے اس کی بیوی بنانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں اور اب

یک دم بہن بنا دیا، مگر اس کے باوجود سالار کو بے حاشا اطمینان محسوس ہوا۔ کم از کم اب اسے ان سے یا

ان کی بیٹی سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔

بہت مسرور سا ہو کر اس نے کارڈ پکڑ لیا۔

”بہت مبارک ہو..... کب ہو رہی ہے شادی؟“ اس نے کارڈ کھولتے ہوئے کہا۔

”اگلے بیٹھے.....“

”چلیں ماں، جی! آپ کی فکر تو ختم ہو گئی۔“

سالار نے ”میری“ کے بجائے ”آپ کی“ کا لفظ استعمال کیا۔

”ہاں اللہ کا شکر ہے، بہت اچھی جگہ رشتہ ہو گیا۔ میری ذمہ داری ختم ہو جائے گی پھر میں بھی اپنے

بیٹوں کے پاس انگلینڈ چلی جاؤں گی۔“

سالار نے کارڈ پر ایک سرسری سی نظر دوڑائی۔

”یہ کارڈ تمہیں دینے خاص طور پر آئی ہوں..... اس بار کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ تمہیں شادی پر

آنا ہے، بھائی بن کر رخصت کرنا ہے، بہن کو۔“

سالار نے اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے چائے کا کپ لیا۔

”آپ فکر نہ کریں۔ میں ضرور آؤں گا۔“

وہ کپ پیچھے رکھ کر سلاکس پر کھن لگانے لگا۔

”یہ فرقان کا کارڈ بھی لے کر آئی ہوں میں..... اس کو بھی دینے جانا ہے۔“

انہیں اب فرقان کی یاد ستانے لگی۔

”فرقان کو تو آج بھابھی کے ساتھ اپنے سرال جانا تھا۔ اب تک تو کھل چکا ہو گا۔ آپ مجھے دے

دیں۔ میں اسے دے دوں گا۔“ سالار نے کہا۔

”تم اگر بھول گئے تو؟“ وہ مطمئن نہیں ہوئیں۔

”میں نہیں بھولوں گا، اچھا میں فون پر اس سے آپ کی بات کروا دیتا ہوں۔“

وہ یک دم خوش ہوئیں۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تم فون پر اس سے میری بات کروادو۔“

سالار اٹھ کر فون اسی میز پر لے آیا۔ فرقان کا موبائل نمبر ڈائل کر کے اس نے اپنیکر آن کر دیا

اور خود ناشتہ کرنے لگا۔

”فرقان سعیدہ ماں آئی ہوئی ہیں میرے پاس۔“

فرقان کے کال ریسیو کرنے پر اس نے بتایا۔

”ان سے بات کرو۔“

وہ خاموش ہو گیا، اب فرقان اور سعیدہ ماں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔

دس منٹ بعد جب یہ گفتگو ختم ہوئی تو سالار ناشتہ ختم کر چکا تھا۔ برتن کچن میں رکھتے ہوئے اسے

خیال آیا۔

”آئی کس کے ساتھ تھیں آپ؟“ وہ باہر نکل آیا۔

”اپنے بیٹے کے ساتھ“ سعیدہ ماں نے اطمینان سے کہا۔

”اچھا، بیٹا آگیا آپ کا؟ چھوٹا والا یا بڑا والا؟“

سالار نے دلچسپی لی۔

”میں ساتھ والوں کے راشد کی بات کر رہی ہوں۔“ سعیدہ ماں نے بے اختیار برلمانا۔

سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا سعیدہ ماں کے لئے ہر لڑکا اپنا بیٹا اور ہر لڑکی

اپنی بیٹی تھی۔ وہ بڑے آرام سے رشتے گھڑ لیتی تھیں۔

”تو وہ کہاں ہے؟“ سالار نے پوچھا۔

”وہ چلا گیا۔ موٹر سائیکل پر آئی ہوں اس کے ساتھ، آندھی کی رفتار سے چلائی ہے اس نے۔ نو

بچے بیٹھی ہوں، پورے ساڑھے دس بجے اور پھینچا دیا اس نے، میری ایک نہیں سنی اس نے۔ سارا

راستہ..... بار بار یہی کہتا رہا آہستہ چلا رہا ہوں۔ یہاں اُتارتے وقت کہنے لگا آپ کے ساتھ موٹر سائیکل

پر میرا آخری سفر تھا۔ دوبارہ کہیں جانا ہوا تو بیدل لے کر جاؤں گا آپ کو.....“

سالار کو ہنسی آئی۔ آدھ گھنٹہ میں طے ہونے والے راستے کو ڈیڑھ گھنٹہ میں طے کرنے والے کی

جھنجھلاہٹ کا وہ اندازہ کر سکتا تھا۔ بوزھوں کے ساتھ وقت گزارنا خاصا مشکل کام تھا۔ یہ وہ سعیدہ ماں

کے ساتھ ہونے والی پہلی ملاقات میں ہی جان گیا تھا۔

”تو وہاں کیسے جائیں گی۔ راشد لینے آئے گا آپ کو؟“

”ہاں اس نے کہا تو ہے کہ بیچ ختم ہونے کے بعد آپ کو لے جاؤں گا۔ اب دیکھو کب آتا ہے۔“

وہ اسے ایک بار پھر اپنی بیٹی اور اس کے ہونے والے سرال کے بارے میں اطلاعات پہنچانے لگیں۔

وہ مسکراتے ہوئے بڑی فرمانبرداری سے سنتا رہا۔

اس قسم کی معلومات میں اسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی مگر سعیدہ ماں اب اس کے ساتھ بیکنگ کے

بارے میں تو گفتگو نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کی باتیں رتی بھر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں مگر وہ یوں ظاہر

کرتا رہتا جیسے وہ ہر بات سمجھ رہا ہے۔

دوپہر کا کھانا اس نے ان کے ساتھ کھایا۔ اس نے ان کے سامنے فریڈر سے کچھ نکال کر گرم

کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ایک بار پھر شادی کے فائد اور ضرورت پر لکچر نہیں سنا چاہتا تھا۔ اس

نے ایک ریسیورٹ فون کر کے لُچکا کا آرڈر دیا۔ ایک گھنٹے کے بعد کھانا آگیا۔

کھانے کے وقت تک راشد نہیں آیا تو سالار نے ان کی تشویش کو کم کرنے کے لئے کہا۔

”میں گاڑی پر چھوڑ آتا ہوں آپ کو۔“

وہ فوراً تیار ہو گئیں۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے، اس طرح تم میرا گھر بھی دیکھ لو گے۔“

”اماں جی! میں آپ کا گھر جانتا ہوں۔“

سالار نے کار کی چابی تلاش کرتے ہوئے انہیں یاد دلایا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد وہ اس گلی میں تھا جہاں سعیدہ اماں کا گھر تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر انہیں اندر گلی میں دروازے تک چھوڑ گیا۔ انہوں نے اسے اندر آنے کی دعوت دی، جسے اس نے شکر یہ کے ساتھ رد کر دیا۔

”آج نہیں..... آج بہت کام ہیں۔“

وہ اپنی بات کہہ کر بچھڑتا ہوا۔

”بیٹے! اسی لئے کہتی ہوں شادی کر لو۔ بیوی ہوگی تو خود سارے کام دیکھے گی۔ تم کہیں آ جا سکو گے۔ اب یہ کوئی زندگی ہے کہ چھٹی کے دن بھی گھر کے کام لے کر بیٹھے رہو گے۔“ انہوں نے افسوس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”جی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اب میں جاؤں؟“

اس نے کمال فرمائیداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”ہاں ٹھیک ہے جاؤ، مگر یاد رکھنا شادی پر ضرور آنا۔ فرقان سے بھی ایک بار پھر کہہ دینا کہ وہ بھی

آئے اور اس کو کارڈ ضرور پہنچا دینا۔“

سالار نے ان کے دروازے پر گئی ہوئی ڈور بیل دوبارہ بجائی اور خدا حافظ کہتے ہوئے پلٹا۔

اپنے پیچھے اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ سعیدہ اماں اب اپنی بیٹی سے کچھ کہہ رہی تھیں۔

باب ۸

”پچھڑ کیا پروگرام ہے، چلو گے؟“

فرقان نے اگلے دن شام کو اس سے کارڈ لیتے ہوئے کہا۔

”نہیں، میں تو اس ویک اینڈ پر کراچی جا رہا ہوں، آئی بی اے کے ایک سیمینار کے لئے۔ اتوار کو میری واپسی ہوگی۔ میں تو آکر بس سوؤں گا۔“

nothing else۔ تم چلے جانا، میں لطف دے دوں گا، وہ تم میری طرف سے معذرت کرتے ہوئے دے دینا۔“ سالار نے کہا۔

”کتنے افسوس کی بات ہے سالار! وہ خود کارڈ دے کر گئی ہیں، اتنی محبت سے بلایا ہے۔“

فرقان نے کہا۔

”جانتا ہوں لیکن میں ادھر جا کر وقت ضائع نہیں کر سکتا۔“

”ہم بس تھوڑی دیر بیٹھیں گے پھر آجائیں گے۔“

”فرقان! میری واپسی کفرم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے میں اتوار کو آئی نہ سکوں یا اتوار کی رات کو آؤں۔“

”بے حد فضول آدمی ہو تم اوہ بڑی مایوس ہوں گی۔“

”کچھ نہیں ہوگا، میرے نہ ہونے سے ان کی بیٹی کی شادی تو نہیں رُک جائے گی۔ ہو سکتا ہے انہیں پہلے ہی میرے نہ آنے کا اندازہ ہو اور ویسے بھی فرقان! تم اور میں کوئی اتنے اہم مہمان نہیں ہیں۔“

سالار نے لاپرواہی سے کہا۔

”بہر حال میں اور میری بیوی تو جائیں گے۔ چاہے ہم کم اہم مہمان ہی کیوں نہ ہوں۔“ فرقان نے ناراضی سے کہا۔

”میں نے کب روکا ہے۔ ضرور جاؤ، تمہیں جانا بھی چاہئے۔ سعیدہ اماں کے ساتھ تمہاری مجھ سے زیادہ بے تکلفی اور دوستی ہے۔“ سالار نے کہا۔

”مگر سعیدہ اماں کو میرے بجائے تمہارا زیادہ خیال رہتا ہے۔“ فرقان نے جتایا۔

”وہ مروت ہوتی ہے۔“ سالار نے اس کی بات کو سنجیدگی سے لئے بغیر کہا۔

”جو بھی ہوتا ہے بہر حال تمہارا خیال تو ہوتا ہے انہیں۔ چلو اور کچھ نہیں تو ڈاکٹر سہیل علی کی مزیدہ کچھ کر ہی تم ان کے ہاں چلے جاؤ۔“ فرقان نے ایک اور حربہ آزمایا۔

”ڈاکٹر صاحب تو خود یہاں نہیں ہیں۔ وہ تو خود شادی میں شرکت نہیں کر رہے اور اگر وہ یہاں ہوتے بھی تو کم از کم مجھے تمہاری طرح مجبور نہیں کرتے۔“

”اچھا، میں بھی نہیں کرتا تمہیں مجبور۔ نہیں جانا چاہتے تو مت جاؤ۔“

فرقان نے کہا۔

سالار ایک بار پھر اپنے لپ ٹاپ کے ساتھ مصروف ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک سرسبز و وسیع سبزہ زار تھا جہاں وہ دونوں موجود تھے۔ وسیع کھلے سبزہ زار میں درخت تھے مگر زیادہ بلند نہیں۔ خوب صورت پھولدار جھاڑیاں تھیں، چاروں طرف خاموشی تھی۔ وہ دونوں کسی درخت کے سائے میں بیٹھنے کے بجائے ایک پھولدار جھاڑی کے قریب کھلی دھوپ میں بیٹھے تھے۔ امامہ اپنے گھنٹوں کے گرد بازو لپیٹے ہوئے بیٹھی تھی اور وہ گھاس پر چت لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ان دونوں کے جوتے کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے تھے۔ امامہ نے اس بار خوب صورت سفید چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ امامہ اس سے کچھ کہتے ہوئے دور کسی چیز کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے اس کی چادر کے ایک پلو سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ یوں جیسے دھوپ کی

شعاعوں سے آنکھوں کو بچانا چاہتا ہو۔ اس کی چادر نے اسے عجیب سا سکون اور سرشاری دی تھی۔ امامہ نے چادر کے سرے کو اس کے چہرے سے ہٹانے یا کھینچنے کی کوشش نہیں کی۔ دھوپ اس کے جسم کو تراوت بخش رہی تھی۔ آنکھیں بند کئے وہ اپنے چہرے پر موجود چادر کے لمس کو محسوس کر رہا تھا۔ اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ وہ نیند اسے اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔

سالار نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنے بیڈ پر چت لیٹا ہوا تھا۔ کسی چیز نے اس کی نیند کو توڑ دیا تھا۔ وہ آنکھیں کھولے کچھ دیر بے چینی سے اپنے ارد گرد کے ماحول کو دیکھتا رہا۔ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں اسے ہونا چاہئے تھا۔ ایک اور خواب..... ایک اور الوژن..... اس نے آنکھیں بند کر لیں اور تب اس کو اس موبائل فون کی آواز نے متوجہ کیا، جو مسلسل اس کے سر ہانے بج رہا تھا۔ یہ فون ہی تھا جو اسے اس خواب سے باہر لے آیا تھا۔ قدرے جھنجھلاتے ہوئے اس نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر اس نے موبائل اٹھایا۔ دوسری طرف فرقان تھا۔

”کہاں تھے سالار! کب سے فون کر رہا ہوں۔ اینڈ کیوں نہیں کر رہے تھے؟“ فرقان نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

”میں سو رہا تھا۔“ سالار نے کہا اور اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظر اب پہلی بار گھڑی پر پڑی جو چار بج رہی تھی۔

”تم فوراً سعیدہ اماں کے ہاں چلے آؤ۔“ دوسری طرف سے فرقان نے کہا۔

”کیوں؟ میں نے تمہیں بتایا تھا، میں تو.....“

فرقان نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں جانتا ہوں، تم نے مجھے کیا بتایا تھا مگر یہاں کچھ ایجنسی ہو گئی ہے۔“

”کیسی ایجنسی؟“ سالار کو تشویش ہوئی۔

”تم یہاں آؤ گے تو چتا چل جائے گا۔ تم فوراً یہاں پہنچو، میں فون بند کر رہا ہوں۔“

فرقان نے فون بند کر دیا۔

سالار کچھ پریشانی کے عالم میں فون کو دیکھتا رہا۔ فرقان کی آواز سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پریشان تھا مگر سعیدہ اماں کے ہاں پریشانی کی نوعیت کیا ہو سکتی تھی۔

چند رہ منٹ میں کپڑے تبدیل کرنے کے بعد گاڑی میں تھا۔ فرقان کی اگلی کال اس نے کار میں ریسیو کی تھی۔

”تم کچھ بتاؤ تو سہی، ہو کیا ہے؟ مجھے پریشان کر دیا ہے تم نے۔“ سالار نے اس سے کہا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تم اور صری آر ہے ہو۔ یہاں آؤ گے تو تمہیں پتا چل جائے

گا۔ میں فون پر تفصیلی بات نہیں کر سکتا۔"

فرقان نے ایک بار پھر فون بند کر دیا۔

تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے آدھ گھنٹہ کا سفر تقریباً پندرہ منٹ میں طے کیا تھا۔ فرقان اسے سعیدہ اماں کے گھر کے باہر ہی مل گیا۔ سالار کا خیال تھا کہ سعیدہ اماں کے ہاں اس وقت بہت چہل پھل ہوگی مگر ایسا نہیں تھا۔ وہاں دور دور تک کسی بارات کے آثار نہیں تھے۔ فرقان کے ساتھ وہ بیرونی دروازے کے بائیں طرف بنے ہوئے ایک پرانی طرز کے ڈرائنگ روم میں آیا۔

"آخر ہوا کیا ہے جو تمہیں مجھے اس طرح بلا تا پڑ گیا۔"

سالار اب اُلجھ رہا تھا۔

"سعیدہ اماں اور ان کی بیٹی کے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔" فرقان نے اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"کیسا مسئلہ؟"

"جس لڑکے سے ان کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی اس لڑکے نے کہیں اور اپنی مرضی سے شادی کر لی ہے۔"

"مائی گڈ نیس۔" سالار کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ان لوگوں نے ابھی کچھ دیر پہلے سعیدہ اماں کو یہ سب فون پر بتا کر ان سے معذرت کی ہے۔ وہ لوگ اب بارات نہیں لا رہے۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے ان لوگوں کے ہاں گیا ہوا تھا، مگر وہ لوگ واقعی مجبور ہیں۔ انہیں اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے، اس لڑکے نے بھی انہیں صرف فون پر ہی اس کی اطلاع دی ہے۔" فرقان تفصیل بتاتے لگا۔

"اگر وہ لڑکا شادی نہیں کرنا چاہتا تھا تو اسے بہت پہلے ہی ماں باپ کو صاف بتا دینا چاہئے تھا۔ بھاگ کر شادی کر لینے کی ہمت تھی تو ماں باپ کو پہلے اس شادی سے انکار کر دینے کی بھی ہمت ہوتی چاہئے تھی۔" سالار نے ناپسندیدگی سے کہا۔

"سعیدہ اماں کے بیٹوں کو اس وقت یہاں ہونا چاہئے تھا، وہ اس معاملے کو ہینڈل کر سکتے تھے۔"

"لیکن اب وہ نہیں ہیں تو کسی نہ کسی کو تو سب کچھ دیکھنا ہے۔"

"سعیدہ اماں کے کوئی اور قریبی رشتہ دار نہیں ہیں؟" سالار نے پوچھا۔

"میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر سہیل علی صاحب سے بات کی ہے فون پر۔" فرقان نے اسے بتایا۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب بھی فوری طور پر تو کچھ نہیں کر سکیں گے۔ یہاں ہوتے تو اور بات تھی۔"

سالار نے کہا۔

"انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہاری فون پر ان سے بات کرواؤں۔" فرقان کی آواز اس بار کچھ دھیمی تھی۔

"میری بات..... لیکن کس لئے؟" سالار کچھ حیران ہوا۔

"ان کا خیال ہے کہ اس وقت تم سعیدہ اماں کی مدد کر سکتے ہو۔"

"میں؟" سالار نے چونک کر کہا۔ "میں کس طرح مدد کر سکتا ہوں؟"

"آمنہ سے شادی کر کے۔"

سالار دم بخود پلکیں چھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" اس نے ہنسنے پر فرقان سے کہا۔

"ہاں، بالکل ٹھیک ہے۔" سالار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"پھر تمہیں پتا نہیں ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

وہ ایک جھپٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ فرقان برقی رفتاری سے اٹھ کر اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔

"کیا سوچ کر تم نے یہ بات کہی ہے۔" سالار اپنی آواز پر قابو نہیں رکھ سکا۔

"میں نے یہ سب تم سے ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر کہا ہے۔" سالار کے چہرے پر ایک رنگ آکر

گزر گیا۔

"تم نے انہیں میرا نام کیوں دیا؟"

"میں نے نہیں دیا سالار! انہوں نے خود تمہارا نام لیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تم

سے درخواست کروں کہ میں اس وقت سعیدہ اماں کی بیٹی سے شادی کر کے اس کی مدد کروں۔"

کسی نے سالار کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچی تھی یا سر سے آسمان، اسے اندازہ نہیں ہوا۔ وہ

پلٹ کر واپس صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میں شادی شدہ ہوں فرقان! تم نے انہیں بتایا۔"

"ہاں، میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ تم نے کئی سال پہلے ایک لڑکی سے نکاح کیا تھا، مگر پھر وہ لڑکی

دو بارہ تمہیں نہیں ملی۔"

"پھر؟"

"وہ اس کے باوجود یہی چاہتے ہیں کہ تم آمنہ سے شادی کر لو۔"

"فرقان..... میں....." وہ بات کرتے کرتے رُک گیا۔

"اور اماں..... اس کا کیا ہوگا؟"

"تمہاری زندگی میں اماں کہیں نہیں ہے۔ اتنے سالوں میں کون جانتا ہے، وہ کہاں ہے۔ ہے بھی

کہ نہیں۔

”فرقان..... سالار نے ترشی سے اس کی بات کاٹی۔ ”اس بات کو رہنے دو کہ وہ ہے یا نہیں۔

مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اگر کل امامہ آجاتی ہے تو..... تو کیا ہو گا؟“

”تم یہ بات ڈاکٹر صاحب سے کہو۔“ فرقان نے کہا۔

”نہیں، تم یہ سب کچھ سعید و اماں کو بتاؤ، آمنہ کو بتاؤ، ضروری تو نہیں ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کو

قبول کر لے جس کی پہلے سے ہی ایک بیوی ہے۔ ایسا ہوتا تو وہ پھر اسی لڑکے کو قبول کر لیتی جس نے

کہیں اور شادی کر لی ہے۔“

”وہ اگر بات لے کر آجاتا تو شاید یہ بھی ہو جاتا۔ مسئلہ تو یہی ہے کہ وہ آمنہ سے دوسری شادی

پر بھی تیار نہیں ہے۔“

”اسے ڈھونڈا جا سکتا ہے۔“

”ہاں، ڈھونڈا جا سکتا ہے لیکن یہ کام اس وقت نہیں ہو سکتا۔“

”ڈاکٹر صاحب نے آمنہ کے لئے غلط انتخاب کیا ہے۔ میں..... میں آمنہ کو کیا دے سکتا ہوں۔

میں تو اس آدمی سے بھی بدتر ہوں جو ابھی اسے چھوڑ گیا ہے۔“

سالار نے بے چارگی سے کہا۔

”سالار! انہیں اس وقت کسی کی ضرورت ہے، ضرورت کے وقت صرف وہی آدمی سب سے

پہلے ذہن میں آتا ہے، جو سب سے زیادہ قابل اعتبار ہو۔ تم زندگی میں اتنے بہت سے لوگوں کی مدد

کرتے آ رہے ہو، کیا ڈاکٹر سید علی صاحب کی مدد نہیں کر سکتے۔“

”میں نے لوگوں کی پیسے سے مدد کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مجھ سے پیسہ مانگ رہے۔“

اس سے پہلے کہ فرقان کچھ کہتا اس کے موبائل پر کال آنے لگی تھی۔ اس نے نمبر دیکھ کر موبائل

سالار کی طرف بڑھا دیا۔

”ڈاکٹر صاحب کی کال آرہی ہے۔“

سالار نے سستے ہوئے چہرے کے ساتھ موبائل پکڑ لیا۔

وہاں بیٹھے موبائل کان سے لگائے سالار کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ زندگی میں ہر بات، ہر شخص

سے نہیں کہی جا سکتی۔ وہ جو کچھ فرقان سے کہہ سکتا تھا وہ ان سے اونچی آواز میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں

دلائل دے سکتا تھا، نہ بہانے بنا سکتا تھا۔ انہوں نے مخصوص نرم لہجے میں اس سے درخواست کی تھی۔

”اگر آپ اپنے والدین سے اجازت لے سکیں تو آمنہ سے شادی کر لیں۔ وہ میری بیٹی نہیں ہے۔

آپ سمجھیں میں اپنی بیٹی کے لئے آپ سے درخواست کر رہا ہوں، آپ کو تکلیف دے رہا ہوں لیکن میں

ایسا کرنے کے لئے مجبور ہوں۔“

”آپ جیسا چاہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔“

اس نے مدغم آواز میں ان سے کہا۔

”آپ مجھ سے درخواست نہ کریں، آپ مجھے علم دیں۔“ اس نے خود کو کہتے پایا تھا۔

فرقان تقریباً دس منٹ کے بعد اندر آیا۔ سالار موبائل فون ہاتھ میں پکڑے گم صم فرش پر

نظریں جمائے ہوئے تھا۔

”ڈاکٹر صاحب سے بات ہو گئی تمہاری؟“

فرقان نے اس کے ہاتھ میں ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے مدغم آواز میں اس سے پوچھا۔

سالار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر کچھ کہے بغیر سینئر ٹیبل پر اس کا موبائل رکھ دیا۔

”میں رخصتی ابھی نہیں کرواؤں گا۔ بس نکاح کافی ہے۔“

اس نے چند لمحوں بعد کہا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھ رہا تھا۔ فرقان کو بے اختیار اس پر

ترس آیا۔ وہ مقدر کا ”شکار“ ہونے والا پہلا انسان نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

سڑک پر گہما گہمی تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ رات بہت تیزی سے گزرتی جا رہی تھی۔ گہری

دھند ایک بار پھر ہر چیز کو اپنے حصار میں لے رہی تھی۔

سڑک پر چلنے والی اسٹریٹ لائٹس کی روشنی دھند کو چیرتے ہوئے اس ہالکونی کی تاریکی کو دور کرنے

کی کوشش کر رہی تھی جہاں منڈیر کے پاس ایک اسٹول پر سالار بیٹھا ہوا تھا۔ منڈیر پر اس کے سامنے کافی

کا ایک گک پڑا ہوا تھا، جس میں سے اٹھنے والی گرم بھاپ دھند کے پس منظر میں عجیب سی شکلیں بنانے

میں مصروف تھی اور وہ..... وہ سینے پر دونوں ہاتھ لپٹے یک تک نیچے سستان سڑک کو دیکھ رہا تھا جو دھند

کے اس تلاف میں بہت عجیب نظر آرہی تھی۔

رات کے دس بج رہے تھے اور وہ چند منٹ پہلے ہی گھر پہنچا تھا۔ سعید و اماں کے گھر نکاح کے بعد

وہ وہاں ڈکا نہیں تھا۔ اسے وہاں عجیب سی وحشت ہو رہی تھی۔ وہ گاڑی لے کر بے مقصد شام سے رات

گئے تک سڑکوں پر بھرتا رہا۔ اس کا موبائل آف تھا۔ وہ بیرونی دنیا سے اس وقت کوئی رابطہ نہیں کرنا چاہتا

تھا۔ موبائل آن ہوتا تو فرقان اس سے رابطہ کرتا۔ بہت سی وضاحتیں دینے کی کوشش کرتا یا ڈاکٹر سید علی

رابطہ کرتے، اس کا شکر یہ ادا کرنا چاہیے۔

وہ یہ دونوں چیزیں نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس وقت مکمل خاموشی چاہتا تھا۔ اٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھتے

ہوئے اس نے ایک بار پھر چند گھنٹے پہلے کے واقعات کے بارے میں سوچا۔ سب کچھ ایک خواب کی طرح

لگ رہا تھا۔ کاش خواب ہی ہوتا۔ اسے وہاں بیٹھے کئی ماہ پہلے حرم پاک میں مانگی جانے والی دعا یاد آئی۔
 ”تو کیا اسے میری زندگی سے نکال دینے کا فیصلہ ہوا ہے؟“ اس نے تکلیف سے سوچا۔
 ”تو پھر یہ اذیت بھی تو ختم ہونی چاہئے۔ میں نے اس اذیت سے رہائی بھی تو مانگی تھی۔ میں نے اس کی یادوں سے فرار بھی تو چاہا تھا۔“ اس نے مندر پر رکھا گرم کافی کا کپ اپنے سرد ہاتھوں میں تھام لیا۔
 تو امام ہاشم بالآخر تم میری زندگی سے ہمیشہ کے لئے نکل گئیں۔
 اس نے کافی کی تلخی اپنے اندر اتاری۔

”اور اب کیا میں بچھتاؤں کہ کاش میں کبھی سعیدہ اماں کو اس سڑک پر نہ دیکھتا یا میں ان کو لٹ نہ دیتا۔ ان کا گھر لٹ جاتا اور میں انہیں وہاں ڈراپ کر کے آجاتا، ان کو اپنے گھر نہ لاتا نہ روایا بڑھتے نہ وہ اس شادی پر مجھے بلاتیں یا پھر کاش میں آج کراچی میں ہی نہ ہوتا۔ یہاں ہوتا ہی نہیں یا میں موہاں آف کر کے سوتا۔ فون کارڈیسیور رکھ دیتا۔ فرقان کی کال رسیوی نہ کرتا یا پھر کاش میں ڈاکٹر سیٹھ علی کو نہ جانتا ہوتا کہ ان کے کہنے پر مجھے مجبور نہیں ہونا پڑتا یا پھر شاید مجھے یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ امام میرے لئے نہیں ہے۔“ اس نے کافی کا گم دوبارہ مندر پر رکھ دیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر بھیرے، پھر جیسے کوئی خیال آنے پر اپنا والٹ نکال لیا۔ والٹ کی ایک جیب سے اس نے ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر کھول لیا۔

ڈیرائل سکندر!

مجھے آپ کے بیٹے کی موت پر بہت افسوس ہوا۔ چند سال پہلے میری وجہ سے آپ کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے سالار کو کچھ رقم ادا کرنی تھی وہ اب میں آپ کو بھیج رہی ہوں۔

خدا حافظ

امام ہاشم

اس نے نو ماہ میں کتنی بار اس کاغذ کو پڑھا تھا اسے یاد نہیں تھا۔ اس کاغذ کو چھوتے ہوئے اسے اس کاغذ میں امام کا لمس محسوس ہوتا۔ اس کے ہاتھ سے لکھا ہوا اپنا نام..... کاغذ پر تحریر ان چند جملوں میں اس کے لئے کوئی اپنائیت نہیں تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ امام کو اس کی موت کی خبر پر بھی کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ خبر اس کے لئے ڈھائی سال بعد رہائی کا پیغام بن کر آئی تھی۔ اسے کیسے افسوس ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ چند جملے اس کے لئے بہت اہم ہو گئے تھے۔

اس نے کاغذ پر لکھے جملوں پر اپنی انگلیاں پھیریں۔ اس نے آخر میں لکھے امام ہاشم کے نام کو چھوا..... پھر کاغذ کو دوبارہ اسی طرح تہ کر کے والٹ میں رکھ لیا۔

مندرجہ پر کافی کا گم سرد ہو چکا تھا۔ سالار نے ٹھنڈی کافی کے باقی گم کو ایک گھونٹ میں اپنے اندر اُنڈل لیا۔

ڈاکٹر سیٹھ علی ایک ہفتے تک لندن سے واپس پاکستان پہنچ رہے تھے اور اسے ان کا انتظار تھا۔ امام ہاشم کے بارے میں جو کچھ وہ اتنے سالوں سے انہیں نہیں بتا سکا تھا وہ انہیں اب بتانا چاہتا تھا۔ اپنے ماضی کے بارے میں جو کچھ وہ انہیں نہیں بتایا تھا اب وہ ان سے کہہ دینا چاہتا تھا۔ اسے اب پروا نہیں تھی۔ وہ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے۔

☆.....☆.....☆

رمضان کی چار تاریخ تھی، جب ڈاکٹر سیٹھ علی واپس آگئے تھے۔ وہ رات کو کافی دیر سے آئے تھے اور سالار نے اس وقت انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ رات کو ان کے پاس پہلے کی طرح جانا چاہتا تھا مگر وہ پہر کو خلاف توقع بینک میں ان کا فون آ گیا۔ سالار کے نکاح کے بعد یہ ان کا سالار کے ساتھ تیسرا رابطہ تھا۔ وہ کچھ دیر اس کا حال احوال دریافت کرتے رہے اور پھر انہوں نے اس سے کہا۔

”سالار! آپ آج رات کو نہ آئیں، شام کو آجائیں۔ افطاری میرے ساتھ کریں۔“

”ٹھیک ہے، میں آ جاؤں گا۔“ سالار نے حامی بھرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر ان کے درمیان مزید گفتگو ہوتی رہی پھر ڈاکٹر سیٹھ علی نے فون بند کر دیا۔

وہ اس دن بینک سے کچھ جلدی نکل آیا۔ اپنے فلیٹ پر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ جب ان کے پاس پہنچا اس وقت افطاری میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔

ڈاکٹر سیٹھ علی کا ملازم اسے اجتماع والے بیرونی کمرے کے بجائے سیدھا اندر لاؤنج میں لے آیا تھا۔ ڈاکٹر سیٹھ علی نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس سے بقلقبیر ہونے کے بعد بڑی محبت کے ساتھ

اس کا ہاتھ چوما۔

”پہلے آپ ایک دوست کی حیثیت سے یہاں آتے تھے، آج آپ گھر کا ایک فرد بن کر یہاں آئے ہیں۔“

وہ جانتا تھا ان کا اشارہ کس طرف تھا۔

”آئیے بیٹھے۔“ وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود دوسرے صوف پر بیٹھ گئے۔

”بہت مبارک ہو۔ اب تو آپ بھی گھر والے ہو گئے ہیں۔“

سالار نے خاموش نظروں اور پھینکی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔

”میں بہت خوش ہوں کہ آپ کی شادی آمنہ سے ہوئی ہے۔ وہ میرے لئے میری چوتھی بیٹی کی

طرح ہے اور اس رشتے سے آپ بھی میرے داماد ہیں۔“

سالار نے نظریں جھکا لیں۔ اس کی زندگی میں امام ہاشم کا باپ نہ لکھا ہوا ہوتا تو شاید ان کے منہ سے یہ جملہ سن کر وہ اپنے آپ پر فخر کرتا مگر سالار فرق امام ہاشم تھی۔ سالار فرق وہی ایک لڑکی پیدا کر رہی تھی وہ جو تھی اور نہیں تھی۔

ڈاکٹر سید علی کچھ دیر اسے دیکھتے رہے پھر انہوں نے کہا۔

”آپ اتنے سالوں سے میرے پاس آرہے ہیں آپ نے کبھی مجھے یہ نہیں بتایا کہ آپ نکاح کر چکے ہیں۔ تب بھی نہیں جب ایک دو بار آپ سے شادی کا ذکر ہوا۔“

سالار نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”میں آپ کو بتانا چاہتا تھا مگر.....“ وہ بات کرتے کرتے چپ ہو گیا۔

”سب کچھ اتنا عجیب تھا کہ میں آپ کو کیا بتاتا۔“ اس نے دل میں کہا ”لب ہوا تھا آپ کا نکاح؟“

ڈاکٹر سید علی دھسے لہجے میں پوچھ رہے تھے۔ ”ساڑھے آٹھ سال پہلے۔ تب میں اکیس سال کا تھا۔“ اس نے کسی گفت خورہ معمول کی طرح کہا، پھر وہ آہستہ آہستہ انہیں سب کچھ بتاتا گیا۔ ڈاکٹر سید علی نے اسے ایک بار بھی نہیں ٹوکا تھا۔ اس کے خاموش ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک وہ چپ رہے تھے۔

بہت دیر بعد انہوں نے اس سے کہا تھا۔

”آمنہ بہت اچھی لڑکی ہے اور وہ خوش قسمت ہے کہ اسے ایک صالح مرد ملا ہے۔“

ان کی بات سالار کو ایک چابک کی طرح لگی۔

”صالح؟ میں صالح مرد نہیں ہوں ڈاکٹر صاحب! میں تو..... اسئل السائلین ہوں۔ آپ مجھے

جاننے ہوتے تو میرے لئے کبھی یہ لفظ استعمال کرتے نہ اس لڑکی کے لئے میرا انتخاب کرتے جسے آپ

اپنا بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں۔“

”ہم سب اپنی زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر ”زمانہ جاہلیت“ سے ضرور گزرتے ہیں، بعض گزر

جاتے ہیں، بعض ساری زندگی اسی زمانے میں گزار دیتے ہیں۔ آپ اس میں سے گزر چکے ہیں۔ آپ کا

بچپن اتنا بھاری ہے کہ آپ گزر چکے ہیں۔ میں آپ کو بچپن سے روکوں گا نہ تو یہ اور دعا ہے، آپ پر

فرض ہے کہ آپ اپنی ساری زندگی یہ کریں، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ شکر بھی ادا کریں کہ آپ نفس

کی تمام بیماریوں سے چھٹکارا پا چکے ہیں۔

اگر دنیا آپ کو اپنی طرف نہیں کھینچتی اگر اللہ کے خوف سے آپ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے

ہیں، اگر دوزخ کا تصور آپ کو ڈراتا ہے، اگر آپ اللہ کی عبادت اس طرح کرتے ہیں، جس طرح کرنی

چاہئے، اگر نیکی آپ کو اپنی طرف راغب کرتی ہے اور برائی سے آپ ڈک جاتے ہیں تو پھر آپ صالح

ہیں۔ کچھ صالح ہوتے ہیں، کچھ صالح بنتے ہیں، صالح ہونا خوش قسمتی کی بات ہے، صالح بننا دودھاری

تکوار پر چلنے کے برابر ہے۔ اس میں زیادہ وقت لگتا ہے۔ اس میں زیادہ تکلیف سنی پڑتی ہے۔ میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ آپ صالح ہیں کیونکہ آپ صالح بنے ہیں، اللہ آپ سے بڑے کام لے گا۔“

سالار کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ انہوں نے ایک بار پھر امام ہاشم کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا

تھا، کچھ نہیں کہا تھا۔ کیا اس کا مطلب تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی سے نکل گئی؟ کیا اس کا مطلب

تھا کہ وہ آئندہ بھی کبھی اس کی زندگی میں نہیں آئے گی؟ اسے اپنی زندگی آمنہ کے ساتھ ہی گزارنی

پڑے گی؟ اس کا دل ڈوبا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے منہ سے امامہ کے حوالے سے کوئی تسلی، کوئی دلاسا، کوئی

امید چاہتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب خاموش تھے۔ وہ چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔

”میں آپ کے اور آمنہ کے لئے بہت دعا کروں گا بلکہ میں بہت دعا کر کے آیا ہوں خانہ کعبہ

میں..... روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر۔“ وہ لندن سے واپسی پر عمرہ کر کے آئے تھے۔ سالار نے سر

جھکا لیا۔ دور اذان کی آواز آرہی تھی۔ ملازم انتظار کے لئے میز تیار کر رہا تھا۔ اس نے بوجھل دل کے

ساتھ ڈاکٹر سید علی کے ساتھ بیٹھ کر روزہ افطار کیا پھر وہ اور ڈاکٹر سید علی نماز پڑھنے کے لئے قریبی مسجد

میں چلے گئے۔ وہاں سے واپسی پر اس نے ڈاکٹر سید علی کے ہاں کھانا کھلایا اور پھر اپنے فلیٹ پر واپس آ گیا۔

☆.....☆

”نکل میرے ساتھ سعید واماں کے ہاں چل سکتے ہو؟“

اس نے ڈاکٹر سید علی کے گھر سے واپسی کے بعد دس بجے کے قریب فرقان کو فون کیا۔ فرقان

ہاسپٹل میں تھا۔ اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔

”ہاں، کیوں نہیں۔ کوئی خاص کام ہے؟“

”میں آمنہ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

فرقان کچھ دیر بول نہیں سکا۔ سالار کا لہجہ بہت ہموار تھا۔ وہاں کسی تلخی کے کوئی آثار نہیں تھے۔

”کیسی باتیں؟“

”کوئی تشویش ناک بات نہیں ہے۔“ سالار نے جیسے اسے تسلی دی۔

”پھر بھی۔“ فرقان نے اصرار کیا۔

”تم پھر امامہ کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو؟“

”تم پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ میرے ساتھ چلو گے؟“

سالار نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

”ہاں، چلوں گا۔“

”تو پھر میں تمہیں کل ہی بتاؤں گا کہ مجھے اس سے کیا بات کرنی ہے۔“
اس سے پہلے کہ فرقان کچھ کہتا، فون بند ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

”تم اس سے امام کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو؟“ فرقان نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سالار سے پوچھا۔

”نہیں، صرف امام کے بارے میں نہیں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو میں کرنا چاہتا ہوں۔“
”قارگاڈ سیک سالار اگڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش مت کرو۔“ فرقان نے ناراضی سے کہا۔
”اس کو میری ترجیحات اور مقاصد کا پتہ ہونا چاہئے۔ اب اسے ساری زندگی گزارنی ہے میرے ساتھ۔“

سالار نے اس کی ناراضی کی پروا کئے بغیر کہا۔

”پتا چل جائے گا، سبھی وار لڑکی ہے وہ اور اگر کچھ بتانا ہی ہے تو گھر لا کر بتانا، وہاں پینڈورا باکس کھول کر مت بیٹھنا۔“

”گھر لا کر بتانے کا کیا فائدہ، جب اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ ہی نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں وہ میری باتوں کو سنے، سمجھے، سوچے اور پھر کوئی فیصلہ کرے۔“

”اب کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی وہ۔ تمہارا اور اس کا نکاح ہو چکا ہے۔“
”رخصتی تو نہیں ہوئی۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”کیوں نہیں پڑتا۔ اگر اس کو میری بات پر اعتراض ہو تو وہ اس رشتے کے بارے میں نظر ثانی کر سکتی ہے۔“ سالار نے سنجیدگی سے کہا۔

فرقان نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

”اور اس نظر ثانی کے لئے تم کس طرح کے حقائق اور دلائل پیش کرنے والے ہو اس کے سامنے؟“
”میں اسے صرف چند باتیں بتانا چاہتا ہوں جس کا جاننا اس کے لئے ضروری ہے۔“ سالار نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”وہ ڈاکٹر سیٹھ علی کی رشتے دار ہے، میں اس حوالے سے اس کی بہت عزت کرتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے نہیں کہا ہوتا تو یہ رشتہ قائم بھی نہیں ہوتا لیکن میں.....“

فرقان نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ٹھیک ہے، تم کو اس سے جو کہنا ہے، کہہ لینا لیکن امام کے ذکر کو ذرا کم ہی رکھنا کیونکہ اگر وہ کسی

بات سے ہرٹ ہوئی تو وہ یہی بات ہوگی، باقی چیزوں کی پروا وہ شاید نہ کرے۔ آفٹر آل۔ دوسری بیوی ہونا یا کہلانا آسان نہیں ہوتا۔“

فرقان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”اور میں چاہتا ہوں، وہ یہ بات محسوس کرے، سوچے، اس کے بارے میں..... ابھی تو کچھ بھی نہیں بگڑا۔ تم کہتے ہو، وہ خوب صورت ہے، پڑھی لکھی ہے، اچھی فیملی سے تعلق ہے اس کا۔“

فرقان نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔

”ختم کرو اس موضوع کو سالار! تم کو اس سے جو کہنا ہے اسے جو سمجھانا ہے جا کر کہہ لینا.....“

”میں اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“ سالار نے کہا۔

”میں سعیدہ اماں سے کہہ دوں گا۔ وہ تمہیں اکیلے میں اس سے بات کروادیں گی۔“

فرقان نے اس کی بات پر سر ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ آدھ گھنٹہ میں سعیدہ اماں کے ہاں پہنچ گئے تھے۔ دروازہ سعیدہ اماں نے ہی کھولا تھا اور سالار اور فرقان کو دیکھ کر وہ جیسے خوشی سے بے حال ہو گئی تھیں۔ وہ ان دونوں کو اسی بیٹھک نما کمرے میں لے گئیں۔

”سعیدہ اماں! سالار، آمنہ سے تمہاری میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔“

فرقان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ سعیدہ اماں کچھ اٹھیں۔

”کیسی باتیں؟“ وہ اب سالار کی طرف دیکھ رہی تھیں جو خود بھی بیٹھنے کے بجائے فرقان کے

ساتھ ہی کھڑا تھا۔

”ہیں چند باتیں، جو وہ اس سے کرنا چاہتا ہے مگر پریشانی والی کوئی بات نہیں۔“ فرقان نے انہیں

تسلی دی۔

سعیدہ اماں ایک بار پھر سالار کو دیکھنے لگیں۔ اس نے نظریں چرائیں۔

”اچھا..... پھر تم میرے ساتھ آ جاؤ بیٹا! آمنہ اندر ہے۔ ادھر آ کر اس سے مل لو۔“

سعیدہ اماں کہتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئیں۔ سالار نے ایک نظر فرقان کو دیکھا پھر وہ خود

بھی سعیدہ اماں کے پیچھے چلا گیا۔

بیٹھک بیرونی دروازے کے بائیں جانب تھی۔ دائیں جانب اوپر جانے والی میز صیالی تھیں۔ بیرونی

دروازے سے کچھ آگے بالکل سامنے کچھ میز صیالی چڑھنے کے بعد گزری کا ایک اور پرانی طرز کا بہت بڑا

دروازہ تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا اور وہاں سرخ اینٹوں کا بڑا وسیع صحن نظر آرہا تھا۔

سعیدہ اماں کا رخ ان ہی میز صیالیوں کی طرف تھا۔ سالار ان سے کچھ فاصلے پر تھا۔ سعیدہ اماں اب

سبز حیاں چڑھ رہی تھیں۔ وہ جب سبز حیاں چڑھ کر صحن میں داخل ہو گئیں تو سالار بھی کچھ جھکتا ہوا سبز حیاں چڑھنے لگا۔

دستیغ سرخ آئینوں کے صحن کے اطراف دیواروں کے ساتھ کھیا ریاں بٹائی گئی تھیں جن میں گے ہوئے سبز پودے اور نیلیں سرخ آئینوں سے بنی ہوئی دیواروں کے بیک گراؤڈ میں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ صحن کے ایک حصے میں دھوپ تھی اور دن کے اس حصے میں بھی وہ دھوپ بے حد تیز تھی۔ دھوپ نے سرخ رنگ کو کچھ اور نمایاں کر دیا تھا۔

آہستہ آہستہ سبز حیاں چڑھ کر سالار نے صحن میں قدم رکھ دیا اور وہ ٹھنک کر رک گیا۔ صحن کے دھوپ والے حصے میں رنگی چارپائی کے سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ وہ شاید ابھی چارپائی سے اترتی تھی۔ اس کی پشت سالار کی طرف تھی۔ وہ سفید کرتے اور سیاہ شلوار میں ملبوس تھی اور نہا کر نکلی تھی۔ اس کی کمر سے کچھ اوپر اس کے سیاہ کپلے بال لٹوں کی صورت میں اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا سفید دوپٹہ چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے کرتے کی آستینوں کو کہنیوں تک فولد کرتے ہوئے سالار کی طرف مڑی تھی۔

سالار سانس نہیں لے سکا۔ اس نے زندگی میں اس سے زیادہ خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی یا پھر اسے اس لڑکی سے زیادہ خوب صورت کوئی نہیں لگا تھا۔ وہ یقیناً آہستہ آہستہ اس گھر میں آمد کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ وہ اس سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ کسی نے اس کے دل کو مٹھی میں لیا تھا۔ دھڑکن لڑکی تھی یا وہاں وہ جان نہیں سکا۔

اس کے اور آمد کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔ آستین موڑتے ہوئے آمد کی پہلی نظر سعیدہ اماں پر پڑی۔

”سالار بیٹا آیا ہے۔“

سعیدہ اماں بہت آگے بڑھ آئی تھیں۔ آمد نے گردن کو تڑپھا کرتے ہوئے صحن کے دروازے کی طرف دیکھا۔ سالار نے اسے بھی ٹھٹکتے دیکھا، پھر وہ مڑی۔ اس کی پشت ایک بار پھر سالار کی طرف تھی۔ سالار نے اسے جھکتے اور چارپائی سے دوپٹہ اٹھاتے دیکھا۔ دوپٹے کو سینے پر پھیلاتے ہوئے اس نے اس کے ایک پلو کے ساتھ اپنے سر اور پشت کو بھی ڈھانپ لیا تھا۔

سالار اب اس کی پشت پر بکھرے بال نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اسے آمد کے اطمینان نے حیران کیا تھا۔ وہاں کوئی گھبراہٹ، کوئی جلدی، کوئی حیرانی نہیں تھی۔

سعیدہ اماں نے مڑ کر سالار کو دیکھا پھر اسے دروازے میں ہی کھڑے دیکھ کر انہوں نے کہا۔

”ارے بیٹا وہاں کیوں کھڑے ہو، اندر آؤ۔ تمہارا پٹائی گھر ہے۔“

آمد نے دوپٹہ اوڑھنے کے بعد مڑ کر اسے ایک بار پھر دیکھا تھا۔ وہ اب بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ چلیں جھپکائے بغیر، دم بخود، بے حس و حرکت۔

آمد کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ وہ اب آگے آگیا تھا۔

”یہ آمد ہے، میری بیٹی۔“ سعیدہ اماں نے اس کے قریب آنے پر تعارف کر دیا۔

”السلام علیکم!“ سالار نے آمد کو کہتے سنا۔ وہ کچھ بول نہیں سکا۔ وہ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اسے دیکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

وہ تروس ہو رہا تھا۔ آمد نے اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔

”سالار! تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔“

سعیدہ اماں نے آمد کو بتایا۔

آمد نے ایک بار پھر سالار کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں نے بیک وقت نظریں چرائیں۔

آمد نے سعیدہ اماں کو دیکھا اور سالار نے آمد کی کلائیوں تک مہندی کے نقش و نگار سے بھرے ہاتھوں کو۔

یک دم اسے لگا کہ وہ اس لڑکی سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

”سالار بیٹا! اندر کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ وہاں تم اطمینان سے آمد سے بات کر لینا۔“

سعیدہ اماں نے اس بار سالار کو مخاطب کیا۔

سعیدہ اماں کہتے ہوئے اندر برآمدے کی طرف بڑھیں۔ سالار نے آمد کو سر جھکائے ان کی

بیرونی کرتے دیکھا۔ وہ وہیں کھڑا اسے اندر جاتا دیکھتا رہا۔ سعیدہ اماں کمرے کا دروازہ کھول کر اندر

داخل ہو گئیں۔ آمد نے دروازے کے پاس پہنچ کر مڑتے مڑتے اسے دیکھا۔ سالار نے برقی رفتار سے

سے نظر جھکائیں۔ آمد نے مڑ کر اسے دیکھا پھر شاید وہ حیران ہوئی۔ سالار اندر کیوں نہیں آ رہا تھا۔ سالار

نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر جھکائے قدم آگے بڑھا دیئے۔ آمد کچھ مطمئن ہو کر مڑ کر کمرے میں

داخل ہو گئی۔

سالار جب کمرے میں داخل ہوا تو سعیدہ اماں پہلے ہی ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھیں۔ آمد لائٹ

آن کر رہی تھی۔ سالار کو دھوپ سے اندر آکر تنگی کا احساس ہوا۔

”بیٹھو بیٹا!“ سعیدہ اماں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ سالار کرسی پر

بیٹھ گیا۔ آمد لائٹ آن کرنے کے بعد اس سے کچھ فاصلے پر ان کے بالفاظ ایک کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

سالار منتظر تھا کہ سعیدہ اماں چند لمحوں میں وہاں سے اٹھ کر چلی جائیں گی۔ فرقان نے واضح طور پر

انہیں بتایا تھا کہ وہ اس سے جوابی میں بات کرنا چاہتا تھا، مگر چند لمحوں کے بعد سالار کو اندازہ ہو گیا کہ اس

کا یہ انتظار بے کار تھا۔ وہ شاید یہ بھول گئی تھیں کہ سالار تنہائی میں آمنہ سے ملنا چاہتا تھا یا پھر ان کا یہ خیال تھا کہ وہ تنہائی صرف فرقان کی عدم موجودگی کے لئے تھی۔ سالار نے انہیں اس میں شامل نہیں کیا ہو گا یا پھر وہ ابھی سالار کو اتنا قابل اعتبار نہیں سمجھتی تھیں کہ اپنی بیٹی کے ساتھ اسے اکیلا چھوڑ دیتیں۔

سالار کو آخری اندازہ صحیح لگا۔ وہ اس سے جو کچھ اور جتنا کچھ کہنا چاہتا تھا، سعیدہ اماں کے سامنے نہیں کہنا چاہتا تھا، وہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو کھنگالنے کی کوشش کی۔ اسے کچھ تو کہنا ہی تھا وہ کچھ نہیں ڈھونڈ سکا۔ اس کا ذہن خالی تھا۔

نیم تار یک خشک کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔ وہ اب دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے فرش پر نظر میں جمائے ہوئے تھا۔

آمنہ نے کمرے میں کوئی فینسی لائٹ روشن کی تھی۔ اونچی دیواروں والا فرنیچر سے بھرا ہوا وہ وسیع و عریض کمرہ شاید سٹنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں بہت زیادہ دروازے تھے اور تمام دروازے بند تھے۔ کمرے میں موجود واحد کھڑکی پر آمدے میں کھلتی تھی اور اس کے آگے پردے تھے۔ فرش کو بھاری بھاری میروں نقش و نگار کے قالین سے ڈھکا گیا تھا اور فینسی لائٹ کمرے کو پوری طرح روشن کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

کم از کم کمرے میں سالار کو تاریکی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ اس کے احساسات تھے یا پھر۔ مجھے اپنے optician سے آج ضرور ملنا چاہئے۔ قریب کے ساتھ ساتھ شاید میری دور کی نظر بھی کمزور ہو گئی ہے۔"

سالار نے مایوسی سے سوچا۔ سینئر نیشنل کے دوسری طرف بیٹھی آمنہ کو وہ دیکھ نہیں پارہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر نظر قالین پر جمادی پھر اس نے یک دم آمنہ کو اٹھتے دیکھا۔ وہ دیوار کے پاس جا کر کچھ اور لائٹس آن کر رہی تھی۔ کمرہ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں جگمگا اٹھا۔ فینسی لائٹ بند ہو گئی۔ سالار حیران ہوا۔ آمنہ نے پہلے ٹیوب لائٹ آن کیوں نہیں کی تھی، پھر اچانک اسے احساس ہوا وہ ابھی نروس تھی۔

آمنہ دوبارہ پھر اس کے سامنے کاؤچ پر آکر نہیں بیٹھی۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر سعیدہ اماں کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ سالار نے اس بار اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسی طرح قالین کو گھورتا رہا۔ سعیدہ اماں کا صبر بالآخر جواب دے گیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کھنگھار کر سالار کو متوجہ کیا۔

"گرو بیٹا! وہ باتیں جو تم نے آمنہ سے تنہائی میں کرنی تھیں۔"

انہوں نے سالار کو بڑے پیار سے یاد دلایا۔

"اتنی دیر سے چپ بیٹھے ہو، میرا تودل ہول رہا ہے۔"

سالار نے ایک گہرا سانس لیا، پھر سعیدہ اماں اور آمنہ کو بھاری بھاری دیکھا۔

"کچھ نہیں، میں بس انہیں دیکھنا چاہتا تھا۔"

اس نے اپنے لہجے کو حتی الامکان ہموار رکھتے ہوئے کہا۔ سعیدہ اماں کے چہرے پر بناشت آگئی۔ "تو اتنی سی بات تھی اور فرقان نے مجھے ڈرا ہی دیا۔ ہاں ہاں ضرور دیکھو، کیوں نہیں۔ بیوی ہے تمہاری۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ ان سے کہہ دیں کہ سامان پیک کر لیں، میں باہر انتظار کرتا ہوں۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھتا ہوا سعیدہ اماں سے بولا۔ آمنہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ سعیدہ اماں بھی حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"مگر بیٹا! تم تو صرف کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے اس سے، پھر رخصتی..... میرا مطلب ہے میں چاہتی تھی باقاعدہ رخصت کروں اور....."

سالار نے نرمی سے سعیدہ اماں کی بات کاٹی۔

"آپ یہ سمجھ لیں کہ میں باقاعدہ رخصت کروانے کے لئے ہی آیا ہوں۔"

سعیدہ اماں کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہیں پھر یوں لیں۔

"ٹھیک ہے بیٹا! تم اگر ایسا چاہتے ہو تو ایسا ہی سہی مگر انتظار کے لئے روکو۔ چند گھنٹے ہی باقی ہیں، کھانا تو کھا کر جاؤ۔"

"نہیں، مجھے اور فرقان کو کچھ کام ہے۔ میں اسے صرف ایک گھنٹے کے لئے لے کر آیا تھا۔ زیادہ دیر ڈرنا ممکن نہیں ہے میرے لئے۔" وہ کھڑے کھڑے کہہ رہا تھا۔

"لیکن اماں! مجھے تو سامان پیک کرنے میں بہت دیر لگے گی۔"

آمنہ نے وہیں کرسی پر بیٹھے ہوئے پہلی بار ساری گفتگو میں حصہ لیا۔ سالار نے مڑ کر اسے دیکھے بغیر سعیدہ اماں سے کہا۔

"سعیدہ اماں! آپ ان سے کہیں یہ آرام سے بیٹنگ کر لیں، میں باہر انتظار کروں گا۔ جتنی دیر یہ چاہیں۔"

وہ اب کمرے سے نکل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

فرقان نے حیرانی سے سالار کو دیکھا۔ وہ بیٹنگ میں داخل ہو رہا تھا۔

"تم اتنی جلدی واپس آگئے، میں تو سوچ رہا تھا کہ تم خاصی دیر کے بعد واپس آؤ گے۔"

سالار جواب میں کچھ کہنے کے بجائے بیٹھ گیا۔

فرقان نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

”خیر بت ہے۔“

”ہاں۔“

”آمنہ سے ملاقات ہوئی؟“

”ہاں۔“

”پھر؟“

”پھر کیا؟“

”چلیں؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”میں آمنہ کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔“

”کیا؟“ فرقان بھونچکا رہ گیا۔

”تم تو اس سے بات کرنے کے لئے آئے تھے۔“

سالار جواب دینے کے بجائے جیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”یہ ایک دم رخصتی کا کیوں سوچ لیا؟“

”بس سوچ لیا۔“

اس بار فرقان نے اسے اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

☆.....☆.....☆

وہ گھنٹے کے بعد آمنہ جب فرقان اور سالار کے ساتھ سالار کے فلیٹ پر پہنچی تھی، جب افطار میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ سالار نے افطاری کا سامان راستے سے لے لیا تھا۔ فرقان ان دونوں کو افطاری کے لئے اپنے فلیٹ پر لے جانا چاہتا تھا مگر سالار اس پر رضامند نہیں ہوا۔ فرقان نے اپنی بیوی کو بھی سالار کے فلیٹ پر بلوایا۔

افطاری کے لئے نیکل فرقان کی بیوی نے ہی تیار کیا تھا۔ آمنہ نے مدد کرنے کی کوشش کی تھی جسے فرقان اور اس کی بیوی نے رد کر دیا۔ سالار نے مداخلت نہیں کی تھی۔ وہ موبائل لے کر بالکونی میں چلا گیا۔ لاؤنج میں بیٹھے کھڑکیوں کے شیشوں کے پار آمنہ نے اسے بالکونی میں ٹپٹے موبائل پر کسی سے بات کرتے دیکھا۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

اس نے سعیدہ اماں کے گھر سے اپنے فلیٹ تک ایک بار بھی اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ یہ صرف

فرقان تھا جو وہ قافو قفا سے مخاطب کرتا رہا تھا اور اب بھی یہی ہو رہا تھا۔

سالار نے وہ خاموشی افطار کی میز پر بھی نہیں توڑی۔ فرقان اور اس کی بیوی ہی آمنہ کو مختلف چیزیں سرو کرتے رہے۔ آمنہ نے اس کی خاموشی اور سرد مہری کو محسوس کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

افطار کے بعد وہ فرقان کے ساتھ مغرب کی نماز کے لئے نکل آیا تھا۔ فرقان کو مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد ہاتھ مل جانا تھا۔

مسجد سے نکل کر فرقان کے ساتھ کار پارکنگ کی طرف آتے ہوئے فرقان نے اس سے کہا۔

”تم بہت زیادہ خاموش ہو۔“ سالار نے ایک نظر اسے دیکھا مگر کچھ کہے بغیر چلا رہا۔

”کیا تمہیں کچھ کہنا نہیں ہے؟“

وہ مسلسل اس کی خاموشی کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سالار نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔

مغرب کے وقت ہی دھند نمودار ہونے لگی تھی۔ ایک گھر اسانس لے کر اس نے فرقان کو دیکھا۔

”نہیں، مجھے کچھ نہیں کہنا۔“

چند لمبے ساتھ چلنے کے بعد فرقان نے اسے بڑبڑاتے سنا۔

”میں آج کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں ہوں۔“

فرقان کو بے اختیار اس پر ترس آیا۔ ساتھ چلتے چلتے اس نے سالار کا کندھا تھپتھپایا۔

میں تمہارے احساسات سمجھ سکتا ہوں لیکن زندگی میں یہ سب ہو جا رہتا ہے، تم امام کے لئے جو

کچھ کر سکتے تھے تم نے کیا۔ جتنا انتہا کر سکتے تھے تم نے کیا۔ آٹھ نو سال کم نہیں ہوتے۔ اب تمہاری

قسمت میں اگر یہی لڑی ہے تو ہم یا تم کیا کر سکتے ہیں۔“

سالار نے بے تاثر نظروں سے اسے دیکھا۔

”اس گھر میں آنا امام کا مقدر نہیں تھا، آمنہ کا مقدر تھا۔ سو وہ آگئی۔ اس سے نکاح ہوئے سات

دن ہوئے ہیں اور آٹھویں دن وہ یہاں ہے۔ امام کے ساتھ نکاح کو نو سال ہونے والے ہیں اور وہ آج

تک تمہارے پاس نہیں آسکی۔ کیا تم یہ بات نہیں سمجھ سکتے کہ امام تمہارے مقدر میں نہیں ہے۔“

وہ پوری دلجمعی سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہماری بہت ساری خواہشات ہوتی ہیں۔ بعض خواہشات اللہ پوری کر دیتا ہے، بعض نہیں کرتا۔

ہو سکتا ہے امام کے نہ ملنے میں تمہارے لئے بہتری ہو۔ ہو سکتا ہے اللہ نے تمہیں آمنہ ہی کے لئے رکھا

ہو۔ ہو سکتا ہے آج سے چند سال بعد تم اسی بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکو۔“

وہ دونوں اب پارکنگ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ فرقان کی گاڑی شروع میں ہی کھڑی تھی۔

”میں نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی انسان نہیں دیکھا جس کی ہر خواہش پوری ہو، جس نے جو چاہا ہو

پالیا ہو پھر شکوہ کس بات کا۔ آمنہ کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزارنے کی کوشش کرو۔“
وہ دونوں اب گاڑی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ فرقان نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول دیا مگر بیٹھے سے پہلے اس نے سالار کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے باری باری اس کے دونوں گالوں کو نرمی سے چوما۔

”تمہیں یہی یاد رکھنا چاہئے کہ تم نے ایک نیکی کی ہے اور اس نیکی کا اجر اگر تمہیں یہاں نہیں ملے گا تو اگلی دنیا میں مل جائے گا۔“

دو اب سالار کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لئے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سالار سر کو ہلکا سا قائم کرتے ہوئے تھوڑا سا مسکرایا۔

فرقان نے ایک گہرا سانس لیا۔ آج کے دن یہ پہلی مسکراہٹ تھی جو اس نے سالار کے چہرے پر دیکھی تھی۔ اس نے خود بھی مسکراتے ہوئے سالار کی پشت چھپتھپائی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

سالار نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ فرقان انکیشن میں چابی لگا رہا تھا۔ جب اس نے سالار کو کھڑکی کا شیشہ اٹھلی سے بجاتے دیکھا۔ فرقان نے شیشہ نیچے کر دیا۔

”تم کہہ رہے تھے کہ تم نے آج تک کوئی ایسا انسان نہیں دیکھا، جس نے جس چیز کی بھی خواہش کی ہو اسے مل گئی ہو۔“

سالار کھڑکی پر بچکے پر سکون آواز میں اس سے کہہ رہا تھا۔ فرقان نے ابھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بے حد پر سکون اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

”پھر تم مجھے دیکھو کیونکہ میں وہ انسان ہوں، جس نے آج تک جو بھی چاہا ہے اسے وہ مل گیا ہے۔“
فرقان کو لگا اس کا ذہن تم کی وجہ سے متاثر ہو رہا تھا۔

”جیسے تم میری نیکی کہہ رہے ہو وہ دراصل میرا اجر ہے جو مجھے زمین پر ہی دے دیا گیا ہے۔ مجھے آخرت کے انتظار میں نہیں رکھا گیا اور میرا مقدر آج بھی وہی ہے جو نو سال پہلے تھا۔“

وہ ظہیر ظہیر کر گہری آواز میں کہہ رہا تھا۔
”مجھے وہی عورت دی گئی ہے جس کی میں نے خواہش کی تھی، امامہ ہاشم اس وقت میرے گھر پہ

ہے، خدا حافظ۔“
فرقان دم بخود دور جاتے ہوئے اس کی پشت دیکھتا رہا۔ وہ کیا کہہ کر گیا تھا اس کی کچھ میں نہیں آیا۔

”شاید میں ٹھیک سے اس کی بات نہیں سن پایا۔ یا پھر شاید اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یا پھر شاید اس نے صبر کر لیا ہے۔ امامہ ہاشم.....؟“ سالار اب بہت دور نظر آ رہا تھا۔

باب ۹

لاہور پہنچنے کے بعد اس کے لئے اگلا مرحلہ کسی کی مدد حاصل کرنے کا تھا مگر کس کی؟ وہ ہاشم نہیں جاسکتی تھی۔ وہ جو یہ اور باقی لوگوں سے رابطہ نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اس کے گھر والے اس کی دوستوں سے واقف تھے اور چند گھنٹوں میں وہ اسے لاہور میں ڈھونڈنے والے تھے، بلکہ ہو سکتا تھا اب تک اس کی تلاش شروع ہو چکی ہو اور اس صورت حال میں ان لوگوں سے رابطہ کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس کے لئے صبیحہ کی صورت میں واحد آپشن رہ جاتا تھا، مگر وہ اس بات سے واقف نہیں تھی کہ وہ ابھی پشاور سے واپس آئی تھی یا نہیں۔

صبیحہ کے گھر پر ملازم کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ لوگ ابھی پشاور میں ہی تھے۔

”واپس کب آئیں گے؟“ اس نے ملازم سے پوچھا۔ وہ اسے جانتا تھا۔

”یہ تو مجھے معلوم نہیں ہے مگر ایک دو دن تک آجائیں گے۔“ اس نے امامہ کو بتایا۔

”کیا آپ کے پاس وہاں کا فون نمبر ہے؟“ اس نے قدرے مایوسی کے عالم میں پوچھا۔

”جی، وہاں کا فون نمبر میرے پاس ہے۔“ ملازم نے اس سے کہا۔

”وہ آپ مجھے دے دیں۔ میں فون پر اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

اسے کچھ تسلی ہوئی۔ ملازم اسے اندر لے آیا۔ ڈرائنگ روم میں اسے بٹھا کر اس نے وہ نمبر لادیا۔

اس نے موبائل پر وہی بیٹھے بیٹھے صبیحہ کو رنگ کیا۔ فون پشاور میں گھر کے کسی فرد نے اٹھایا تھا اور اسے بتایا کہ صبیحہ باہر گئی ہوئی ہے۔

امام نے فون بند کر دیا۔

”صبیحہ سے میری بات نہیں ہو سکی۔ میں کچھ دیر بعد اسے دوبارہ فون کروں گی۔“ اس نے پاس کھڑے ملازم سے کہا۔

”جب تک میں یہیں بیٹھی ہوں گی۔“

ملازم سر ہلاتے ہوئے چلا گیا۔ اس نے ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ صبیحہ کو فون کیا۔ وہ اس کی کال پر حیران تھی۔

اس نے اسے مختصر طور پر اپنا گھر چھوڑ آنے کے بارے میں بتایا۔ اس نے اسے سالار سے اپنے نکاح کے بارے میں نہیں بتایا کیونکہ وہ نہیں جانتی تھی صبیحہ اس سارے معاملے کو کس طرح دیکھے گی۔

”امام! تمہارے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ تم اس معاملے میں کورٹ سے رابطہ کرو۔ تبدیلی مذہب کے حوالے سے پروٹیکشن مانگو۔“ صبیحہ نے اس کی ساری گفتگو سننے کے بعد کہا۔

”میں یہ کرنا نہیں چاہتی۔“

”کیوں؟“

”صبیحہ! میں پہلے ہی اس مسئلے کے بارے میں بہت سوچ چکی ہوں۔ تم میرے بابا کی پوزیشن اور اثر و رسوخ سے واقف ہو۔ پریس تو طوفان اٹھا دے گا۔ میری فیملی کو بہت ساری پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں یہ تو نہیں چاہتی کہ میرے گھر پر پتھر اڑو، میری وجہ سے میرے گھر والوں کی زندگی کو

خطرہ ہو اور آج تک جتنی لڑکیوں نے اسلام قبول کر کے کورٹ پر دیکھن لینے کی کوشش کی ہے ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ کورٹ دارالامان بھجوا دیتی ہے۔ وہ جیل بھجوانے کے مترادف ہے۔ کیس کا فیصلہ کتنی

دیر تک ہو، کچھ پتا نہیں۔

گھر والے ایک کے بعد ایک کیس قائل کرتے رہتے ہیں۔ کتنے سال اس طرح گزر جائیں، کچھ پتا

نہیں ہوتا اگر کسی کو کورٹ آزاد رہنے کی اجازت دے بھی دے تو وہ لوگ اتنے مسئلے کھڑے کرتے رہتے ہیں کہ بہت ساری لڑکیاں واپس گھر والوں کے پاس چلی جاتی ہیں۔ میں نہ تو دارالامان میں اپنی زندگی

برباد کرنا چاہتی ہوں نہ ہی لوگوں کی نظروں میں آنا چاہتی ہوں۔ میں نے خاموشی کے ساتھ گھر چھوڑا ہے اور میں اسی خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔“

”میں تمہاری بات سمجھ سکتی ہوں امام! لیکن مسائل تو تمہارے لئے ابھی بھی کھڑے کئے جائیں گے۔ وہ تمہیں تلاش کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے اور ان لوگوں کے لئے مسائل پیدا ہوں گے جو تمہیں پناہ دیں گے اور وہ جب تمہیں ڈھونڈنا شروع کر دیں گے تو مجھ تک پہنچنا تو ان کے لئے

بہت آسان ہو گا۔ تمہاری مدد کر کے ہمیں بہت خوشی ہو گی مگر میرے ابو کیسے چاہیں گے کہ مدد چھپ کر کرنے کے بجائے کھل کر کی جائے اور کورٹ اس معاملے میں یقیناً تمہارے حق میں اپنا فیصلہ دے گا۔ تم

ابھی میرے گھر پر ہی رہو۔ میں اس بارے میں ملازم کو کہہ دیتی ہوں اور آج میں اپنے ابو سے بات کرتی ہوں ہم کوشش کریں گے، کل لاہور واپس آ جائیں۔“

امام نے ملازم کو بلا کر فون اس کے حوالے کر دیا۔ صبیحہ نے ملازم کو کچھ ہدایات دیں اور پھر رابطہ منقطع کر دیا۔

”میں صبیحہ بی بی کا کمرہ کھول رہا ہوں، آپ وہاں چلی جائیں۔“ ملازم نے اس سے کہا۔

وہ صبیحہ کے کمرے میں چلی آئی مگر اس کی تشویش اور پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ صبیحہ کے نقطہ نظر کو سمجھ سکتی تھی۔ وہ یقیناً یہ نہیں چاہتی تھی کہ خود صبیحہ اور اس کی فیملی پر کوئی مسمیت آئے۔ اس

معاملے میں صبیحہ کے امدیشہ درست تھے۔ اگر ہاشم مبین کو یہ پتا چل جاتا کہ اسے صبیحہ کی فیملی نے پناہ دی تھی تو وہ ان کے جانی دشمن بن جاتے۔ شاید اس لئے صبیحہ نے اس سے قانون کی مدد لینے کے لئے کہا تھا

مگر یہ راست اس کے لئے زیادہ شہار تھا۔

جماعت کے اتنے بڑے لیڈر کی بیٹی کا اس طرح مذہب چھوڑ دینا پوری جماعت کے منہ پر طمانچے کے مترادف تھا اور وہ جانتے تھے کہ اس سے پورے ملک میں جماعت اور خود ان کے خاندان کو کتنی زک

پہنچے گی اور وہ اس بے عزتی سے بچنے کے لئے کس حد تک جاسکتے تھے، امام جانتی نہیں تھی، مگر اندازہ کر سکتی تھی۔

وہ صبیحہ کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی جب اس کے ذہن میں ایک جھماکے کے ساتھ سیدہ

مریم سیٹھلی کا خیال آیا تھا۔ وہ صبیحہ کی دوست اور کلاس فیلو تھی۔ وہ اس سے کئی بار ملتی رہی تھی۔ ایک بار صبیحہ کے گھر پر ہی مریم کو اس کے قبول اسلام کا پتا چلا تھا۔ وہ شاید صبیحہ کی واحد دوست تھی جسے صبیحہ نے

امام کے بارے میں بتا دیا تھا اور مریم بہت حیران نظر آئی تھی۔

”تمہیں اگر کبھی میری کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو مجھے ضرور بتانا بلکہ بلا جھجک میرے پاس آ جانا۔“

اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ امامہ سے ہاتھ ملائے ہوئے کہا۔ بعد میں بھی امامہ سے ہونے والی ملاقاتوں میں وہ ہمیشہ اس سے اسی گرم جوشی کے ساتھ ملتی رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے اس کا کیوں خیال آیا تھا یا وہ کس حد تک اس کی مدد کر سکتی تھی مگر اس وقت اس نے اس سے بھی رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے موبائل سے فون کرنا چاہا مگر موبائل کی بیٹری ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اسے ری چارج کرنے کے لئے لگا یا اور خود لاؤنج میں آکر اپنی ڈائری سے مریم کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

فون ڈاکٹر سیٹھ علی نے اٹھایا تھا۔

”میں مریم سے بات کرنا چاہتی ہوں، میں ان کی دوست ہوں۔“

اس نے اپنا تعارف کروایا۔ اس نے پہلی بار مریم کو فون کیا تھا۔

”میں بات کروا تا ہوں۔“ انہوں نے فون ہولڈ رکھنے کا کہا۔ کچھ سیکنڈز کے بعد امامہ نے دوسری طرف مریم کی آواز سنی۔

”ہیلو۔۔۔“

”ہیلو مریم! میں امامہ بات کر رہی ہوں۔“

”امامہ۔۔۔ امامہ ہاشم؟“ مریم نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

وہ اسے اپنے بارے میں بتاتی گئی۔ دوسری طرف محل خاموشی تھی جب اس نے بات ختم کی تو مریم نے کہا۔

”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”میں صیبر کے گھر ہوں، مگر صیبر کے گھر کوئی نہیں ہے۔ صیبر پشاور میں ہے۔“

اس نے صیبر کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں اسے نہیں بتایا۔

”تم وہیں رہو۔ میں ڈرائیور کو بھجواتی ہوں۔ تم اپنا سامان لے کر اس کے ساتھ آ جاؤ۔۔۔ میں اتنی دیر میں اپنی امی اور ابو سے بات کرتی ہوں۔“

اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ یہ صرف ایک اتفاق تھا کہ اس نے ڈاکٹر سیٹھ علی کے گھر کی جانے والی کال سالار کے موبائل سے نہیں کی تھی ورنہ سکندر عثمان ڈاکٹر سیٹھ علی کے گھر بھی پہنچ جاتے اور اگر امامہ کو یہ خیال آ جاتا کہ وہ موبائل کے بل سے اسے فریٹ آؤٹ کرنے کی کوشش کریں گے تو وہ لاہور آ کر ایک بار بھی موبائل استعمال نہ کرتی۔

یہ ایک اور اتفاق تھا کہ ڈاکٹر سیٹھ علی نے اپنے آفس کی گاڑی اور ڈرائیور کو اسے لینے کے لئے بھجوایا تھا، ورنہ صیبر کا ملازم مریم کی گاڑی اور ڈرائیور کو پہچان لیتا کیونکہ مریم اکثر وہاں آیا کرتی تھی اور

صیبر کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی یہ جان جاتے کہ وہ صیبر کے گھر سے کہاں گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

آدھ گھنٹہ کے بعد ملازم نے ایک گاڑی کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ اپنا بیگ اٹھانے لگی۔

”کیا آپ جا رہی ہیں؟“

”ہاں۔۔۔“

”مگر صیبر بی بی تو کہہ رہی تھیں کہ آپ یہاں رہیں گی۔“

”نہیں۔۔۔ میں جا رہی ہوں۔۔۔ اگر صیبر کا فون آئے تو آپ اسے بتادیں کہ میں چلی گئی ہوں۔“

اس نے دانستہ طور پر اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ مریم کے گھر جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ پہلی بار مریم کے گھر گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے وہاں جا کر ایک بار پھر مریم اور اس کے والدین کو اپنے بارے میں سب کچھ بتانا پڑے گا۔ وہ ذہنی طور پر خود کو سوالوں کے لئے تیار کر رہی تھی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

”ہم لوگ تو ناشتہ کر چکے ہیں تم ناشتہ کر لو۔“

مریم نے پورچ میں اس کا استقبال کیا تھا اور اسے اندر لے جاتے ہوئے کہا۔ اندر لاؤنج میں ڈاکٹر سیٹھ علی اور ان کی بیوی سے اس کا تعارف کروایا گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ امامہ کے چہرے پر اتنی سراسیمگی اور پریشانی تھی کہ ڈاکٹر سیٹھ علی کو اس پر ترس آیا۔

”میں کھانا لگواتی ہوں۔ مریم تم اسے اس کا کمرہ دکھا دو۔۔۔ تاکہ یہ کپڑے پیچھ کر لے۔“ سیٹھ علی کی بیوی نے مریم سے کہا۔

وہ جب کپڑے بدل کر آئی تو ناشتہ لگ چکا تھا۔ اس نے خاموشی سے ناشتہ کیا۔

”امامہ! اب آپ جا کر سو جائیں۔ میں آفس جا رہا ہوں، شام کو وہاں پریم آپ کے مسئلے پر بات کریں گے۔“

ڈاکٹر سیٹھ علی نے اسے ناشتہ ختم کرتے دیکھ کر کہا۔

”مریم! تم اسے کمرے میں لے جاؤ۔“ وہ خود لاؤنج سے نکل گئے۔

وہ مریم کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

”امامہ! اب تم سو جاؤ۔ تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے کہ تم پچھلے کئی گھنٹوں سے نہیں سوئیں۔ عام طور پر صبحیں اور پریشانی میں نیند نہیں آتی اور تم اس وقت اس کا شکار ہو گی۔ میں تمہیں کوئی ٹیبلٹ لا کر

دیتی ہوں اگر نیند آگئی تو ٹھیک ہے ورنہ ٹیبلٹ لے لینا۔“

وہ کمرے سے باہر نکل گئی، کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی، پانی کا گلاس اور ٹیبلٹ بیڈر ایڈجمنٹیل پر رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

”تم بالکل ریٹیکس ہو کر سو جاؤ۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم سمجھو کہ تم اپنے گھر میں ہو۔“ وہ کمرے کی لائٹ آف کرتی ایک بار پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔

صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے مگر ابھی تک باہر بہت دھند تھی اور کمرے کی کڑکیوں پر پردے ہونے کی وجہ سے کمرے میں اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ اس نے کسی معمول کی طرح ٹیبلٹ پانی کے ساتھ نکل لی۔ اس کے بغیر نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ذہن میں اتنے بہت سے خیالات آ رہے تھے کہ بیڈ پر لیٹ کر نیند کا انتظار کرنا بہت مشکل ہو جاتا۔ چند منٹوں کے بعد اس نے اپنے اعصاب پر ایک شوگر ڈیٹا کی ماری ہوئی محسوس کی۔

☆ — ☆ — ☆

وہ جس وقت دو بار دوا کھلی اس وقت کمرہ مکمل طور پر تاریک ہو چکا تھا۔ وہ بیڈ سے اٹھ کر دیواری کی طرف گئی اور اس نے لائٹ جلا دی، وال کلاک رات کے ساڑھے گیارہ بج رہا تھا۔ وہ فوری طور پر اندازہ نہیں کر سکی کہ یہ اتنی لمبی نیند ٹیبلٹ کا اثر تھی یا پھر پچھلے کئی دنوں سے صبح طور پر نہ سو سکنے کی۔

”جو کچھ بھی تھا وہ صبح سے بہت بہتر حالت میں تھی۔ اسے بے حد بھوک لگ رہی تھی، مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ گھر کے افراد اس وقت جاگ رہے ہوں گے یا نہیں۔ بہت آہستگی سے وہ دروازہ کھول کر لاؤنج میں نکل آئی۔ ڈاکٹر سیٹھ علی لاؤنج کے ایک صوفے پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور اسے دیکھ کر مسکرائے۔

”ابھی نیند آئی؟“ وہ بڑی ہنستاہنستا سے بولے۔

”جی.....؟“ اس نے مسکرائے کی کوشش کی۔

”اب ایسا کریں کہ وہ سانسے بگن ہے، وہاں چلی جائیں۔ کھانا رکھا ہوا ہے۔ گرم کریں۔ وہاں بھیل پ جی کھالیں اس کے بعد چائے کے دو کپ بنائیں اور یہاں آ جائیں۔“

وہ کچھ کہے بغیر بگن میں چلی گئی۔ فرنیچ میں رکھا ہوا کھانا نکال کر اس نے گرم کیا اور کھانے کے بعد چائے لے کر لاؤنج میں آ گئی۔ چائے کا ایک کپ بنا کر اس نے ڈاکٹر سیٹھ علی کو دیا۔

وہ کتاب میز پر رکھ چکے تھے۔ دوسرا کپ لے کر وہ ان کے بالمقابل دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ اندازہ کر چکی تھی کہ وہ اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے۔

”چائے بہت اچھی ہے۔“

انہوں نے ایک سپ لے کر مسکراتے ہوئے کہا وہ اتنی تروتوس تھی کہ ان کی تعریف پر مسکرائی نہ

شکر ایہ لودا کر سکی۔ وہ صرف انہیں دیکھتی رہی۔

”اما۔! آپ نے جو فیصلہ کیا ہے اس کے صحیح ہونے میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی مگر فیصلہ بہت بڑا ہے اور اتنے بڑے فیصلے کرنے کے لئے بہت بہت کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس کم عمری میں، مگر بعض دفعہ فیصلے کرنے کے لئے اتنی جرأت کی ضرورت نہیں ہوتی جتنی ان پر قائم رہنے کے لئے ہوتی ہے۔ آپ کو کچھ عرصہ بعد اس کا اندازہ ہو گا۔“

وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

”میں آپ سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا مذہب کی تبدیلی کا فیصلہ صرف مذہب کے لئے ہے یا کوئی اور وجہ بھی ہے۔“

وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”میرا خیال ہے مجھے زیادہ واضح طور پر یہ سوال پوچھنا چاہئے کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کسی لڑکے میں دلچسپی رکھتی ہیں اور اس کے کہنے پر یا اس کے لئے آپ نے کمرے لگنے کا فیصلہ کیا ہو یا مذہب بدلنے کا۔ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے آپ یہ مت سوچنا کہ اگر ایسی کوئی وجہ ہوگی تو میں آپ کو برا سمجھوں گا یا آپ کی مدد نہیں کروں گا۔ میں یہ صرف اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ اگر ایسا ہوا تو پھر مجھے اس لڑکے اور اس کے گھر والوں سے بھی ملنا ہو گا۔“

ڈاکٹر سیٹھ علی اب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس وقت اما۔ کو چٹیلی بار مریم سے اتنی دیر سے رابطہ کرنے پر پچھتاوا ہوا اگر سالار کے بھائے ڈاکٹر سیٹھ علی، جلال سے یا اس کے گھر والوں سے بات کرتے تو شاید۔۔۔“ اس نے پوچھلے دل سے لہجے میں سر ہلادیا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“

”کیا آپ کو واقعی یقین ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے؟“ انہوں نے ایک بار پھر پرسکون انداز میں اس سے کہا۔

”جی۔۔۔ میں نے اسلام کسی لڑکے کے لئے قبول نہیں کیا۔“ وہ اس بار جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ اس نے اسلام واقعی جلال انصر کے لئے قبول نہیں کیا تھا۔

”پھر آپ کو یہ اندازہ ہونا چاہئے کہ آپ کو کتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

”مجھے اندازہ ہے۔“

”آپ کے والد ہاشم مبین صاحب سے میں واقف ہوں۔ جماعت کے بہت سرگرم اور بار سونگ لیڈر ہیں اور آپ کا ان کے مذہب سے تائب ہو کر اس طرح گھر سے چلے آنا ان کے لئے ایک بہت بڑا دھچکا ہے۔ آپ کو ڈھونڈنے اور واپس لے جانے کے لئے وہ زمین آسمان ایک کر دیں گے۔“

”مگر میں کسی بھی قیمت پر واپس نہیں جاؤں گی۔ میں نے بہت سوچ بچھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔“
 ”مگر آپ نے چھوڑ دیا ہے۔ اب آپ آگے کیا کریں گی؟“ امامہ کو اندیشہ ہوا کہ وہ اسے کورٹ میں جانے کا مشورہ دیں گے۔

”میں کورٹ میں نہیں جاؤں گی۔ میں کسی کے بھی سامنے آنا نہیں چاہتی۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سامنے آکر میرے لئے بہت زیادہ مسائل پیدا ہو جائیں گے۔“

”پھر آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟“ انہوں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”سامنے نہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ میڈیکل کالج میں اپنی اسٹڈیز جاری نہیں رکھ سکیں گی۔“

”میں جانتی ہوں۔“ اس نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

”میں ویسے بھی خود تو میڈیکل کی تعلیم انور ذکر بھی نہیں سکتی۔“

”اور اگر کسی دوسرے میڈیکل کالج میں کسی دوسرے شہر یا صوبے میں آپ کی مائٹگریشن کروادی جائے تو؟“

”نہیں، وہ مجھے ڈھونڈ لیں گے۔ ان کے ذہن میں بھی سب سے پہلے یہی آئے گا کہ میں مائٹگریشن کروانے کی کوشش کروں گی اور اتنے تھوڑے سے میڈیکل کالج میں مجھے ڈھونڈنا بہت آسان کام ہے۔“
 ”پھر.....؟“

”میں بی ایس سی میں کسی کالج میں ایڈمیشن لینا چاہتی ہوں مگر کسی دوسرے شہر میں..... لاہور میں وہ ایک ایک کالج جہان ماریں گے اور میں اپنا نام بھی بدلوانا چاہتی ہوں..... اگر آپ ان دونوں کاموں میں میری مدد کر سکیں تو میں بہت احسان مند رہوں گی۔“

ڈاکٹر سید علی بہت دیر خاموش رہے وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ پھر انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔
 ”امامہ! ابھی کچھ عرصہ آپ کو یہیں رہنا چاہئے، پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ آپ کے گھر والے آپ کی تلاش میں کیا کیا طریقے اختیار کرتے ہیں۔ چند ہفتے انتظار کرتے ہیں پھر دیکھتے ہیں آگے کیا کرنا ہے۔ آپ اس گھر میں بالکل محفوظ ہیں..... آپ کو اس حوالے سے کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کورٹ میں نہیں جانا چاہئیں؟ میں آپ کو اس کے لئے مجبور بھی نہیں کروں گا اور آپ کو یہ ڈر نہیں ہونا چاہئے کہ کوئی یہاں تک آجائے گا یا آپ کو زبردستی یہاں سے لے جائے گا۔ آپ کے ساتھ کوئی بھی کسی بھی طرح کی زبردستی نہیں کر سکتا۔“

انہوں نے اس رات اسے بہت سی تسلیاں دی تھیں۔ اسے ڈاکٹر سید علی کی شکل دیکھ کر بے اختیار ہاشم بینین یاد آتے رہے۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دوسرے دن ڈاکٹر سید علی شام پانچ بجے کے قریب اپنے آفس سے آئے تھے۔

”صاحب آپ کو اپنی اسٹڈی میں بارہے ہیں۔“

وہ اس وقت مریم کے ساتھ کچن میں تھی جب ملازم نے آکر اسے پیغام دیا۔

”آؤ امامہ! بیٹھو!“ اسٹڈی کے دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہونے پر ڈاکٹر سید علی نے

اس سے کہا وہ اپنی ٹیبل کی ایک دراز سے کچھ ہیچرز نکال رہے تھے وہ وہاں رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”آج میں نے کچھ معلومات کروائی ہیں آپ کے بارے میں کہ آپ کے گھر والے آپ کی تلاش

میں کہاں تک پہنچے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔“

انہوں نے دراز بند کرتے ہوئے کہا۔

”یہ سالار سکندر کون ہے؟“

ان کے اگلے سوال نے اس کے دل کی دھڑکن کو چند لمحوں کے لئے روک دیا تھا۔ وہ اب کرسی پر

بیٹھے اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ اس کے چہرے کی فتن ہوتی ہوئی رنگت نے انہیں یہ بتا دیا کہ وہ نام امامہ کے لئے اجنبی نہیں تھا۔

”سالار! ہمارے ساتھ..... والے..... گھر..... میں..... رہتا..... ہے۔“ اس نے اکتھتے

ہوئے کہا۔

”اس نے میری بہت مدد کی ہے۔ گھر سے نکلنے میں..... اسلام آباد سے لاہور مجھے وہی چھوڑ

کر گیا تھا۔“

وہ دانستہ رک گئی۔

”کیا اس کے ساتھ نکاح کے بارے میں بھی بتانا چاہئے؟“ وہ گونگو میں تھی۔

”آپ کے والد نے اس کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی ہے، آپ کو اغوا کرنے کے

الزام میں۔“

امامہ کے چہرے کی رنگت اور زرد ہو گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ سالار سکندر اتنی جلدی پکڑا جائے

گا اور اب اس کے گھر والے یقیناً جلال انصر تک بھی پہنچ جائیں گے اور وہ نکاح اور اس کے بعد کیا وہ یہاں آجائیں گے۔“

”کیا وہ پکڑا گیا؟“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”نہیں..... یہ فریس آؤٹ کر لیا گیا تھا کہ وہ اس رات کسی لڑکی کے ساتھ لاہور تک آیا تھا لیکن

اس کا اصرار ہے کہ وہ آپ نہیں تمہیں۔ کوئی دوسری لڑکی تھی۔ اس کی کوئی گرل فرینڈ..... اور اس نے اس

کا ثبوت بھی دے دیا ہے۔“

ڈاکٹر سید علی نے دانستہ طور پر یہ نہیں بتایا کہ وہ لڑکی کوئی طوائف تھی۔

”پولیس اسے گرفتار اس کے اپنے والد کی وجہ سے نہیں کر سکی۔ اس کے ثبوت دینے کے باوجود آپ کے گھروالوں کا یہی اصرار ہے کہ آپ کی گمشدگی میں وہی ملوث ہے۔ امامہ اکیس لاکھ ہے یہ سالار سکندر؟“

ڈاکٹر سید علی نے اسے تفصیل بتاتے ہوئے اچانک پوچھا۔

”بہت برا۔“ بے اختیار امامہ کے منہ سے نکلا۔ ”بہت ہی برا۔“

”مگر آپ تو یہ کہہ رہی تھیں کہ اس نے آپ کی بہت مدد کی ہے۔ پھر.....“

”ہاں، اس نے میری مدد کی ہے مگر وہ بہت برے کردار کا لڑکا ہے۔ میری مدد شاید اس نے اس لئے کی ہے کیونکہ میں نے ایک بار اسے فرسٹ ایڈ دی تھی۔ اس نے خود بخود ہی کی کوشش کی تھی جب۔ اور شاید اس لئے بھی اس نے میری مدد کی ہوگی کیونکہ میرا بھائی اس کا دوست ہے۔ ورنہ وہ بہت برا لڑکا ہے۔ وہ ذہنی مریش ہے۔ پتا نہیں جیپ ہاتھی کرتا ہے۔ جیپ حرکتیں کرتا ہے۔“

امامہ کے ذہن میں اس وقت اس کے ساتھ کئے گئے سفر کی یاد تازہ تھی جس میں وہ پورا راستہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہوتی رہی تھی۔ ڈاکٹر سید علی نے سر ہلایا۔

”پولیس آپ کی فریڈز سے بھی پوچھ لے کر رہی ہے اور صیبر کے گھر تک بھی پولیس گئی ہے۔ صیبر پتلاور سے واپس آگئی ہے، مگر مریم نے صیبر کو یہ نہیں بتایا کہ آپ ہمارے یہاں ہیں۔ آپ اب صیبر سے رابطہ مت کریں۔ اسے فون بھی مت کریں کیونکہ ابھی وہ اس کے گھر کو انڈر آبزرویشن رکھیں گے اور فون کو بھی وہ خاص طور پر چیک کریں گے، بلکہ آپ اب کسی بھی دوست سے فون پر کالمیک مت کرنا نہ ہی یہاں سے باہر جانا۔“

انہوں نے اسے ہدایات دیں۔

”میرے پاس موبائل ہے۔ اس پر بھی کالمیک نہیں کر سکتی؟“

وہ چونکے۔

”آپ کا موبائل ہے؟“

”نہیں، اسی لڑکے سالار کا ہے۔“

وہ سالار تک پہنچ گئے تو موبائل تک بھی پہنچ جائیں گے۔ ”وہ بات کرتے کرتے ترک گئے۔“

”جو کال آپ نے ہمارے گھر کی تھی وہ اس موبائل سے کی تھی؟“ اس بار ان کی آواز میں کچھ

تشویش تھی۔

”نہیں، وہ میں نے صیبر کے گھر سے کی تھی۔“

”آپ اب اس موبائل پر دوبارہ کوئی کال کرنا نہ کال ریسیو کرنا۔“
وہ کچھ مطمئن ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

اگلے کچھ دنوں میں اسے ڈاکٹر سید علی سے اس کی تلاش کے سلسلے میں اور خبریں موصول ہوتی رہی تھیں۔ ان کے ذرائع معلومات جو بھی تھے مگر وہ بے حد باذوق تھے۔ اسے ہر جگہ ڈھونڈا جا رہا تھا۔ میڈیکل کالج، ہاسپٹل، کلاس فیلوز..... ہاسپٹل، روم میٹس اور فرینڈز..... ہاشم حسین نے اسے ڈھونڈنے کے لئے نیوز ہیج کاسہار انہیں لیا تھا۔ میڈیا کی مدد لینے کا نتیجہ ان کے لئے رسوا کن ثابت ہوتا۔ وہ جس حد تک اس کی گمشدگی کو خفیہ رکھنے کی کوشش کر سکتے تھے کر رہے تھے، مگر وہ پولیس کی مدد حاصل کئے ہوئے تھے۔ ان کی جماعت بھی اس سلسلے میں ان کی پوری مدد کر رہی تھی۔

وہ لوگ صیبر تک پہنچ گئے تھے مگر وہ یہ جان نہیں پاتے تھے کہ وہ لاہور آنے کے بعد اس کے گھر گئی تھی۔ شاید یہ صیبر کے ان دنوں پتلاور میں ہونے کا نتیجہ تھا جن دنوں امامہ اپنے گھر سے چلی آئی تھی۔ ورنہ شاید صیبر اور اس کے گھروالوں کو بھی کچھ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا۔

مریم نے صیبر کو امامہ کی اپنے ہاں موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس نے مکمل طور پر یوں ظاہر کیا تھا جیسے امامہ کی اس طرح کی گمشدگی باقی اسٹوڈنٹس کی طرح اس کے لئے بھی حیران کن بات تھی۔

☆.....☆.....☆

چند ہفتے گزر جانے کے بعد جب امامہ کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ ڈاکٹر سید علی کے ہاں محفوظ ہے اور کوئی بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تو اس نے سالار سکندر کو فون کیا۔ وہ اس سے نکاح کے بیچہ زلیخا چاہتی تھی اور جب پہلی بار یہ جان کر اس کے بیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی کہ سالار نے نہ تو طلاق کا حق اسے تفویض کیا تھا اور نہ ہی وہ اسے طلاق دینے کا کوئی ارادہ رکھتا تھا۔

ڈاکٹر سید علی کے گھر پہنچنے کے بعد اس نے پہلی بار موبائل کا استعمال کیا تھا اور وہ بھی کسی کو بتائے بغیر اور سالار سے فون پر بات کرنے کے بعد اسے اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہوا..... اسے سالار جیسے شخص پر کبھی بھی اس حد تک اعتماد نہیں کرنا چاہئے تھا اور اسے بیچہ زکو دیکھنے میں کتنا وقت لگ سکتا تھا جو اس نے انہیں دیکھنے سے اجتناب کیا اور پھر آخر اس نے بیچہ زکی ایک کا پی فوری طور پر اس سے کیوں نہیں لی۔ کم از کم اس وقت جب وہ اپنے گھر سے نکل آئی تھی۔

اسے اب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شخص اس کے لئے کتنی بڑی مصیبت بن گیا تھا اور آئندہ آنے والے دنوں میں..... وہ اب ہر بات پر بچھتا رہی تھی۔ اگر اسے اندازہ ہو جا کہ وہ ڈاکٹر سید علی جیسے آدمی کے پاس پہنچ جائے گی تو وہ کبھی بھی نکاح کرنے کی حماقت نہ کرتی اور سالار جیسے آدمی کے ساتھ تو کبھی

بھی نہیں۔

اور اگر اسے یقین ہو تا کہ ڈاکٹر سید علی ہر حالت میں اس کی مدد کریں گے تو وہ کم از کم سالار کے بارے میں ان سے جھوٹ نہ بولتی پھر وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال لینے، مگر اب جب وہ انہیں بڑے دعوے اور یقین کے ساتھ یہ یقین دلا چکی تھی کہ وہ کسی لڑکے کے ساتھ کسی بھی طرح انوالو نہیں تھی تو اس نکاح کا انکشاف اور وہ بھی اس لڑکے کے ساتھ..... جس کی برائیوں کے بارے میں وہ ڈاکٹر سید علی سے بات کر چکی تھی اور جس کے بارے میں وہ یہ بھی جانتے تھے کہ امام کے والدین نے اس کے خلاف انوکھا کیس فائل کیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اگر اب ڈاکٹر سید علی کو یہ حقائق بتانے کی کوشش کرے گی تو ان کا رد عمل کیا ہو گا اور وہ کم از کم اس وقت وہ واحد امکان کھونے کے لئے تیار نہیں تھی۔

اگلے دن کو اس کی بھوک پیاس بالکل ختم ہو گئی۔ مستقبل یک دم جھوٹ بن گیا تھا اور سالار سکندر..... اسے اس شخص سے اتنی عزت محسوس ہو رہی تھی کہ اگر وہ اس کے سامنے آ جاتا تو وہ اسے شوٹ کر دیتی۔ اسے عجیب عجیب خدشے اور اندیشے تنگ کرتے رہتے۔ پہلے اگر اسے صرف اپنے گھر والوں کا خوف تھا تو اب اس خوف کے ساتھ سالار کا خوف بھی شامل ہو گیا تھا اگر اس نے بھی میری تلاش شروع کر دی تو اور اس کے ساتھ ہی اس کی حالت خیر ہونے لگی۔

ان کا وزن یک دم کم ہونے لگا تھا۔ وہ پہلے بھی خاموش رہتی تھی مگر اب اس کی خاموشی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ شدید ذہنی دباؤ میں تھی اور یہ سب کچھ ڈاکٹر سید علی اور ان کے گھر کے افراد سے پوشیدہ نہیں تھا۔ ان سب نے اس سے باری باری ان اچانک آنے والی تبدیلیوں کی وجہ جاننے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں نالقی رہی۔

”تم پہلے بھی ادا اور پریشان لگتی تھی مگر اب ایک دو ہفتے سے بہت زیادہ پریشان لگتی ہو۔ کیا پریشانی ہے امام؟“

سب سے پہلے مریم نے اس سے اس بارے میں پوچھا تھا۔

”نہیں، کوئی پریشانی نہیں۔ بس میں گھر کو مس کرتی ہوں۔“

امام نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں، میں یہ نہیں مان سکتی۔ آخر اب اچانک اتنا کیوں مس کرنے لگی انہیں کہ کھانا پینا بھول گئی ہو۔ چہرہ زرد ہو گیا ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑنے لگے ہیں اور وزن کم ہو جا چاہا ہے۔ کیا تم بیمار ہونا چاہتی ہو؟“

وہ مریم کی کبھی ہوئی کسی بات کو رد نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ظاہری حالت دیکھ کر کوئی بھی اس کی پریشانی کا اندازہ ہسانی لگا سکتا تھا اور شاید یہ اندازہ بھی کہ یہ پریشانی کسی نئے مسئلے کا نتیجہ

تھی مگر وہ اس معاملے میں بے بس تھی۔ وہ سالار کے ساتھ ہونے والے نکاح اور اس سے متعلقہ خدشات کو اپنے ذہن سے نکال نہیں پا رہی تھی۔

”مجھے اب اپنے گھر والے زیادہ یاد آنے لگے ہیں۔ جوں جوں دن گزر رہے ہیں وہ مجھے زیادہ یاد آ رہے ہیں۔“

امام نے مدغم آواز میں اس سے کہا اور یہ جھوٹ نہیں تھا، اسے واقعی اب اپنے گھر والے پہلے سے زیادہ یاد آنے لگے تھے۔

وہ کبھی بھی اتنا لمبا عرصہ ان سے الگ نہیں رہی تھی اور وہ بھی مکمل طور پر اس طرح کٹ کر۔ لاہور ہاسٹل میں رہتے ہوئے بھی وہ مہینے میں ایک بار ضرور اسلام آباد جاتی اور ایک دو بار وسم یا ہاشم مبین لاہور اس سے ملنے چلے آتے اور فون تو وہ اکثر ہی کرتی رہتی تھی مگر اب یک دم اسے یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ سمندر میں موجود کسی دیران جزیرے پر آن چکی ہو۔ جہاں دور دور تک کوئی تھا ہی نہیں اور وہ چہرے..... جن سے اسے سب سے زیادہ محبت تھی وہ خوابوں اور خیالوں کے علاوہ نظر آئی نہیں سکتے تھے۔ پتا نہیں مریم اس کے جواب سے مطمئن ہوئی یا نہیں مگر اس نے موضوع بدل دیا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہو گا کہ اس طرح اس کا ذہن بٹ جائے گا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر سید علی کی تین بیٹیاں تھیں، مریم ان کی تیسری بیٹی تھی۔ ان کی بڑی دونوں بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ جب کہ مریم ابھی میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ ڈاکٹر سید علی نے امام کو اپنی بڑی دونوں بیٹیوں سے بھی متعارف کروایا تھا۔ وہ دونوں بیرون شہر مقیم تھیں اور ان کا رابطہ زیادہ تر فون کے ذریعہ ہی ہو جاتا تھا یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ امام کے وہاں آنے کے چند ہفتوں کے دوران وہ دونوں باری باری کچھ دنوں کے لئے وہاں آئیں۔

امام سے ان کا رویہ مریم سے مختلف نہیں تھا۔ ان کے رویے میں اس کے لئے محبت اور مانوسیت کے علاوہ کچھ نہیں تھا لیکن امام کو انہیں دیکھ کر ہمیشہ اپنی بڑی بہنیں یاد آ جاتیں اور پھر جیسے سب کچھ یاد آ جاتا۔ اپنا گھر..... ہا ہا..... بڑے بھائی..... وسم..... اور سعد..... سعد سے اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔

ان کی جماعت کے بااثر خاندان اپنے گھروں میں اولاد ہونے کے باوجود بے سہارا یا یتیم بچوں میں سے کسی ایک لڑکے کو گود لینے لگے تھے۔ یہ اپنی جماعت کے افراد کی مستقبل میں تعداد بڑھانے کے لئے کوششوں کا ایک ضروری حصہ تھی۔ ایسا پچھ ہمیشہ عام مسلمانوں کے بچوں میں سے ہی ہوتا اور ہمیشہ لڑکا ہوتا۔ سعد بھی اسی سلسلے میں بہت چھوٹی عمر میں اس کے گھر آیا تھا۔ وہ اس وقت اسکول کے آخری سالوں میں تھی اور اسے گھر میں ہونے والے اس عجیب اضافے نے کچھ حیران کیا تھا۔

”ہم لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شکر ادا کرنے کے لئے سعد کو گود لیا ہے، تاکہ ہم بھی دوسروں کو لوگوں پر احسانات کر سکیں اور نیکی کا یہ سلسلہ جاری رہے۔“

اس کی امی نے اس کے استفسار پر اسے بتایا تھا۔

”تم سمجھو، وہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔“

تب اسے اپنے باپا اور امی پر بہت فخر ہوا تھا۔ وہ کتنے عظیم لوگ تھے کہ ایک بے سہارا بچے کو اچھی زندگی دینے کے لئے گھر لے آئے تھے، اسے اپنا نام دے رہے تھے۔ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو اس کے ساتھ بانٹ رہے تھے۔ اس نے تب غور نہیں کیا تھا کہ ایسا ہی ایک بچہ اس کے تایا اعظم کے گھر پر بھی کیوں تھا۔ ایسا ہی ایک بچہ اس کے چھوٹے چچا کے گھر پر کیوں تھا؟ ایسے ہی بہت سے دوسرے بچے ان کے جاننے والے کچھ اور بااثر خاندانوں کے گھر پر کیوں تھے؟ اس کے لئے بس یہی کافی تھا کہ وہ ایک اچھا کام کر رہے تھے۔ ان کی جماعت ایک ”اچھے کام“ کی ترویج کر رہی تھی۔ یہ اس نے بہت بعد میں جانا تھا کہ اس ”اچھے کام“ کی حقیقت کیا تھی؟

سعد اس سے بہت مانوس تھا۔ اس کا زیادہ وقت امامہ کے ساتھ ہی گزارتا تھا۔ وہ شروع کے کئی سال امامہ کے کمرے میں اس کے بیڈ پر ہی سوتا رہا۔ اسلام قبول کر لینے کے بعد میڈیکل کالج سے وہ جب بھی اسلام آباد آتی وہ سعد کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بتاتی رہتی۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ کسی چیز کو منطقی طریقے سے نہیں سمجھایا جاسکتا تھا مگر وہ اس سے صرف ایک بات کہتی رہی۔

”جیسے اللہ ایک ہو تا ہے اسی طرح ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایک ہی ہیں۔ ان سا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔“

وہ اسے ساتھ یہ تاکید بھی کرتی رہتی کہ وہ ان دونوں کی آپس کی باتوں کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتائے اور امامہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی یہ کوشش بے کار تھی۔ سعد کو بچپن ہی سے مذہبی اجتماعات میں لے جایا جانے لگا تھا اور وہ اس اثر کو قبول کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ یہ سوچتی رہتی کہ وہ میڈیکل کی تعلیم کے بعد سعد کو لے کر اپنے گھروالوں سے الگ ہو جائے گی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ کس قدر مشکل کام تھا۔ اس نے گھر سے بھاگنے ہوئے بھی سعد کو اپنے ساتھ لے آنے کا سوچا تھا مگر یہ کام ناممکن تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اسے لاتے ہوئے خود بھی پکڑی جائے۔ وہ اسے وہاں چھوڑ آتی تھی اور اب ڈاکٹر سیٹھ علی کے ہاں پہنچ جانے کے بعد اسے اس کا بار بار خیال آتا اگر وہ کسی طرح اسے وہاں لے آتی تو وہ بھی اس دلدل سے نکل سکتا تھا مگر ان تمام سوچوں، تمام خیالوں نے اپنے گھروالوں کے لئے اس کی محبت کو کم نہیں کیا۔ اپنے گھروالوں کے لئے، نہ جلال انصر کے لئے۔

وہ ان کا خیال آنے پر جو روٹا شروع ہوتی تو ساری رات روٹی ہی رہتی۔ شروع کے دنوں میں وہ

ایک الگ کمرے میں تھی اور مریم کو اس کا اندازہ نہیں تھا مگر ایک رات وہ اچانک اس کے کمرے میں اپنی کوئی کتاب لینے آئی۔ رات کے چھپتے پہرے سے قلعاً یہ اندازہ نہیں تھا کہ امامہ جاگ رہی ہو گی اور نہ صرف جاگ رہی ہو گی بلکہ رو رہی ہو گی۔

امامہ کمرے کی لائٹ آف کئے اپنے بیڈ پر کھل اوڑھے رو رہی تھی جب اچانک دروازہ کھلا تو اس نے کھیل سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ وہ نہیں جانتی تھی مریم کو کیسے اس کے جاننے کا اندازہ ہوا تھا۔

”امامہ اچانک رہی ہو؟“

اس نے امامہ کو آواز دی۔ امامہ نے حرکت نہیں کی مگر پھر مریم اس کی طرف چلی آئی اور اس نے کھیل اس کے چہرے سے ہٹا دیا۔

”میرے اللہ! تم رو رہی ہو..... اور اس وقت.....؟“

وہ اس کے پاس ہی تشویش کے عالم میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ امامہ کی آنکھیں بری طرح سو جی ہوئی تھیں اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھینکا ہوا تھا، مگر اسے سب سے زیادہ غم امت اس طرح پکڑے جانے کی تھی۔

”اس لئے جہیں راتوں کو نیند نہیں آتی کیونکہ تم رو رہی رہتی ہو اور صبح یہ کہہ دیتی ہو کہ رات کو سونے میں وقت ہوئی اس لئے آنکھیں سو جی ہوئی ہیں۔ بس تم آج سے یہاں نہیں سوو گی۔ اٹھو میرے کمرے میں چلو۔“

اس نے کچھ برہمی کے عالم میں اسے سمجھ کر اٹھایا۔ امامہ ایک لفظ نہیں بول سکی۔ وہ اس وقت بے حد شرمندہ تھی۔

مریم نے اس کے بعد اسے اپنے کمرے میں ہی سلاٹا شروع کر دیا۔ راتوں کو وہ ہر تک روٹنے کا وہ سلسلہ ختم ہو گیا مگر نیند پر اس کا اب بھی کوئی اختیار نہیں تھا۔ اسے نیند بہت دیر سے آتی تھی۔

کئی بار مریم کی عدم موجودگی میں اس کی میڈیکل کی کتابیں دیکھتی اور اس کا دل بھر آتا۔ وہ جانتی تھی سب کچھ بہت پیچھے رو گیا تھا۔

صبح مریم اور ڈاکٹر سیٹھ علی کے گھر سے چلے جانے کے بعد وہ سارا دن انہی کے ساتھ گزار دیتا یا شاید وہ سارا دن اس کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ اسے اکیلا نہ رہنے دینے کی کوشش میں مصروف رہتی تھیں مگر ان کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی وہ پتا نہیں کن کن سوچوں میں ڈوبتی رہتی تھی۔

اس نے سالار کے ساتھ دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کا کوئی قاعدہ نہیں تھا۔ اس کی ذہنی پریشانی میں اضافے کے علاوہ اس رابطے سے اسے کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔

اسے ڈاکٹر سبط علی کے ہاں آئے تین ماہ ہو گئے تھے جب ایک دن انہوں نے رات کو اسے بلایا۔
 ”آپ کو اپنا گھر چھوڑے کچھ وقت گزر گیا ہے۔ آپ کے گھر والوں نے آپ کی تلاش ابھی تک ختم تو نہیں کی ہو گی مگر چند ماہ پہلے والی تندی و تیزی نہیں رہی ہو گی اب..... میں جانتا چاہتا ہوں کہ آپ اب آگے کیا کرنا چاہتی ہیں۔“
 انہوں نے مختصر تمہید کے بعد کہا۔

”میں نے آپ کو بتایا تھا میں اسٹڈیز جاری رکھنا چاہتی ہوں۔“

وہ اس کی بات پر کچھ دیر خاموش رہے پھر انہوں نے کہا۔

”امامہ! آپ نے اپنی شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ وہ ان سے اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

”شادی.....؟ کیا مطلب.....؟“ وہ بے اختیار ہلکائی۔

”آپ جن حالات سے گزر رہی ہیں ان میں آپ کے لئے، سب سے بہترین راستہ شادی ہی ہے کسی اچھی فیملی میں شادی ہو جانے سے آپ اس عدم تحفظ کا شکار نہیں رہیں گی جس کا شکار آپ ابھی ہیں۔ میں چند اچھے لڑکوں اور فیملیز کو جانتا ہوں میں چاہتا ہوں ان میں سے کسی کے ساتھ آپ کی شادی کر دی جائے۔“

وہ بالکل سفید چہرے کے ساتھ انہیں چپ چاپ دیکھتی رہی۔ وہ ان کے پاس آنے سے بہت پہلے اپنے لئے اسی حل کو منتخب کر چکی تھی اور اسی ایک حل کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ سالار سکندر سے نکاح کی صداقت کر چکی تھی۔

اس وقت اگر وہ سالار سکندر سے نکاح نہ کر چکی ہوتی تو وہ بلا شیل و جنت ڈاکٹر سبط علی کی بات ماننے پر تیار ہو جاتی۔ وہ جانتی تھی ان حالات میں کسی اچھی فیملی میں شادی اسے کتنی اور کن مصیبتوں سے بچا سکتی تھی۔ اس نے آج تک کبھی خود مختار زندگی نہیں گزار لی تھی۔ وہ اپنی ہر چیز کے لئے اپنی فیملی کی محتاج رہی تھی اور وہ یہ تصور کرتے ہوئے بھی خود فرود رہتی تھی کہ آخر وہ کب اور کس طرح صرف اپنے بل بوتے پر زندگی گزار سکے گی۔

مگر سالار سے وہ نکاح اس کے گلے کی ایسی بڑی بن گیا تھا جسے وہ نہ نکل سکتی تھی اور نہ اگل سکتی تھی۔
 ”نہیں میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔“

”کیوں؟“ اس کے پاس اس سوال کا جواب موجود تھا، مگر حقیقت بتانے کے لئے حوصلہ نہیں تھا۔

ڈاکٹر سبط علی اس کے بارے میں کیا سوچتے یہ کہ وہ ایک جموئی لڑکی ہے جو اب تک انہیں دھوکا دیتے ہوئے ان کے پاس رہ رہی تھی۔

”یہ کہ شاید..... وہ سالار سے شادی کے لئے ہی اپنے گھر سے نکلی تھی اور باقی سب کچھ کے بارے میں جھوٹ بول رہی تھی۔“

اور اگر انہوں نے حقیقت جان لینے پر اس کی مدد سے معذرت کر لی یا اسے گھر سے چلے جانے کا کہا تو.....؟ اور اگر انہوں نے اس کے والدین سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو.....؟ ”وہ تین ماہ سے ڈاکٹر سبط علی کے پاس تھی۔ وہ کتنے اچھے انسان تھے وہ بخوبی جانتی تھی لیکن وہ اس قدر خود فرود اور محتاط تھی کہ وہ کسی قسم کا رسک لینے پر تیار نہیں تھی۔“

”میں پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں تاکہ کسی پر بھی بوجھ نہ بنوں۔ کسی پر بھی..... شادی کر لینے کی صورت میں اگر مجھے بعد میں کبھی کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تو میں کیا کروں گی۔ اس وقت تو میرے لئے شاید تعلیم حاصل کرنا بھی ممکن نہیں رہے گا۔“

اس نے ایک لمبی خاموشی کے بعد جیسے کسی فیصلہ پر پہنچنے ہوئے ڈاکٹر سبط علی سے کہا۔

”امامہ! ہم ہمیشہ آپ کی مدد کرنے کے لئے موجود رہیں گے۔ آپ کی شادی کر دینے کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ میرے گھر سے آپ کا تعلق ختم ہو جائے گا یا میں آپ سے جان چھڑانا چاہتا ہوں..... آپ میرے لئے چوتھی بیٹی ہیں۔“

امامہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”میں آپ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالوں گا جو آپ چاہیں گی وہی ہو گا یہ صرف میری ایک تجویز تھی۔“
 ڈاکٹر سبط علی نے کہا۔

”کچھ سال گزر جانے دیں اس کے بعد میں شادی کر لوں گی۔ جہاں بھی آپ کہیں گے۔“ اس نے ڈاکٹر سبط علی سے کہا ”مگر ابھی فوری طور پر نہیں۔“

ابھی مجھے سالار سکندر سے جان چھڑانی ہے۔ اس سے طلاق لینے کا کوئی راستہ تلاش کرنا ہے۔ وہ ان سے بات کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”کس شہر میں پڑھنا چاہتی ہیں آپ؟“

ڈاکٹر سبط علی نے اس پر مزید کوئی دباؤ نہیں ڈالا۔

”کسی بھی شہر میں، میری کوئی ترجیح نہیں ہے۔“ اس نے ان سے کہا۔

☆.....☆.....☆

وہ اپنے گھر سے آتے ہوئے، اپنے سارے ڈاکومنٹس اپنے پاس موجود زیور رات اور رقم بھی لے آئی تھی۔ جب ڈاکٹر سبط علی نے اس گفتگو کے چند دن بعد ایک دن اسے بلا کر مکان میں اس کے ایڈمیشن کے فیصلے کے بارے میں بتانے کے ساتھ اس کے ڈاکومنٹس کے بارے میں پوچھا تو وہ اس بیک کولے کر

وہ ملتان چلی آئی، یہ اس کے لئے زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ ایک مشکل اور تکلیف دہ دور..... وہ ہاسٹل میں رہ رہی تھی اور وہ عجیب زندگی تھی۔ بعض دفعہ اسے اسلام آباد میں اپنا گھر اور خاندان کے لوگ اتنی شدت سے یاد آتے کہ اس کا دل چاہتا وہ بھاگ کر ان کے پاس چلی جائے۔ بعض دفعہ وہ بغیر کسی وجہ کے رونے لگتی۔ بعض دفعہ اس کا دل چاہتا وہ جلال انصر سے رابطہ کرے۔ اسے وہ بے تحاشا یاد آتا۔ وہ بی ایس سی کر رہی تھی اور اس کے ساتھ بی ایس سی کرنے والی لڑکیاں وہی تھیں جو ایف ایس سی میں میرٹ لسٹ پر نہیں آسکی تھیں اور اب وہ بی ایس سی کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں جانے کی خواہش مند تھیں۔

”میڈیکل کالج..... ڈاکٹر“ اس کے لئے بہت عرصے تک یہ دونوں الفاظ ٹھٹھرتے رہے۔ کئی بار وہ اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ کر حیران ہوتی رہتی۔ آخر وہاں کیا تھا جو ہر چیز کو مٹی کی ریت بنا رہا تھا۔ کئی بار اسے جویریہ سے کہا جانے والی اپنی باتیں یاد آتیں۔

”میں اگر ڈاکٹر نہیں بن سکی تو میں تو زندہ ہی نہیں رہ سکی گی۔ میں مری جاؤں گی۔“

وہ حیران ہوتی، وہ مری تو نہیں تھی۔ اسی طرح زندہ تھی۔

”پاکستان کی سب سے مشہور آئی اسپیشلسٹ؟“

سب کچھ ایک خواب ہی رہا تھا..... وہ ہر چیز کے اتنے پاس تھی وہ ہر چیز سے اتنا دور تھی۔ اس کے پاس گھر نہیں تھا۔

اس کے پاس گھر والے نہیں تھے۔ اس کے پاس مسجد نہیں تھا۔ میڈیکل کی تعلیم نہیں تھی۔

جلال بھی نہیں تھا۔ وہ زندگی کی ان آسانٹیوں سے ایک ہی جھلکے میں محروم ہو گئی تھی جن کی وہ عادی تھی اور اس کے باوجود وہ زندہ تھی۔ امامہ کو کبھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر بہادر تھی یا کبھی ہو سکتی تھی مگر وہ ہو گئی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تکلیف میں کمی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یوں جیسے اسے صبر آ رہا تھا۔ اللہ کے بعد شاید زمین پر یہ ڈاکٹر سید علی تھے جن کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی تھی۔ مہینے میں ایک بار ایک اینڈ پریو وہ ان کے پاس لاہور آتی۔ وہ وقتاً فوقتاً اسے ہاسٹل فون کرتے رہتے، اسے کچھ نہ کچھ بھجواتے رہتے۔ ان کی بیٹیاں اور بیوی بھی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ ان کے نزدیک ان کے گھر کا ایک فرد بن چکی تھی اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو میرا کیا ہوتا۔ وہ کئی بار سوچتی۔

☆.....☆.....☆

ملتان میں اپنے قیام کے دوران بھی اس نے سالار سکندر کو کبھی اپنے ذہن سے فراموش نہیں کیا تھا۔ تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ طور پر شروع کرنے کے بعد وہ ایک بار اس سے رابطہ کرنا چاہتی تھی اور اگر وہ

پھر اسے طلاق دینے سے انکار کر دیتا تو وہ اب بالآخر ڈاکٹر سید علی کو اس تمام معاملے کے بارے میں بتا دینا چاہتی تھی۔

اور سالار سے رابطہ اس نے بی ایس سی کے امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد لاہور آنے سے پہلے کیا۔ اپنے پاس موجود سالار کے موبائل کا استعمال وہ بہت پہلے ترک کر چکی تھی۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ دو سال کے عرصہ میں سالار دوبارہ ای موبائل نمبر کو استعمال کرنا شروع کر چکا ہے یا پھر اس نے نمبر کو استعمال کر رہا تھا، جو اس نے اسے اپنا موبائل دے دینے کے بعد دیا تھا۔

ایک بی سی او سے اس نے سب سے پہلے اس کا نیا نمبر ڈائل کیا۔ وہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں تھا، پھر اس نے اپنے پاس موجود موبائل کے نمبر کو ڈائل کیا..... وہ نمبر بھی کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔

اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اب وہ کوئی تیسرا نمبر لئے ہوئے تھا اور وہ نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔

اس نے بالآخر اس کے گھر کا نمبر ڈائل کیا کچھ دیر تک تیل ہوتی رہی، پھر فون اٹھا لیا گیا۔

”ہیلو.....“ کسی عورت نے دوسری طرف سے کہا۔

”سالار سکندر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“ امامہ نے کہا۔

”سالار صاحب سے..... آپ کون بول رہی ہیں۔“

امامہ کو اچانک محسوس ہوا جیسے اس عورت کے لہجے میں یک دم جنس پیدا ہو گیا تھا۔

امامہ کو پتا نہیں کیوں اس کی آواز شناسا گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اچانک اس عورت نے بڑی بے جوش آواز میں کہا۔ ”امامہ بی بی آپ امامہ بی بی ہیں؟“

ایک کرنت کھا کر امامہ نے بے اختیار کریدل دبا دیا۔ وہ کون تھی جس نے اسے صرف آواز سے پہچان لیا تھا۔ اتنے سالوں بعد بھی..... اور اتنی جلدی اور وہ بھی سالار سکندر کے گھر.....

کچھ دیر اس کے ہاتھ کا پینچے رہے۔ وہ بی بی او کے اندر والے کیمین میں تھی اور کچھ دیر ریسیور اسی طرح ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی۔

”جو بھی ہو مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسلام آباد سے اتنی دور ہوں کہ یہاں مجھ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ مجھے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے سوچا اور بی بی او کے مالک کو ایک بار پھر کال ملانے کے لئے کہا۔

فون کی کھنٹی بجنے پر اس بار فون فوراً اٹھا لیا گیا تھا مگر اس بار بولنے والا کوئی مرد تھا اور وہ سالار نہیں تھا۔ یہ وہ آواز سنتے ہی جان گئی تھی۔

”میں سالار سکندر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”آپ امامہ ہاشم ہیں؟“

مرد نے کھردری آواز میں کہا۔ اس بار امامہ کو کوئی شاک نہیں لگا۔

”جی۔۔۔“ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

”آپ ان سے میری بات کروادیں۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ دوسری طرف سے اس مرد نے کہا۔

”کیوں؟“

”سالار زندہ نہیں ہے۔“

”کیا...؟“ بے اختیار امامہ کے حلق سے نکلا۔

”وہ مر گیا؟“

”ہاں...“

”کب...؟“

اس بار مرد خاموش رہا۔

”آپ سے آخری بار ان کا رابطہ کب ہوا؟“

اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس آدمی نے کہا۔

”چند سال پہلے... ڈھائی سال پہلے۔“

”ایک سال پہلے اس کی ڈھتھ ہوئی ہے۔ آپ...“

امامہ نے کچھ بھی اور سننے سے پہلے فون بند کر دیا۔ کچھ کہنے اور سننے کی ضرورت نہیں تھی۔۔۔ وہ

آزاد ہو چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک انسان کے طور پر اسے اس کی موت پر افسوس ہونا چاہئے تھا مگر

اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ اگر اس نے اس طرح اسے طلاق دینے سے انکار نہ کیا ہوتا تو وہ یقیناً اس کے

لئے دکھ محسوس کرتی مگر اس وقت ڈھائی سال کے بعد اسے بے اختیار سکون اور خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ تمنا کر رہی تھی وہ عذاب ہو چکی تھی۔

اسے اب ڈاکٹر سپاہلی کو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صحیح معنوں میں آزاد ہو چکی تھی وہ

اس کا وہاں ہاسٹل میں آخری دن تھا اور اس رات اس نے سالار سکندر کے لئے بخشش کے لئے دعا کی۔

وہ اس کی موت کے بعد اسے معاف کر چکی تھی اور وہ اس کی موت پر بے پناہ خوش تھی۔

☆.....☆.....☆

اس سے فون پر بات کرنے والی وہی ملازمہ تھی جو سالار کے ساتھ ساتھ اس کے گھر میں بھی کام

کرتی رہی تھی اور اس نے امامہ کی آواز کو فوراً پہچان لیا تھا۔ امامہ کے فون بند کرتے ہی وہ کچھ اظہار

اور جوش و خروش کے عالم میں سکندر عثمان کے پاس پہنچ گئی۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اس دن طبیعت کی

خرابی کی وجہ سے وہ گھر پر ہی تھے۔

”ابھی کچھ دیر پہلے ایک لڑکی کا فون آیا ہے۔ وہ سالار صاحب سے بات کرنا چاہتی تھی۔“

”تو تم بات کروادیتیں۔“ سکندر عثمان نے قدرے لاپرواہی سے کہا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ

سالار بھی ان دنوں پاکستان آیا ہوا تھا اور گھر پر ہی موجود تھا۔ ملازمہ کچھ ہنسی چکرائی۔

”صاحب جی اوہ امامہ لہی لہی تھیں۔“

سکندر عثمان کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھونٹے چھونٹے پھا، وہ ایک دم حواس باختہ نظر آنے لگے۔

”امامہ ہاشم... ہاشم مبین کی بیٹی؟“ ملازمہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔ سکندر عثمان کا سر گھومنے لگا۔

”تو کیا سالار ہر ایک کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ وہ ابھی تک امامہ کے ساتھ رابطے میں ہے اور وہ

جاننا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ تو پھر یقیناً وہ اس سے ملنا بھی رہا ہوگا۔“ انہوں نے بے اختیار سوچا۔

”اس نے تمہیں خود اپنا نام بتایا؟“ انہوں نے چائے کا کپ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں... میں نے ان کی آواز پہچان لی اور جب میں نے ان کا نام لیا تو انہوں نے فون بند کر

دیا۔“ ملازمہ نے سکندر عثمان کو بتایا ”مگر مجھے یقین ہے وہ ان ہی کی آواز تھی۔ مجھے کم از کم اس بار سے

میں کوئی یاد ہو سکتا۔“ اس سے پہلے کہ سکندر عثمان کچھ کہتے انہوں نے فون کی گھنٹی سنی مگر اس بار

وہ ڈائمنگ روم میں موجود ایجنٹیشن کی طرف بڑھ گئے اور انہوں نے فون اٹھالیا۔ دوسری طرف موجود

لڑکی ایک بار پھر سالار سکندر کا پوچھ رہی تھی۔ ان کے استفسار پر اس نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ وہ امامہ ہاشم

ہی تھی۔ وہ نہیں جانتے کیوں مگر بے اختیار ان کے دل میں آیا کہ وہ اسے سالار کے مرنے کی خبر دے

دیں، تاکہ وہ دوبارہ کبھی ان کے گھر فون نہ کرے۔ انہیں اس سے بات کر کے یہ اندازہ تو ہو ہی چکا تھا

کہ وہ بہت عرصے سے سالار کے ساتھ رابطہ نہیں کر سکی ہے اور اس کے پاس ان کے بیان کی صداقت کو

پرکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ دوبارہ رابطہ نہ کرتی تو ان کی جان اس سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ سکتی تھی۔

وہ ابھی تک اس ایک سال کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکے تھے۔ جب امامہ کی کشدگی کے فوراً بعد سالار

پر شبہ ہونے کی وجہ سے ہاشم مبین احمد نے ان کے لئے ہر قسم کی پریشانی کمزری کی تھی۔

بہت سے سرکاری دفاتر جہاں پہلے ان کی فرم کی فائلز بہت آسانی سے نکل آتی تھیں۔ مبینوں

پہنسی رہیں۔ ان کے گھر دھکی آمیز کاٹز اور خط آتے رہے۔ کئی لوگوں نے بالواسطہ طور پر ان پر دباؤ

ڈالا کہ وہ ہاشم مبین احمد کی بیٹی کی واپسی کے لئے ان کی مدد کریں۔ ایک لمبے عرصے تک سالار کی گھرائی کی

گئی اور گھرائی کا یہ سلسلہ صرف پاکستان ہی نہیں باہر بھی جاری رہا، مگر جب کسی طرح بھی امامہ سے اس کے

رابطے کا کوئی ثبوت باسراغ نہیں ملا تو رفتہ رفتہ یہ تمام سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔

سکندر عثمان کی بے پناہ کوشش کے باوجود بھی ہاشم مبین کے ساتھ ان کے تعلقات بحال نہیں

ہوئے مگر ان کی طرف سے عدم تحفظ کا اندیشہ ختم ہو گیا تھا اور اب ڈھائی سال بعد وہ لڑکی ایک بار پھر سالار سے رابطہ کرنا چاہتی تھی وہ کسی صورت بھی دوبارہ ان حالات کا سامنا نہ خود کرنا چاہتے تھے نہ ہی سالار کو کرنے دینا چاہتے تھے۔

اگر وہ خود ہاشم مبین احمد کی نگر کے آدمی نہ ہوتے تو اب تک وہ اس سے زیادہ نقصان اٹھانے لگتے ہوتے، جتنا نقصان انہوں نے اس ایک سال اور خاص طور پر شروع کے چند ماہ میں اٹھایا تھا۔ وہ امامہ کو اس طلاق نامے کی ایک کاپی بھجوانا چاہتے تھے، جو سالار کی طرف سے انہوں نے تیار کیا تھا اور انہیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ جائز تھا یا نہیں۔ وہ صرف امامہ کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ سالار یا اس کے خاندان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہونا چاہئے نہ ہی ہوگا۔

اگر کچھ تھا بھی تو وہ سالار کی موت اور اس سے بھی پہلے کے تحریر شدہ اس طلاق نامے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا مگر یہ ایک اور اتفاق تھا کہ امامہ نے ان کی بات مکمل طور پر سنے بغیر فون بند کر دیا انہوں نے فون کو ٹریس آؤٹ کرنے کی کوشش کی، مگر وہ ملتان کے ایک پنی سی او کا ثابت ہوا۔ سالار ایک ہفتہ کے بعد واپس امریکہ جانے والا تھا اور انہوں نے اس ایک ہفتہ اس کی مکمل طور پر نگرانی کروائی۔ وہ ملازموں کو ہدایات دے چکے تھے کہ کسی کا بھی فون آئے وہ کسی بھی صورت سالار سے بات نہ کروائیں، چاہے فون کسی مرد کا ہو یا عورت کا جب تک وہ خود یہ جان نہ لیتے کہ فون کرنے والا کون تھا۔ ملازمہ کو بھی وہ سختی کے ساتھ منع کر چکے تھے کہ وہ سالار کو امامہ کی اس کال کے بارے میں نہ بتائے۔ ایک ہفتے کے بعد جب سالار واپس امریکہ چلا گیا تو انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔

سر پر آئی ہوئی آفت ایک بار پھر ٹل گئی تھی۔ سالار کی واپسی کے چند ہفتے کے بعد انہیں ایک لفافہ موصول ہوا تھا۔

امامہ نے لاہور واپس پہنچنے کے بعد وہ موبائل بیچ دیا تھا۔ وہ اسے واپس نہیں بھجوا سکتی تھی اور سالار کی وفات کے بعد اب یہ امکان نہیں تھا کہ کبھی اس کے ساتھ آنا سامنا ہونے کی صورت میں وہ اسے وہ موبائل واپس دے سکے گی۔ اس نے موبائل بیچنے سے ملنے والی رقم کے ساتھ اپنے پاس موجود کچھ اور رقم شامل کی۔ وہ اندازاً ان کا لڑکے بل کی رقم تھی، جو ڈھائی تین سال پہلے سالار نے ادا کئے ہوں گے اور چند دوسرے اخراجات جو اپنے گھر قید کے دوران وہاں سے لاہور فرار کے دوران سالار نے اس پر کئے تھے۔ اس کے ساتھ سکندر عثمان کے نام ایک مختصر نوٹ بھجوایا تھا۔ ٹریولرز ویکس۔ اس کے سر پر موجود اس آدمی کا قرض بھی اتر گیا تھا۔

اس رقم اور اس کے ساتھ ملنے والے نوٹ سے سکندر عثمان کو تسلی ہو گئی تھی کہ وہ دوبارہ اس سے رابطہ نہیں کرے گی اور یہ بھی کہ اس نے واقعی ان کی بات پر یقین کر لیا تھا۔

باب ۱۰

ملتان سے بی ایس سی کرنے کے بعد وہ لاہور چلی آئی تھی۔ اسے گھر چھوڑے تین سال ہونے والے تھے اور اس کا خیال تھا کہ اب کم از کم اس طرح اسے تلاش نہیں کیا جائے گا، جس طرح پہلے کیا جاتا رہا تھا۔ اگر کیا بھی گیا تو صرف میڈیکل کالج پر نظر رکھی جائے گی۔ اس کا یہ اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔

اس نے پنجاب یونیورسٹی میں کیسٹری میں ایم ایس سی کے لئے ایپلیکیشن لے لیا تھا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ بے حد محتاط تھی۔ یہ لاہور تھا یہاں کسی بھی وقت کوئی بھی اسے پہچان سکتا تھا۔ ملتان میں وہ صرف چادر اوڑھ کر کالج جاتی تھی۔ لاہور میں اس نے نقاب لگانا شروع کر دیا۔

لاہور میں دوبارہ واپسی کے بعد وہ ڈاکٹر سہیل علی کے ساتھ نہیں رہی تھی، وہ سعید و اماں کے پاس رہنے لگی تھی۔

سعیدہ اماں سے اس کی پہلی ملاقات ڈاکٹر سید علی نے ملتان جانے سے پہلے لاہور میں کروائی تھی۔ سعیدہ اماں کے بہت سے عزیز واقارب ملتان میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر سید علی، امامہ کو ان سے آگاہ کرنا چاہتے تھے، تاکہ ملتان میں قیام کے دوران کسی بھی ضرورت یا ایمر غرضی میں وہ ان کی مدد لے سکے۔

سعیدہ اماں ایک ہینڈ ستر سالہ بے حد باتونی اور اینٹو عورت تھیں۔ وہ لاہور کے اندرون شہر میں ایک پرانی حویلی میں تنہا رہتی تھیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا جبکہ دو بیٹے بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہیں مقیم تھے۔ وہ دونوں شادی شدہ تھے اور ان کے بے حد اصرار کے باوجود سعیدہ اماں باہر جانے پر تیار نہیں تھیں۔ ان کے دونوں بیٹے باری باری ہر سال پاکستان آیا کرتے اور کچھ عرصہ قیام کے بعد واپس چلے جاتے تھے۔ ڈاکٹر سید علی سے ان کی قربت داری تھی۔ وہ ان کے کزن ہوتے تھے۔

ڈاکٹر سید علی نے امامہ کے بارے میں پہلے ہی سعیدہ اماں کو بتا دیا تھا، اسی لئے جب وہ ان کے ساتھ ان کے گھر پہنچی تو وہ بڑی گرم جوشی سے اس سے ملی تھیں۔ انہوں نے ملتان میں موجود تقریباً اپنے ہر رشتے دار کے بارے میں تفصیلات اس کے گوش گزار کر دی تھیں اور پھر شاید اس سب کو ناکافی جانتے ہوئے انہوں نے خود ساتھ چل کر اسے ہاسٹل چھوڑ آنے کی آفر کی جسے ڈاکٹر سید علی نے نرمی سے رد کر دیا تھا۔

”نہیں آپا! آپ کو زحمت ہوگی۔“ ان کے بے حد اصرار کے باوجود وہ نہیں مانے تھے۔

”بہتر تو یہ ہے بھائی صاحب کہ آپ اسے میرے بھائیوں میں سے کسی کے گھر ٹھہرا دیں۔ بچی کو گھر جیسا آرام اور ماحول ملے گا۔“

انہیں اچانک ہاسٹل پر اعتراض ہونے لگا اور پھر انہوں نے ہاسٹل کی زندگی کے کئی مسائل کے بارے میں روشنی ڈالی تھی مگر ڈاکٹر سید علی اور خود وہ بھی کسی کے گھر میں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ ہاسٹل بہترین آپشن تھا۔

☆.....☆.....☆

سعیدہ اماں سے اس کی دوسری ملاقات ملتان جانے کے چند ماہ بعد اس وقت ہوئی تھی، جب ایک دن اچانک اسے کسی خاتون ملاقاتی کی اطلاع ہاسٹل میں دی گئی تھی۔ کچھ دیر کے لئے وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ وہاں اس طرح اچانک اس سے ملنے کون آسکتا تھا اور وہ بھی ایک خاتون..... مگر سعیدہ اماں کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ وہ اس سے اسی گرم جوشی سے ملی تھیں، جس طرح لاہور میں ملی تھیں۔ وہ تقریباً دو ہفتے ملتان میں رہی تھیں اور ان دو ہفتوں میں کئی بار اس سے ملنے آئیں۔ ایک بار وہ ان کے ساتھ ہاسٹل سے ان کے بھائی کے گھر بھی گئی۔

پھر یہ جیسے ایک معمول بن گیا تھا۔ وہ چند ماہ بعد ملتان آئیں اور اپنے قیام کے دوران باقاعدگی

سے اس کے پاس آتی رہتیں۔ وہ خود جب مہینے میں ایک بار لاہور آتی تو ان سے ملنے کے لئے بھی جاتی۔ کئی بار جب اس کی چھٹیاں زیادہ ہوتیں تو وہ اسے وہاں ٹھہرنے کے لئے اصرار کرتیں۔ وہ کئی بار وہاں رہی تھی۔ شرح انٹوں کا بنا ہوا وہ پرانا گھر اسے اچھا لگتا تھا یا پھر یہ تنہائی کا وہ احساس تھا، جو وہ ان کے ساتھ شیئر کر رہی تھی۔ اس کی طرح وہ بھی تنہا تھیں۔ اگرچہ ان کی یہ تنہائی ان کے ہمہ وقت میل جول کی وجہ سے کم ہو جاتی تھی مگر اس کے باوجود امامہ ان کے احساسات کو بنا گوشش کے سمجھ سکتی تھی۔

لاہور واپس شفٹ ہونے سے بہت عرصہ پہلے ہی انہوں نے امامہ سے یہ جان لینے کے بعد کہ وہ ایم ایس سی لاہور سے کرنا چاہ رہی ہے، اسے ساتھ رکھنے کے لئے اصرار کرنا شروع کر دیا۔

اسی عرصے کے دوران ڈاکٹر سید علی کی سب سے بڑی بیٹی ان کے پاس اپنے بیچوں سمیت کچھ عرصہ کے لئے رہنے چلی آئیں۔ ان کے شوہر بی ایچ ڈی کے لئے بیرون ملک چلے گئے تھے۔ وہ ڈاکٹر سید علی کے بھتیجے تھے۔ جانے سے پہلے وہ اپنی فیملی کو ان کے ہاں ٹھہرا گئے۔ ڈاکٹر سید علی کے گھر میں جگہ کی کمی نہیں تھی مگر امامہ اب ان کے گھر میں رہنا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اپنے بیروں پر کھڑا ہونا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر سید علی کے احسانات کا بوجھ پہلے ہی اسے زیر بار کر رہا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ان کے پاس رہ کر تعلیم حاصل کرے اور اس کے بعد اس کے چاب کرنے پر بھی وہ اسے کہیں اور رہنے نہ دیتے لیکن اگر وہ پہلے ہی علیحدہ رہائش اختیار رکھتی تو اس کے لئے ان سے اپنی بات منوانا آسان ہوتا۔ سعیدہ اماں کا گھر اسے اپنی رہائش کے لئے بہت مناسب لگا تھا۔ وہ چاب شروع کرنے پر انہیں مجبور کر کے کرائے کی مدد میں کچھ نہ کچھ لینے پر مجبور کر سکتی تھی مگر ڈاکٹر سید علی شاید یہ سب کبھی گوارا نہ کرتے۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر سید علی کے لئے اس کا فیصلہ ایک شاک کی طرح تھا۔

”کیوں آمنہ! میرے گھر پر کیوں نہیں رہ سکتیں آپ؟“ انہوں نے بہت ناراضی سے اس سے

کہا۔ ”سعیدہ آپا کے ساتھ کیوں رہنا چاہتی ہیں؟“

”وہ بہت اصرار کر رہی ہیں۔“

”میں انہیں سمجھا دوں گا۔“

”نہیں، میں خود بھی ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ میں ان کے ساتھ رہوں گی تو ان کی تنہائی

دور ہو جائے گی۔“

”یہ کوئی وجہ نہیں ہے۔ آپ ان کے پاس جب چاہیں جا سکتی ہیں، مگر ساتھ رہنے کے لئے نہیں۔“

”پلیز، آپ مجھے وہاں رہنے کی اجازت دے دیں، میں وہاں زیادہ خوش رہوں گی۔ میں اب

آہستہ آہستہ اپنے بیروں پر کھڑا ہونا چاہتی ہوں۔“

ڈاکٹر سہیل علی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”جیروں پر کھڑے ہونے سے کیا مراد ہے آپ کی؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

”میں آپ پر بہت لمبے عرصے تک بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ پہلے ہی میں بہت سال سے آپ پر

انحصار کر رہی ہوں، مگر ساری زندگی تو میں آپ پر بوجھ بن کر نہیں گزار سکتی۔“

وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔ اسے لگا اس کے آخری جملے نے ڈاکٹر سہیل علی کو تکلیف دی تھی۔

اسے پچھتاوا ہوا۔

”میں نے کبھی بھی آپ کو بوجھ نہیں سمجھا آمنہ! کبھی بھی نہیں۔ بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتیں اور میرے

لئے آپ ایک بیٹی کی طرح ہیں پھر یہ بات..... مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔“

”میں جانتی ہوں ابو! مگر میں صرف اپنی فیملی کی بات کر رہی تھی۔ دوسرے پروفیشنلز ہونا

بہت تکلیف دہ بات ہے۔ میں سعیدہ اماں کے ساتھ رہ کر زیادہ پرسکون رہوں گی۔ میں انہیں پے (pay)

کروں گی۔ آپ کو میں کبھی پے (pay) کرنا چاہوں بھی تو نہ کر سکوں گی۔ شاید مجھے دس زندگیوں بھی ملیں

تو میں آپ کے احسانات کا بدلہ نہیں اٹا کر سکتی مگر اب بس..... اب اور نہیں..... میں نے زندگی کو

گزارنے کے سارے طریقے ابھی سیکھے ہیں۔ مجھے سیکھنے دیں۔“

ڈاکٹر سہیل علی نے اس کے بعد اسے دوبارہ اپنے گھر میں رہنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے لئے

بھی ان کی احسان مند تھی۔

سعیدہ اماں کے ساتھ رہنے کا تجربہ اس کے لئے ہاسٹل میں یا ڈاکٹر سہیل علی کے ہاں رہنے سے

بالکل مختلف تھا۔ اسے ان کے پاس ایک عجیب سی آزادی اور خوشی کا احساس ہوا تھا۔ وہ بالکل اکیلی رہتی

تھیں۔ صرف ایک ملازمہ تھی جو دن کے وقت آکر گھر کے کام کر دیا کرتی تھی اور شام کو وہ ایس پٹلی جایا

کرتی تھی۔ وہ بے حد سوشل لائف گزارتی تھیں۔ محلے میں ان کا بہت آنا جانا تھا اور نہ صرف محلے میں بلکہ

اپنے رشتے داروں کے ہاں بھی اور ان کے گھر بھی اکثر کوئی نہ کوئی آتا رہتا تھا۔

انہوں نے محلے میں ہر ایک سے امامہ کا تعارف اپنی بھانجی کہہ کر کروایا تھا اور چند سالوں کے بعد

یہ تعارف بھانجی سے بیٹی میں تبدیل ہو گیا تھا، اگرچہ محلے والے پچھلے تعارف سے واقف تھے، مگر اب کسی

نئے ملنے والے سے جب وہ امامہ کو بیٹی کی حیثیت سے متعارف کروائیں تو کسی کو کوئی تجسس نہیں ہوتا تھا۔

لوگ سعیدہ اماں کی عادت سے واقف تھے کہ وہ کتنا محبت بھرا دل رکھتی تھیں۔ ان کے بیٹے بھی امامہ سے

واقف تھے، بلکہ وہ باقاعدگی سے فون پر سعیدہ اماں سے بات کرتے ہوئے اس کا حال احوال بھی دریافت

کرتے رہتے تھے۔ ان کی بیوی اور بیٹے بھی اس سے بات چیت کرتے رہتے تھے۔

ان کے بیٹے ہر سال پاکستان آیا کرتے تھے اور ان کے قیام کے دوران بھی امامہ کو کبھی ایسا محسوس

نہیں ہوتا تھا، جیسے وہ ان کی فیملی کا حصہ نہیں تھی، بعض دفعہ اسے یوں ہی لگتا جیسے وہ واقعی سعیدہ اماں کی

بیٹی اور ان کے بیٹوں کی بہن تھی۔ ان دونوں کے سچے اسے پھوپھو کہا کرتے تھے۔

پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی کرنے کے بعد اس نے ڈاکٹر سہیل علی کے توسط سے ایک

فارماسیوٹیکل کمپنی میں جاب شروع کر دی تھی۔ اس کی جاب بہت اچھی تھی اور پہلی بار اس نے مالی طور پر

بھی خود مختاری حاصل کر لی تھی۔ یہ ویسی زندگی نہیں تھی جو وہ اپنے والدین کے گھر گزارتی تھی نہ ہی ویسی

تھی جیسی زندگی کے وہ خواب دیکھا کرتی تھی مگر یہ ویسی بھی نہیں تھی جن خدشات کا وہ گھر سے نکلنے

ہوئے شکار تھی۔ وہ ہر ایک کے بارے میں نہیں کہہ سکتی مگر اس کے لئے زندگی معجزات کا دوسرا نام تھی۔

سالار سکندر جیسے لڑکے سے اس طرح کی مدد..... ڈاکٹر سہیل علی تک رسائی..... سعیدہ اماں جیسے خاندان کا

ملنا..... تعلیم کا مکمل کرنا اور پھر وہ جاب..... صرف جلال العصر تھا جس کا خیال ہمیشہ اسے تکلیف میں مبتلا کر

دیتا تھا اور شاید وہ اسے مل جاتا تو وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی۔

آٹھ سالوں نے اس میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ گھر سے نکلنے وقت وہ جانتی تھی کہ

اب دنیا میں اس کے خڑے اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے کسی سے کوئی توقعات وابستہ کرنی تھیں نہ ہی

ان کے پورا نہ ہونے پر تکلیف محسوس کرتی تھی۔ اس کا رونا دھونا بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم

ہوتا گیا تھا۔ تیس سال کی عمر میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوف زدہ اور پریشان ہونے والی امامہ ہاشم آہستہ

آہستہ اپنا وجود کھوتی گئی تھی۔ نئی نمودار ہونے والی امامہ زیادہ پر اعتماد اور مضبوط اعصاب رکھتی تھی مگر اس

کے ساتھ ساتھ وہ بہت زیادہ محتاط بھی ہو گئی تھی۔ ہر چیز کے بارے میں اپنی گفتگو کے بارے میں، اپنے

طور اطوار کے بارے میں۔

ڈاکٹر سہیل علی اور سعیدہ اماں دونوں کے خاندانوں نے اسے بہت محبت اور اپنائیت دی تھی لیکن

اس کے باوجود وہ ہمیشہ کوشش کرتی تھی کہ وہ کوئی ایسی بات یا حرکت نہ کرے، جو انہیں قابل اعتراض یا

ناگوار لگے۔ ہاشم بہین کے گھر میں اسے یہ ساری احتیاطیں نہیں کرنی پڑتی تھیں مگر وہاں سے نکل کر اسے

یہ سب کچھ سیکھنا پڑا تھا۔

سعیدہ اماں کی گمشدگی کے دوران وہ آفس میں تھی۔ چار بجے کے قریب جب وہ گھر آئی تو گھر پر

تالا لگا ہوا تھا۔ اس کے پاس اس تالے کی دوسری چابی تھی، کیونکہ اس سے پہلے بھی سعیدہ اماں کئی بار

ادھر ادھر چلی جایا کرتی تھیں۔ اسے تشویش نہیں ہوئی۔

لیکن جب مغرب کی اذان ہونے لگی تو وہ پہلی بار فکر مند ہوئی کیونکہ وہ شام کو تین بجے بغیر کبھی یوں

غائب نہیں ہوئی تھیں۔ ساتھ والوں کے ہاں پتا کرنے پر اسے پتا چلا کہ ان کا بیٹا انہیں بال کے گھر صبح

چھوڑ کر آیا تھا۔ سعید و اماں پہلے بھی اکثر وہاں آتی جاتی رہتی تھیں، اس لئے امامہ ان لوگوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے وہاں فون کیا تو اسے پتا چلا کہ وہ دوپہر کو وہاں سے جا چکی تھیں اور تب پہلی بار اسے صحیح معنوں میں تشویش ہونے لگی۔

اس نے باری باری ہر اس جگہ پتا کیا جہاں وہ جا سکتی تھیں مگر وہ کہیں بھی نہیں ملیں اور تب اس نے ڈاکٹر سیٹھ علی کو اطلاع دی۔ اس کی حالت تب تک بے حد خراب ہو چکی تھی۔ سعید و اماں کا میل جول اپنے محلے تک ہی تھا۔ وہ اندرون شہر کے علاوہ کسی جگہ کو اچھی طرح نہیں جانتی تھیں۔ انہیں کسی دوسری جگہ جانا ہوتا تو وہ ہمسایوں کے کسی لڑکے کے ساتھ جاتیں یا پھر امامہ کے ساتھ اور بی بی ہات امامہ کو تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔

دوسری طرف سالار اندرون شہر کے سوا شہر کے تمام پوش علاقوں سے واقف تھا۔ اگر اسے اندرون شہر کے بارے میں تو بڑی بہت معلومات بھی ہوتیں تب بھی وہ سعید و اماں کے احوال سے پتے کے باوجود کسی نہ کسی طرح ان کے گھر تک پہنچ جاتا۔

ڈاکٹر سیٹھ علی نے رات گئے اسے سعید و اماں کی خبریت سے اپنے کسی جاننے والے کے پاس ہونے کی اطلاع دی اور امامہ کی جیسے جان میں جان آئی۔

مزید ایک گھنٹے کے بعد دروازے کی بیل بجی تھی اور اس نے تقریباً بھاگتے ہوئے جا کر دروازہ کھولا۔ دروازے کی اوٹ سے اس نے سعید و اماں کے پیچھے کھڑے ایک خوش چلن آدمی کو دیکھا، جس نے دروازہ کھلنے پر اسے سلام کیا اور پھر سعید و اماں کو خدا حافظ کہتے ہوئے مزگیا اور اس دوسرے دروازے قدامت شخص کے پیچھے چلنے لگا جس کی امامہ کی طرف پشت تھی۔ امامہ نے اس پر غور نہیں کیا وہ تو بے اختیار سعید و اماں سے لپٹ گئی تھی۔

سعید و اماں اگلے کئی دن اس کے سامنے ان دونوں کا نام لیتی رہیں، سالار اور فرقان۔ امامہ کو پھر بھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ سالار۔۔۔ سالار سکندر بھی ہو سکتا تھا۔۔۔ مرد و لوگ زندہ نہیں ہو سکتے تھے اور اسے اگر اس کی موت کا یقین نہ بھی ہوتا تب بھی سالار سکندر جیسا شخص نہ تو ڈاکٹر سیٹھ علی کا شاہسار ہو سکتا تھا نہ ہی اس میں اس طرح کی اچھائیاں ہو سکتی تھیں جن اچھائیوں کا ذکر سعید و اماں وقتاً فوقتاً کرتی رہتی تھیں۔

اس کے کچھ عرصے بعد اس نے جس شخص کو اس رات سعید و اماں کے ساتھ بیڑ جیوں پہ کھڑے دیکھا تھا اس شخص سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی۔ فرقان اپنی بیوی کے ساتھ ان کے ہاں آیا تھا۔ اسے وہ اور اس کی بیوی دونوں اچھے لگے تھے پھر وہ چند ایک بار اور ان کے گھر آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی شناسائی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

اسے جانب کرتے تب دو سال ہو چکے تھے۔ کچھ وقت شاید اور اسی طرح گزر جاتا۔ اگر وہ اتفاقاً

ایک روز اس سڑک سے نہ گزرتی جہاں جلال کے بنائے ہوئے ہاسٹل کے باہر اس کا نام آویزاں تھا۔ جلال انصر کا نام اس کے قدم روک دینے کے لئے کافی تھا مگر کچھ دیر تک ہاسٹل کے باہر اس کا نام دیکھتے رہنے کے بعد اس نے طے کیا تھا کہ وہ دوبارہ اس سڑک پر کبھی نہیں آئے گی۔

جلال شادی کر چکا تھا۔ یہ وہ گھر چھوڑتے وقت ہی سالار سے جان چکی تھی اور وہ دوبارہ اس کی زندگی میں نہیں آتا چاہتی تھی مگر اس کا یہ فیصلہ دیر پا ثابت نہیں ہوا۔

دو ہفتے کے بعد فارما سیو نیگل کہنی کے آفس میں ہی اس کی ملاقات راجہ سے ہوئی۔ راجہ وہاں کسی کام کے لئے آئی تھی۔ چند لمحوں کے لئے تو اسے اپنے سامنے دیکھ کر اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح کاروبار میں ظاہر کرے۔ یہ مشکل راجہ نے آسان کر دی۔ وہ اس سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ملی تھی۔

”تم ٹیک دم کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ کالج اور ہاسٹل میں تو ایک لمبا عرصہ طوقان بچا رہا۔“

راجہ نے چہرے ہی اس سے پوچھا۔ امامہ نے مسکرائے کی کوشش کی۔

”بس میں گھر سے چلی گئی تھی۔ کیوں گئی تھی تم تو جانتی ہی ہو گی۔“ امامہ نے مختصر کہا۔

”ہاں، مجھے کچھ اندازہ تو تھا ہی مگر میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ ویسے ہم لوگوں کی بڑی کم ہمتی

آئی۔ میری جو بریہ، زینب، سب کی۔۔۔ پولیس تک نے پوچھ گچھ کی ہم سے۔ ہمیں تو کچھ پتا ہی نہیں تھا

تمہارے بارے میں، مگر ہاسٹل اور کالج میں بہت ساری باتیں پھیل گئی تھیں تمہارے بارے میں۔“

راجہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی مسلسل بولے جا رہی تھی۔

”تم اکبلی ہی گئی تھیں؟“ اس نے بات کرتے کرتے اچانک پوچھا۔

”ہاں۔“ امامہ انصر کام پر چائے کا کہتے ہوئے بولی۔

”مگر گئی کہاں تھیں؟“

”کہیں نہیں، یہیں لاہور میں تھی۔ تم بتاؤ، تم کیا کر رہی ہو آج کل اور جو بریہ۔۔۔ باقی سب۔“

امامہ نے بات بدلنے ہوئے کہا۔

”میں پریکٹس کر رہی ہوں لاہور میں۔ جو بریہ یہ اسلام آباد میں ہوتی ہے۔ شادی ہو گئی ہے اس کی

ایک ڈاکٹر سے۔ میری بھی فاروق سے ہوئی ہے۔ تمہیں تو یاد ہو گا کلاس فیلو تھا میرا۔“

امامہ مسکرائی۔ ”اور زینب؟“ اس کا دل بے اختیار دھڑکا تھا۔

”ہاں، زینب آج کل انگلینڈ میں ہوتی ہے۔ ریڑی ٹیسی کر رہی ہے وہاں اپنے شوہر کے ساتھ۔

اس کے بھائی کے ہاسٹل میں ہی فاروق پریکٹس کرتے ہیں۔“

امامہ نے بے اختیار اسے دیکھا۔ ”جلال انصر کے ہاسٹل میں؟“

”ہاں، اسی کے ہاسٹل میں۔ وہ اسٹوڈنٹز انیشن کر کے آیا ہے کچھ عرصے پہلے لیکن بے چارے کے

راجہ بڑی ٹریڈری ہوئی ہے۔ چند ماہ پہلے طلاق ہو گئی ہے۔ حالانکہ اتنا چھابندو ہے مگر۔
 امامہ اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکی۔

”طلاق..... کیوں؟“

”پتا نہیں، فاروق نے پوچھا تھا اس سے۔ کہہ رہا تھا انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہوئی۔ بیوی بھی بڑی اچھی تھی اس کی۔ ڈاکٹر ہے وہ بھی لیکن پتا نہیں کیوں طلاق ہو گئی۔ ہم لوگوں کا تو خاصا آنا جانا تھا ان کے گھر میں۔ ہمیں کبھی بھی اتنا اذہ نہیں ہوا کہ ایسا کوئی مسئلہ ہے دونوں کے درمیان۔ ایک بیٹا ہے تین سال کا۔ وہ چہلا کے پاس ہی ہے۔ اس کی بیوی وہاں امریکہ چلی گئی ہے۔“

راجہ لا پرواہی سے تمام تفصیلات بتا رہی تھی۔

”تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ یہ تو میں جان گئی ہوں کہ یہاں جا ب کر رہی ہو مگر اسٹڈیز تو تم نے کھلی نہیں کی۔“

”ایم ایس سی کیا ہے کیسٹری میں۔“

”اور شادی وغیرہ؟“

”وہ ابھی نہیں۔“

”تیس برس کے ساتھ تمہارا جھگڑا ختم ہوا یا نہیں؟“

امامہ نے حیرت سے اس کو دیکھا۔

”نہیں۔“ پھر اس نے مدہم آواز میں کہا۔

وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہی پھر چلی گئی۔ امامہ باقی کا سارا وقت آفس میں ڈسٹرب رہی۔ اس نے جلال انصر کو کبھی بھلا یا نہیں تھا۔ وہ اسے بھلا نہیں سکتی تھی۔ اس نے صرف اپنی زندگی سے اس کو الگ کر دیا تھا مگر وہاں بیٹھے ہوئے اس دن اسے احساس ہوا کہ یہ بھی ایک خوش گمانی یا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ جلال انصر کو اپنی زندگی سے الگ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ صرف اس کی زندگی میں داخل ہو کر اسے کسی پریشانی سے دوچار کرنا چاہتی تھی نہ ہی اس کی ازدواجی زندگی کو خراب کرنا چاہتی تھی لیکن بعد ہر جاننے کے بعد کہ اس کی ازدواجی زندگی پہلے ہی ناکام ہو چکی ہے اور وہ ایک بار پھر اکیلا تھا۔ اسے پانچ آٹھ سال پہلے وہ کس طرح اس شخص کے حصول کے لئے بچوں کی طرح کھلتی رہی تھی۔ وہ اسے حاصل نہیں کر سکی تھی۔ جب بہت سی دیواریں، بہت سی رکاوٹیں تھیں جنہیں وہ پار کر سکتی تھی نہ جلال انصر پاسکتا تھا۔

مگر اب بہت وقت گزر چکا تھا۔ ان رکاوٹوں میں سے اب کچھ بھی ان دونوں کے درمیان نہیں تھا۔ بس اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ ایک شادی کر چکا تھا یا اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔

”مجھے اس کے پاس ایک بار پھر جانا چاہئے، شاید وہ اب بھی میرے بارے میں سوچتا ہو شاید اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہو۔“ امامہ نے سوچا تھا۔

اس نے آخری بار فون پر بات کرتے ہوئے اس سے جو کچھ کہا تھا، امامہ اس کے لئے اس کو معاف کر چکی تھی۔ جلال کی جگہ جو بھی ہو تا وہ یہی کہتا۔ صرف ایک لڑکی کے لئے تو کوئی بھی اتنے رسک نہیں لیتا اور پھر اس کا کیریئر تھا جسے وہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کے پڑوس کی اس سے کچھ امیدیں تھیں جنہیں وہ شتم نہیں کر سکتا تھا۔ میری طرح وہ بھی مجبور تھا۔ بہت سال پہلے کہے گئے اس کے جملوں کی بازگشت نے بھی اسے دلبرداشتہ یا اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔

”مجھے اس کے پاس جانا چاہئے۔ ہو سکتا ہے یہ موقع مجھے اللہ نے ہی دیا ہو۔ ہو سکتا ہے اللہ نے میری دعاؤں کو اب قبول کر لیا ہو۔ ہو سکتا ہے اللہ کو مجھ پر اب رحم آ گیا ہو۔“

وہ بار بار سوچ رہی تھی۔

”ورنہ اس طرح اچانک راجہ میرے سامنے کیوں آ جاتی۔ مجھے کیوں یہ پتا چلا کہ اس کی بیوی سے علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہو سکتا ہے اب میں اس کے سامنے جاؤں تو.....“ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ جلال انصر کے پاس دوبارہ جانا چاہتی تھی۔

☆.....☆

”میں ڈاکٹر جلال انصر سے ملنا چاہتی ہوں۔“ امامہ نے ریپیشنٹ سے کہا۔

”اپائنٹ منٹ ہے آپ کی؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، اپائنٹ منٹ نہیں ہے۔“

”پھر تو وہ آپ سے نہیں مل سکیں گے۔ اپائنٹ منٹ کے بغیر وہ کسی پینٹ کو نہیں دیکھتے۔“ اس نے بیسے پروفیٹل انداز میں کہا۔

”میں پینٹ نہیں ہوں، ان کی دوست ہوں۔“ امامہ نے کاؤنٹر پر ہاتھ رکھتے ہوئے مدہم آواز میں کہا۔

”ڈاکٹر صاحب جانتے ہیں کہ آپ اس وقت ان سے ملنے آئیں گی؟“ ریپیشنٹ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

”ایک منٹ، میں ان سے پوچھتی ہوں۔“ اس نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ اور ریپیشنٹ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ اس نے اپنا سوال دہرایا۔

”امام ہاشم۔“ اسے یاد نہیں اس نے کتنے سالوں بعد اپنا نام لیا تھا۔

”سر او کوئی خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ آپ کی دوست ہیں۔ امام ہاشم نام ہے ان کا۔“

وہ دوسری طرف سے جلال کی گفتگو سنتی رہی۔

”او کے سر۔“ پھر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

”آپ اندر چلی جائیں۔“ ریپشنسٹ نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

وہ سر ہلاتے ہوئے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ جلال انصر کا ایک مریض باہر نکل رہا تھا اور وہ خود اپنی میز کے پیچھے کھڑا تھا۔ امام نے اس کے چہرے پر حیرت دیکھی تھی۔ وہ اپنے دھڑکنے والی آواز باہر تک سن سکتی تھی۔ اس نے جلال انصر کو آٹھ سال اور کتنے ماہ کے بعد دیکھا تھا۔ امام نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے یاد نہیں آیا۔

”What a pleasant surprise Imam!“ (کیسا خوشگوار سر پرانز ہے امام!)۔

جلال نے آگے بڑھ کر اس کی طرف آتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم کیسی ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟“

وہ اس کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر بولی۔ پچھلے آٹھ سال سے یہ چہرہ ہر وقت اس کے ساتھ رہا تھا اور یہ آواز بھی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں، آؤ بیٹھو۔“

اس نے اپنی ٹیبل کے سامنے پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ خود ٹیبل کے دوسری جانب اپنا کرسی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ ہمیشہ سے چلتی تھی۔ وہ جلال انصر کو جب بھی دیکھے گی اس کا دل اسی طرح بے قابو ہو گا مگر اتنی خوشی، ایسی سرشاری تھی جو وہ اپنے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑتی محسوس کر رہی تھی۔

”کیا پیو گی؟ چائے، کافی، سوٹ ڈرنک؟“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

”جو آپ چاہیں۔“

”او کے، کافی منگوا لیتے ہیں۔ تمہیں پسند تھی۔“

وہ انٹرکام اٹھا کر کسی کو کافی بھجوانے کی ہدایات دے رہا تھا اور وہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ڈاڑھی اب نہیں تھی۔ اس کا ہیرا شکل مکمل طور پر تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کا وزن پہلے کی نسبت کچھ بڑھ گیا تھا۔ وہ پہلے کی نسبت بہت پر اعتماد اور بے تکلف نظر آ رہا تھا۔

”تم آج کل کیا کر رہی ہو؟“ ریسیور رکھتے ہی اس نے امام سے پوچھا۔

”ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں کام کر رہی ہوں۔“

”ایم بی بی ایس تو چھوڑ دیا تھا تم نے۔“

”ہاں، ایم ایس سی کیا ہے کیمسٹری میں۔“

”کون سی کمپنی ہے؟“ امام نے نام بتایا۔

”وہ تو بہت اچھی کمپنی ہے۔“

وہ کچھ دیر اس کمپنی کے بارے میں تعریفی تبصرہ کرتا رہا۔ وہ چاپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

”میں اس وقت تازہ نشین کر کے آیا ہوں۔“

وہ اپنے بارے میں بتانے لگا۔ وہ چالیس بھپکائے بغیر کسی معمول کی طرح اسے دیکھتی رہی۔ بعض لوگوں کو صرف دیکھنا ہی کتنا کافی ہوتا ہے۔ اس نے اسے بات کرتے دیکھ کر سوچا تھا۔

”ایک سال ہوا ہے اس ہاسپتال کو شروع کئے اور بہت اچھی پریکٹس چل رہی ہے میری۔“

وہ بولتا رہا۔ کافی آچکی تھی۔

”تمہیں میرا پتا کیسے چلا؟“ وہ کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

”میں نے آپ کے ہاسپتال کے بورڈ پر آپ کا نام پڑھا تھا پھر راجہ سے ملاقات ہوئی۔ آپ جانتے ہوں گے۔ راجہ بھی واقف تھی اس سے۔“

”راجہ فاروق کی بات کر رہی ہو۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کا شوہر ڈاکٹر فاروق میرے ساتھ کام کرتا ہے۔“ اس نے کافی پیتے ہوئے کہا۔

”ہاں وہی..... پھر میں یہاں آئی۔“

امام نے ابھی کافی نہیں پی تھی۔ کافی بہت گرم تھی اور بہت گرم چیزیں نہیں چیتی تھی۔ اس نے کسی زمانے میں میز کے دوسری جانب بیٹھے ہوئے شخص کو آئیڈیلز کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس میں ہر خوبی تھی، ہر وہ خوبی جو ایک مکمل مرد میں ہونی چاہئے۔ ہر وہ خوبی جو وہ اپنے شوہر میں دیکھنا چاہتی تھی۔ ساڑھے آٹھ سال گزر گئے تھے اور امام کو یقین تھا کہ وہ اب بھی ویسا ہی ہے۔ چہرے سے ڈاڑھی کے ہٹ جانے کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کو اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت نہ رہی ہو۔ اپنے ہاسپتال کی کامیابی کے قصیدے اس کے سامنے پڑھتے ہوئے بھی امام اس کی اسی آواز کو اپنے کانوں میں گونجنے محسوس کر رہی تھی، جس آواز نے ایک بار اس کی زندگی کا سب سے مشکل فیصلہ آسان کر دیا تھا۔

وہ اس کے منہ سے کامیاب پریکٹس اور شہرت کا سن کر مسرور تھی۔ جلال نے زندگی میں ان ہی کامیابیوں کو سمیٹنے کے لئے ساڑھے آٹھ سال پہلے اسے چھوڑ دیا تھا مگر وہ خوش تھی۔ آج سب کچھ جلال

انصر کی مٹھی میں تھا۔ کم از کم آج فیصلہ کرنے میں اسے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

”تم نے شادی کر لی؟“ بات کرتے کرتے اس نے اچانک پوچھا۔

”نہیں۔“ امام نے مدہم آواز میں جواب دیا۔

”تو پھر تم کہاں رہتی ہو، کیا اپنے بیٹرس کے پاس ہو؟“ جلال اس بار کچھ سنجیدہ تھا۔

”نہیں۔“

”پھر؟“

”اکیلی رہتی ہوں، بیٹرس کے پاس کیسے جا سکتی تھی۔“ اس نے مدہم آواز میں کہا۔

”آپ نے شادی کر لی؟“ جلال نے کافی کا ایک کھونٹ لیا۔

”ہاں، شادی کر لی اور علیحدگی بھی ہو گئی۔ تین سال کا ایک بیٹا ہے میرا۔ میرے پاس ہی ہوتا ہے۔“

جلال نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

”آئی ایم سوری۔“ امام نے اظہارِ افسوس کیا۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ اچھا ہوا یہ شادی ختم ہو گئی۔“

”It was not a marriage, it was a mess.“ (یہ شادی نہیں تھی ایک کھجیرا تھا)۔

جلال نے کافی کا کپ ٹھیل پر رکھتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی پھر اس خاموشی کو

امام نے توڑا۔

”بہت سال پہلے ایک بار میں نے آپ کو پوچھ لیا تھا جلال؟“

جلال اسے دیکھنے لگا۔

”پھر میں نے آپ سے شادی کے لئے ریکوریٹ کی تھی۔ آپ اس وقت مجھ سے شادی نہیں

کر سکے۔“

”کیا میں یہ ریکوریٹ آپ سے دوبارہ کر سکتی ہوں؟“

اس نے جلال انصر کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔

”اب تو حالات بدل چکے ہیں۔ آپ کسی پریزنٹ نہیں ہیں۔ نہ ہی میرے بیٹرس کے کسی رد عمل

کا آپ کو اندیشہ ہو گا نہ ہی آپ کے بیٹرس اعتراض کریں گے۔ اب تو آپ مجھ سے شادی کر سکتے ہیں۔“

وہ جلال کا جواب سننے کے لئے زکی۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کی خاموشی نے امام کے اعصاب

کو متھل کیا۔ شاید یہ اس لئے خاموش ہے کیونکہ اسے اپنی پہلی شادی یا بیٹے کا خیال ہو گا۔ امام نے سوچا۔

مجھے اسے بتانا چاہئے کہ مجھے اس کی پہلی شادی کی کوئی پروا نہیں ہے، نہ ہی اس بات پر اعتراض کہ اس کا

ایک بیٹا بھی ہے۔

”جلال! مجھے آپ کی پہلی شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

جلال نے اس کی بات کاٹ دی۔

”امام! یہ ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں ممکن نہیں ہے۔ کیا آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے؟“

”محبت کی بات نہیں ہے امام! اب بہت وقت گزر چکا ہے۔ ویسے بھی ایک شادی ناکام ہونے کے

بعد میں فوری طور پر دوسری شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میں اپنے کیرئیر پر دھیان دینا چاہتا ہوں۔“

”جلال! آپ کو مجھ سے تو کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہئے۔ میرے ساتھ تو آپ کی شادی ناکام

نہیں ہو سکتی۔“

”پھر بھی..... میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔“ جلال نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں انتظار کر سکتی ہوں۔“

جلال نے ایک گہرا سانس لیا۔

”اس کا کوئی فائدہ نہیں امام! میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تم سے شادی کر سکوں۔“

وہ دم سادھے اسے دیکھتی رہی۔

”یہ شادی میں نے اپنی مرضی سے کی تھی۔ دوبارہ میں اپنی مرضی نہیں کرنا چاہتا۔ دوسری شادی میں

اپنے بیٹرس کی مرضی سے کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ اپنے بیٹرس کو میرے بارے میں بتادیں۔ شاید وہ آپ کو اجازت دے دیں۔“ اس نے

ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

”نہیں بتا سکتا۔ دیکھو امام! کچھ حقائق ہیں جن کا سامنا مجھے اور تمہیں بہت حقیقت پسندی سے کرنا

چاہئے۔ میں اپنے لئے تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی زمانے میں،

میں بھی تمہارے ساتھ انوالو تھا یا یہ کہہ لو کہ محبت کرنا تھا۔ میں آج بھی تمہارے لئے دل میں بہت

خاص جذبات رکھتا ہوں اور ہمیشہ رکھوں گا مگر زندگی جذبات کے سہارے نہیں گزارا جا سکتی۔“

وہ زکا۔ امام کافی کے کپ سے اٹھتے دھوئیں کے پار اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”تم جب سات آٹھ سال پہلے اپنا گھر چھوڑی تھیں تو میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ اس طرح نہ کرو

کرنے کے بجائے تم مجھے مجبور کرتی رہیں کہ میں تم سے چھپ کر شادی کر لوں۔ میں ایسا نہیں کر سکا اور

نہ ہی یہ مناسب تھا۔ مذہب کی بات اپنی جگہ، مگر مذہب کے ساتھ معاشرہ بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے جس

میں ہم رہتے ہیں اور جس کی ہمیں پروا کرنی چاہئے۔“

امامہ کو یقین نہیں آیا۔ وہ یہ سب اس شخص کے منہ سے سن رہی تھی جو.....

”تم تو چلی گئیں مگر تمہارے جانے کے بعد تمہارا اس طرح غائب ہو جانا کتنا بڑا سکیٹل ثابت ہوا اس کا تمہیں اندازہ نہیں۔ تمہارے جرنل نے پریس میں یہ خبر آنے نہیں دی مگر پورے میڈیکل کالج کو تمہارے اس طرح چلے جانے کا پتا تھا۔ پولیس نے تمہاری بہت ساری فرینڈز اور کلاس فیلوز سے تمہارے بارے میں انوشٹی کی۔ زینب بھی اس میں شامل تھی۔ خوش قسمتی سے ہم بچ گئے۔“

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”میں نے اتنے سال محنت کر کے اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ میں اتنا بہادر نہیں ہوں کہ میں تم سے شادی کر کے لوگوں کی چہ گویوں کا نشانہ بنوں۔ میرا اٹھنا بیٹنا ڈاکٹرز کی کیونٹی میں ہے اور امامہ ہاشم کی میری بیوی کے طور پر واپسی مجھے سکیٹل لائز کر دے گی۔ تم سے شادی کر کے میں لوگوں سے نظریں نہیں چراتا چاہتا۔ تم اتنے سال کہاں رہی ہو، کیسے رہی ہو، یہ بہت اہم سوالات ہیں۔ میرے جرنل کو تمہاری کسی بات پر یقین نہیں آئے گا اور مجھے لوگوں کی نظروں میں اپنا یہ مقام برقرار رکھنا ہے۔ تم بہت اچھی ہو مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ تم اچھی لڑکی نہیں ہو اور میں کسی سکیٹل لائز لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی یہ کہے کہ میری بیوی کا کردار اچھا نہیں ہے۔ آئی ہو پ، تم میری پوزیشن کو سمجھ سکتی ہو۔“

کافی کے کپ سے اٹھتا دھواں ختم ہو چکا تھا مگر جلال انصر کا چہرہ ابھی کسی دھوئیں کے پیچھے چھپا نظر آرہا تھا پھر یہ اس کی آنکھوں میں اترنے والی دھند تھی جس نے جلال انصر کو غائب کر دیا تھا۔

کری کے دونوں ہتھوں کا سہارا لیتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ہاں، میں سمجھ سکتی ہوں۔“ اس نے اپنے آپ کو کہتے سنا۔ ”خدا حافظ۔“

”آئی ایم سوری امامہ!“ جلال معذرت کر رہا تھا۔ امامہ نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ پیسے نیند کی حالت میں چلتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئی۔

شام کے سات بج چکے تھے، اندھیرا چھا چکا تھا۔ سڑکوں پر اسٹریٹ لائٹس اور نیون سائن بورڈز روشن تھے۔ سڑک پر بہت زیادہ ٹریفک تھی۔ اس پورے روڈ پر دونوں طرف ڈاکٹرز کے کلینک تھے۔ اسے یاد تھا کسی زمانے میں اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کا بھی ایسا ہی کلینک ہو تا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ وہ بھی اپنے نام کے آگے اسی طرح کوالی فیکشن کی ایک لمبی لسٹ دیکھنا چاہتی تھی بالکل ویسے ہی جس طرح جلال انصر کے نام کے ساتھ تھیں۔ بالکل ویسے ہی جس طرح اس روڈ پر لگے ہوئے بہت سے ڈاکٹرز کے ناموں کے ساتھ تھی۔ یہ سب ہو سکتا تھا، یہ سب ممکن تھا، اس کے ہاتھ کی مٹھی میں تھا اگر وہ..... وہ بہت سال پہلے اپنے گھر سے نہ نکلی ہوتی۔

وہ بہت دیر تک جلال کے ہاتھل کے باہر سڑک پر کھڑی خالی الذہنی کی کیفیت میں سڑک پر دوڑتی ٹریفک کو دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ یہاں سے کہاں جائے اس نے ایک بار پھر مڑ کر ہاتھل کے ماتھے پر جھگکتے الیکٹریک بورڈ پر ڈاکٹر جلال انصر کا نام دیکھا۔

”تم اچھی لڑکی ہو، مگر لوگ تمہیں اچھا نہیں سمجھتے۔“

اسے چند منٹ پہلے کہے ہوئے اس کے الفاظ یاد آئے، وہاں کھڑے اسے پہلی بار پتا چلا کہ اس نے اپنی پوری زندگی ایک طرف محبت میں گزار دی تھی۔ جلال انصر کو اس سے کبھی محبت تھی ہی نہیں۔ نہ ساڑھے آٹھ سال پہلے، نہ ہی اب..... اس کو صرف امامہ کی ضرورت نہیں تھی، اس کے ساتھ منسلک باقی چیزوں کی بھی ضرورت تھی۔ اس کا لمبا چوڑا فیملی بیک گراؤ..... سوسائٹی میں اس کے خاندان کا نام اور مرتبہ..... اس کے خاندان کے کلائیکس..... اس کے خاندان کی دولت..... جس کے ساتھ تھی ہو کر وہ چپ لگا کر راتوں رات اپر کلاس میں آجاتا..... اور وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہی کہ وہ صرف اس کی محبت میں جتا تھا..... اس کا خیال تھا کہ وہ ایک بار بھی اس کے کردار کے حوالے سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ وہ کم از کم یہ یقین ضرور رکھے گا کہ وہ غلط راستے پر نہیں چل سکتی مگر وہ پھر غلط تھی..... اس کے نزدیک وہ ایک سکیٹل لائز لڑکی تھی جس کے دفاع میں اپنی فیملی یا دوسرے لوگوں سے کچھ کہنے کے لئے اس کے پاس کوئی لفظ نہیں تھا۔ ساڑھے آٹھ سال پہلے گھر چھوڑتے ہوئے وہ جانتی تھی کہ لوگ اس کے بارے میں بہت کچھ کہیں گے۔ وہ اپنے لئے کانٹوں بھر راستہ، زہر انگلی زبانیں اور مٹھ کر کرتی نظریں جن رہی تھی مگر اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان لوگوں میں جلال انصر بھی شامل ہو گا۔ زہر انگلی زبانوں میں ایک زبان اس کی بھی ہو گی۔ وہ زندگی میں کم از کم جلال انصر کو اپنے کردار کے اچھا ہونے کے بارے میں کوئی صفائی یا وضاحت نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ اس کو کوئی صفائی دے ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے لفظوں نے ساڑھے آٹھ سال بعد پہلی بار اسے صبح معنوں میں حقیقت کے پتے ہوئے صحرا میں پھینک دیا تھا۔ وہ معاشرے کے لئے ایک outcast بن چکی تھی۔

”تو امامہ ہاشم یہ ہے تمہاری اوقات، ایک سکیٹل لائز اور stigmatized (داغ دار) لڑکی اور تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی تھیں۔“

وہ فٹ پاٹھ پر چلنے لگی۔ ہر بورڈ، ہر نیون سائن کو پڑھتے ہوئے..... وہاں لگے ہوئے بہت سے ڈاکٹروں کے ناموں سے وہ واقف تھی۔ ان میں سے کچھ اس کے کلاس فیلوز تھے۔ کچھ اس سے جو نینر، کچھ اس سے سینئر اور وہ خود کہاں کھڑی تھی کہیں بھی نہیں۔

”تم دیکھنا امامہ! تم کس طرح ذلیل و خوار ہو گی۔ تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا، کچھ بھی نہیں۔“

اس کے کانوں میں ہاشم بینین کی آواز گونجنے لگی تھی۔ اس نے اپنے گالوں پر سیال بارے کو پتے

محسوس کیا۔ آس پاس موجود روشنیاں اب اس کی آنکھوں کو اور چند حیا نے لگی تھیں۔ جلال النور برا آدمی نہیں تھا۔ بس وہ، وہ نہیں تھا جو سمجھ کر وہ اس کی طرف لگی تھی۔ کیسا دھوکا تھا جو اس نے دکھایا تھا۔ جان بوجھ کر کھلی آنکھوں کے ساتھ، وہ بھی ایک مادہ پرست تھا مکمل مادہ پرست۔ صرف اس کا یہ روپ اس نے پہلی بار دیکھا تھا اور اس کے لئے یہ سب ناقابل یقین تھا۔ وہ برا آدمی نہیں تھا، اس کی اپنی اخلاقیات تھیں اور وہ ان کے ساتھ جی رہا تھا۔ امام ہاشم کو آج اس نے وہ اخلاقیات بتادی تھیں۔ اس نے ایسی تعظیم اور تحقیر آٹھ سالوں میں پہلی بار دیکھی تھی اور وہ بھی اس شخص کے ہاتھوں تھے وہ خوبیوں کا مجموعہ سمجھتی رہی تھی اور خوبیوں کے اس مجموعے کی نظروں میں وہ کیا تھی؟ گھر سے بھاگی ہوئی ایک اسکینڈل لڑائی لڑی۔ آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا جو اس کی آنکھوں سے اُمڑ رہا تھا اور اس میں سب کچھ بہ رہا تھا، سب کچھ اس نے بے رحمی کے ساتھ آنکھوں کو رگڑا۔ اپنی چادر کے ساتھ گیلے چہرے کو خشک کرتے ہوئے ایک رکشے کو روک کر وہ اس میں بیٹھ گئی۔

دروازہ سعیدہ اماں نے کھولا تھا۔ وہ سر جھکائے اس طرح اندر داخل ہوئی کہ اس کے چہرے پر ان کی نظر نہ پڑی۔

”کہاں تھیں تم امامہ۔۔۔ ارات ہو گئی۔ میرا تو دل گھبرا رہا تھا۔ ساتھ والوں کے گھر جانے ہی والی تھی میں کہ کوئی تمہارے آفس جاکر تمہارا پتا کرے۔“

سعیدہ اماں دروازہ بند کر کے تشویش کے عالم میں اس کے پیچھے آئی تھیں۔

”کہیں نہیں اماں۔۔۔ اب اس میں کچھ کام تھا اس لئے دیر ہو گئی۔“

اس نے ان سے چند قدم آگے چلتے ہوئے پیچھے مڑے بغیر ان سے کہا۔

”پہلے تو کبھی تمہیں آفس میں دیر نہیں ہوئی۔ پھر آج کیا ہو گا کہ رات ہو گئی۔ آخر آج کیوں اتنی دیر روکا انہوں نے تمہیں؟“ سعیدہ اماں کو اب بھی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

”اس کے بارے میں، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ آئندہ دیر نہیں ہوگی۔“ وہ اسی طرح اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ہوئی۔

”کھانا گرم کر دوں یا تھوڑی دیر بعد کھاؤ گی؟“ انہوں نے اس کے پیچھے آتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں کچھ دیر کے لئے سونا چاہتی ہوں۔“

اس نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”درد کیوں ہو رہا ہے؟ کوئی دوائی دے دوں یا چائے بنا دوں؟“ سعیدہ اماں کو اور تشویش لاحق ہوئی۔

”اماں اپلیز مجھے سونے دیں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہوئی تو میں آپ سے کہہ دوں گی۔“

اس کے سر میں واقعی درد ہو رہا تھا۔ سعیدہ اماں کو شاید اندازہ ہو گیا کہ ان کی تشویش اس وقت اسے بے آرام کر رہی ہے۔

”ٹھیک ہے تم سو جاؤ۔“ وہ جانے کے لئے چلیں۔

امامہ نے اپنے کمرے کی لائٹ آن نہیں کی، اس نے اسی طرح اندھیرے میں دروازے کو بند کیا اور اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی۔ اپنا کپڑا کھینچ کر اس نے سیدھا لیٹنے ہوئے اپنی آنکھوں پر ہاندو رکھ لیا۔ وہ اس وقت صرف سوچا جاتی تھی۔ وہ کچھ بھی یاد نہیں کرنا چاہتی تھی نہ جلال النور سے ہونے والی کچھ دیر پہلے کی گفتگو نہ ہی کچھ اور۔۔۔ وہ رونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اسے خند کیسے آگئی یہ وہ نہیں جانتی تھی مگر وہ بہت گہری خند سوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ اس سے تین قدم آگے کھڑا تھا۔ اتنا قریب کہ وہ ہاتھ بڑھاتی تو اس کا کندھا چھو لیتی۔ وہاں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اس کے کندھے سے اوپر خانہ کعبہ کے کھلتے ہوئے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ نور کے اس سیلاب کو دیکھ رہی تھی جس نے وہاں موجود ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ خانہ کعبہ کے خلاف ہر تحریر آیات کو باسانی دیکھ سکتی تھی۔ وہ آسمان پر موجود ستاروں کی روشنی کو ایک دم بڑھتے محسوس کر سکتی تھی۔

ان میں سے آگے کھڑا شخص تلبیہ پڑھ رہا تھا۔ وہاں گونجنے والی واحد آواز ہی کی آواز تھی۔ خوش الحان آواز..... اس نے بے اختیار اپنے آپ کو اس کے پیچھے وہی کلمات ڈہراتے پایا۔ اسی طرح جس طرح وہ پڑھ رہا تھا، مگر زیر لب پھر وہ اپنی آواز اس کی آواز میں ملانے لگی۔ اسی کی طرح مگر زیر لب..... پھر اس کی آواز بلند ہونے لگی پھر اس کو احساس ہوا۔۔۔ وہ اپنی آواز اس کی آواز سے بلند نہیں کر پاری تھی۔ اس نے کوشش ترک کر دی۔ وہ اس کی آواز میں آواز ملائی رہی۔

خانہ کعبہ کا دروازہ کھل چکا تھا۔ اس نے اس شخص کو آگے بڑھ کر دروازے کے پاس جا کر کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس نے اسے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتے دیکھا۔ وہ دعا کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی پھر اس نے ہاتھ نیچے کر لئے۔ اب وہ نیچے بیٹھ کر زمین پر سجدہ کر رہا تھا، کعبہ کے دروازے کے سامنے۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ اب وہ کھڑا ہو رہا تھا۔ وہ پلٹنے والا تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی آواز شناسا تھی مگر چہرہ، چہرہ دیکھے بغیر۔۔۔ وہ اب مڑ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ چند لمحوں کے لئے اسے لگا وہ وہیں ہو، خان کعبہ میں، پھر جیسے وہ حقیقت میں واپس آگئی۔ اس نے اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلا دی اور پھر بیڈ پر آکر دو پارہ بیٹھ گئی۔ اسے خواب اپنی پوری جزئیات سمیت یاد تھا، یوں جیسے اس نے کوئی فلم دیکھی ہو۔ مگر اس آدمی کا چہرہ وہ اتنے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کے مڑنے سے پہلے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

”خوش الحان آواز، جلال انصر کے سوا کس کی ہو سکتی ہے۔“ اس نے سوچا۔

مگر وہ شخص دراز قد تھا۔ جلال انصر سا نوا تھا، اس شخص کے احرام میں سے نکلے ہوئے کندھے اور بازوؤں کی رنگت صاف تھی اور اس کی آواز وہ شناسا تھی۔ وہ یہ پہچان نہیں پاری تھی کہ وہ آواز جلال کی تھی یا کسی اور کی۔

خواب بہت عجیب تھا مگر اس کے سر کا رد و عتاب ہو چکا تھا اور وہ حیران کن طور پر پرسکون تھی۔ اس نے اٹھ کر کمرے کی لائٹ آن کی۔ وال کلاک ایک بج رہا تھا۔ امام کو یاد آیا وہ رات کو عشاء کی نماز پڑھے بغیر ہی سو گئی تھی۔ اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کئے تھے نہ ہی سونے سے پہلے وضو کیا تھا۔ اس نے کپڑے تبدیل کئے اور اپنے کمرے سے باہر آگئی۔ سعیدہ اماں کے کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ وہ سو رہی تھیں۔ پورے گھر میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صحن میں بلب جل رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دھند کی موجودگی بھی بلب کی روشنی میں محسوس کی جاسکتی تھی۔ صحن کی دیواروں کے ساتھ چڑھی سبز پتیلیں، سرخ اینٹوں کی دیواروں کے ساتھ بالکل ساکت تھیں۔ وہ وضو کرنے کے لئے صحن کے دوسری طرف موجود ہاتھ روم میں جانا چاہتی تھی مگر صحن میں جانے کے بجائے وہ برآمدے کے ستون کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اپنے سویٹر کی آستینوں کو اوپر کرتے ہوئے اس نے اپنی شرٹ کی آستینوں کے منہ کھولنے سے متنبہ نہیں ہوئے۔ فونڈ کر دیا۔ چند لمحوں کے لئے اسے گھبر جھری آئی۔ ننگی بہت زیادہ تھی پھر وہ ان بیٹوں کو دیکھنے لگی۔ ایک بار پھر جلال انصر کے ساتھ شام کو ہونے والی ملاقات اسے یاد آ رہی تھی مگر اس بار اس کی باتوں کی گونج اسے اشک پار نہیں کر رہی تھی۔

دیکھو میری جہانی کی تو نے ہی تو کی
میں تو مر جاتا اگر ساتھ نہ ہوتا میرا
= یہ تہ حیرتوں ذہن پر جب نوتی ہیں
نور ہو جاتا ہے کچھ اور ہویدا میرا
کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا میرا
اس کی دولت ہے فقط نقش کعبہ پاتیرا

ایک افسردہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ گزرے ہوئے پچھلے ساڑھے آٹھ

سالوں میں یہ آواز۔۔۔ اور یہ الفاظ اس کے ذہن سے کبھی معدوم نہیں ہوئے تھے اور پھر اسے کچھ دیر پہلے کے خواب میں سنائی دینے والی وہ دوسری آواز یاد آئی۔

”لیک اللهم لیک، لیک لا شریک لک لیک، ان الحمد والنعمه لک والملك لا شریک لک۔“

وہ آواز مانوس اور شناسا تھی مگر جلال انصر کی آواز کے علاوہ وہ اور کسی آواز سے واقف نہیں تھی۔ آنکھیں بند کر کے اس نے خواب میں دیکھے ہوئے اس منظر کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ مقام حترم، خانہ کعبہ کا کھلا دروازہ، خلاف کعبہ کی دور روشن آیات۔۔۔ وہ پرسکون دھندلی معطر رات۔۔۔ خانہ کعبہ کے دروازے سے پھوٹی وہ دو دھیار روشنی اور سجدہ کرنا تکبیر پڑھتا وہ مرد۔۔۔ امام نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر تک وہ صحن میں اتاری دھند میں نظریں جمائے اس آدمی کے بارے میں سوچتی رہی۔

اس آدمی کے برہنہ کندھے کی پشت پر پلکے پلکے بالوں میں زخم کا ایک مندر شدہ نشان تھا۔ امام کو حیرت ہو رہی تھی۔ خواب کی اس طرح کی جزئیات اسے پہلے کبھی یاد نہیں رہی تھیں۔ اس نے زندگی میں پہلی بار خانہ کعبہ کو خواب میں دیکھا تھا اور وہاں بیٹھے اسے خواہش ہوئی تھی کہ کاش وہ کبھی اسی طرح مسجد نبوی ﷺ میں روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑی ہو۔ اسی طرح مسجد نبوی ﷺ لوگوں سے خالی ہو، وہاں صرف وہ ہو، وہ اندازہ نہیں لگا سکتی وہ کتنی دیر وہاں اسی طرح بیٹھی رہی۔ وہ اپنے گرد و پیش میں تب لوٹی تھی جب سعیدہ اماں تہجد پڑھنے کے لئے وضو کرنے کی خاطر باہر صحن میں نکلی تھیں۔ امام کو وہاں اس وقت کچھ کر وہ حیران ہوئی تھیں۔

”تمہارے سر کا رد و عتاب ہے؟“ اس کے پاس کھڑے ہو کر انہوں نے پوچھا۔

”اب تو رد نہیں ہے۔“ امام نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”رات کو کھانا کھائے بغیر ہی سو گئی تھیں؟“ وہ اس کے پاس برآمدے کے حلقے فرش پر بیٹھنے ہوئے یوٹیس۔

وہ خاموش رہی۔ سعیدہ اماں ایک گرم اونٹنی شمال اوڑھے ہوئے تھیں۔ امام نے ان کے کندھے پر اپنا چہرہ لگا دیا۔ اس کے سن پھرے کو گرم شمال سے ایک عجیب سی آسودگی کا احساس ہو۔

”اب تم شادی کر لو آمت!“ سعیدہ اماں نے اس سے کہا۔ وہ اسی طرح گرم شمال میں اپنا چہرے پھپھائے رہی۔ سعیدہ اماں پہلی بار یہ بات نہیں کہہ رہی تھیں۔

”آپ کر دیں۔“ وہ ہمیشہ ان کی اس بات پر خاموشی اختیار کر لیتی تھی۔ کیوں؟ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی لیکن آج پہلی بار وہ خاموش نہیں رہی تھی۔

”تم سچ کہہ رہی ہو؟“ سعیدہ اماں اس کی بات پر حیران ہوئی تھیں۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ اما نے سران کے کندھے سے اٹھالیا۔

”تمہیں کوئی پسند ہے؟“ سعیدہ اماں نے اس سے پوچھا۔ وہ سر جھکائے صحن کے فرش کو دیکھ رہی تھی۔

”کوئی مجھے پسند ہے؟ نہیں مجھے کوئی بھی پسند نہیں ہے۔“ سعیدہ اماں کو اس کی آواز بھڑائی ہوئی لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہتیں اس نے ایک بار پھر ان کی شمال میں اپنا چہرہ چھپالیا۔

”تمہاری شادی ہو جائے تو میں بھی انگلینڈ چلی جاؤں گی۔“

انہوں نے اس کے سر کو چھتپتاتے ہوئے کہا اور اس کے سر کو چھتپتاتے ہوئے ہی انہیں احساس ہوا کہ وہ ان کی شمال میں منہ چھپائے لگیوں سے رو رہی تھی۔

”آمت آمت۔ پتا کیا ہوا؟“ انہوں نے پریشان ہو کر اس کا چہرے اٹھانے کی کوشش کی۔

وہ کامیاب نہیں ہوئیں۔ وہ اسی طرح ان کے ساتھ لگ کر رو رہی۔

”اللہ کے لئے..... کچھ تو بتاؤ، کیوں رو رہی ہو؟“ وول گرفت ہو گئیں۔

”کچھ نہیں..... بس ایسے ہی..... سر میں درد ہو رہا ہے۔“ انہوں نے زبردستی اس کا گیلیا چہرہ اوپر کیا تھا۔ وہ اب اپنی آستینوں سے چہرہ پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے سعیدہ اماں سے آنکھیں نہیں ملائی تھیں۔ سعیدہ اماں ہکا بکا اسے ہاتھ روم کی طرف جاتے دیکھتی رہیں۔

سعیدہ اماں اس کی شادی کی بات کرنے والی اکیلی نہیں تھیں۔ اس کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ڈاکٹر سہیل علی نے ایک بار پھر اس سے شادی کا ذکر کیا تھا۔ وہ نہیں جانتی جب اس نے کیوں انکار کر دیا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اب آزاد تھی۔

”مجھے کچھ عرصہ چاب کر لینے دیں اس کے بعد میں شادی کروں گی۔“ اس نے ڈاکٹر سہیل علی سے کہا تھا۔ شاید یہ پچھلے کئی سالوں سے ڈاکٹر سہیل علی پر مائل طور پر ایک بوجھ بننے کا احساس تھا، جس سے وہ نجات حاصل کرنا چاہتی تھی یا پھر کہیں اس کے لاشعور میں یہ چیز تھی کہ ڈاکٹر سہیل علی کو اس کی شادی پر ایک بار پھر اجازت کرنے پر اس کے اور وہ یہ چاہتی تھی کہ وہ ان اجازت کے لئے خود کچھ جمع کرنے کی کوشش کر لے۔ اس نے یہ بات ڈاکٹر سہیل علی کو نہیں بتائی تھی مگر اس نے ان سے چاب کی اجازت لے لی تھی۔

شاید وہ ابھی کچھ عرصہ مزید چاب کرتی رہتی، مگر جلال انصر سے اس ملاقات کے بعد وہ ایک تکلیف دہ ذہنی دھچکے سے دو چار ہوئی تھی اور اس نے یک دم سعیدہ اماں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ وہ نہیں جانتی۔ سعیدہ اماں نے ڈاکٹر سہیل علی سے اس بات کا ذکر کیا یا نہیں مگر وہ خود ان دنوں مکمل طور پر اس کے لئے رشتے کی تلاش میں سرگرداں تھیں اور اس کوشش کا نتیجہ فہد کی صورت میں نکلا تھا۔

فہد ایک کنبھی میں اچھے عہد سے پر کام کر رہا تھا اور اس کی شہرت بھی بہت اچھی تھی۔ فہد کے گھر والے اسے جیکلی بار دیکھ کر ہی پسند کر گئے تھے اور اس کے بعد سعیدہ اماں نے ڈاکٹر سہیل علی سے اس رشتے کی بات کی۔

ڈاکٹر سہیل علی کو کچھ تامل ہوا..... شاید وہ اس کی شادی اب بھی اپنے جاننے والوں میں کرنا چاہتے تھے، مگر سعیدہ اماں کی فہد اور اس کے گھر والوں کی بے پناہ تعریفوں کے بعد اور فہد اور اس کے گھر والوں سے خود ملنے کے بعد انہوں نے سعیدہ اماں کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا، البتہ انہوں نے فہد کے بارے میں بہت چھان بین کروائی تھی اور پھر وہ بھی مطمئن ہو گئے تھے۔

فہد کے گھر والے ایک سال کے اندر شادی کرنا چاہتے تھے لیکن پھر اچانک انہوں نے چند ماہ کے اندر شادی پر اصرار کرنا شروع کر دیا۔ یہ صرف ایک اتفاق ہی تھا کہ ڈاکٹر سہیل علی اسی دوران اپنی کچھ مصروفیات کی وجہ سے انگلینڈ میں تھے جب فہد کے گھر والوں کے اصرار پر تاریخ طے کر دی گئی تھی۔ سعیدہ اماں فون پر ان سے مشورہ کرتی رہی تھیں اور ڈاکٹر سہیل علی نے انہیں اپنا اکتاف کرنے کے لئے کہا تھا۔ وہ فوری طور پر وہاں سے نہیں آ سکتے تھے، البتہ انہوں نے کلثوم آجی کو واپس پاکستان بھیجا دیا تھا۔

اس کی شادی کی تیاری کلثوم آجی اور مریم نے ہی کی تھی جو راولپنڈی سے کچھ ہفتوں کے لئے اپنی سرسرا لایا ہو آگئی تھی۔ ڈاکٹر سہیل علی نے اس کی شادی کی تاریخ طے ہو جانے کے بعد فون پر اس سے طویل گفتگو کی تھی۔ ان کی تینوں بیٹیوں کی شادی ان کے اپنے خاندان میں ہی ہوئی تھی اور ان کے سرسرا ل میں سے کسی نے بھی جہیز نہیں لیا تھا، مگر ڈاکٹر سہیل علی نے تینوں بیٹیوں کے جہیز کے لئے مخصوص کی جانے والی رقم انہیں تحفتاً دے دی تھی۔

”ساز سے آٹھ سال پہلے جب آپ میرے گھر آئیں تھیں اور میں نے آپ کو اپنی بیٹی کہا تھا تو میں نے آپ کے لئے بھی کچھ رقم رکھ دی تھی۔ وہ رقم آپ کی لمانت ہے۔ آپ اسے ویسے لے لیں یا پھر میں مریم اور کلثوم سے کہہ دوں گا کہ وہ آپ کے جہیز کی تیاری پر اسے خرچ کریں۔ سعیدہ آپا کی خواہش تھی کہ شادی ان کے گھر پر ہو ورنہ میں چاہتا تھا کہ یہ شادی میرے گھر پر ہو۔ آپ کے گھر پر.....“ انہوں نے اس سے کہا تھا۔

”مجھے اس بات پر بہت رنج ہے کہ میں اپنی چوتھی بیٹی کی شادی میں شرکت نہیں کر سوں گا مگر شاید اس میں ہی کوئی بہتری ہے۔ میں پھر بھی آخری وقت تک کوشش کروں گا کہ کسی طرح شادی پر آ جاؤں۔“ وہ ان کی باتوں کے جواب میں بالکل خاموش رہی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ یہ ہی اصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی شادی پر اپنا رقم خرچ کرے گی اور نہ ہی یہ کہ وہ شادی ان کی رقم سے نہیں کرنا چاہتی۔ اس دن اس کا دل چاہا تھا ان کا ایک اور احسان لینے کو۔ وہ اس پر اسے احسان کر چکے تھے کہ اب اسے ان احسانوں کی عادت ہونے لگی تھی۔ اسے صرف ان سے ایک گلہ تھا وہ آخر اس کی شادی میں شرکت کیوں

نہیں کر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

فہد کے گھر والوں کا اصرار تھا کہ شادی سادگی سے ہو اور اس پر کسی کو بھی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ اماں خود بھی شادی سادگی سے کرنا چاہتی تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ فہد کے گھر والوں کا سادگی پر اصرار دراصل کچھ اور وجوہات کی بناء پر تھا۔

اس کا نکاح مہندی والی شام کو ہونا تھا، مگر اس شام کو سہ پہر کے قریب فہد کے گھر والوں کی طرف سے یہ اطلاع دی گئی کہ نکاح اگلے دن یعنی شادی والے دن ہی ہو گا۔ جب تک اسے پاسبیدہ اماں کو کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ فہد کے گھر میں کوئی مسئلہ تھا۔ مہندی کی ویسے بھی کوئی لمبی پوڑی قریب نہیں تھی۔ صرف سعیدہ اماں کے بہت قریبی لوگ تھے یا پھر نزدیکی ہمسائے۔ نکاح کی تقریب کے لئے جس کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا وہ ان لوگوں کو سرو کر دیا گیا۔

شادی کی تقریب بھی سادگی سے گھر ہی ہوئی تھی۔ چار بیجے بارات کو آجانا تھا اور چھ بیجے کے قریب رخصتی تھی لیکن بارات آنے سے ایک گھنٹہ پہلے فہد کے گھر والوں نے سعیدہ اماں کو فہد کی روپوشی کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے اس رشتے سے معذرت کر لی۔

اماں کو چار بیجے تک اس سارے معاملے کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ فہد کے گھر سے عروسی لباس پہلے بھجوا دیا گیا تھا اور وہ اس وقت وہ لباس پہنے تقریباً تیار تھی جب مریم اس کے کمرے میں چلی آئی، اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس نے اماں کو کپڑے تبدیل کرنے کے لئے کہا، اس نے اماں کو فوری طور پر یہ نہیں بتایا تھا کہ فہد کے گھر والے انکار کر کے چاہتے تھے۔ اس نے اماں سے صرف یہی کہا کہ فہد کے گھر والوں نے شادی کینسل کر دی ہے اس کے گھر میں کسی قریبی عزیز کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ یہ بتا کر بہت افراتفری میں کمرے سے نکل گئی۔ اماں نے کپڑے تبدیل کر لئے لیکن اس وقت اس کی چھٹی حس نے اسے اس پریشانی سے آگاہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے مریم کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئی اور باہر موجود لوگوں کے تاثرات نے اس کے تمام شبہات کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ سعیدہ اماں کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ کچھوم آئی، میون، نور العین آیا۔ ہمسائے میں رہنے والی چند عورتیں، مریم اور سعیدہ اماں۔ مریم سعیدہ اماں کو پائی پاری تھی۔ وہ بہت ملاحظہ حال نظر آ رہی تھیں۔ ایک لمبے کے لئے اس کے دل کی وحزن لڑکی۔ انہیں کیا ہوا تھا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی سب کی نظریں اس پر پڑیں۔ میون آپا اس کی طرف تیزی سے بڑھیں۔

”آمت! تم باہر آ جاؤ۔“ انہوں نے اسے ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔

”اماں کو کیا ہوا ہے؟“ وہ ان کی طرف بڑھ گئی۔ کچھوم آئی نے کمرے میں موجود لوگوں کو باہر نکالنا شروع کر دیا۔ وہ سعیدہ اماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”انہیں کیا ہوا ہے؟“ اس نے بے تابی سے مریم سے پوچھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ سعیدہ اماں کا چہرہ آنسوؤں سے ہیچا ہوا تھا۔ وہ اماں کو دیکھ رہی تھیں مگر اسے یوں لگا جیسے وہ اس وقت اسے دیکھ نہیں پا رہی تھیں۔ گلاس ہاتھ سے بنا تے ہوئے انہوں نے اسے ساتھ لگا کر وہاں شروع کر دیا۔

گھر خالی ہو چکا تھا۔ صرف ڈاکٹر سید علی کی قلمی وہاں پر تھی۔

”کیا ہوا ہے اماں؟ مجھے بتائیں۔“ اماں نے انہیں نرمی سے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”فہد نے اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر گھر سے جا کر کسی اور کے ساتھ شادی کر لی ہے۔“ مریم نے مدہم آواز میں کہا۔ ”وہ لوگ کچھ دیر پہلے معذرت کرنے آئے تھے۔ وہ لوگ یہ رشتہ ختم کر گئے ہیں۔“ چند منٹ تک وہ بالکل ساکت رہی تھی۔ خون کی گردش، دل کی وحزن، چلتی ہوئی سانس۔ چند سیکنڈ سب کچھ جیسے ڈک گیا تھا۔“

”کیا میرے ساتھ یہ بھی ہونا تھا؟“ اس نے بے اختیار سوچا۔

”کوئی بات نہیں اماں! آپ کیوں رو رہی ہیں؟“ اس نے بڑی سہولت سے سعیدہ اماں کے آنسو صاف کئے۔ سب کچھ ایک بار پھر بحال ہو گیا تھا سوائے اس کی رنگت کے وہ فق تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔“ سعیدہ اماں کو اس کی باتوں پر اور روٹا آیا۔

”یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں.....“ اماں نے انہیں بات مکمل کرنے نہیں دی۔

”اماں! چھوڑیں ناں۔ کوئی بات نہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ لیٹ جائیں۔ کچھ دیر آرام کر لیں۔“ وہ انہیں پرسکون کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”میں تمہارے دل کی حالت کو سمجھ سکتی ہوں۔ میں تمہارے غم کو چاہتی ہوں۔ آمت! میری بیٹی مجھے معاف کر دو۔ یہ سب میری وجہ سے ہی ہوا ہے؟“ انہیں تسلی نہیں ہو پاری تھی۔

”مجھے کوئی غم نہیں ہے اماں! کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے سعیدہ اماں سے کہا۔

سعیدہ اماں یک دم روتے ہوئے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

اماں کسی سے کوئی بات کہے بغیر ایک بار پھر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس کے بیڈ پر تمام چیزیں اسی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے انہیں سینٹا شروع کر دیا۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس وقت وہاں پیشی رو رہی ہوتی مگر وہ غیر معمولی طور پر پرسکون تھی۔

”اگر میں جلال کے نہ ملنے پر صبر کر سکتی ہوں تو یہ تو پھر ایک ایسا شخص تھا جس کے ساتھ میری کوئی جہد باقی وابستگی نہیں تھی۔“ اس نے اپنے عروسی لباس کو نہ کرتے ہوئے سوچا۔

”زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا، یہاں بھی لوگوں کے سامنے نظریں چرا کر اور سر جھکا کر چلنا پڑے گا۔ کچھ باتیں اور بے عزتی برداشت کرنی پڑے گی تو پھر کیا ہو۔ اس میں میرے لئے نیا کیا ہے۔“

مریم کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے ساتھ چیزیں سمیٹنے لگی۔

”ابو کو فون کر دیا ہے۔“ اس نے امامہ کو بتایا۔

وہ جلیلی پارکچہ جھملائی۔

”کیوں خواہتا ہوں تم لوگ انہیں ٹھک کر رہے ہو۔ انہیں وہاں سکون سے رہنے دو۔“

”اتنا بڑا حادثہ ہو گیا ہے اور تم۔“

اس نے مریم کی بات کاٹ دی۔

”مریم میری زندگی میں اس سے بڑے حادثے ہو چکے ہیں۔ یہ کیا معنی رکھتا ہے۔ مجھے تکلیف پہنچنے کی عادت ہو چکی ہے۔ تم سعیدہ ماں کو تلی دو۔ مجھے کچھ نہیں ہوا میں بالکل ٹھیک ہوں اور ابو کو بھی خواہ مخواہ ٹھک نہ کرو۔ وہ وہاں پریشان ہوں گے۔“

مریم کو چیزیں سمیٹتے ہوئے وہاں داخل ہوئی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی۔ کلثوم آئی، سعیدہ ماں کے ساتھ یک دم اندر آگئیں۔ امامہ کو ان دونوں کے چہرے بہت عجیب لگے۔ کچھ دیر پہلے کے برعکس وہ دونوں بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔ اس کے کسی سوال سے پہلے کلثوم آئی نے اسے سالار کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ وہ دم بخود ان کی باتیں سن رہی تھی۔

”اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو تمہارا نکاح اس سے کر دیا جائے؟“ آئی نے اس سے پوچھا۔

”سہیل علی اسے بہت اچھی طرح جانتے تھے، وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔“ وہ اسے تلی دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”اگر ابو اسے جانتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جیسا بہتر سمجھیں کریں۔“

”اس کا ایک دوست تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔“ وہ اس مطالبے پر کچھ حیران ہوئی تھی مگر اس نے فرقان سے ملنے سے انکار نہیں کیا۔

”میرے دوست نے آٹھ نو سال پہلے ایک لڑکی سے نکاح کیا تھا۔ اپنی پسند سے۔“

وہ چپ چاپ فرقان کو دیکھتی رہی۔

”وہ آپ سے شادی پر تیار ہے، مگر وہ اس لڑکی کو حلاق دینا نہیں چاہتا۔ کچھ وجوہات کی بنا پر وہ

لڑکی اس کے ساتھ نہیں رہی لیکن وہ اب بھی اسے اپنے گھر میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کو یہ سب بتا دوں تاکہ اگر آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہو تو اس بات کو یقیناً ختم کر دیں گے لیکن میں آپ سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ شاید وہ لڑکی اسے کبھی بھی نہ ملے، آٹھ نو سال سے اس کا میرے دوست کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے۔ یہ ایک موبہوم سی امید ہے، جس پر وہ اس کا انتظار کر رہا ہے۔ ڈاکٹر سہیل علی صاحب آپ کو اپنی بیٹی سمجھتے ہیں اور اس حوالے سے آپ میری بہن کی طرح ہیں۔ اس وقت اس صورت حال سے نکلنے کے لئے یہی بہتر ہے کہ آپ اس سے شادی کر لیں۔ وہ لڑکی اسے کبھی بھی نہیں ملے گی کیونکہ نہ تو وہ اسے پسند کرتی تھی نہ ہی آج تک اس نے اس سے کوئی رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے اور پھر اتنا لمبا عرصہ گزر چکا ہے۔“

وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”دوسری بیوی..... تو امامہ ہاشم یہ ہے تمہاری وہ عقد پر جو اب تک تم سے پوشیدہ تھی۔“ اس نے سوچا۔

”اگر ڈاکٹر سہیل علی اس شخص کے بارے میں یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کو میرے لئے منتخب کر رہے ہیں تو ہو سکتا ہے میرے لئے یہی بہتر ہو۔ میں جلال کی بھی تو دوسری بیوی بننے کے لئے تیار تھی، اس سے محبت کرنے کے باوجود..... اور اس شخص کی بیوی بننے پر مجھے کیا اعتراض ہو گا جس سے مجھے محبت بھی نہیں ہے۔“

اسے ایک بار پھر جلال یاد آیا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ان کی بیوی جب بھی آئے وہ اسے رکھ سکتے ہیں۔ میں بڑی خوشی سے ان کو یہ اجازت دیتی ہوں۔“ مدہم آہ آہ میں کسی مال کے بغیر اس نے فرقان سے کہا۔

پندرہ منٹ بعد اسے پہلا شاک اس وقت لگا تھا جب نکاح خواہ نے اس کے سامنے سالار سکندر کا نام لیا تھا۔

”سالار سکندر..... ولد سکندر عثمان۔“ اسے نکاح خواہ کے منہ سے نکلنے والے لفظوں سے پیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ نام ایسے نہیں تھے جو ہر شخص کے ہوتے۔

”سالار سکندر..... سکندر عثمان؟ اور پھر اس ترتیب میں..... کیا..... یہ..... شخص زندہ..... ہے.....؟“

اس کے سر پر جیسے آسمان آگرا تھا۔ اس کے چہرے پر چادر کا گھوٹ گھٹ نہ ہوتا تو اس وقت اس کے چہرے کے تاثرات نے سب کو پریشان کر دیا ہوتا۔ نکاح خواہ اپنے کلمات دو بار دہرا رہا تھا۔

امامہ کا ذہن ماؤف اور دل ڈوب رہا تھا اگر یہ شخص زندہ تھا تو..... میں تو اب تک اس کے نکاح میں

باراس نے بڑے شوق سے اپنے ہاتھوں پر نقش و نگار بنوائے تھے منہ صرف ہاتھوں پر بلکہ بیروں پر بھی۔
وہ اپنے بیروں کو دیکھنے لگی۔ مثال کو اپنے گرد پھینٹتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کو اس کے نیچے چھپالیا۔

”اسجد سے جلال۔ جلال سے فہد۔ اور فہد سے سالار۔۔۔۔۔ ایک شخص کو میں نے رد کیا، دو نے مجھے رد کر دیا اور چوتھا شخص جو میری زندگی میں شامل ہوا وہ سب سے بدترین ہے۔۔۔۔۔ سالار سکندر۔“

اس کے اندر دھواں سا بھر گیا۔ وہ اپنے اسی علیے کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔ کھاکر بیان، گلے میں لٹکتی زنجیر، ربر بینڈ میں بندھے ہال، چھتی ہوئی تھنیک آمیز نظریں، دائیں گال پر مذاق آڑائی مسکراہٹ کے ساتھ پڑنے والا ڈاہیل، کھاتیوں میں لٹکتے بینڈ زاور برسلیٹ، عورتوں کی تصویروں والی نلگ جنز۔

وہ جیسے اس کے زندگی کے سب سے خوب صورت خواب کی سب سے بھیاںک تعبیر بن کر سامنے آیا تھا۔ اس کے دل میں سالار سکندر کے لئے ڈوہرا بر عزت نہ تھی۔

”میں نے زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہیں مگر میں اتنی بری نہیں ہوں کہ تمہارے جیسا بر امرد میری زندگی میں آئے۔“ اس نے کئی سال پہلے فون پر اس سے کہا تھا۔

”شاید اسی لئے جلال نے بھی تم سے شادی نہیں کی کیونکہ نیک مردوں کے لئے نیک عورتیں ہوتی ہیں، تمہارے جیسی نہیں۔“

سالار نے جواباً کہا تھا۔ امام نے اپنے ہونٹ ہچکچائے۔

”چاہے کچھ ہو جائے سالار! میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی۔ تم واقعی مر جاتے تو زیادہ اچھا تھا۔“ وہ بڑبڑاتی تھی۔

اس وقت ایک لمحے کے لئے بھی اسے خیال نہیں آیا تھا کہ سالار سکندر نے کبھی اس پر کوئی احسان کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر سید علی، جس رات پاکستان واپس آئے تھے اس رات امام ان کے گھر پر ہی تھی مگر رات کو اس نے ان سے سالار کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ مریم ابھی لاہور میں ہی تھی اس لئے وہ سب آپس میں خوش گپوں میں مصروف رہے۔

اگلے دن صبح بھی وہ سب اسی طرح اکٹھے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وہ امام کو ان تھانک کے بارے میں بتاتے رہے جو وہ انگلینڈ سے امام اور سالار کے لئے لے کر آئے تھے۔ امام خاموشی سے سنتی رہی۔

”سالار بھائی کو تو آج اظہاری پر بلائیں۔“ یہ مریم کی تجویز تھی۔

ڈاکٹر سید علی نے مریم کے کہنے پر سالار کو فون کیا۔ امام تب بھی خاموش رہی۔

وہ دوپہر کو نماز پڑھنے کے لئے باہر جانے لگی تو امام ان کے ساتھ باہر پورے تک آگئی۔

”ابو! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”ابھی؟“ ڈاکٹر سید علی قدرے حیرانی سے بولے۔

”نہیں، آپ نماز پڑھ آئیں پھر واپسی پر۔“

وہ کچھ دیر تشویش سے اسے دیکھتے رہے اور پھر کچھ کہے بغیر باہر چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

”میں سالار سے طلاق لینا چاہتی ہوں۔“ وہ مسجد سے واپسی پر اسے لے کر اپنی اسٹڈی میں آگئے تھے اور امام نے بلا کسی تمہید یا توقف کے اپنا مطالبہ پیش کر دیا۔

”آمنہ! وہ دم بخور ہو گئے۔“

”میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“ وہ مسلسل فریض پر غور رہی تھی۔

”آمنہ! آپ کے ساتھ اس کی دوسری شادی ضرور ہے لیکن اس کی پہلی بیوی کا کوئی پتا نہیں ہے۔ فرقان بتا رہا تھا کہ تقریباً نو سال سے ان دونوں میں کوئی رابطہ نہیں ہے اور شادی بھی نہیں، صرف نکاح ہوا تھا۔“

ڈاکٹر سید علی، اس کے انکار کو پہلی شادی کے ساتھ جوڑ رہے تھے۔

”کون جانتا ہے وہ کہاں ہے، کہاں نہیں۔ نو سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔“

”میں اس کی پہلی بیوی کو جانتی ہوں۔“ اس نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا۔

”آپ؟“ ڈاکٹر سید علی کو یقین نہیں آیا۔

”وہ میں ہوں۔“ اس نے پہلی بار سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

وہ بولنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

”آپ کو یاد ہے نو سال پہلے میں ایک لڑکے کے ساتھ اسلام آباد سے لاہور آئی تھی جس کے بارے میں آپ نے مجھے بعد میں بتایا تھا کہ میری پہلی نے اس کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی ہے۔“

”سالار سکندر۔۔۔۔۔“ ڈاکٹر سید علی نے بے اختیار اس کی بات کاٹی۔

”یہ وہی سالار سکندر ہے؟“ امام نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ جیسے شاک میں تھے۔ سالار سکندر سے ان کی فرقان کے توسط سے پہلی ملاقات امام کے گھر سے چلے آئے کے چار سال بعد ہوئی تھی اور

ان کے ذہن میں کبھی یہ نہیں آیا کہ اس سالار کا امام سے کوئی تعلق ہو سکتا تھا۔ چار سال پہلے سنے جانے والے ایک نام کو وہ چار سال بعد ملنے والے ایک دوسرے شخص کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے اور کبھی

دیتے اگر وہ چار سال پہلے والے سالار سے ہی ملتے مگر وہ جس شخص سے ملے تھے، وہ حافظ قرآن تھا۔ اس

ہوں۔ میرے خدا۔۔۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر سیٹھ علی اسے کیسے جانتے ہیں۔ اس کے ذہن میں ایک فکرا برپا تھا۔

”آمنہ۔۔۔ بیٹا! ہاں کہو۔“ سعید و اماں نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”سالار سکندر جیسے شخص کے لئے ہاں۔۔۔؟“

اس کا دل کسی نے اپنی مٹھی میں لے کر بھینچا۔۔۔ وہ ”ہاں“ کے علاوہ اس وقت کچھ اور کہہ ہی نہیں سکتی تھی۔ خوف اور شاک کے عالم میں اس نے کاغذات پر دھستکے کئے تھے۔

”کاش کوئی معجزہ ہو۔ یہ وہ سالار سکندر نہ ہو۔ یہ سب ایک اتفاق ہو۔“ اس نے اللہ سے دعا کی تھی۔

ان سب لوگوں کے کمرے سے چلے جانے کے بعد مریم نے اس کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔

اس کے چہرے کا رنگ بالکل سفید ہو چکا تھا۔

”کیا ہوا؟“ مریم کی تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ وہ سمجھ نہیں سکی۔ وہ اس سے کیا کہہ رہی تھی۔ اس کا ذہن کہیں اور تھا۔

”مریم! Just do me a favour! اس نے مریم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”میں نے نکاح کر لیا ہے۔ مگر میں آج رخصتی نہیں چاہتی۔ تم سعید و اماں سے کہو کہ وہ آج میری رخصتی نہ کریں۔ پلیز۔۔۔“

مریم اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”کیوں؟“

”بس تم اس وقت مجھ سے کچھ نہ پوچھو، کچھ بھی نہیں۔ سعید و اماں سے کہو میں ابھی رخصتی نہیں چاہتی۔“

اس کے لہجے میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا کہ مریم اٹھ کر باہر نکل گئی۔ وہ بہت جلد ہی واپس آگئی۔

”اماں! رخصتی نہیں ہو رہی ہے۔ سالار بھی رخصتی نہیں چاہتا۔“

اماں کے ہاتھوں کی کینا پھاٹ کچھ کم ہو گئی۔

”ابو کا فون آنے والا ہے تمہارے لئے۔ وہ تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔“

اس نے اماں کو مزید اطلاع دی۔ وہ فون سننے کے لئے دوسرے کمرے میں آگئی۔ انہوں نے کچھ دیر بعد اسے فون کیا تھا۔ وہ اسے مبارکباد دے رہے تھے۔ اماں کا دل رونے کو چاہا۔

”سالار بہت اچھا انسان ہے۔“ وہ کہہ رہے تھے۔ ”میری خواہش تھی کہ آپ کی شادی اسی سے

ہو، مگر چونکہ آپ سعید و اماں کے پاس رہ رہی تھیں اس لئے میں نے ان کی خواہش اور انتخاب کو مقدم سمجھا۔“

وہ سانس لینے تک کے قابل نہیں رہی تھی۔

”مجھے یہ علم نہیں تھا کہ سالار نے اس سے پہلے کبھی شادی کی تھی مگر تھوڑی دیر پہلے فرقان نے مجھے اس کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ صرف ضرور ناکیا جانے والا کوئی نکاح تھا۔ فرقان نے مجھے تفصیل نہیں

بتائی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میرے جانے والوں میں سالار سے اچھا کوئی شخص ہو تا تو اس کے نکاح کے بارے میں جان لینے کے بعد میں آپ کی شادی سالار سے کرنے کے

بہائے کہیں اور کر دیتا لیکن میرے ذہن میں سالار کے علاوہ اور کوئی آیا ہی نہیں۔ آپ خاموش کیوں ہیں آمنہ؟“

انہیں بات کرتے کرتے اس کا خیال آیا۔

”ابو! آپ واپس کب آئیں گے؟“

”میں ایک ہفتے تک آرہا ہوں۔“ ڈاکٹر سیٹھ علی نے کہا۔

”مجھے آپ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ مجھے آپ کو بہت کچھ بتانا ہے۔“

”آپ خوش نہیں ہیں؟“ ڈاکٹر سیٹھ علی کو اس کے لہجے نے پریشان کیا۔

”آپ پاکستان آجائیں پھر میں آپ سے بات کروں گی۔“ اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

☆.....☆.....☆

ورات کو سونے سے پہلے وضو کرنے کے لئے ہاتھ روم میں گئی۔ وضو کر کے واپس آتے ہوئے اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہ صحن میں برآمد سے کی میز میوں پہ بیٹھ گئی۔ گھر میں اس وقت کوئی

مہمان نہیں تھا۔ وہ اور سعید و اماں ہمیشہ کی طرح تھا تھے۔ سعید و اماں تھکاوٹ کی وجہ سے بہت جلد سو گئیں۔ وہ ملازمہ کے ساتھ گھر میں موجود کام بناتی رہی۔ ساڑھے دس بجے کے قریب ملازمہ بھی اپنا کام

ختم کر کے سونے کے لئے چلی گئی۔ وہ شادی کے کاموں کی وجہ سے پچھلے کچھ دنوں سے وہیں رہ رہی تھی۔ اماں، ابکن اور اپنے کمرے کے بہت سے چھوٹے چھوٹے کام بناتی رہی۔

وہ جس وقت ان سب کاموں سے فارغ ہوئی اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ وہ بہت تھک چکی تھی مگر سونے سے پہلے وضو کرنے کے بعد صحن سے گزرتے ہوئے ایک دم ہی اس کا دل

اپنے کمرے میں جانے کو نہیں چاہا۔ وہیں برآمد سے بیٹھ گئی۔ صحن میں چلنے والی روشنیوں میں اس نے اپنے ہاتھوں اور کھانچوں پر لگی ہوئی مہندی کو دیکھا۔ مہندی بہت اچھی رہی تھی۔ اس کے ہاتھ

کہیوں تک سرخ تیل بوتلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے کل بہت سالوں کے بعد پہلی بار بے شوقی سے مہندی لگوائی تھی۔ اسے مہندی بہت پسند تھی۔ تہواروں کے علاوہ بھی وہ اکثر اپنے ہاتھوں پر مہندی

لگاتی کرتی تھی مگر ساڑھے آٹھ سال پہلے اپنے گھر سے نکل آنے کے بعد اس نے کبھی مہندی نہیں لگائی تھی۔ غیر محسوس طور پر ان تمام چیزوں سے اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی مگر ساڑھے آٹھ سال کے بعد پہلی

کے اندازہ اور گفتار میں کہیں اس ذہنی مرض کا عکس نہیں پایا جاتا تھا جس کا حال انہیں امام نے کئی بار دیا تھا۔ ان کا دھوکا کھا جانا ایک فطری امر تھا پھر یہ سب اسی طرح سے "لے کیا گیا تھا۔"

"اور آپ نے نو سال پہلے اس سے شادی کی تھی؟" وہ اب بھی بے یقینی کا شکار تھے۔

"صرف نکاح۔" اس نے مدہم آواز میں کہا۔

"اور پھر اس نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ ڈاکٹر سیٹھ علی بہت دیر خاموش رہے تھے پھر انہوں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا چاہئے تھا آہ! میں آپ کی مدد کر سکتا تھا۔"

امام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، مجھے آپ پر اعتبار کر لینا چاہئے تھا مگر اس وقت میرے لئے یہ بہت مشکل تھا۔ آپ کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ میں اس وقت کس ذہنی کیفیت سے گزر رہی تھی یا پھر شاید میری قسمت میں یہ آزمائش بھی لکھی تھی اسے آنا ہی تھا۔"

وہ بات کرتے کرتے زکی، پھر اس نے تم آنکھوں کے ساتھ سر اٹھا کر ڈاکٹر سیٹھ علی کو دیکھا اور مسکراتے کی کوشش کی۔

"لیکن اب تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تو آپ طلاق لینے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔"

"نہیں، میں اب اس طلاق میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آہ! میں نے اس سے آپ کی شادی

کروائی ہے۔" انہوں نے جیسے اسے یاد دلایا۔

"اسی لئے تو میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔ آپ اس سے مجھے طلاق دلو اور۔"

"لیکن کیوں، میں کیوں اس سے آپ کو طلاق دلو اور؟"

"کیونکہ..... کیونکہ وہ ایک..... اچھا آدمی نہیں ہے کیونکہ میں نے اپنی زندگی کو سالار جیسے آدمی کے ساتھ گزارنے کا نہیں سوچا۔ ہم دو مختلف دنیاؤں کے لوگ ہیں۔" وہ بے حد دلیرا دشت ہو رہی تھی۔

"میں نے کبھی اللہ سے شکایت نہیں کی اب اس نے کبھی اللہ سے شکایت نہیں کی مگر اس بار مجھے اللہ سے بہت شکایت ہے۔"

وہ گلو کیر لہجے میں بولی۔

"میں اتنی محبت کرتی ہوں اللہ سے۔ اور دیکھیں اللہ نے میرے ساتھ کیا کیا۔ میرے لئے دنیا

کے سب سے برے آدمی کو چنا۔"

وہ اب رو رہی تھی۔

"لڑکیاں دیکھنا کچھ ناگفتی ہیں..... میں نے تو کچھ بھی نہیں مانگا، صرف ایک "صالح آدمی" مانگا تھا۔"

اس نے مجھے وہ تک نہیں دیا۔ کیا اللہ نے مجھے کسی صالح آدمی کے قائل نہیں سمجھا۔" وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

"امام! وہ صالح آدمی ہے۔"

"آپ کیوں اسے صالح آدمی کہتے ہیں؟ وہ صالح آدمی نہیں ہے۔ میں اس کو جانتی ہوں، میں اس کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"میں بھی اس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"آپ اس کو اتنا نہیں جانتے جتنا میں جانتی ہوں۔ وہ شراب پیتا ہے، وہ نفسیاتی مریض ہے کئی بار خودکشی کی کوشش کر چکا ہے۔ گریبان کھلا چھوڑ کر پھرتا ہے۔ عورت کو دیکھ کر اپنی نظر تک ہٹتی رکھتا نہیں جانتا اور آپ کہتے ہیں وہ صالح آدمی ہے؟"

"امام! میں اس کے ماضی کو نہیں جانتا، میں اس کے حال کو جانتا ہوں۔ وہ ان میں سے کچھ بھی نہیں کرتا جو آپ کہہ رہی ہیں۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسا کچھ نہیں کرتا۔ وہ جھوٹا اور مکار ہے۔ میں اس کو جانتی ہوں۔"

"وہ ایسا نہیں ہے۔"

"ابو! وہ ایسا ہی ہے۔"

"ہو سکتا ہے اسے واقعی آپ سے محبت ہو۔ وہ آپ کی وجہ سے تبدیل ہو گیا ہو۔"

"مجھے ایسی محبت کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس کی نظروں سے گھن آتی ہے۔ مجھے اس کے کھلے گریبان سے گھن آتی ہے۔ میں ایسے کسی آدمی کی محبت نہیں جانتی۔ وہ بدل نہیں سکتا۔ ایسے لوگ کبھی نہیں بدلتے۔ وہ صرف اپنے آپ کو چھپا لیتے ہیں۔"

"نہیں، سالار ایسا کچھ نہیں کر رہا۔"

"ابو! میں سالار جیسے کسی شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ وہ ہر چیز کا مذاق اڑاتا ہے۔ مذہب کا، زندگی کا، عورت کا..... کیا ہے جسے وہ چنگیوں میں اڑانا نہیں جانتا۔ جس شخص کے

نزدیک میرا اپنے مذہب کو چھوڑ دینا ایک حماقت ہے، جس کے نزدیک مذہب پر بات کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے جو صرف "What is next to ecstasy" کا مطلب جاننے کے لئے خود کشیاں

کرنا پھرتا ہو، جس کے نزدیک زندگی کا مقصد صرف عیش ہے۔ وہ میرے ساتھ محبت کرے بھی تو کیا صرف محبت کی بنیاد پر میں اس کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہوں؟ میں نہیں گزار سکتی۔"

"ساڑھے آٹھ سال سے وہ آپ کے ساتھ قائم ہونے والے اس اتفاق پر شے کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ آپ کو آپ کے تمہارے نظریات اور عقائد کو جانتے ہوئے بھی اور وہ آپ کے انتظار میں

بھی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ آپ اس کے ساتھ رہنے پر تیار ہو جائیں گی۔ کیا ان ساری خواہشوں کے ساتھ اس نے اپنے اندر کچھ تبدیلی نہیں کی ہوگی؟“

”میں نے اس کے ساتھ زندگی نہیں گزارنی۔ میں نے اس کے ساتھ نہیں رہنا۔“ وہ اب بھی اپنی بات پر مصر تھی۔ ”مجھے حق ہے کہ میں اس شخص کے ساتھ نہ رہوں۔“

”لیکن اللہ یہ کیوں کر رہا ہے کہ اس شخص کو بار بار آپ کے سامنے لا رہا ہے۔ دو دفعہ آپ کا نکاح ہوا اور دونوں دفعہ اسی آدمی سے۔“

وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”میں نے زندگی میں ضرور کوئی گناہ کیا ہوگا، اس لئے میرے ساتھ ایسا ہو رہا ہے۔“ اس نے بھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔

”آمنہ! آپ کبھی ضد نہیں کرتی تھیں پھر اب کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ ڈاکٹر سہیل علی حیران تھے۔

”آپ مجھے مجبور کریں گے تو میں آپ کی بات مان لوں گی کیونکہ آپ کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں تو آپ کی کسی بات کو رد کر ہی نہیں سکتی لیکن آپ اگر یہ کہیں گے کہ میں اپنی مرضی اور خوشی کے ساتھ اس کے ساتھ زندگی گزاروں تو وہ میں کبھی نہیں کر سکوں گی۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ وہ کتنا تعلیم یافتہ ہے، کتنے اچھے عہدے پر کام کر رہا ہے یا مجھے کیا دے سکتا ہے۔ آپ ایک ان پڑھ آدمی سے شادی کر دیتے لیکن وہ اچھا انسان ہوتا تو میں کبھی آپ سے کوئی شکوہ نہیں کرتی لیکن سالار، وہ آنکھوں دیکھی کبھی ہے جس کو میں اپنی خوشی سے نہیں نکل سکتی۔ آپ سالار کے بارے میں وہ جانتے ہیں، جو آپ نے سنا ہے۔ میں اس کے بارے میں جو جانتی ہوں، وہ میں نے دیکھا ہے۔ ہم چند روز سال ایک دوسرے کے ہمارے رہے ہیں۔ آپ تو اس کو چند سالوں سے جانتے ہیں۔“

”آمنہ! میں آپ کو مجبور کبھی نہیں کروں گا۔ یہ رشتہ آپ اپنی خوشی سے قائم رکھنا چاہیں گی تو ٹھیک ہے لیکن صرف میرے کہنے پر اسے قائم رکھنا چاہو تو ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ایک بار سالار سے مل لیں پھر بھی اگر آپ کا یہی مطالبہ ہو تو میں آپ کی بات مان لوں گا۔“

ڈاکٹر سہیل علی بے حد شہید تھے۔

اسی وقت ملازم نے آکر سالار کے آنے کی اطلاع دی۔ ڈاکٹر سہیل علی نے اپنی گھڑی پر ایک نظر دوڑائی اور ملازم سے کہا۔

”انہیں اندر لے آؤ۔“

”یہاں؟“ ملازم حیران ہوا۔

”ہاں، یہیں پر۔“ ڈاکٹر سہیل علی نے کہا۔

امامہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”میں ابھی اس طرح اس سے بات نہیں کرنا چاہتی۔“

اس کا اشارہ اپنی متورم آنکھوں اور سرخ چہرے کی طرف تھا۔

”آپ نے ابھی تک اسے دیکھا نہیں ہے۔ آپ اسے دیکھ لیں۔“ انہوں نے دھیمے لہجے میں اس سے کہا۔

”یہاں نہیں، میں اندر کمرے میں سے اس کو دیکھ لوں گی۔“

وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اس نے اسے بند نہیں کیا۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ ادھ کھلے دروازے سے لاؤنچ سے آنے والی روشنی اتنی کافی نہیں تھی کہ کمرے کے اندر اچھی طرح سے دیکھا جاسکے۔ وہ اپنے بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔

اپنے بیڈ پر بیٹھ کر اس نے اپنی انگلیوں سے اپنی آنکھوں کو مسلا۔ وہ جہاں بیٹھی تھی وہاں سے وہ لاؤنچ کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ نو سال کے بعد اس نے ادھ کھلے دروازے سے لاؤنچ میں اس شخص کو نمودار ہوتے دیکھا جسے وہ ایک طویل عرصہ پہلے مردہ سمجھ چکی تھی جس سے زیادہ عزت اور گمن اسے کبھی کسی سے محسوس نہیں ہوئی تھی جسے وہ بدترین لوگوں میں سے ایک سمجھتی تھی اور جس کے نکاح میں وہ پچھلے کئی سالوں سے تھی۔

نقد پر کیا اس کے علاوہ کسی اور چیز کو کہتے ہیں؟

اپنی آنکھوں میں آنرٹی دھند کو اس نے انگلیوں کی پوروں سے صاف کیا۔ ڈاکٹر سہیل علی اس سے گلے مل رہے تھے۔ اس کی پشت امامہ کی طرف تھی۔ اس نے معاف کرنے سے پہلے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پھول اور ایک سیکٹ سینئر ٹیبل پر رکھا تھا۔ معاف کے بعد وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور تب پہلی بار امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔

کھلا گریبان، گلے میں لگتی زنجیریں، ہاتھوں میں نکلنے بیٹڈ، ربر بیٹڈ میں بندھے ہالوں کی پونی، وہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ کریم گلر کے ایک سادہ شلوار سوٹ پہ ڈاسٹ پہنے ہوئے تھا۔

”ہاں ظاہری طور پر بہت بدل گیا ہے۔“ اسے دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی یقین نہیں کر سکتا کہ یہ کبھی..... اس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ اب ڈاکٹر سہیل علی سے باتیں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر سہیل علی اسے شادی کی مبارکباد دے رہے تھے۔ وہ وہاں بیٹھی ان دونوں کی آواز میں آسانی من رہی تھی اور وہ ڈاکٹر سہیل علی کے استفسار پر انہیں امامہ کے ساتھ ہونے والے اپنے نکاح کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ اپنے پچھتاوے کا اظہار کر رہا تھا کس طرح اس نے جلال کی شادی کے بارے میں اس سے جھوٹ بولا۔ کس طرح اس نے طلاق کے بارے میں اس سے جھوٹ بولا۔

”میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اتنی تکلیف کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ وہ میرے ذہن سے نکلتی ہی نہیں۔“
وہ دیکھتے لہجے میں ڈاکٹر سید علی کو بتا رہا تھا۔

”بہت عرصے تو میں انازل رہا۔ اس نے مجھ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے مدد مانگی تھی۔ یہ کہہ کر کہ میں ایک مسلمان ہوں، ختم نبوت پر یقین رکھنے والا مسلمان۔ میں دھوکا نہیں دوں گا اسے اور میری پستی کی انتہا دیکھیں کہ میں نے اسے دھوکا دیا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت کرتی ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر گھر سے نکل آئی اور میں اس کا مذاق اڑاتا رہا، اسے پاگل سمجھتا اور کہتا رہا۔ جس رات میں اسے لاہور چھوڑنے آیا تھا، اس نے مجھ سے راستے میں کہا تھا کہ ایک دن مجھے ہر چیز کی سمجھ آجائے گی، تب مجھے اپنی اوقات کا پتہ چل جائے گا۔“
وہ مجھ سے انداز میں ہنسا تھا۔

”اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ مجھے واقعی ہر چیز کی سمجھ آگئی۔ اتنے سالوں میں، میں نے اللہ سے اتنی دعا اور توبہ کی ہے کہ۔۔۔“

وہ بات کرتے کرتے رگ گیا۔ امام نے اسے سینہ خیل کے شیشے کے کنارے پر اپنی انگلی پھیرتے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
”بعض دفعہ مجھے لگتا تھا کہ شاید میری دعا اور توبہ قبول ہوگئی۔“ وہ ڈکا۔

”مگر اس دن۔۔۔ میں آمنہ کے ساتھ نکاح کے کاغذات پر دستخط کر رہا تھا تو مجھے اپنی اوقات کا پتا چل گیا۔ میری دعا اور توبہ کچھ بھی قبول نہیں ہوئی۔ ایسا ہوتا تو مجھے امام ملتی، آمنہ نہیں۔ خواہش تو اللہ انسان کو وہ دے دیتا ہے کہ مجھوں کے علاوہ کوئی چیز جسے پورا کر ہی نہیں سکتی۔ میری خواہش دیکھیں میں نے اللہ سے کیا مانگا۔ ایک ایسی لڑکی جسے کسی اور سے محبت ہے، وہ جو مجھے اسفل السافلین سمجھتی ہے، جسے میں نو سال سے ڈھونڈ رہا ہوں مگر اس کا کچھ پتہ نہیں ہے۔“

اور میں۔۔۔ میں خواہش لئے پھر رہا ہوں اس کے ساتھ اپنی زندگی گزارنے کی۔ یوں جیسے وہ مل ہی جائے گی، یوں جیسے وہ مل گئی تو میرے ساتھ رہنے کو تیار ہی ہو جائے گی، یوں جیسے وہ جاہل انصر کو بھلا بیگی ہوگی۔ ویوں جتنی اور ویوں جیسی عبادت کرتا تو شاید اللہ میرے لئے یہ معجزے کر دیتا پر میرے جیسے آدمی کے لئے۔۔۔ میری اوقات تو یہ ہے کہ لوگ خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر بخشش مانگتے ہیں۔ میں وہاں کھڑا ہو کر بھی اسے ہی مانگتا رہا۔ شاید اللہ کو یہی برا لگا۔“

امام کے جسم سے ایک کرنٹ گزرا تھا۔ ایک جھماکے کی طرح وہ خواب اسے یاد آیا تھا۔
”میرے اللہ! اس نے اپنے دونوں ہاتھ۔ منوں پر رکھ لئے۔ وہ بے یقینی سے سالار کو دیکھ رہی

تھی۔ وہ خواب میں اس شخص کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ ”کیا وہ یہ شخص تھا، یہ جو میرے سامنے بیٹھا ہے۔ یہ آدمی۔۔۔؟“ اس نے جب خواب میں اس آدمی کو جلال سمجھا تھا مگر اسے یاد آیا تھا جلال دراز قد نہیں تھا، وہ آدمی دراز قد تھا۔ سالار سکندر دراز قد تھا۔ اس کے ہاتھ کا پینے لگے تھے۔ جلال کی رنگت گندی تھی۔ اس آدمی کی رنگت صاف تھی۔ سالار سکندر کی رنگت صاف تھی۔ اس نے خواب میں اس آدمی کے کندھے پر ایک تیسری چیز بھی دیکھی تھی۔ وہ تیسری چیز؟
اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو مکمل طور پر ڈھانپ لیا۔

وہ معجزوں کے نہ ہونے کی باتیں کر رہا تھا اور۔۔۔ اندر ڈاکٹر سید علی خاموش تھے۔ وہ کیوں خاموش تھے۔ یہ صرف وہ اور امام جانتے تھے، سالار سکندر نہیں۔ امام نے اپنی آنکھیں رگڑیں اور چہرے سے ہاتھ ہٹا دیئے۔ اس نے ایک بار پھر ہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس شخص کو دیکھا۔
نہ وہ وہی تھا نہ درویش۔۔۔ صرف بچے دل سے توبہ کرنے والا ایک شخص تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے اسے پہلی بار احساس ہوا کہ جلال اور اس کے درمیان کیا چیز آکر کھڑی ہوگئی تھی جس نے اتنے سالوں میں جلال کے لئے اس کی ایک بھی دعا قبول نہیں ہونے دی۔ کون سی چیز آخری وقت میں فہد کی جگہ اس کو لے آئی تھی۔

اس شخص میں کوئی نہ کوئی بات تو ایسی ہوگی کہ اس کی دعائیں قبول ہوئیں، میری نہیں۔ ہر بار مجھے پتلا کر اسی کی طرف بھیجا گیا۔

اس نے تم آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔ اس نے ڈاکٹر سید علی کو اسے صالح آدمی کہتے سنا۔ وہ جانتی تھی وہ یہ بات کس کے لئے کہہ رہے تھے۔ وہ سالار کو نہیں بتا رہے تھے۔ وہ امام کو بتا رہے تھے۔ وہ اسے صالح قرار نہ بھی دیتے تب بھی وہ اسے صالح ماننے پر مجبور تھی۔
اس کے پاس جو گواہی تھی وہ دنیا کی ہر گواہی سے بڑھ کر تھی۔ اس کے پاس جو ثبوت تھا اس کے بعد اور کسی ثبوت کی ضرورت تھی نہ گنجائش۔ اسے کیا ”بتا“ دیا گیا تھا، اسے کیا ”جتا“ دیا گیا تھا۔ وہ جانتی تھی۔۔۔ صرف وہی جان سکتی تھی۔

انفاری کے بعد سالار اور ڈاکٹر سید علی نماز پڑھنے کے لئے چلے گئے۔
وہ منہ ہاتھ دھو کر کچن میں چلی آئی۔ ان کے آنے سے پہلے اس نے ملازم کے ساتھ مل کر کھانا لگا دیا تھا۔ سالار کی واپسی کھانے کے بعد ہوئی تھی اور اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر سید علی جس وقت کچن میں آئے، اس وقت امام کچن کی میز پر بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی متورم تھیں مگر اس کا چہرہ پرسکون تھا۔

”میں نے سالار کو آپ کے بارے میں نہیں بتایا لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ اب جلد از جلد اس

سے مل کر بات کر لیں۔“

ڈاکٹر سید علی نے اس سے کہا۔

”مجھے اس سے کوئی بات نہیں کرنی۔“ وہ پانی پیتے ہوئے رُک گئی۔ ”اسے اللہ نے میرے لئے منتخب کیا ہے اور میں اللہ کے انتخاب کو رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ اس نے کہا ہے کہ وہ تو بے کرپکا ہے وہ نہ بھی کرتا وہ یہاں ہی ہوتا جیسا پہلے تھا تب بھی میں اس کے پاس چلی جاتی اگر میں جان لیتی کہ اسے اللہ نے میرے لئے منتخب کیا ہے۔“

وہ اب دوبارہ پانی پی رہی تھی۔ ”آپ اس سے کہیں مجھے لے جائے۔“

☆.....☆.....☆

سالار جس وقت مغرب کی نماز پڑھ کر آیا تب تک امامہ فرقان کی بیوی کے ساتھ کھانے کی میز لگا چکی تھی۔ فرقان اور سالار کی عدم موجودگی میں اس بار آمدن اصرار کر کے اس کے ساتھ کام کرنے لگی تھی۔

سالار کے آنے پر وہ اپنے قلیٹ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ سالار اور امامہ نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔

”نہیں، مجھے بچوں کے ساتھ کھانا کھانا ہے۔ وہ بے چارے انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”آپ انہیں بھی یہیں بلا لیں۔“ سالار نے کہا۔

”نہیں بھئی، میں اس قسم کی فضول حرکت نہیں کر سکتی۔ امامہ تو پھر تمہیں پتا ہے یہاں سے جانے کا نام ہی نہیں لے گی۔“ نوشین نے اپنی بیٹی کا نام لیا۔

”سالار بڑا پیار کرتا ہے امامہ کے ساتھ۔“

فرقان کی بیوی نے امامہ سے کہا۔ ایک لمحے کے لئے سالار اور امامہ کی نظریں ملیں پھر سالار برقی رفتار سے مڑ کر ٹیبل پر پڑے گلاس میں جگ سے پانی اٹھ لینے لگا۔ نوشین نے حیرانی سے امامہ کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھا مگر وہ سمجھ نہیں پائیں۔

”تم لوگ کھانا کھاؤ۔ سحری بھی میں ملازم کے ہاتھ بھجوادوں گی۔ تم لوگ کچھ تیار مت کرنا۔“

ان کے جانے کے بعد سالار دروازہ بند کر کے واپس آ گیا۔ امامہ کو مخاطب کئے بغیر وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا لیکن اس نے کھانا شروع نہیں کیا۔

امامہ چند لمحے کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر خود بھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھ جانے کے بعد سالار نے اپنے سامنے پڑی پلیٹ میں چاول نکالنا شروع کئے۔ کچھ چاول نکال لینے کے بعد اس نے دائیں ہاتھ سے چاولوں کا ایک چمچہ منہ میں ڈالا۔ چند لمحوں کے لئے امامہ کی نظر اس کے دائیں ہاتھ سے

ہوتی ہوئی اس کے چہرے پر گئی۔ سالار اس کی طرف متوجہ نہیں تھا مگر وہ جانتا تھا وہ کیا دیکھ رہی تھی۔

کھانا بہت خاموشی سے کھایا گیا۔ امامہ کو اس کی خاموشی اب بری طرح چھینے لگی تھی۔ آخر وہ اس سے بات کیوں نہیں کر رہا تھا؟

”کیا مجھے دیکھ کر اتنا شاک لگا ہے اسے؟ یا پھر؟“

اسے اپنی بھوک غائب ہوتی محسوس ہوئی۔ اسے اپنی پلیٹ میں موجود کھانا ختم کرنا مشکل لگنے لگا۔ سالار اس کے برعکس بہت اطمینان اور تیز رفتاری سے کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے جس وقت کھانا ختم کیا، اس وقت عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔

امامہ کے کھانا ختم کرنے کا انتظار کئے بغیر وہ میز سے اٹھ کر اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ امامہ نے اپنی پلیٹ پیچھے سرکا دی۔

وہ میز پر پڑے برتن سمیٹنے لگی جب اس نے سالار کو تبدیل شدہ لباس میں برآمد ہوتے دیکھا۔ ایک بار پھر اسے مخاطب کئے بغیر وہ قلیٹ سے نکل گیا تھا۔ امامہ نے بیچے ہوئے کھانے کو فریج میں رکھ دیا۔ برتنوں کو سنک میں رکھنے کے بعد اس نے میز صاف کی اور خود بھی نماز پڑھنے چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ عشاء کی نماز کے بعد جس وقت واپس لوٹا اس وقت وہ کچن میں برتن دھونے میں مصروف تھی۔ سالار اپنے پاس موجود چائے سے قلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ سالار لاؤنج سے گزرتے ہوئے رُک گیا۔ کچن کے دروازے کی طرف امامہ کی پشت تھی اور وہ سنک کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا دوپٹہ لاؤنج کے صوفے پر پڑا ہوا تھا۔

سالار نے پہلی بار اسے سعیدہ اماں کے ہاں کچھ گھنٹے پہلے دوپٹے کے بغیر دیکھا تھا اور اب وہ ایک بار پھر اسے دوپٹے کے بغیر دیکھ رہا تھا۔

نو سال پہلے وضو کرتے دیکھتے ہوئے اسے پہلی بار امامہ کو اس چادر کے بغیر دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی جو وہ اوڑھے رکھتی تھی۔ نو سال بعد اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اس نے نو سال میں کئی بار اسے اپنے گھر میں ”محسوس“ کیا تھا مگر آج جب وہ اسے وہاں ”دیکھ“ رہا تھا تو وہ دم بخود تھا۔ اس کے سیاہ بال ڈھیلے ڈھالے انداز میں جوڑے کی شکل میں لپیٹے گئے تھے اور سفید سویٹر کی پشت پر وہ یک دم بہت نمایاں ہو گئے تھے۔

نکاح نامے پر آمدن مبین ولد ہاشم مبین احمد کو اپنی بیوی کے طور پر تسلیم کرنے کا اقرار کرتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک لمحے کے لئے بھی کوئی شک پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہی ہاشم مبین احمد کے نام نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ سعیدہ اماں کی ”بیٹی“ سے شادی کر رہا تھا۔ اس کا نام امامہ ہاشم بھی ہوتا تب بھی اس کے

وہم وگمان میں بھی یہ کبھی نہیں آتا کہ یہ وہی امام تھی، کوئی اور نہیں اور اسے سعیدہ اماں کے گمن میں کھڑا دیکھ کر اسے ایک لمحہ کے لئے بھی شبہ نہیں رہا تھا کہ اس کا کلاچ کس سے ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

”تصہیں پتا ہے امام! نو سال میں کتنے دن، کتنے گھنٹے، کتنے منٹ ہوتے ہیں؟“

خاموشی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی آواز میں جسم کو ہلکا دینے والی ٹھنڈک تھی۔ امام نے ہونٹ ہینچتے ہوئے گل بند کر دیا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اتنا قریب کہ وہ اگر مڑنے کی کوشش کرتی تو اس کا کندھا ضرور اس کے سینے سے ٹکرا جاتا۔ اس نے مڑنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ اپنی گردن کی پشت پر اس کے سانس لینے کی مدد آواز سن سکتی تھی۔ وہ اب اس کے جواب کا منتظر تھا۔ اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ سنگ کے کناروں پر ہاتھ جمائے وہ گل سے کرتے ہوئے چند آخری قطروں کو دیکھتی رہی۔

”کیا ان سالوں میں ایک بار بھی تم نے میرے بارے میں سوچا؟ سالار کے بارے میں؟“

اس کے سوال مشکل ہوتے جا رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر چپ رہی۔

”What is next to ecstasy?“ وہ جواب کا انتظار کئے بغیر کہہ رہا تھا۔

”تم نے کہا تھا pain تم نے ٹھیک کہا تھا pain۔“

وہ ایک لمحہ کے لئے رکا۔

”میں یہاں اس گھر میں ہر جگہ تمہیں اتنی بار دیکھ چکا ہوں کہ اب تم میرے سامنے ہو تو مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

امام نے سنگ کے کناروں کو اور مضبوطی سے تھام لیا۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو روکنے کے لئے وہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

”مجھے لگتا ہے، میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ آنکھیں کھولوں گا تو۔۔۔“

وہ رکا۔ امام نے آنکھیں بند کر لیں۔

”تو سب کچھ ہو گا، بس تم نہیں ہو گی۔ آنکھیں بند کروں گا تو۔۔۔“

امام نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے گل بھیگ رہے تھے۔

”تو بھی اس خواب میں دوبارہ نہیں جا پاؤں گا۔ تم وہاں بھی نہیں ہو گی، مجھے تمہیں ہاتھ لگاتے ڈر لگتا ہے۔ ہاتھ بڑھاؤں گا تو سب کچھ تحلیل ہو جائے گا جیسے پانی میں نظر آنے والا عکس۔“

وہ اس کے اتنے قریب تھا کہ ذرا ہلکتا تو اس کے ہونٹ اس کے بالوں کو جھو جاتا مگر وہ اسے چھو نہیں چاہتا تھا۔

”اور تم ہو کون امام۔۔۔؟ آمنت۔۔۔؟ میرا وہم۔۔۔؟ پاپھر کوئی مجھو؟“

”کیا میں تمہیں یہ بتاؤں کہ مجھے۔۔۔ مجھے تم سے۔۔۔“

وہ کچھ کہتے کہتے رکا گیا۔ امام کی آنکھوں سے نلکے والا پانی اس کے چہرے کو بھگو تا ہوا اس کی خموزی سے ٹپک رہا تھا۔ وہ کیوں رکا تھا، وہ نہیں جانتی تھی مگر اسے زندگی میں کبھی خاموشی اتنی بڑی نہیں لگی تھی جتنی اس وقت لگی تھی۔ وہ بہت دیر خاموش رہا۔ اتنی دیر کہ وہ اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی اور تب اسے پتا چلا وہ کیوں خاموش ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ بھی بھیگا ہوا تھا۔

وہ دونوں زندگی میں پہلی بار ایک دوسرے کو اتنے قریب سے دیکھ رہے تھے۔ اتنے قریب سے کہ وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں نظر آنے والے اپنے آپنے عکس کو بھی دیکھ سکتے تھے پھر سالار نے اس سے نظریں چرانے کی کوشش کی تھی۔

وہ اپنے ہاتھ سے اپنے چہرے کو صاف کر رہا تھا۔

”تم مجھ سے اور میں تم سے کیا چھپائیں گے سالار۔۔۔! سب کچھ تو جانتے ہیں ہم ایک دوسرے کے بارے میں۔۔۔“

امام نے مدغم آواز میں کہا۔ سالار نے ہاتھ روک کر سر اٹھایا۔

”میں کچھ نہیں چھپا رہا۔ میں آنسوؤں کو صاف کر رہا ہوں تاکہ تمہیں اچھی طرح دیکھ سکوں۔ تم پھر کسی دھند میں لپٹی ہوئی نظر نہ آؤ۔“

وہ اس کے کان کی لومیں نلکے والے اُن موتیوں کو دیکھ رہا تھا، جنہیں اس نے بہت سال پہلے بھی دیکھا تھا۔ فرق صرف یہ تھا آج وہ بہت قریب تھے۔ ایک بار اُن موتیوں نے اسے بہت زلایا بھی تھا۔ وہ موتی آج بھی رلا رہے تھے، اپنے ہر ہلکورے کے ساتھ، وہم سے جنبش۔۔۔ جنبش سے وہم بنتے ہوئے۔

وہ اپنے کانوں کی لوڑوں پر اس کی نحویت محسوس کر رہی تھی۔

”میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں کبھی تمہارے اتنے قریب کھڑے ہو کر تم سے بات کر رہا ہوں گا۔“

وہ مسکرایا تھا لیکن تم آنکھوں کے ساتھ۔۔۔ امام نے اس کے دائیں گال میں چند لمحوں کے لئے ابھرنے والا گڑھا دیکھا۔ مسکراتے ہوئے اس کے صرف ایک گال میں ڈپل پڑتا تھا، دائیں گال میں اور

نو سال پہلے امام کو اس ڈپل سے بھی بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ نو سال کے بعد اس ڈپل نے پہلی بار عجیب سے انداز میں اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔

”میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میں کبھی تمہارے کان میں موجود ایررنگ کو ہاتھ لگاؤں گا اور

تم۔۔۔“

وہ اب اس کے دائیں کان میں بلکورے لیتے ہوئے موتی کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے روک رہا تھا۔
”اور تم..... تم مجھے ایک تھپڑ نہیں سمجھ مارو گی۔“

امام نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ سالار کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اگلے لمبے وہ سیلے
چہرے کے ساتھ بے اختیار ہنسی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

”تمہیں ابھی بھی وہ تھپڑ یاد ہے۔ وہ ایک reflex action تھا اور کچھ نہیں۔“

امام نے ہاتھ کی پشت سے اپنے بھیکے ہوئے گالوں کو صاف کیا۔ وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ ذمیل ایک
بار پھر نمودار ہوا۔ اس نے بہت آہستگی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے ہاتھ تھام لئے۔

”تم جاننا چاہتے ہو کہ میں اتنے سال کہاں رہی، کیا کرتی رہی، میرے بارے میں سب کچھ؟“

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ رہا تھا۔

”میں کچھ جاننا نہیں چاہتا، کچھ بھی نہیں۔ تمہارے لئے اب میرے پاس کوئی اور سوال نہیں ہے۔

میرے لئے کافی ہے کہ تم میرے سامنے کھڑی ہو، میرے سامنے تو ہو۔ میرے جیسا آدمی کسی سے کیا
تحقیق کرے گا۔“

امام کے ہاتھ سالار کے سینے پر اس کے ہاتھوں کے نیچے دبے تھے۔ پانی نے اس کے ہاتھوں کو
سرد کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ کیوں اس کے ہاتھ اپنے سینے پر رکھے ہوئے تھا۔ لاشعوری طور پر وہ اس
کے ہاتھوں کی خشک گرم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی بڑا کسی بچے کے سرد
ہاتھوں میں حرارت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کے سینے پر ہاتھ رکھے وہ سوئزر کے نیچے سے اس کے دل کی دھڑکن کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ

بے ترتیب تھی۔ تیز..... پر جوش..... کچھ گتھی ہوئی..... کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہوئی..... اس کے سینے پر
ہاتھ رکھے وہ اس وقت اس کے دل تک پہنچی ہوئی تھی، اسے شہ نہیں تھا۔

وہ شخص اس سے محبت کرتا تھا، کیوں کرتا تھا؟ اس کا جواب سامنے کھڑا ہوا شخص بھی نہیں دے سکتا

تھا۔ اس نے اس شخص سے یہ سوال کیا بھی نہیں تھا۔ سالار کی آنکھیں پر سکون انداز میں بندھیں نہ بھی
ہوتیں تب بھی ان آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اب اسے کوئی اُلجھن نہیں ہو رہی تھی۔ ان آنکھوں میں جو کچھ

نوسال پہلے تھا اب نہیں تھا۔ جو اب تھا وہ نوسال پہلے نہیں تھا۔

”ہم کیا ہیں، ہماری محبتیں کیا ہیں، کیا چاہتے ہیں، کیا پاتے ہیں۔“

اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نئی آترنے لگی تھی۔

”جلال انصر..... اور سالار سکندر..... خواب سے حقیقت..... اور حقیقت سے خواب..... زندگی

کیا اس کے سوا اور کچھ ہے؟“

امام نے آہستگی سے اپنے ہاتھ کھینچے۔ سالار نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک
ٹاپے کے لئے ابھرنے والے تاثر کو صرف وہی پہچان سکتی تھی۔

پریشانی، اضطراب، خوف..... تینوں میں سے کچھ تھا۔ امام نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا
پھر سیاہ سوئزر کے گلے سے باہر نکلے ہوئے سفید کالرڈ کو دیکھا۔ کچھ کہے بغیر بہت نرمی کے ساتھ اس کی

گردن کے گرد بازو جھانک کرتے ہوئے اس نے سالار کے سینے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے
پہلی بار سالار کے کولون کی ہلکی سی مہک کو محسوس کیا۔ نوسال پہلے وہ بہت تیز قسم کے پرفیومز استعمال

کرتا تھا۔ نوسال بعد.....؟

سالار بالکل ساکت تھا۔ یوں جیسے اسے یقین نہیں آیا ہو۔ چند لمحوں کے بعد اس نے بڑی نرمی کے

ساتھ امام کے گرد اپنے بازو پھیلائے۔

”I am honoured“ (یہ میرے لئے اعزاز ہے)۔

امام نے اسے مدغم آواز میں کہتے سنا۔ وہ اس کی بند آنکھوں کو نرمی سے چوم رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ سالار کے ساتھ خانہ کعبہ کے صحن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سالار اس کے دائیں جانب تھا۔ وہ وہاں

ان کی آخری رات تھی۔ وہ پچھلے پندرہ دن سے وہاں تھے۔ کچھ دیر پہلے انہوں نے تہجد ادا کی تھی۔ وہ
تہجد کے نوافل کے بعد وہاں سے چلے جایا کرتے تھے۔ آج نہیں گئے، آج وہیں بیٹھے رہے۔ ان کے اور

خانہ کعبہ کے دروازے کے درمیان بہت لوگ تھے اور بہت فاصلہ تھا۔ اس کے باوجود وہ دونوں جہاں
بیٹھے تھے وہاں سے وہ خانہ کعبہ کے دروازے کو بہت آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔

وہاں بیٹھتے وقت ان دونوں کے ذہن میں ایک ہی خواب تھا۔ وہ اس رات کو اب اپنی آنکھوں

سے دیکھ رہے تھے۔ حرم پاک کے فرش پر اس جگہ گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے سالار سورہ رحمن کی
 تلاوت کر رہا تھا۔ امام جان بوجھ کر اس کے برابر میں بیٹھنے کی بجائے بائیں جانب اس کے عقب میں بیٹھ

گئی۔ سالار نے تلاوت کرتے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے اپنے برابر
والی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ امام اٹھ کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔ سالار نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اب

خانہ کعبہ کے دروازے پر نظر جمائے ہوئے تھا۔

امام بھی خانہ کعبہ کو دیکھنے لگی۔ وہ خانہ کعبہ کو دیکھتے ہوئے اس خوش الحان آواز کو سنتی رہی جو اس

کے شوہر کی تھی۔ فہامی الاء دیکھا دکھا ہان۔

اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

”تم جو کچھ کر رہی ہو امام! تم اس پر بہت بچھتاؤ گی۔ تمہارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔“

نو سال پہلے ہاشم مبین نے اس کے چہرے پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا تھا۔

”ساری دنیا کی ذلت اور رسوائی، بدنامی اور بھوک تمہارا مقدر بن جائے گی۔“

انہوں نے اس کے چہرے پر ایک اور تھپڑ مارا۔

”تمہارے جیسی لڑکیوں کو اللہ ذلیل و خوار کرتا ہے۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑتا۔“

امامہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”ایک وقت آئے گا جب تم دوبارہ ہماری طرف لوٹو گی۔ منت سماجت کرو گی۔ گلا گڑاؤ گی۔ تب

ہم تمہیں دھتکار دیں گے۔ تب تم جینا چھین کر اپنے منہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگو گی۔ کیوں کہ میں غلام تھی۔“

امامہ انگلیاں آنکھوں سے مسکرائی۔

”میری خواہش ہے بابا!“ اس نے زیر لب کہا۔ ”کہ زندگی میں ایک بار میں آپ کے سامنے

آؤں اور آپ کو بتا دوں کہ دیکھ لیجئے، میرے چہرے پر کوئی ذلت، کوئی رسوائی نہیں ہے۔ میرے اللہ

اور میرے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری حفاظت کی۔ مجھے دنیا کے لئے تماشیا نہیں بنایا، نہ دنیا

میں بنایا ہے نہ ہی آخرت میں میں کسی رسوائی کا سامنا کروں گی اور میں آج اگر یہاں موجود ہوں تو

صرف اس لئے کیونکہ میں سیدھے راستے پر ہوں اور یہاں بیٹھ کر میں ایک بار پھر اقرار کرتی ہوں کہ محمد

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔ ان کے بعد کوئی پیغمبر آیا ہے نہ ہی کبھی آئے گا۔ میں

اقرار کرتی ہوں کہ وہی پیر کامل ہیں۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ ان سے کامل ترین انسان دوسرا کوئی نہیں۔

ان کی نسل میں بھی کوئی ان کے برابر آیا ہے نہ ہی کبھی آئے گا اور میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے

آنے والی زندگی میں بھی کبھی اپنے ساتھ شریک کرے نہ ہی مجھے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے برابر کسی کو لاکڑا کرنے کی جرأت ہو۔ میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ زندگی بھر مجھے سیدھے راستے پر

رکھے۔ بے شک میں اس کی کسی نعمت کو نہیں جھٹلا سکتی۔“

سالار نے سورہ زمر کی تلاوت شتم کر لی تھی۔ چند لمحوں کے لئے وہ زکا پھر سجدے میں چلا گیا۔

سجدے سے اٹھنے کے بعد وہ کھڑا ہوتے ہوئے زک گیا۔ امامہ آنکھیں بند کئے دونوں ہاتھ پھیلائے دعا

کر رہی تھی۔ وہ اس کی دعا شتم ہونے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ امامہ نے دعا شتم کی۔

سالار نے اٹھنا چاہا، وہ اٹھ نہیں سکا۔ امامہ نے بہت نرمی کے ساتھ اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ

حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ ناکہ جس سے محبت ہوئی وہ نہیں ملا۔ ایسا ہوتا ہے؟“

رات کے اس چپھلے پہر نرمی سے اس کا ہاتھ تھامے وہ بیگلی آنکھوں اور مسکراتے چہرے کے

ساتھ کہہ رہی تھی۔

”محبت میں صدق نہ ہو تو محبت نہیں ملتی۔ نو سال پہلے میں نے جب جلال سے محبت کی تو پورے

صدق کے ساتھ کی۔ دعائیں، دھینے، مٹین، کیا تھا جو میں نے نہیں کر چھوڑا مگر وہ مجھے نہیں ملا۔“

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔ سالار کا ہاتھ اس کے ہاتھ کی نرم گرفت میں اس کے کھینے پر

دھرا تھا۔

”پتا ہے کیوں؟ کیونکہ اس وقت تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگے تھے اور تمہاری محبت میں میری

محبت سے زیادہ صدق تھا۔“

سالار نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اس کی ٹھوڑی سے ٹپکنے والے آنسو اب اس کے ہاتھ پر گر رہے

تھے۔ سالار نے دوبارہ امامہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”مجھے اب لگتا ہے کہ اللہ نے مجھے بہت پیار سے بنایا تھا۔ وہ مجھے کسی ایسے شخص کو سوچنے پر تیار نہیں

تھا جو میری ناقدری کرے، مجھے ضائع کرے اور جلال، وہ میرے ساتھ جیسا سب کچھ کرتا۔ وہ میری قدر سمجھی

نہ کرتا۔ نو سال میں اللہ نے مجھے ہر حقیقت بتادی۔ ہر شخص کا اندر اور باہر دکھا دیا اور پھر اس نے مجھے

سالار سکندر کو سونپا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تم وہ شخص ہو جس کی محبت میں صدق ہے۔ تمہارے علاوہ اور

کون تھا جو مجھے یہاں لے آتا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا تم نے مجھ سے پاک محبت کی تھی۔“

وہ بے حس و حرکت اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اب اس کے ہاتھ کو نرمی سے چومتے ہوئے باری باری

اپنی آنکھوں سے لگا رہی تھی۔

”مجھے تم سے کتنی محبت ہو گی، میں نہیں جانتی۔ دل پر میرا اختیار نہیں ہے مگر میں جتنی زندگی

تمہارے ساتھ گزاروں گی تمہاری وفادار اور فرمانبردار رہوں گی۔ یہ میرے اختیار میں ہے۔ میں

زندگی کے ہر مشکل مرحلے، ہر آزمائش میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ میں اچھے دنوں میں تمہاری

زندگی میں آئی ہوں۔ میں برسوں میں بھی تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی اس نے جتنی نرمی سے اس کا

ہاتھ پکڑا تھا اسی نرمی سے چھوڑ دیا۔ وہ اب سر جھکائے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو صاف کر رہی تھی۔

سالار کچھ کہے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خانہ کعبہ کے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ اسے زمین پر

اُتاری جائے والی صابغ اور بہترین عورتوں میں سے ایک بخش دی گئی تھی۔ وہ عورت جس کے لئے

نو سال اس نے ہر وقت اور ہر جگہ دعا کی تھی۔

کیا سالار سکندر کے لئے نعتوں کی کوئی حد رہ گئی تھی اور اب جب وہ عورت اس کے ساتھ تھی تو

اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کسی بھاری ذمہ داری اپنے لئے لے بیٹھا تھا۔ اسے اس عورت کا لگیل بنانا پڑا

تھا، جو تنگی اور پارسائی میں اس سے کہیں آگے تھی۔

امامہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سالار نے کچھ کہے بغیر اس کا ہاتھ تھام کر وہاں سے جانے کے لئے قدم

بڑھادیئے۔ اسے اس عورت کی حفاظت سونپ دی گئی تھی، جس نے اپنے اختیار کی زندگی کو اس کی طرح کسی آلائش اور غلاظت میں نہیں ڈبویا، جس نے اپنی تمام جسمانی اور جذباتی کمزوریوں کے باوجود اپنی روح اور جسم کو اس کی طرح نفس کی بھیٹ نہیں چڑھایا۔ اس کا ہاتھ تھامے قدم بڑھاتے ہوئے اسے زندگی میں پہلی بار پارسائی اور تقویٰ کا مطلب سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ اس سے چند قدم پیچھے تھی۔ وہ حرم پاک میں بیٹھے اور چلتے لوگوں کی قطاروں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔

وہ اپنی پوری زندگی کو جیسے فلم کی کسی اسکرین پر چلتا دیکھ رہا تھا اور اسے بے تحاشا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ گناہوں کی ایک لمبی فہرست کے باوجود اس نے صرف اللہ کا کرم دیکھا تھا اور اس کے باوجود اس وقت کوئی اس سے زیادہ اللہ کے غضب سے خوف نہیں کھا رہا تھا۔ وہ شخص جس کا آئی کیولیول +۱۵۰ تھا اور جو فوٹو گرافک میموری رکھتا تھا نو سال میں جان گیا تھا کہ ان دونوں چیزوں کے ساتھ بھی زندگی کے بہت سارے مقامات پر انسان کسی اندھے کی طرح ٹھوکر کھا کر گر سکتا تھا۔ وہ بھی گرا تھا بہت بار..... بہت مقامات پر..... تب اس کا آئی کیولیول اس کے کام آیا تھا نہ اس کی فوٹو گرافک میموری۔

ساتھ چلتی ہوئی لڑکی وہ دونوں چیزیں نہیں رکھتی تھی۔ اس کی مٹھی میں ہدایت کا ایک ننھا سا جگنو تھا اور وہ اس جگنو سے اُمدتی روشنی کے سہارے زندگی کے ہر گھپ اندھیرے سے کوئی ٹھوکر کھائے بغیر گزر رہی تھی۔